دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

اکتوبر 2015

نگران اعلیٰ

معراج رسول

انگارے

طاہر جاوید مغل کی نئی سلسلے وار کہانی

اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں

OCT-2015 PRICE RS. 60/=
REGD. NO. SS-13
Monthly JASOOSI DIGEST

جاسوسی

جلد 45 • شمارہ 10 • اکتوبر 2015 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

پبلشر و پرو پرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: 63-C فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیرِ اعلیٰ

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

اکتوبر کے اس تازہ شمارے کے ساتھ ہی قارئین کو عیدِ قرباں مبارک جس کی برکات سے وہ چند روز قبل مستفیض ہو چکے ہیں اور رنگا رنگ ذائقے تو ابھی کچھ دنوں تک چلتے ہی رہیں گے۔ ہماری یہ تمام خوشیاں اُن شہیدوں کے لہو کی ممنون ہیں جو دفاعِ وطن کے لیے، اور دہشت گردی کے خلاف لڑتے ہوئے آئے دن اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں۔ چند روز پہلے بڈھ بیر میں فضائیہ کے ایک رہائشی کیمپ میں ملک دشمنوں نے خون کی جو ہولی کھیلی، وہ ہر اعتبار سے نفرت اور مذمت و ملامت کی سزاوار ہے۔ بے گناہ اور نہتے نمازیوں کا خانۂ خدا میں خون بہانا مسلمانوں کے کسی مسلک میں روا نہیں ہے۔ پھر یہ کون ہیں جو مذہب کے نام پر ہمارے ملک و مذہب کی پگڑیاں اچھال رہے ہیں۔ ان کی بیخ کنی کی جگر سوز مہم جاری ہے مگر اہم اور بنیادی سوال یہ ہے کہ جب ہم اپنی صفوں میں چھپے ہوئے دشمنوں سے لڑ رہے ہیں تو ہر امکانی کمزوری کا سدِباب کیوں نہیں ہو رہا، ان لوگوں کو نیم دفاعی اداروں اور پولیس اہلکاروں کی یا ان جیسی وردیاں کہاں سے مل جاتی ہیں جن کی آڑ میں وہ ہر نگراں چوکی اور اہل کار کو جل دے کر پیش قدمی کر گزرتے ہیں۔ یہ کام یقیناً سول اداروں کا ہے کہ وہ ایسے کاروبار بند کرائیں۔ بڈھ بیر میں خوں ریز مقابلہ ہوا... بے گناہوں کی شہادت کے ساتھ دہشت گرد بھی اپنے اصل اہداف تک پہنچنے سے قبل اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے مگر عقابی نظروں سے یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ اس ممنوعہ علاقے میں کیسے اور کیوں کر داخل ہوئے۔ ہم داخلی محاذ پر اس وقت تقریباً حالتِ جنگ میں ہیں۔ فوج اپنا کام کر رہی ہے تو سول اداروں کو بھی آنکھیں کھول کر اپنے گرد و پیش میں جاری ہر منفی سرگرمی کو روکنا لازم ہے۔ ہمارے پیاروں اور دوسروں کا خون آخر کب تک بہتا رہے گا۔ اس سلسلے کی جڑوں کے خاتمے کے لیے ہم میں سے ہر ایک کو اپنی سرکاری اور ذاتی حیثیت میں بھرپور کردار ادا کرنا ہوگا۔ اس خوش امیدی کے ساتھ اب چلتے ہیں اپنی محفلِ ترش و شیریں میں...

عذرا ہاشمی کی بڑھ موڑ سے نئے نئے موڑ اختیار کرتی سوچ ''بڑی مخمور ہیں تمہاری آنکھیں'' کے مصداق تھیں جاتنگ گرلز کی آنکھیں۔ پیچھے عشقِ حقیقی کا نمائندہ مضراب پر الوہی کلام کی دُھن چھیڑے ہوئے محسوس ہوا اور اس کی دُھن پر بلھے شاہ و خواجہ غلام فرید کے صوفیانہ طرزِ رقص کے مطابق دو ہیولے محوِ رقص تھے۔ بے اختیار سر دُھننے کو جی چاہا۔ باکمال انکل ذاکر، بے مثال سرورق۔ مدیرِ اعلیٰ کے وطن کی محبت میں سرشار دردمندانہ خیالات میں ہم ان کے ہمنوا ہیں۔ چوہدری محمد سرفراز صاحب کی چوہدراہٹ اچھی لگی۔ سرفراز صاحب طنز و تنقید کے نشتر اور صنفِ نازک اور کرخت کی پرانی کھٹ پٹ، یہ تو ہمارے معاشرے کی گھریلو جنگیں ہیں، یہ جنگیں چینی نکتہ چینی میں الفاظ و صفحات کا پہلے ہی کافی خون پی چکی ہیں۔ آنٹی مجھے مار... کے مصداق۔ بہار حسین صاحب، آپ کے خیالات و آمد پر خوش آمدید، آپ کے اماتی الفاظ پر ہم من و عن آپ کے موقف کو درست تسلیم کرتے ہیں۔ فلک شیر ملک صاحب، آپ کا کڑوا سچ بے شک تائید کے قابل ہے۔ روبی انصاری صاحب تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ عامر اعظم عراقی صاحب جاسوسی کا معیار برقرار ہے اور ان شاء اللہ رہے گا۔ آپ کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے ہم سب کا فرض ہے کہ میڈیا کی یلغار میں کتاب دوستی کا ثبوت دیں اور اپنے گوشۂ عافیت جاسوسی ڈائجسٹ کو برقرار رکھیں جو ہمارے ذہنی انتشار اور دکھوں بھرے ماحول میں ہر ماہ اپنی مامتا بھری گود ہمارے لیے وا کرتا ہے۔ محمد ادریس خان، روبی انصاری اور محمد اقبال کے تبصرے پسند آئے۔ سید شکیل کاظمی اور مسرت محبوب عباسی کے تبصرے بہت اعلیٰ تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی نام کی وجہ سے سب سے پہلے ایبولا پڑھی۔ ڈاکٹر مریسا کی مشکلات بھری جدوجہد نے ہماری معلومات میں اچھا خاصا اضافہ کیا۔ امجد رئیس صاحب، اتنی اچھی کہانی پیش کرنے پر ہماری طرف سے خراجِ تحسین۔ انگارے پڑھی، حسبِ سابق اور حسبِ روایت ولی ذان مغل صاحب۔ ایتی کا کردار اچھا لگا، دیکھتے ہیں عاشرہ اور عارف کا ملاپ ہوتا ہے یا نہیں۔ آوارہ گرد کی مذکورہ قسط بھی تیز رفتار ایکشن سے بھرپور تھی۔ میری پیش گوئی ہے کہ مقتول لئیق شاہ، شہریار عرف شہزی کا بڑا بھائی ہوگا۔ انگارے اور آوارہ گرد میں فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون سی کہانی کی موجودہ قسط زیادہ زبردست تھی۔ دونوں آؤٹ اسٹینڈنگ اور بہترین تھیں۔ سونیا محبت گل صاحبہ، آپ کی پہلی کاوش شک بے شک نے دل کو چھو لیا۔ کہانی کی شروعات میں ہی ہمارا شک میڈم جانی پر گیا تھا، فنکار کے فن کی تعریف ہی اس کے لیے اصل صلہ ہوتی ہے۔ بہت اچھے۔ سرورق کے دونوں رنگ ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ دہری چال میں ہمارا شک ساریہ کی طرف بالکل گیا ہی نہیں کہ وہ بھی اس سب میں شامل ہوگی۔ شاہ اور تیموری کی آمد وہ بھی روایت سے ہٹ کر، واقعی مزہ آیا۔ عمر قید ملکی حالات اور انسانی رویوں کے حسبِ حال کہانی تھی۔ غلام حسین عرف شہاب الدین کی عمر قید صرف آٹھ ماہ میں ختم ہوگئی۔ احمد اقبال کے قلم کا نگینہ تھی یہ کہانی۔ اس بار جوں جوں ڈائجسٹ پڑھتے گئے، دل میں یقین پختہ ہوتا گیا کہ بہت عرصے بعد اتنا بھرپور اور زبردست رسالہ پڑھنے کو ملا ہے۔ سالگرہ میں پاؤلا نے اپنی ساس مادر تھارپ کو ہی قتل نہیں کیا بلکہ اپنا معاشی قتل بھی کر ڈالا، اچھی کہانی تھی۔ شکار اور شکاری مسٹر چوے کے انتقام کی منفرد کہانی بھی اچھی لگی۔ کمیشن میں برنیڈا اور ڈیل دونوں بہن بھائیوں نے ایک دوسرے کے ساتھ جو کیا اس نے مغربی خون کی سفیدی اور خود غرضی کی ایک اور صورت آشنائی کروائی، نارمل کہانی تھی۔ گرینڈپا میں بوڑھے نارمن نے اپنی ذہانت اور فرض شناسی سے جوانوں کو بھی مات دے دی۔ یہ کہانی بھی پسند آئی۔ اعتراف چھوٹی مگر لاجواب کہانی۔ پیراٹن کی عیاری پر بے اختیار داد دینی پڑی۔ ٹارزن، ہمارا معاشرتی المیہ ثابت ہوئی اور ایک اہم پیغام دے کر سوچوں کے دریچے وا کر گئی کہ آج ہمارے بچے ٹوائز شاپ پر سب سے پہلے کھلونا پستول ہی کیوں منتخب کرتے ہیں؟ اور ہم انہیں خرید کر کیوں دیتے ہیں؟ اسی بات سے منسلک تازہ واقعے نے مزید دکھی کر دیا۔ میٹرک کے اسٹوڈنٹ نے نجی اسکول کے کمرۂ جماعت میں ساتھی لڑکی کو گولی مار کر خودکشی کر لی اور ایک دن پہلے فیس

بک پر اپ ڈیٹ کیا کہ کل ہم زندہ نہیں ہوں گے اور اگلے جنم میں ملیں گے، ذرا سوچیے۔''

باغ جھنگ سے مسز ڈاکٹر عمران فاروق کی شمولیت ''جاسوسی 4 ستمبر عالمی یوم حجاب کو بے نقاب موصول ہوا۔ حجاب ایک مکمل نظام اخلاق اور نظام عفت و عصمت ہے۔ جاسوسی کا سرورق بہت جاذب نظر ہے۔ ایک جوگی بابا اور دو مجنوں خوب صورت لیلیٰ کی زلفوں کے اسیر نظر آ رہے ہیں۔ اشتہارات کی دنیا کے بعد اداریہ پڑھا۔ میرا نہیں خیال کہ اور کچھ کہنے یا لکھنے کو بچا ہے۔ ہمیں بحیثیت قوم توبہ و استغفار کرتے ہوئے اپنے خالق و مالک سے رجوع کرنا چاہیے کہ وہ ہمیں مکمل تباہی سے بچائے، آمین۔ بھائی چوہدری محمد سرفراز کا تبصرہ ابتدائی صفحات پر موجود تھا۔ بھائی آپ کی انگارے میں شاہ زیب کے ماضی کے متعلق پیشن گوئی سچ ثابت ہوئی۔ ویلڈن! بھائی شکیل کاظمی ہم نے 10 ستمبر تک تمام جاسوسی ڈائجسٹ کی جانچ پڑتال مکمل کر لی ہے۔ بہت سارے نام نئے سے ہیں۔ انگارے میں شاہ زیب کا پاشا پر ہاتھ ڈالنا پھر ناہید پاشا سے شکیل داراب تک پہنچ کر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنا۔ داؤد بھاؤ کا کردار بہت زبردست، واؤ! آوارہ گرد میں شہزی کاکے کی گوریلا طرز کی لڑائی۔ ڈمی ہمدرد یعنی ممتاز خان کے بندے پر قابو پانا، افسوس کے وزیر جان بچ نکلا۔ خوشی ہوئی کہ شہزی کو ماں جی کی صورت میں خوشی نصیب ہوئی۔ پہلا اور دوسرا رنگ تقریباً گزارے لائق تھے۔ مجموعی طور پر ماہنامہ ستمبر بہت اچھا رہا۔''

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کا تحریروں کا نچوڑ ''ستمبر کا ماہنامہ بہ آسانی 2 تاریخ کو مل گیا۔ سرورق کو ایک خوب صورت ماڈل اور تین اول جلول سے بندوں سے سجایا گیا جبکہ ماڈل کی آنکھیں ہلکی براؤن لگ رہی ہیں جو کہ بے وفا ہونے کا پتا دیتی ہیں۔ ایسی آنکھیں رکھنے والے جتنے لوگوں کو دیکھا یا دوستی رکھی سب بے وفا نکلے۔ (اچھا ہمارے لیے نیا انکشاف ہے) اپنی محفل میں آئے تو چوہدری محمد سرفراز کو بہت اچھا تبصرہ کرتے پایا۔ بہار حسین ہم آپ کو جاسوسی میں ویلکم کہتے ہیں۔ ادریس احمد خان مختصر پر اچھا تبصرہ کر گئے۔ حبیب اللہ اینڈ عثمان کو جاسوسی میں ویلکم۔ سید شکیل حسین کاظمی بھائی بھی عمدہ تبصرہ کر گئے۔ انور یوسف زئی شکریہ کس بات کا جو چیز اچھی لگے، وہ لکھ دیتا ہوں۔ لاہور سے رومی صاحب کا بھی اچھا تبصرہ تھا۔ عرفان راجہ کا مختصر تبصرہ اچھا رہا۔ معراج محبوب عباسی بھی اچھا تبصرہ کرتے نظر آئے۔ عذرا ہاشمی صاحبہ میں نے کب مغل صاحب پر تنقید کی ہے۔ محمد اقبال کی آمد بھی اچھی لگی۔ کہانیوں کی ابتدا انگارے سے کی۔ شاہ زیب نے کیا دکھتی رگ جا پکڑی ہے شکیل داراب کی، مزہ آ گیا۔ مزہ تو تب آتا ہے کہ جب سوا سیر سے سیر ٹکرائے اور سیر بھاری پڑ جائے۔ اس کے بعد آوارہ گرد پڑھی۔ نشیب و فراز سے گزرتی یہ قسط بہت عمدہ رہی۔ امجد رئیس صاحب کی ایبولا، اگر یہ کہوں کہ یہ اسٹوری آف منتھ ہے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ اتنے مشکل موضوع پر لکھنا اور پھر تحریر بھی کافی جاندار ہو۔ مریسا بالکل درست انداز سے پر جا رہی ہے۔ بابر نعیم کی آتشِ انتقام بھی اچھی تحریر تھی۔ جمال دتی کی کمیشن بھی عمدہ رہی۔ برنیڈا بھائی کو چونا لگانا چاہتی تھی لیکن ڈیل اور اس کی دوست نے الٹا اس کو چونا لگا دیا۔ ایس انور کی گرینڈ پا میں اولڈ نارمن نے کیا خوب طریقہ اپنایا اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔ تنویر ریاض کی شکار اور شکاری میں ولی کو ستا کو خوب بے وقوف بنایا چینیوں نے۔ سلیم انور کی نادیدہ قاتل بھی اچھی رہی۔ سرور اکرام کی ناززن انسانوں کو بہت کچھ سوچنے کا درس دیتی ہے کہ دنیا تو امن و امان اور بھائی چارے کی جگہ ہے نا کہ لڑائی جھگڑے اور خون خرابے کی۔ شک بے شک سونیا محبت گل کی پہلی کاوش عمدہ رہی جس میں انسپکٹر ذیشان اے ایس آئی کامران کی شازیہ قتل کیس میں بہت عمدہ کارکردگی رہی کہ نہ صرف شازیہ کے قاتل خان محمد عرف میڈم جانی کو پکڑا بلکہ کئی اور افراد کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ کاشف زبیر دہری چال یعنی کہ شامی اینڈ تیمور بہت عمدہ تحریر تھی۔ احمد اقبال کی عمر قید غلام حسین سے شروع ہو کر شہاب پر ختم ہونے والی تحریر میں غلام حسین ہر طرح سے کامیاب رہا، چاہے اس کے لیے دو قتل اور ایک کو جیل میں بھی بھجوانا پڑا۔ یہ تحریر بھی عمدہ رہی۔ میرے دوست محمد نعمان حیدر آف شورکوٹ بھی جاسوسی ڈائجسٹ کو بہت پسند کرتے ہیں۔''

سینٹرل جیل میانوالی سے سجاد خان آف موچھ کا تبصرہ ''اس بار قسمت کچھ زیادہ ہی مہربان رہی اور ہمیشہ کی طرح خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ 4 ستمبر کو اپنے جاسوسی ڈائجسٹ کا دیدار نصیب ہو گیا جو کہ کافی خوشگوار بات ہے کیونکہ پہلے کبھی اتنی جلدی جناب کے دیدار نصیب نہیں ہوئے۔ شاید میری گریہ و زاری نے اثر دکھا دیا۔ اللہ پاک ان دوستوں کا بھلا کرے جنہوں نے ہم قیدیوں کے لیے محفل میں آواز اٹھائی۔ ہمارا ابھی قصور نہیں، ہم جائز احتجاج کرتے ہیں کیونکہ ہم سزائے موت کے قیدیوں کے پاس جاسوسی ڈائجسٹ کے انتظار کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس بار روایت سے ہٹ کے ٹائٹل دیکھنے کو ملا کیونکہ خوب صورت حسینہ ملنگ بابا سے شاید کوئی صوفیانہ کلام سن رہی تھی، کم از کم ان حسینوں سے تو بہتر تھی جو زلف میں گولی پھنسا کر ڈراتی ہے، ملنگ بابا نے تو سارنگی پر دھنیں بکھیر کر میلا ہی لوٹ لیا۔ اب چلتے ہیں چٹکی نکتہ چینی میں نمک ڈالنے، یہ بات پوری دنیا کو پتا ہے کہ ہماری افواج پاکستان پوری دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتی، یہ بات پڑوسی دشمن کو بھی معلوم ہے اور ان شاء اللہ پاکستان کی عوام بھی ہر مشکل گھڑی میں اپنی فوج کے شانہ بشانہ لڑے گی۔ محفل میں چوہدری سرفراز براجمان نظر آئے۔ صفدر معاویہ بھائی آپ کی تبصرہ نگاری کے کیا کہنے۔ نوال اینڈ مثال، دوستوں کی غیر حاضری بالکل اچھی نہیں لگتی لیکن کچھ مجبوریوں نے چپ رہنے پر مجبور کر رکھا ہوتا ہے، آپ کا شکوہ بجا ہے اگر خود کو محفل تک ہی محدود رکھو تو اچھا ہے۔ بلقیس خان، خیریت تو ہے آپ محفل سے غیر حاضر رہنے لگی ہیں۔ عذرا ہاشمی صاحبہ! دیکھ بھال کر گن لینا، یہ نہ ہو اپنے میاں کا کان ہی نہ اڑا دو۔ کہانیوں میں سب سے پہلے امجد رئیس کی ایبولا پڑھی، مریسا کی لگن نے متاثر کیا۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی انگارے اچھی جا رہی ہے، دیکھتے ہیں آگے کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی آوارہ گرد کی کہانی اچھی جا رہی ہے۔ کاشف زبیر کی دہری چال دلچسپ رہی، باقی تقریباً ٹھیک ہی تھا۔''

میانوالی سے ملک رحمت کی سوغات ''جاسوسی ڈائجسٹ میں آٹھ ماہ بعد دوسری مرتبہ خط لکھ رہا ہوں امید واثق ہے تھوڑی جگہ پر قابض ہو ہی جاؤں گا۔ لاحول ولا آپ ہمیں قبضہ مافیا گروپ سمجھ رہے ہیں۔ (ہم تو نہیں سمجھ رہے آپ خود ہی فرما رہے ہیں) ستمبر 2015ء کے جاسوسی مبارک کی سرورق دوشیزہ کسی بھی زاویے سے حسینہ عالم یا قتالہ، لم نہیں لگ رہی۔ ویسے پسٹل کے بغیر جاسوسی کا سرورق، حیرت کی بات ہے۔ بیک گراؤنڈ میں صوفی ازم

جاسوسی سے میل نہیں کھاتا۔ اس بار خطوط کی محفل میں ایک بھی خط ایسا نہیں جس کی ہمارے ہاتھوں درگت بنے اور وہ مائنڈ نہ کرے اس لیے صرف تعریف ہی کر دیتے ہیں حق داروں کی۔ اس بار جن کے خطوط پسند آئے، ان کے نام یہ ہیں۔ معراج محبوب عباسی، عذرا ہاشمی، محمد اقبال، محمد ادریس احمد خان۔ کہانیوں کی شروعات ایبولا سے کی۔ زبردست! دوسرے حصے کا بے تابی سے انتظار ہے۔ انگارے ابھی جوبن پر نہیں آئی، یہ قسط پچھلی دو قسطوں سے اچھی رہی۔ کاشف زبیر صاحب کے شامی اور تیمور سے زیادہ مجھے ان کے جلیل اور راجا پسند ہیں۔ احمد اقبال صاحب کی کہانی عمر قید نے مزہ نہیں دیا۔ آوارہ گرد اچھی جا رہی ہے۔ شارٹ اسٹوریز میں شک بے شک اعتراف، نادیدہ قاتل، گرینڈ پا، شکار اور شکاری نے ہمارے دل میں جگہ پائی۔''

ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کی دعائیں ''ستمبر کے شمارے کا شدت سے انتظار تھا۔ سرورق کافی منفرد سا لگا۔ حسینہ کا مغرور سا انداز دل کو بھا گیا۔ بیچے بھائی تھے یا بھن کافی جلال میں لگ رہے تھے۔ دوستوں کی محفل میں چوہدری محمد سرفراز موجود تھے۔ سجاد خان، اللہ پاک انشاءاللہ آپ کی رہائی کا سبب بنا دیں گے۔ اپنی خیریت سے آگاہ کرتے رہا کریں، آپ کا تبصرہ پڑھ کر دل اداس ہو گیا۔ عرفان راجا آپ کی آمد اچھی لگی۔ عذرا ہاشمی اور وڈے شاہ جی تبصرے کی پسندیدگی کے لیے دل سے مشکور ہوں۔ نوال اور مثال اداسی اچھی نہیں۔ عذرا ہاشمی، وڈے شاہ جی اور ادریس خان کے تبصرے اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شامی اور تیمور کی طرف بھاگے جو اس دفعہ نواب صاحب کی گمشدہ محبوبہ کے قتل کا کیس حل کرنے میں مصروف تھے۔ کہانی میں اس دفعہ اہم کردار نوشی کی غیر موجودگی نے کہانی کا مزہ خراب کر دیا۔ اس کے بعد انگارے کا نمبر آیا۔ شاہ زیب میں عمران کی جھلک نظر آتی ہے، داراب صاحب کی بے بسی نے مزہ دیا۔ شاہ زیب کا ساتھی انیق کا کردار مزے کا لگ رہا ہے۔ امجد رئیس کی کہانی اچھی تھی مگر مجھے انگلش ترجمے اچھے نہیں لگتے۔ احمد اقبال دوسرے رنگ پر چھائے رہے لیکن سب سے اچھی کہانی سونیا محبت گل کی تھی، لگ ہی نہیں رہا تھا نئی لکھاری ہیں۔ خواجہ سرا کے روپ میں ایک مجرم انجام تک بالآخر پہنچ ہی گیا آخر میں جاسوسی ٹیم کے لیے سلام اور دعا گو ہوں۔''

ساہیوال سے محسن علی طاب کی تشنگی ''ٹائٹل انگارے کی اسٹوری سے مناسبت رکھتا تھا۔ بے شک انگارے اس شمارے کی بہترین اسٹوری ہے۔ جلدی سے نکتہ چینی میں پہنچے۔ انشاءاللہ انڈیا منہ کی کھائے گا اگر ہمارے شیر دل فوجیوں کو چھیڑے گا۔ مجھے جن حضرات کے خطوط اچھے لگے ان کے نام ہیں سرفراز، عبدالجبار اور محمد اقبال۔ ایبولا نے کافی قارئین کو متاثر کیا ہوگا، دوسری قسط کا انتظار ہے۔ گرینڈ پا نے سب کو حیران پریشان کیا۔ اعتراف، واہ کیا شاہکار تحریر یعنی اب دلن بھی پسند کیا جانے لگا۔ آوارہ گرد ایک ہی دائرے میں گھوم رہی ہے، کچھ چینج آنا چاہیے۔ تارزن نے بھی متاثر کیا۔ نئی لکھاری سونیا شک بے شک اچھی تحریر لائیں۔ اس کے سسپنس نے مزہ دیا۔ اختتام شاندار تھا۔ کاشف زبیر، یار کچھ پرانا کرو، کچھ مزاحیہ لوازمات بھی شامل کیا کرو تم سے اور احمد اقبال سے ایسی امید ہوتی ہے کہ تحریر پڑھنے کا مزہ آئے گا مگر اس دفعہ بھی تم دونوں نے مایوس کیا اللہ تم لوگوں کے قلم میں طاقت عطا فرمائے، آمین۔''

ناظم آباد سے محمد ادریس احمد خان کی تبصرہ نگاری ''دیدہ زیب رنگوں سے سجا جاسوسی ڈائجسٹ نظر نواز ہوا۔ سرورق بہت خوب تھا جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ بھی موقع اور وقت کے لحاظ سے برمحل تھا۔ سب سے پہلے طاہر جاوید مغل کی انگارے پڑھی۔ نت نئے ہنگاموں کے ساتھ دلچسپیوں کا مرقع تھا۔ آخری سطر تک بہت ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ یہی کسی تحریر کی مقبولیت کی سند ہے۔ آوارہ گرد بھی بہت اچھی تحریر ہے اس میں بھی بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔ کامیابی سے جاری و ساری ہے۔ ایبولا، امجد رئیس کی تحریر بھی اچھے انداز میں لکھی ہوئی کہانی ہے۔ سالگرہ بھی بہتر تحریر تھی۔ پاؤلا نے دولت کے لالچ میں آکر اپنی ساس کو خود ہی موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ مگر جب یہ معلوم ہوا کہ دولت کا حصول ناممکن ہے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ آتشِ انتقام نے بھی اچھا تاثر دیا۔ کیمشن بھی اچھی کہانی تھی۔ گرینڈ پا میں اولڈ نارمن نے ڈاکوؤں کو بڑی عقلمندی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جس سے اس پر کوئی الزام ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ اس پر یہ مثال صادق آتی ہے کہ نیا نو دن پرانا سو دن۔ اولڈ از گولڈ۔ شکار اور شکاری بھی اچھی تھی۔ نادیدہ قاتل، اعتراف، تارزن بھی اچھی تحریریں تھیں۔ آخر صفحات کی دونوں کہانیاں شک بے شک اور دوہری چال اور عمر قید بھی دلچسپی کا محور رہیں۔ چینی نکتہ چینی میں چوہدری سرفراز سرفہرست تھے۔ دیگر نئے پرانے دوست نظر آرہے تھے۔ آپ کے ادارے کے سینئر رکن حاجی بدرالدین کے سانحۂ ارتحال پر تعزیت کا اظہار کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں اللہ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، آمین۔''

انور یوسف زئی کی ای میل اسلام آباد سے، کہتے ہیں ''پرچہ 3 کو ملا اور 7 ستمبر کو پورا پڑھ لیا۔ سرورق خوب تھا۔ سرفراز نئے شریک ہیں، سرفہرست رہنے پر مبارکباد۔ شکیل کاظمی، معراج عباسی، ادریس احمد اور میرے علاوہ سب تبصرہ نگار نئے تھے۔ احمد اقبال کی عمر قید اس ماہ کی بہترین کہانی تھی۔ دہری چال میں کاشف زبیر نے شامی اور تیمور کی روایتی کہانی پیش کی۔ رابن کک کے ناول ایبولا کا ترجمہ شاندار رہا۔ امجد رئیس کی اس کاوش کے اگلے حصے کا انتظار ہے۔ آوارہ گرد میں سنسنی آگئی ہے۔ دیکھنا ہے کہ شہزی اب وزیر جان اور ممتاز سے کیسے نمٹتا ہے۔ اس ماہ غیر ملکی کہانیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ طبع زاد کہانیوں میں سرور اکرام کی تارزن منفرد کہانی تھی۔ اس ماہ کارٹونوں کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔''

عبدالغفور خان ساغری خٹک ضلع اٹک سے لکھتے ہیں ''کچھ ماہ بعد محفل میں حاضرِ خدمت ہیں، مصروفیت سے ٹائم نکال کے۔ اس دفعہ ٹائٹل کچھ خاص نہیں تھا۔ عام نظر ڈال کر کہانیوں کی لسٹ میں پہنچے، کہانیوں کی لسٹ کی ترتیب اچھی لگی۔ آوارہ گرد پڑھی جس میں شہزاد خان فل ایکشن میں نظر آئے۔ اگر ایک طرف اپنی ماں کو حاصل کر لیا ہے لیکن عابدہ کو کھو دیا ہے۔ لگتا ہے کہ مہم جوئی کرنے امریکا نہ چلا جائے، اچھی قسط تھی۔ اس کے بعد انگارے مغل صاحب کی تحریر پڑھی۔ انیق اور شاہ زیب کو دیکھ کر مجھے تو عادل اور سلو کی یاد دلا دی ہے جیسے سلو بھی عادل کو ہنسا دیتا تھا۔ اس طرح انیق

بھی کرتا ہے۔ نوک جھوک کافی پسند آئی ہے۔ داؤد بھائی کا کردار بھی اچھا جا رہا ہے۔ نئی لکھاری سونیا محبت گل خوش آمدید ہے۔ شک بے شک میں ایک چیز کی ذیشان نے غلطی کی ہے کہ خواجہ سرا میڈم جانی کا بھی ڈی این اے کرنا تھا کیونکہ جب سب کا ہو گیا تو میری نظر میں یہی قاتل تھی۔ ویسے گل صاحبہ نے اچھا لکھنے کی کوشش کی ہے۔ دہری چال، کاشف زبیر کی بھی ایک مہم جوئی تھی لیکن شاہی نے اسے حل کر دیا۔ عمر قید، میں غلام حسین کا کردار بھی کافی مضبوط تھا بلقیس کی قدر نہ کی اس لیے وہ جان سے گئی، اچھی تھی۔ کترنیں اچھی تھیں۔ چیں بہ چیں نکتہ چینی میں آئے تو دیکھا چوہدری سرفراز جتوئی ابتدا میں موجود تھے۔ ویسے یہ محفل میں بہار حسین مظفر گڑھ، قدرت اللہ نیازی صاحب نے کیا لکھا کہ 55 صفحات ضائع کیے۔ قدرت صاحب آپ نے دل لگا کر نہیں پڑھا تھا، کافی مواد تھا، خاص کر سلطان کی حب الوطنی تھی لیکن وہ کرپٹ افسران کے ہاتھوں خزانہ چلا جائے گا، دکھ ہوا تھا۔ سجاد خان بھائی جمیل میانوالی، آپ کے دوست کی فوتگی کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ خدا ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے، آمین۔"

کراچی سے شمس الحق کی توصیف نگاری ”جاسوسی کا تازہ شمارہ پہلی تاریخ کو ہی موصول ہوا۔ ٹائٹل گرل کی مخمور نگاہوں اور ساون کی گھٹاؤں جیسی زلفوں سے جھینپتے ہوئے دوستوں کی محفل پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے آگے بڑھے اور سید ھا طاہر جاوید انکل کی خدمت میں حاضر ہوئے جہاں ان کی نئی کہانی انگارے اپنی پوری آب و تاب سے آگے بڑھ رہی ہے۔ شکیل داراب کی کمزوری شاہ زیب نے پکڑ ہی لی لیکن گرگٹ سے بھی زیادہ رنگ بدلنے والے شکیل داراب جیسے لوگ ضرور اپنے وعدے کے خلاف کچھ سازشیں بُننے میں مصروف ہوں گے۔ شاہ زیب کے ساتھ ٹکر کا مزہ آئے گا۔ دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔ کاشف زبیر کے ساتھ اپنے پسندیدہ کرداروں کو دیکھ کر لطف دوبالا ہو گیا اور خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ ایک اور معاملے کی گتھی سلجھانے میں شاہی اور تیمور کی جوڑی کامیاب رہی۔ لیکن مزاح کا عنصر کچھ کم دیکھنے میں آیا۔ فولاد خان کے کردار کو بھی کاشف انکل نے پس پشت رکھا۔ عمر قید، وہی معاشرے کے ظلم و ستم وہی دولت کی ہوس اور وہی سیاست دانوں اور سفید پوشوں کے کالے کرتوتوں سے پردہ اٹھانے کی ایک بہترین کوشش تھی لیکن غلام حسین کا کردار کچھ منفی رہا جس کی وجہ سے زیادہ متاثر نہیں کر سکی۔ ایبولا میں یقیناً مسیحاؤں کے روپ میں چند درندے سامنے آئیں گے۔ مریسا کے کردار نے ثابت کر دیا کہ پانچوں انگلیاں کسی بھی سماج میں برابر نہیں ہوتیں۔ سونیا صاحبہ کی پہلی کاوش ایک عمدہ کہانی تھی۔ سالگرہ میں چند دن رہ گئے تھے لیکن پاؤلا کے لالچ نے سب کچھ ختم کر دیا۔ انگلش اسٹائل میں لالچ بری بلا ہے کا سبق پڑھنے میں کامیاب رہے۔ جاسوسی اس دفعہ بھی ٹائٹل سے لے کر آخر تک شاندار تھا۔“

شاہ گڑھ سے فلک شیر ملک کا جذبۂ حب الوطنی ”ماہ ستمبر کا جاسوسی، حسبِ معمول زبردست رنگینیاں سمیٹے ہوئے تھا۔ اچھی تحریریں پڑھنے کو ملیں۔ بس کمی تھی تو یوم دفاع اور یوم فضائیہ کی مناسبت سے کوئی تحریر نہ تھیں۔ کسی مردِ مجاہد پر کچھ لکھا جاتا تو بہتر ہوتا۔ تارزن اور گرینڈ پا، گزارہ تھی۔ انگارے، دہری چال نے متاثر کیا۔ سونیا محبت گل کی شک بے شک، بڑی کاوش تھی۔ اس دفعہ تراش خراش میں سوائے تین چار لطیفوں کے کچھ نہ تھا۔ کچھ ایسا دلچسپ سلسلہ اس رسالے میں شروع کریں تاکہ لوگ اچھے اچھے اقوالِ زریں، حکمت کی باتیں یا شعر و شاعری بھیجیں۔ (یہ تمام چیزیں ایسے بھی بھیج سکتے ہیں) چیں بہ چیں نکتہ چینی میں مدیرِ اعلیٰ نے صحیح فرمایا کہ دشمن آج بھی اپنے پرانے زخموں کو چاٹ رہا ہے۔ 1965ء کی جنگ میں پاکستانی ہیرا کمانڈوز نے انبالہ کے ہوائی اڈے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ جونہی بھارتی فضائیہ کے پائلٹ آپریشن روم سے پاکستان پر تباہی کے احکامات لے کر باہر نکل رہے تھے اور طیاروں میں بیٹھ کر کسی بھی لمحے اُڑنے کے لیے تیار تھے۔ ہمارے کمانڈوز ان پر خدا کا قہر بن کر نازل ہو گئے۔ پھر چونڈہ کے محاذ پر مجاہدوں نے دشمن کے ٹینکوں کا جو حشر کیا۔ اپنے سینوں پر بم باندھ کر ٹینکوں کے نیچے گھس گئے۔ ان مجاہدوں اور ان شہیدوں کو سلام۔ جن کے نام آج بھی تاریخ میں سنہری لفظوں سے لکھے ہوئے ہیں۔ ہم باقی قوام سے پیچھے کیوں ہیں؟ سب سے بڑی وجہ ایمان کی کمزوری، ہوس، لالچ، جھوٹ، اللہ پر توکل نہ کرنا، غیروں کے آگے ہاتھ پھیلانا، ملک سے وفاداری کا فقدان، حالانکہ ہمارا وطن ہر لحاظ سے اور ہر اعتبار سے سونے کی کان ہے۔ یہاں ہر موسم اور ہر معدنیات ہے۔ ہماری زمین کے نیچے میٹھے پانی کا سمندر موجود ہے۔ مگر ہم پانی کے لیے ترس رہے ہیں۔ اس ملک میں اتنے قیمتی درختوں کا اتنا ذخیرہ ہے جس سے ورلڈ بینک کا قرضہ اتر سکتا ہے۔“ (اب تو کوئی اعتراض نہیں، آپ کا خط من وعن شائع کر دیا)

پشاور سے طاہرہ گلزار کی داستان امیر حمزہ ”آج 3 ستمبر کو 4 بجے مجھے میرا فیورٹ سویٹ دوست، جاسوسی ملا تو ہاتھ میں لیتے ہی تمام تھکن دور ہو گئی اور ادارے سے ناراضی بھی کم ہو گئی۔ 5 بجے گھر آ کر جاسوسی پڑھنے بیٹھ گئی۔ سرورق پر لڑکی سوئی ہوئی آنکھوں اور پنک لپ اسٹک لگائے، کانوں میں ٹاپس پہنے ہمایوں سعید کو اس جوگی کے روپ میں دیکھ کے مسکرائی۔ جس کے ہاتھوں سے دوڈاکو رباب لینے کے لیے بے تاب نظر آئے۔ ہاہاہا کیا بات ہے سرورق کی حسینہ کی۔ میرے بہت سے بھائیوں کو تڑپا گئی۔ آگے بڑھی تو انکل نے الفاظ کے تیر مار مار کے ہمارا دل تو چھلنی کر دیا لیکن افسوس صد افسوس ان بے حس اور سنگ دل حکمرانوں پر کوئی اثر نہ ڈال سکے۔ انکل اگر ان کے سینوں میں گوشت پوست کے دل ہوتے تو تھوڑا سا ہی ہم بے بس اور مجبور عوام کے لیے بھی سوچتے تو آج ہماری یہ حالت نہ ہوتی۔ اب چلتی ہوں دوستوں کے خطوط کی طرف۔ جتوئی کے بھائی سرفراز سرفہرست تھے۔ مبارکاں، مبارکاں۔ بھائی اتنی بھی کیا کنجوسی کہ آپ جاسوسی خرید نہیں سکتے۔ اب تو میں جاب کرتی ہوں جب اسٹوڈنٹ تھی تو اپنی جیب خرچ سے بچا کے خریدتی تھی۔ خود سارا دن اسکول اور پھر کالج میں بھوکی رہتی تھی۔ بھائی جاسوسی تو مجھے بھی انعام میں ملا تھا لیکن مجال ہے کہ کسی نے جھوٹے منہ ہی مبارک باد دی ہو۔ آپ نے بھی یاد نہیں رکھا، کوئی بات نہیں۔ بھائی پہلے میں خط میں سب دوستوں کو بہت تنگ اور چھیڑتی تھی اور مذاق بھی بہت کرتی تھی لیکن ہائے رے نصیب، سب نے مجھ سے نفرت کرنا شروع کر دی۔ اب میں نے مذاق کرنا چھوڑ دیا اور دل پر پتھر رکھ لیا۔ بھائی آپ کا تبصرہ بہت میٹھا میٹھا لگا۔ صفدر معاویہ بھائی بھی آرمی کی محبت میں سرشار نظر آئے۔ تبصرہ اچھا لگا۔ بہار حسین بھائی کا تبصرہ اچھا لگا۔ بھائی میں آپ کی بات سے متفق ہوں

کہ آج کل پتا نہیں قدرت اللہ نیازی، تفسیر عباس اور کبیر عباسی کو کیا ہوا ہے وہ فیس بک پہ ایسی لاحاصل اور تکلیف دہ باتیں کیوں کرتے ہیں۔ محمد ادریس احمد خان بھائی عوام کی محبت میں سرشار نظر آئے، بہت اچھے۔ فلک شیر بھائی میں نے ہمیشہ ہر خط میں جیل سے رہائی کے لیے درود مستغاث کا وظیفہ بتایا ہے کہ روزانہ ایک بار پڑھیے۔ واہ جی واہ آج تو وڈے شاہ جی بہت شاندار تبصرہ لے کے حاضر تھے۔ کاظمی جی آپ کو خوب صورت خواتین نے کیا تکلیف دی ہے، کچھ وضاحت کریں گے۔ لگتا ہے آپ کی پڑوسن بھی خوب صورت ہے۔ پلیز آپ خواتین سے دور رہیے افاقہ ہوگا۔ ویسے شاہ جی آپ بھی بڑے وہ...... استاد نکلے ہاہاہا...... انور یوسف بھائی یاد رکھنے کا شکریہ۔ بھائی میرا خط شائع نہ ہونے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے آپ وضاحت کر سکتے ہیں ہاہاہا۔ جہلم سے نوال اور مشال کا مختصر تبصرہ بھی اچھا لگا۔ عبدالجبار رومی جس کو اپنے اوپر اعتماد نہ ہو وہی نامعلوم والے خطوط لکھتے ہیں۔ آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح زبردست رہا، ویلڈن رومی بھائی! حسن افضال کا مختصر تبصرہ اچھا رہا۔ معراج محبوب عباسی آپ نے صحیح کہا کہ انکل سیانے نے کہیں کبیر بھائی کو سستی اور بے وقوفی کی وجہ سے عاق تو نہیں کیا۔ آپ کا تبصرہ مجھے بہت پیارا پیارا لگا، ویلڈن عباسی بھائی! عامر انجم بھائی آپ کی یہ بدنصیب اور حالات کی ماری بہن تو بہت چھوٹی عمر سے سسپنس، جاسوسی اور سرگزشت کی دیوانی ہے، مسلسل تینوں میں تبصرہ لکھتی ہوں۔ محمد اقبال آف کراچی کا تبصرہ بھی بہت دلچسپ اور خوب صورت رہا۔ ادارے کے دیرینہ ساتھی حاجی بدرالدین احمد کی وفات کا بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کریں، آمین۔ کہانیوں میں پہلے اپنے موسٹ فیورٹ رائٹر مغل اعظم کی ایکشن سے بھرپور کہانی انگارے پڑھی۔ یہ قسط لاجواب رہی اور بے جا تنقید کرنے والوں کے لیے منہ توڑ جواب۔ آوارہ گرد میں دشمن شہزی کو عارفہ کے روپ میں ایک اور ذہنی دھچکا دینے میں کامیاب رہا۔ اس بار تو شہزی بھی آگ کا گولا بنا دشمن کو خاکستر کرنے نکلا ہے۔ ویلڈن بھٹی زورِ قلم اور بھی تیز ہو۔ کاشف زبیر ایک بار پھر ایک لاجواب تحریر، دہری چال شامی اور تیمور کو لے کر حاضر۔ دل خوش ہوگیا۔ اپنا خط شائع نہ ہونے کا دکھ بھی دور ہوا۔ احمد اقبال بابا جانی کو ہم پر رحم آگیا اور اتنی زبردست اور لاجواب تحریر پڑھنے کو دی۔ میری نظر میں تو یہ ستمبر کے حوالے سے ایک یادگار تحریر ہے۔ ویلڈن احمد اقبال صاحب!''

گوجرانوالہ سے **آصف محمود** کی رائے ''اس بار جاسوسی ڈائجسٹ ابتدائی تاریخوں میں ہی مل گیا تھا۔ جاسوسی ڈائجسٹ کی حسینہ کا دلکش انداز تھا تبھی مجنوں میاں کنگ سنبھالے رخِ زیبا حسینہ کی طرف کیے ساتھیوں کے ساتھ عشق سفر طے کر رہے تھے۔ سب سے پہلے طاہر جاوید مغل کی انگارے ایک ہی نشست میں پڑھی۔ اس بار قلم ان کا رواں تھا۔ اب دیکھیے شکیل دارا اب کیا گل کھلائے گا۔ دوسری نشست میں آوارہ گرد، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا جوہر دیکھا۔ 4 نشستوں میں کہانی مکمل کی۔ کسی ساتھی کے بغیر اور مدد کے بغیر اسپیکٹرم جیسی تنظیم سے نبرد آزما ہونا عقل سے بعید لگا۔ باجوہ صاحب بھی مدد نہیں کر رہے۔ کم از کم بیرونِ ملک یا ملک میں ہی شہزاد احمد کی نگرانی و مدد کی ہوتی۔ ویسے بھی ایک کوٹھی میں بغیر سیکیورٹی کے رہنا اسپیکٹرم کی طاقت کی نفی ہوتی ہے۔ اور شہزاد، زہرہ بی بی سے بھی روکھا پن کا مظاہرہ کر رہا ہے جبکہ ان کی اپنی ایک تنظیم ہے پھر اس تنظیم کا کیا کردار ہے؟ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب پرانے قلمکار ہیں۔ شہزی کی اکیلے کی بھاگ دوڑ سے اجتناب کیا جائے اور باجوہ صاحب کے پاور ایجنٹوں سے مدد لی جائے۔ ایک چنا کیا بھاڑ جھونکے گا؟ بہرکیف اندازِ تحریر بکھرا بکھرا سا مگر تیز تھا۔ شک۔ بے شک نئی لکھاری سونیا محبت گل کی ایک اچھی کاوش تھی، محنت کی ضرورت ہے۔ جلدی کہانی انجام کو پہنچا دی گئی۔ کاشف زبیر کی دہری چال اچھی تحریر ہے۔ تارزن، سرور اکرام کی موجودہ دور میں پرانی تحریر، واجبی سی تھی۔ ایبولا رابن کک کے بیسٹ سیلر ناول کا ترجمہ امجد رئیس نے شاندار انداز میں تحریر کیا ہے، ابھی تک تو اس کہانی میں ایبولا کے کرتا دھرتا کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوا کہ وہ کون ہے۔ ڈاکٹر مریسا کا کردار اچھا لگا۔ پل پل بدلتی صورتِ حال اچھی لگی۔ اس بار جاسوسی ڈائجسٹ مجموعی طور پر جاسوسی سا لگا۔''

ہری پور ہزارہ سے **معراج محبوب عباسی** کی تگڑی لفاظی ''3 ستمبر کو جاسوسی جونہی نظر آیا، فوراً لایا، سرورق سنار ہاتھا سازوں کی کہانی، ماڈل بھی نہ تھی کوئی اپنی جانی پہچانی، چھوڑا ٹائٹل اور فہرست کی راہ لی۔ نئے انداز پہ دل نے خواب واہ واہ کی، دیکھی جو شامی و تیمور کی کہانی بے ساختہ دل پکارا۔ کاشف تیری مہربانی۔ جن دوستوں نے تحریروں میں یاد کیا کہتی ہے میری نظر شکریہ۔ کہانیوں میں آغاز انگارے سے کیا۔ کیا خوب کام اس بار شاہ زیب نے کیا۔ ایسے ایسے اس قسط میں ہیرو نے جوہر دکھائے جیسے منہ سے شیر کے کوئی نوالہ چھین لائے۔ طاہر انکل کی کہانی اچھی جارہی ہے۔ بھٹی صاحب تو ایکشن کے موجد لگتے ہیں ہر قسط میں آٹھ دس بندے ضرور پھڑکتے ہیں۔ اپنی ماں کو تو وہ دشمن سے بچا لایا ہے پر نہ جانے دشمن نے امریکا میں کیا گل کھلایا ہے۔ مصیبتوں کے مارے کا کیا بنے گا یہ تو اگلی قسط میں ہی پتا چلے گا۔ کاشف زبیر ایسی دہری چال کے ساتھ آئے ناممکن کہ قاری کو لطف نہ آئے۔ زر مریدوں نے جب دہری چال چلا دی، دو گزنوں نے مل کے تو بینڈ بجا دی۔ پیچیدہ کیس بھی حل کر کے دکھا دیا۔ اصل مجرموں کو رنگے ہاتھوں پکڑا دیا۔ کہنے کو تو انسان اشرف المخلوقات ہے۔ جب آپے سے باہر ہو تو حیوانوں سے بھی بری اس کی ذات ہے۔ ثمر قیدہ لے کر آئے اس بار احمد اقبال، فیروز نے تباہ کرنا چاہے تھے غلام حسین کے ماہ و سال۔ عقل مند تھا اس لیے بازی پلٹ دی جس کی چال تھی اسی پہ الٹ دی۔ عائشہ کا ہوا جو برا انجام ملا ہو شاید بلقیس کی روح کو آرام۔ اعتراف میں چلی قاتل نے کمال کی چال۔ سراغ رساں بھی پھنس گیا اس میں بچھایا جو اس نے جال۔ اس طرح وہ صاف بچ نکل گیا جیسے مکھن سے کوئی بال نکل گیا۔ نادیدہ قاتل میں رچرڈ کا پلان خوب تھا۔ اس کیس میں سراغ رسانوں کا امتحان خوب تھا۔ مگر پھر انکشافات کی کھڑکیاں کھلنے لگیں... کڑی سے کڑی ملنے لگی۔ ٹھیک ہی کسی نے کہا ہے کہ قاتل کوئی تو غلطی کرجاتا ہے جو آخرکار اس کو پھنساتی ہے۔ پھانسی کا پھندا بن جاتی ہے۔ گرینڈ پا میں بوڑھے نے عقل مندی دکھائی۔ مجرمان کا مقدر بنی اندھی کھائی۔ دونوں کو ان کے انجام تک پہنچایا۔ اپنا عزمِ انتقام سچ کر دکھایا۔ سالگرہ میں سب کے لیے یہ پیغام تھا کہ نقصان دیتا ہے فیصلہ جلد بازی کا۔ اگر بہو کچھ روز صبر کر جاتی تو ساری دولت کی مالکن بن جاتی۔ آتشِ انتقام جو بابر نعیم نے لکھی کہانی یہ بھی کمال کی تھی۔ بیٹی نے باپ سے بدلہ لیا آئیور نے جو بویا وہ کاٹ بھی لیا۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں ابھی۔ ان پر کچھ لکھنے کو میں ہوں قاصر ابھی۔ اب اگلے شمارے کا انتظار ہے تب تک یہ قاری بیکار ہے۔ اب عید کی مبارک سب کو، خدا کرے آئے خوشی راس سب کو۔''

تحصیل جتوئی سے چوہدری محمد سرفراز کی سرفرازی ”سوچا تو یہی تھا کہ ٹائٹل ماہ ستمبر کی مناسبت سے ہوگا۔ اداریے کا رخ کیا تو وہ ماہ ستمبر کی مطابقت سے تھا۔ بلاشبہ قیادت کا فقدان ہی اس ملک کو صحیح معنوں میں آگے بڑھنے نہیں دیتا، وگرنہ قدرتی وسائل سے لے کر انسانی وسائل تک کسی بھی چیز کی اس ملک میں کمی نہیں۔ چیں نکتہ چینی میں اپنا تبصرہ دیکھ کر جو خوشی ملی اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس ناچیز کو نوازنے کا بے حد شکریہ۔ معراج محبوب عباسی نے اہالیانِ محفل سے لے کر کہانیوں تک نہایت جاندار انداز میں تبصرہ کیا۔ بہار حسین صاحب چیں نکتہ چینی کے چکر لگاتے رہیں، مہارت خود بخود آجائے گی۔ عذرا ہاشمی صاحبہ کا افسانوی رنگ پہ تبصرہ تخریبانہ انداز میں اختتام پذیر ہوا۔ توبہ توبہ! کیا نیک ارادے ہیں آپ کے۔ ہماری تمام ہمدردیاں اور نیک تمنائیں آپ کے میاں جی کے ساتھ ہیں۔ کہتے ہیں کچھ لوگوں کو بلا حساب جنت میں داخلہ اس لیے بھی مل جائے گا کہ وہ اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی سزا، اس دنیا میں ہی اپنی بیوی کے ہاتھوں ہونے والے مظالم کی شکل میں بھگت چکے ہوں گے۔ سید شکیل کاظمی صاحب نے بھی کیا خوب لکھا اور اپنے کبیر عباسی صاحب تو اس ماہ منظرِ عام سے غائب رہے۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی تحریر کے ہوتے کسی اور تحریر سے ابتدا کیسے کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ابتدا انگارے کی تیسری قسط سے ہوئی۔ جہاں پر ایکشن، سسپنس اور تھرل مغل صاحب کے مخصوص اندازِ تحریر میں عروج پر تھا۔ شاہ زیب نے آخر پر پرزے نکال ہی لیے اور شکیل داراب کا عارضی جھکنا کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو، کچھ کچھ اشارے ملے۔ امید ہے جب یہ پس منظر سامنے آئے گا تو تحریر کا لطف ہی الگ ہوگا۔ ابتدائی صفحات پر امجد رئیس صاحب کی ایبولا جاسوسی کی روایتوں کی امین کہانی ثابت ہوئی۔ بلاشبہ ہر سطر میں ایکشن، تجسس، جاسوسی اور سنسنی بھرپور انداز میں رچی بسی تھی۔ سرورق کے رنگوں میں کاشف زبیر اور احمد اقبال کے نام جگمگا رہے تھے۔ احمد اقبال کا اندازِ تحریر چونکہ زیادہ پسند ہے اس لیے ابتدا عمر قید سے کی۔ ہمارا موجودہ معاشرتی و سیاسی نظام، اس کی خامیاں کمزوریاں، اس سب کو اجاگر کرتی اچھی تحریر ثابت ہوئی۔ کاشف زبیر صاحب پہلا رنگ یعنی دہری چال میں شامی اور تیمور کے ساتھ حاضر ہوئے۔ اس مرتبہ نواب وقار الملک نے پہلی بار شامی اور تیمور کو بذاتِ خود کسی مشن پر بھیجا وگرنہ اس سے پہلے تو وہ دونوں کسی پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑاتے تو پھنس جاتے تھے۔ اس مرتبہ مزاح کا عنصر بھی کم تھا، شامی کی نہ تو کوئی بے وقوفی سامنے آئی اور نہ اس کی کلاس لگی، نوشی کا ذکر ندارد تھا اور اس سب کو بہت زیادہ مس کیا۔“

واہ کینٹ سے بلقیس خان کی آمد بہار ”دو ماہ کی خود ساختہ جلاوطنی یعنی رضا کارانہ غیر حاضری (تاکہ دوسروں کو بھی موقع ملے) کے بعد حاضرِ خدمت ہیں۔ ارے بیٹھ جائیں۔ کھڑے ہونے کا تکلف نہ کریں۔ تشریف رکھیں پلیز۔ ادارے اور احباب کو چھوٹی عید، 14 اگست، یوم دفاع اور عالیشان پیغمبرِ خدا کی عالی شان قربانی کی یاد میں منائی جانے والی عید الاضحیٰ کی ایک ساتھ مبارک باد۔ اس سے پہلے کے کھٹے میٹھے دوستوں سے فرداً فرداً ملاقات ہو، سرورق پہ بات ہو جائے جہاں ہمیں اپنے فنکار کی ایک اور اضافی خوبی سے آگاہی ہوئی۔ ہم جو ہمایوں سعید کو تفسیر عباس بابر، ماہا ایمان اور اب ماریہ خان کی طرح لاپتا افراد میں شامل کر رہے تھے۔ لگے تھے انہیں پڑوسن (ہماری والی شکیل والی نہیں) کی چوکھٹ پر جوگی بنے بیٹھے ہمارے ذاکر صاحب نے کھوج نکالا یعنی چھاپا مارا تو میں ہی نہیں، ماہر کھوجی بھی کہتے ہیں بھئی مان گئے۔ محفل دوستاں میں چوہدری محمد سرفراز کی چوہدراہٹ روایتی چوہدریوں سے ہٹ کر تھی۔ تبصرہ مکمل اور خوش رنگ تھا۔ محمد صفدر معاویہ کی عمدہ تبصرہ نگاری کو ہمارا ادارہ مانتا ہے تو میں کیوں نہ مانوں۔ تیسرا نمبر بہار حسین کا، ان کا پُریقین انداز اچھا لگا۔ ہمارے مستقل تبصرہ نگار ادریس خان بھی خوب رنگ جماتے ہیں۔ البتہ فلک شیر کا پکا پکا جواب کی ہمیں بھی سمجھ نہیں آئی۔ سید شکیل حسین کاظمی، یادآوری اور دلداری کا شکریہ۔ ہم تو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ آپ نے ہمیں کسی کھاتے ہی میں نہ رکھا۔ نادر سیال! آپ کو اپنی دعاؤں میں شامل کرنے کی کوشش میں لگی ہوں۔ اللہ آپ کے راستے آسان کرے۔ دلکش تبصروں اور دلنشین کترنوں والے رضوان تنولی، ہاتھ ذرا ہلکا رکھیں چاہے کٹھن ہی کیوں نہ ہو۔ ساگر تکوکر، وہی رشتہ جو میرا اور آپ کا جاسوسی والوں سے ہے مگر آپ ٹھہرے عقل سے پیدل۔ مظہر سلیم ہاشمی، شکر گزار ہوں۔ عبدالجبار رومی اور معراج محبوب عباسی کئی اچھوں سے اچھے رہے۔ محمد اقبال کی آمد بھی اچھی لگی۔ مختصر میں راجہ عرفان، سجاد خان، انور یوسف زئی، نوال مثال، اور انجم عراقی نمایاں رہے اور اب اپنے مغل شہزادے کی انگارے جس کی پہلی قسط سے ہم دانستہ محروم رہے۔ دوسری قسط سے ابتدا کی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ پہلی قسط میں دل جلانے والا کام ہو چکا ہے۔ اب تو شاہ زیب کی فائٹ ہے اور ہمارا کلیجا ٹھنڈا۔ ہمارے شہزادے کی قلم کچھار سے جب رستم سیال نکلتا ہے تو قاری ڈاکو سے محبت پہ خود کو مجبور پاتا ہے اور ڈپٹی ریاض سے نفرت کرتا ہے، ایسی ہی نفرت جیسی ہندو راجا راون سے کرتے ہیں۔ یہ ہے ہمارے طاہر جاوید کی قلم کو الٹی۔ پھر آوارہ گرد کی طرف دوڑ لگائی۔ جہاں پادر ٹھوس ثبوت میں لگی ہے جبکہ شہزی اکیلا پادر کی شان بڑھانے میں لگا ہے اگرچہ انداز غیر حقیقی ہے۔ اللہ کرے عابدہ دوسری عافیہ نہ بنے۔ نئی لکھاری سونیا گل نے تو کمال کر دیا۔“

رحیم یار خان سے طاہر چوہدری کی عالمانہ گفتگو ”چند ماہ قبل برتی گئی بے اعتنائی نے میرے قلم کو کچھ ایسا دلبرداشتہ کیا کہ بے اختیار آنسو چھلک پڑے۔ بہتے سوتوں نے اثرات مرتب کیے تو نوبت عینک شدگی تک جا پہنچی۔ اسی کارن کئی ماہ زمانۂ عافیت میں گزرے۔ اس ماہ ”آلات“ کچھ سازگار ہوئے تو سوچا کہ حاضری لگوا ہی لوں قبل اس کے کہ ذہن کے نہاں خانوں سے بھی خارج ہو جاؤں۔ پرچہ پڑوسن کے ابا سے ہوتا ہوا پڑوسن کی ہی وساطت سے جب مجھ تک پہنچا تو ابتدا ناچار سرورق سے ہی کرنی پڑی۔ کیونکہ محترمہ سرورق کی بدولت میری ایک دیرینہ خواہش پوری ہو گئی، نہ جانے نامعلوم سے ہی مجھے کسی ”کتابی“ چہرے کو دیکھنے کی خواہش تھی۔ محترمہ سرورق کے چہرے کی ماہیت کسی ٹیبل پہ ترچھی رکھی بند کتاب کا منظر پیش کر رہی تھی۔ اس کی زلفوں کے بہاؤ میں دو افراد عالمِ بے خودی میں رقصاں نظر آئے۔ ان کی محویت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ بے پایاں شفقت کے شکار ہیں۔ بہرحال سرورق سے مزید کنی کتراتے ہوئے صفحہ پلٹا اور جذبۂ حب الوطنی اور سوچوں کے زنگ لگے دروا کرتے اداریے سے مستفیض ہوئے۔ جناب ہم لوگ صرف سوچ کی تان باندھنے میں ہی مشاق ہیں۔ عملی طور پہ تو ہم میں سب کچھ ہی مفقود ہے۔ چوہدری صاحب کی چوہدراہٹ کام کر ہی گئی کافی

مفصل تجزیہ تھا، مبارکباد قبول فرما ہی لیں، محترم بہار حسین جو قاری مبلغ 60 روپے کے عوض پرچہ خریدتا ہے وہ اچھی یا بری رائے دینے میں مجاز ہے اس لیے آپ ایسی باتوں سے قطع نظر اپنی پسند ناپسند کو مدِ نظر رکھیں۔ وڈے شاہ جی ہمیشہ کی طرح بہترین انداز۔ عبدالجبار رومی صاحب کا تبصرہ بھی مناسب رہا۔ معراج محبوب عباسی بھائی کی محبوبیت اچھی رہی بقیہ سب احباب کے تبصرے بھی حسبِ ذائقہ رہے۔ کافی دوستوں کی کمی محسوس ہوئی، انکل سیانے، انی لالا، مظہر بھائی کدھر گم صم ہیں آپ سب لوگ۔ چند ایک تبصروں کے تناظر میں میری رائے ہے کہ محفل کا نام نہیں نکتہ چینی سے بدل کے کھٹن بٹا کھٹن کر دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ احمد اقبال کا نام فہرست میں دیکھنے کے بعد توجہ کہیں اور بھٹکتی ہی نہیں اس لیے کہانیوں کی ابتدا دوسرے رنگ عمر قید سے کی۔ کیا ہی کمال تحریر یوں سمجھیں کہ پورے پیسے وصول ہو گئے، پہلا رنگ بھی شاہی اور تیمور کی جوڑی نے خوب رنگ جمایا لیکن مزاح کا رنگ کچھ ماٹھا رہا شاید مجھے توقعات زیادہ تھیں۔ سونیا محبت گل کی پہلی تحریر ایوریج سے کچھ بڑھ کے تھی، امید ہے کہ محترمہ ایک اچھا اضافہ ثابت ہوں گی۔ انگارے، مغل اعظم اپنے روایتی موضوع کے ساتھ دوبارہ نظر آئے لیکن ان کا اندازِ تحریر ہی ایسا ہے کہ مماثلت کے باوجود پڑھے بغیر رہا نہیں جاتا، ابھی تو ابتدا ہے آگے دیکھتے ہیں ہوتا ہے کیا۔ بھٹی صاحب کے شہزی کی آوارہ گردیاں اپنے عروج پر ہیں۔ اس کی تیز رفتاری دیکھ کے تو مجھے کبھی کبھار اختلاجِ قلب ہونے لگتا ہے۔ منظر امام صاحب کی کمی بہت محسوس ہوئی، ایک وہی تو ہیں جو اپنی تحریروں کے ذریعے ہلکے پھلکے انداز میں ہماری تربیت کی سعی لاحاصل میں مصروف ہیں، لیکن یہ بھی حیرت کی ہی بات ہے کہ میں نے آج تک کبھی کسی سے ان کے لیے توصیفی کلمات نہیں سنے بلکہ پڑھے بھی نہیں۔ خیر پسند اپنی اپنی۔ سرور اکرام صاحب نے ٹارزن کے ذریعے منظر امام صاحب کی کمی کچھ پوری کی، چھوٹی سی تحریر لیکن سوچ بہت بڑی۔ اولین صفحات کا توشۂ خاص امجد رئیس صاحب کی ایبولا ایک بہترین تحریر، امجد رئیس صاحب کا انداز بہت اعلیٰ ہے، بہت روانی ہے۔ بقیہ تحریریں بھی حسبِ روایت رہیں یعنی آٹے میں نمک کا تاثر لیے ہوئے جس کے بنا ذائقہ گھٹا جائے۔

فتح پور لیہ سے محی الدین اشفاق کی مبارکباد ’’سرورق کی حسینہ گم صم نظر آ رہی تھی۔ آوارہ گرد شہزی نے مشکلوں کے ساتھ نہ صرف بیگم صاحبہ کو بچا لیا بلکہ وزیر جان کے ہاتھوں سے اپنی ماں کو بچا لیا، زبردست ایکشن تھا۔ کاشف زبیر مخصوص کرداروں کے ساتھ آئے، دہری چال زبردست تحریر تھی۔ عمر قید میں آل ٹائم گریٹ احمد اقبال صاحب کے قلم کی کاٹ نے لہو گرما دیا۔ چوہدری سرفراز ابتدائی تبصرے پر براجمان تھے۔ مبارک ہو! محفل کے پرانے جانے پہچانے دوست نظر نہیں آئے۔ باقی ڈائجسٹ زیرِ مطالعہ ہے۔ اتنا اچھا ڈائجسٹ شائع کرنے پر ادارے کو مبارکباد۔‘‘

میانوالی سے احسان سحر کی دلنشین باتیں ’’جاسوسی حسبِ معمول ایک گرم دن کو اپنی بانہوں کی زینت بنا، بانہوں میں ہمیشہ پیاری چیزیں ہی آتی ہیں۔ پہلی بار جاسوسی میں ایسا دلکش اور رومانس سے بھرپور ٹائٹل دیکھا جو کہ جاسوسی کا خاصہ تو نہیں...... خیر چینج از بیسٹ۔ گرم دن گزر رہے ہیں اور انسانوں میں بھی تلخیاں بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ ہر چہرے پر زبردستی کی اور مصنوعی مسکراہٹوں کا ڈیرا ہے جیسے یہاں ہر چیز کا قحط پڑ گیا ہو پتا نہیں کیا ہوگا آگے۔ بس یہی کہیں گے سب سے اور خود سے بھی کہ مایوس ہوتے نہیں...... دل کو جلاتے نہیں...... محفلِ دوستاں کی جانب قدم بڑھاتے ہیں جہاں رنگوں کی بہاریں ہی بہاریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ چوہدری محمد سرفراز اس دفعہ سب سے زیادہ نمایاں اور گہری شوخی کے رنگ رہے اور رنگ بکھیرتی نظروں سے گزرتے چلے گئے۔ فلک شیر ملک کی طرح ہم بھی گزارش کریں گے، ہم نے بھی ایک عدد ترجمہ شدہ کہانی بھیج رکھی ہے پچھلے کچھ عرصے سے اگر تکلیف نہ ہو تو معذرت کے ساتھ دیکھیے یا بغیر دیکھے ہمیں بھی آگاہ کیا جائے، باقی ہم تلخی پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ شکیل کاظمی نے اچھا تبصرہ کیا ہے۔ پہلی کاوش کو نظر انداز کیا وجہ یہ کہ اگلا شمارہ ملا تو اکٹھے دو حصے پڑھیں گے۔ دوسرا ایک تو تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور کردار بھی آدھے سے زیادہ بھول جاتے ہیں اور وہ انفرادیت اور دلچسپی نہیں رہتی۔ سالگرہ، اکثر جلد بازی اور لالچ انسان کو لے ڈوبتی ہے۔ پیسے کے لالچ نے انسان کو ہمیشہ اپنا ہی نہیں رہنے دیا۔ پاؤلا کے انجام سے خوشی ہوئی۔ آتشِ انتقام، انتقام کی آگ کو بجھانا بہت ہی مشکل ہے۔ جب بھڑکتی ہے تو دوسرے تو دوسرے خود کے وجود کو بھی خاکستر کر دیتی ہے۔ کمیشن، مجھے پسند نہیں آئی ایک بور اور لاحاصل کہانی رہی۔ انگارے، اب مکمل کھل کر سامنے آنے لگی ہے، کافی پسند آ رہی ہے۔ گرینڈ پا، بھی وہی لالچ اور خود غرضی پر مشتمل کہانی رہی۔ شکار اور شکاری، مسٹر چو نے نہایت چالاکی اور عرق ریزی سے کوریرا سے اپنے خاندان کی موت کا بدلہ لیا۔ اس دفعہ سراغ رسی نہیں تھی کہانی میں۔ آوارہ گرد میں شہزی آخر اپنی والدہ کو پانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ کافی مارا ماری رہی۔ دوسری طرف سیٹھ وغیرہ کا دھر لیا جانا، آگے چل کر کافی ڈرامائی موڑ لے گا۔ ٹارزن، انسان ہمیشہ سے فائدے کے چکر میں خود کو دھوکا دیتا آیا ہے۔ زمین پر بھی ہم نے نئے نئے اور تباہی پھیلانے والے ہتھیار بنا کر اپنی تباہی خود کی ہے۔ نئے قلم کار کی کاوش اچھی تھی۔ ایک کھلی حقیقت ایک سچائی جس کی تلخی بہت کم لوگ محسوس کرتے ہیں۔ جان محمد جیسے لوگ اب ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ یہی اب ہمارا حال بن گیا ہے، آدھے سے زیادہ اس ملک کو دہشت کا گہوارہ خود ہم نے بنا رکھا ہے۔ دوسری تو تمیں تو محض ہماری حوصلہ افزائی کے لیے آتی ہیں۔ رنگوں میں پہلی کاوش دہری چال سے آغاز کیا۔ انسان ایک ایسی آبشار کے مانند ہے جس میں نت نئی خواہشات جنم لے کر پانی کے قطروں کے مانند بہتی رہتی ہیں۔ ان خواہشات میں دولت کی ہوس سب سے نمایاں ہے اور اس ہوس کا شکار افراد اپنے بے گانے میں تمیز کھو بیٹھتے ہیں۔ سبین اور سارہ بھی ایسے ہی کردار تھے۔ دوسرا رنگ احمد اقبال صاحب لے کر حاضر ہوئے۔ خواہشیں پیدا بھی ہوتی ہیں اور احساسات جنم بھی لیتے ہیں۔ غلام حسین کے بہروز بننے کے عمل سے کتنی ہی خواہشوں نے جنم لیا۔ کتنی ہی احساسیت جاگتی اور مرتی رہیں۔ یہ سب انسان کے اندر کے رنگ ڈھنگ ہیں جو مختلف روپ میں باہر آتے رہتے ہیں۔‘‘

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

عبدالجبار رومی انصاری، لاہور۔ مشال، اینڈنوال، جہلم۔ عابد اسلم، فیصل آباد۔ محمد اقبال، کراچی۔ آفتاب احمد، حیدرآباد۔ ماہین حنیف، کراچی۔

ایبولا

تحریر
امجد رئیس

بیماریاں اور صحت بخش زندگی غرض ہر شے قبضۂ قدرت میں ہے... بیماری ہے تو اس کا توڑ بھی کہیں نہ کہیں موجود ضرور ہوتا ہے... اہمیت اس کی تلاش و کھوج کی جستجو کی ہے... ڈینگی، کرونا وائرس... کانگو وائرس اور نیگلیریا جیسے نت نئے خوفناک وائرس... جن کے نام بھی کبھی نہیں سُنے تھے... جواب سننے میں آرہے ہیں... جاسوسی کے اولین صفحات پر روبن کُک کے بیسٹ سیلرز ناولز میں سے بہترین کا انتخاب... نت نئے موڑ اختیار کرتی کہانی میں اچانک ہی خون ریزی شروع ہوجاتی ہے... انسان جیسے خوفناک وائرس کے ہاتھوں معصوم عوام اور باصلاحیت ڈاکٹر مسلسل موت کے شکنجے میں جانا شروع ہو جاتے ہیں۔ ایکشن... سنسنی اور تحیر کے اس طلسماتی ماحول سے تعلق رکھنے والی ایک پری وش ڈاکٹر کے درست اندازوں اور تحقیق و جستجو کا پُرتجسس احوال.. اس کی سرغراسی... مشاہدات اور تجربات نے بالآخر اسے ان راہوں پر ڈال دیا... جہاں تلخ حقائق کے ساتھ قدم قدم پر موت کے ہرکارے اس کی تاک میں تھے...

[illegible]

مریسا سی ڈی سی جاتے ہوئے سوچ رہی تھی، کہیں نورس نے گارڈ زکو اس کے... ڈپارٹمنٹ کے بارے میں مطلع نہ کردیا ہو۔

تاہم ایسا نہیں تھا۔ وہ گارڈ کی جھلک دکھا کر آگے بڑھتی چلی گئی۔ بطور حفظ ماتقدم اس نے پہلے اپنے آفس کا رخ کیا۔ اندر داخل ہو کر اس نے روشنی کی اور چند منٹ تک اپنی ڈیسک کے عقب میں کرسی پر بیٹھی رہی۔

ڈیسک پر تین لفافے پڑے تھے۔ دو دواساز کمپنیوں کی جانب سے تھے۔ تیسرے نے مریسا کی توجہ جذب کرلی۔ جس پر ''لیب انجینئرنگ اِن سائوتھ بینڈ'' کی مہر لگی تھی۔

مریسا نے لفافہ چاک کر کے پرچہ برآمد کیا۔ یہ ایک سیلز لیٹر تھا۔ جس میں مریسا کی دلچسپی کے لیے شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ نیز مریسا کی انکوائری کے جوابات بھی دیے گئے تھے۔

اس میں بتایا گیا تھا کہ اس قسم کے ہڈز، کسٹمر کی فرمائشی ضرورت اور ہدایات کے مطابق بنائے جاتے ہیں۔ یعنی یہ ''کسٹم بلٹ'' ہوتے ہیں۔ انہیں اپنی ضرورت اور مرضی کے مطابق بنوانے کے لیے ضروری ہے کہ کسٹمر کی اپنی آرکیٹکچرل فرم ہو۔ ایسی فرم کے لیے لازم ہے کہ وہ ہیلتھ کیئر

کے شعبے میں خصوصی تعمیراتی تجربہ رکھتی ہو۔ آخر میں مریسا کے اہم ترین سوال کا جواب دیا گیا تھا۔ جواب کچھ یوں تھا: ''لیب انجینئرنگ'' کو آخری آرڈر گزشتہ برس پروفیشنل لیب سے ملا تھا۔ یعنی PL اِن گریسن جارجیا۔

مریسا نے دیوار پر لگے US کے نقشے پر نظر ڈالی۔ پھر ایک دراز سے جارجیا کا روڈ میپ نکالا۔ گریسن ایک چھوٹا ٹاؤن تھا۔ اٹلانٹا سے مشرق کی سمت جائیں تو چند گھنٹے میں وہاں پہنچا جا سکتا تھا۔ نقشہ اس نے واپس رکھ دیا۔ لیب انجینئرنگ کا خط جیب میں ڈالا اور کھڑی ہوگئی۔

آفس سے نکلتے وقت وہ سوچ رہی تھی کہ گریسن جیسی مضافاتی اور غیر معروف جگہ پر کون ہے؟ جو ٹائپ تھری بیاہڈ جیسی ہائی پروفیشنل اشیا استعمال کر رہا ہے؟ بیا فلٹریشن سسٹم اس نے ٹیڈ کے ہمراہ MCL میں... دیکھا تھا۔ باتوں کے دوران میں بیا سسٹم کے بارے میں معلومات لی تھیں اور خاموشی سے ایک خط ''لیب انجینئرنگ'' کو روانہ کر دیا تھا۔

وہ جانے پہچانے راستوں سے ہوتی ہوئی MCL کی جانب رواں دواں تھی۔ اسے خاص امید نہیں تھی... کہ ''لیب انجینئرنگ'' سے کوئی مثبت جواب آئے گا۔

وزنی فولادی دروازے میں مخصوص جگہ پر مریسا نے ٹیڈ کا کارڈ استعمال کیا۔ کوڈ نمبر اسے ازبر تھا۔ 39-23-43 پنچ کرتے ہی لاک کھلنے کی مدھم سی کلک سنائی دی۔

مضطرب دل کے ساتھ اس نے اندر قدم رکھا۔ رفتارِ قلب میں ازخود اضافہ ہو گیا تھا۔ ماحول میں جراثیم کش ادویات کی شناسا بو بسی ہوئی تھی۔ ٹیڈ کی نقل کرتے ہوئے اس نے سرکٹ بریکرز کو چھیڑا۔

مریسا ٹیڈ کی نقل کرتے ہوئے MCL میں آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ دو مرتبہ پہلے ٹیڈ کے ساتھ یہاں آچکی تھی اس لیے اسے MCL کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ البتہ وہ تنہا تھی۔ یہ جگہ اس کے نزدیک ''ایوانِ دہشت'' تھی۔ وہ قدرے خوف محسوس کر رہی تھی۔ ہراس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ قطعی غیر قانونی طور پر وہاں داخل ہوئی تھی۔ وہ ہمت مجتمع کر کے MCL کے مخصوص مراحل سے گزر رہی تھی۔

تمام حفاظتی انتظامات مکمل کر کے اس نے آخری دروازہ کھولا اور مرکزی لیب میں داخل ہوگئی۔ MCL کے مخصوص لباس میں اور ہوز پائپ کے ساتھ وہ کوئی خلائی مخلوق لگ رہی تھی۔

مریسا نے تمام روشنیاں آن نہیں کی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچ گئی۔ گزشتہ دورے میں اس نے کوڈز، نمبرز اور ترتیب ذہن نشین کر لیے تھے۔

یہ ایبولا کی خفیہ پناہ گاہ تھی۔ ہر ٹرے میں ایک ہزار نمونے تھے۔ افریقہ والی ٹرے علیحدہ تھیں۔ ہر ٹرے میں پچاس وائل تھیں۔

مریسا نے نہایت احتیاط سے ٹرے نمبر 197 اٹھا کر ایک طرف کاؤنٹر پر رکھ دی۔ گھبراہٹ اور خوف کے باعث وہ کسی قدر گڑبڑا گئی۔ تاہم اس نے اپنے مطلب کی وائل (ٹیوب) کی تلاش جاری رکھی۔

بالآخر ایک وائل اس کے ہاتھ آگئی۔ جس کا نمبر E39 تھا۔ وائل خالی تھی۔

اس نے فیس ماسک کے عقب سے بغور خالی وائل کو دیکھا۔ اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ جہاں مریسا کا خدشہ درست نکلا وہیں اس کا جسم دہشت سے لرز اٹھا۔ وہ ایک ایسا راز دریافت کر چکی تھی جس کے بعد اس کی زندگی واضح طور پر خطرے میں پڑ گئی تھی... شدید خطرے میں۔

یہ حد درجہ ہولناک انکشاف تھا کہ ایبولا کی خفیہ پناہ گاہ سی ڈی سی میں تھی۔ کوئی خوفناک سازش تھی۔ کوئی شک نہیں رہا تھا کہ ایبولا جیسے خون آشام، ناقابلِ علاج وائرس کو انسانی ہاتھ استعمال کر رہے تھے۔

مریسا سکتے کے عالم میں ایبولا کی خالی وائل کو گھور رہی تھی۔ سازشی عناصر کون تھے؟ اور اگر ان کو مریسا کی کارگزاری کا علم ہو جاتا تو اس کی موت یقینی تھی۔ وہ جو بھی تھے، پہلے ہی سیکڑوں انسانوں کو ایبولا کے ذریعے ہلاک کر چکے تھے تو مریسا کی کیا اوقات تھی۔

دفعتاً مریسا کی آنکھ کے کونے کو کسی حرکت کا احساس ہوا۔ اس کا دل حلق میں دھڑکنے لگا۔ توجہ وائل پر سے ہٹ گئی۔ اندر آنے کے لیے فولادی دروازے کا پہیا گھوم رہا تھا۔ مریسا جیسے مفلوج ہو کر رہ گئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ کوئی اندر داخل ہونے والا ہے۔

لمحہ بھر کے لیے اسے مایوسی نے گھیرا پھر وہ متحرک ہو گئی۔ وائل واپس رکھ کر ٹرے اس نے جگہ پر رکھ دی۔

پہلا خیال اسے بھاگنے کا آیا لیکن وہاں بھاگنے کی جگہ کہاں تھی۔ پھر اسے چھپنے کا خیال آیا لیکن کہاں؟ اسے جانوروں کے سیکشن کا خیال آیا جہاں نیم تاریکی تھی۔ اتنے میں ائرٹائٹ فولادی دروازہ کھل گیا اور دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ دونوں نے مخصوص پلاسٹک سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ایک لمبا تڑنگا تھا، دوسرا پستہ قد۔ پستہ قد لیب سے شناسا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی کو ائر ہوز پلگ ان

کرنے کا طریقہ بتایا۔

مریسا کا دل پسلیوں کے پنجرے کو ہتھوڑے کے مانند کوٹ رہا تھا۔ نہایت معمولی امکان تھا کہ وہ دونوں سی ڈی سی کے ڈاکٹرز ہوں اور کسی کام سے وہاں اچانک آن پہنچے ہوں... یہ معمولی خوش فہمی بھی فوراً دور ہو گئی۔ دونوں سیدھے مریسا کی جانب آ رہے تھے۔ اس وقت مریسا نے نوٹ کیا کہ پستہ قد کے ہاتھ میں ایک سرنج تھی۔ دراز قامت کا ایک ہاتھ مصنوعی انداز میں کہنی سے مڑا ہوا تھا۔

آہ... مریسا کو گھر پر ہونے والا حملہ یاد آ گیا۔ بے ساختہ اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ قاتلوں کے نرغے میں تھی۔

بدقت تمام اس نے خود کو سنبھالا اور اپنا ائر ہوز پائپ، پلاسٹک سوٹ سے الگ کر دیا اور بھاگتی ہوئی جانوروں کے سیکشن میں گھس گئی۔ لمبا آدمی قریب آ چکا تھا۔ وہ اپنے شکار پر جھپٹا جس وقت وہ مریسا کو پکڑنے والا تھا، ائر پائپ کی لمبائی ختم ہو گئی۔ وہ جھٹکا کھا کر رکا۔ مریسا پھرتی سے جانوروں کے پنجروں کے درمیان روپوش ہو گئی۔ مختلف جانوروں نے غل بپا کر دیا۔

مریسا لیب کی محدود جگہ میں پھنس گئی تھی۔ توجہ ہٹانے کے لیے اس نے بندروں کے پنجرے کھولنے شروع کر دیے۔

ائر پائپ کی موجودگی میں اب اس کی سانس بھاری ہونے لگی تھی۔ بندر خوخیاتے ہوئے باہر نکل پڑے۔

مریسا نے رخ بدل کر ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ اس کی نگاہ نیم تاریکی سے آشنا ہو گئی۔ شاید قسمت تھی کہ اسے ایک ائر پائپ نظر آ گیا۔ اس نے پائپ پلگ ان کر کے گہرے گہرے سانس لیے۔

یہ امر واضح تھا کہ دراز قامت لیب میں پہلی بار آیا تھا لیکن مریسا کے لیے اس میں کوئی واضح سبقت پنہاں نہیں تھی۔

وہ پنجروں کے درمیان اپنی دانست میں مناسب جگہ پر چھپ گئی۔ اسے بندروں کی جانب سے بھی دھڑکا لگا ہوا تھا۔

ایک انسانی سایہ مریسا کی پوشیدہ جگہ کی طرف آ رہا تھا۔

اسے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ سایہ اسے دیکھ چکا ہے یا نہیں۔

مریسا ہمت کر کے دبکی رہی مگر اس کا اندازہ غلط نکلا، سایہ قریب آ گیا تھا اور واضح انسانی شبیہ میں ڈھل گیا۔ نکل بھاگنے کی مہلت نہیں تھی۔ مریسا کی گردن کا رُواں رُواں کھڑا ہو گیا۔ سانس خودبخود رک گئی۔ پھر بھی اس نے ائر پائپ الگ کیا اور پنجروں کے درمیان دور جانے کے لیے حرکت کی۔

اسی وقت اس آدمی نے مریسا کا بایاں بازو جکڑ لیا۔ مریسا کی مزاحمت طاقتور گرفت کے مقابلے میں قطعی غیر اہم تھی۔ مریسا نے اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن واضح طور پر پہچاننے میں ناکام رہی۔

''اب وہ کیا کرے؟ کیا آخری وقت آ گیا ہے؟'' دفعتاً اس کی نگاہ قاتل کے شانے کے عقب میں سرخ رنگ کے لیور پر پڑی جس پر ایمرجنسی لکھا ہوا تھا۔

لیور استعمال کرنے کے کیا نتائج نکلیں گے، یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ مایوسی کے عالم میں مریسا نے آزاد ہاتھ سے سرخ لیور کھینچ ڈالا۔ بیک وقت، دو چیزیں ظہور پذیر ہوئیں۔ ایک زوردار الارم کی آواز، دوسرے اس علاقے میں فینولک ڈس انفیکٹ کے شاور کی برسات شروع ہو گئی۔ دھند کے بادل چھانے لگے اور نگاہ کی رسائی تقریباً زیرو ہو گئی۔

قاتل نے اچانک افتاد سے بدحواس ہو کر مریسا کا بازو چھوڑ دیا۔ مریسا نے پنجروں کے پیچھے گھس کر کرالنگ شروع کر دی۔ وہ اندازے سے مرکزی لیب کی طرف جا رہی تھی۔ کچھ دور جا کر وہ باہر نکل کر قدموں پر کھڑی ہو گئی۔ ڈس انفکیٹ شاور کی برسات رکتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ غالباً ضروری تھا کہ کوئی اس لیور کو واپس جگہ پر کر دے۔

مریسا کی سانس پھر بوجھل ہونا شروع ہو گئی۔ اسے تازہ ہوا کی ضرورت تھی۔ وہ ہانپتی ہوئی مرکزی لیب تک پہنچ گئی۔ اسے امید تھی کہ دوسرا آدمی، پہلے کی مدد کے لیے جانوروں کے سیکشن میں ہونا چاہیے۔

مریسا نے پہلے ائر پائپ منسلک کر کے سانس بحال کی۔ جانوروں کے سیکشن سے اسے پریشان کن آوازیں سنائی دیں۔ اگرچہ یہ مدھم تھیں۔ تاہم اس نے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ ہوا کی کمی کا شکار ہو گئے ہیں، قبل اس کے کہ انہیں مخصوص ائر پائپ ملتا، مریسا نے تمام روشنیاں گل کر دیں۔ دوسرے سیکشن سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ غالباً کوئی پنجرے سے ٹکرا گیا تھا۔

وہ کسی نہ کسی طرح ڈس انفیکنگ روم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ اتفاق سے، فینولک شاور، جانوروں کے سیکشن میں پہلے ہی مل چکا تھا۔ لہٰذا اس نے شاور لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اگلے کمرے میں حتی الامکان تیزی سے اس نے پلاسٹک ڈریس کے علاوہ تمام حفاظتی اشیا الگ کیں اور اپنا عام لباس زیب تن کر لیا۔ اس کے دماغ میں ابھی تک چنگاریاں سی بھری ہوئی تھیں۔ دھڑکنیں بے اعتدالی کا شکار تھیں۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ موت کے منہ سے واپس نکل آئی ہے۔ مریسا نے مہیب فلٹر سسٹم بھی آف کر دیے۔ وہ جہاں سے گزرتی روشنیاں آف کر دیتی۔

ڈاکٹر ہوتے ہوئے اسے ان بے رحم قاتلوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ اس نے وائبلیشن سسٹم بھی بند کر دیا۔ وہ MCL سے نکل چکی تھی۔ بدن اب بھی لرز رہا تھا۔

سیکیورٹی گارڈ ڈیسک پر تھا۔ مریسا نے خود پر قابو پایا۔ وہ کسی کو اطلاع دے رہا تھا کہ بائیولوجیکل الارم کسی طرح آن ہو گیا ہے۔ مریسا سائن کر کے آگے بڑھ گئی۔

''ہے... یو۔'' گارڈ کی آواز آئی۔ پہلا خیال مریسا کو آیا کہ بھاگ لے۔ باہر نکلنے کے لیے اسے زیادہ فاصلہ طے نہیں کرنا تھا۔

''تم نے وقت نہیں لکھا۔'' گارڈ کی آواز آئی۔ مریسا دوڑ لگاتے لگاتے تھم گئی۔

''اوہ سوری۔'' وہ پلٹی اور رجسٹر پر وقت تحریر کر دیا۔

باہر نکلتے ہی وہ کار کی جانب دوڑی۔

اسے بہت سارے سوالات کے جواب مل گئے تھے۔ چند سوال تشنہ تھے کہ MCL سے ایبولا چرانے والوں کا تعلق سی ڈی سی سے تھا یا وہ کوئی اور تھے؟ سی ڈی سی کے مخصوص اسٹاف کے علاوہ کوئی اور MCL میں نہیں جا سکتا تھا۔ معاً اسے حماقت کا احساس ہوا۔ بدحواسی میں وہ رجسٹر پر MCL میں داخل ہونے والے دونوں قاتلوں کے دستخط اور نام دیکھنا بھول گئی تھی۔ ''کوئی'' نہیں چاہتا تھا کہ یہ راز فاش ہو اسی لیے وہ ایک بار پھر بال بال بچ گئی تھی۔ وہ کون تھا؟ یا تھے؟

ان دونوں کا کیا ہوگا، وہ کیا بیان دیں گے؟ تاہم بیان مریسا کے خلاف ہی جائے گا کہ وہ ویسے بھی غیر قانونی طور پر MCL میں داخل ہوئی تھی۔ مریسا کو یقین تھا کہ جلد ہی پولیس اسے تلاش کرنا شروع کر دے گی۔ اس نے رالف کی طرف جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

مریسا کا سوٹ کیس ابھی تک کار میں ہی تھا۔ اس نے فی الفور قریبی موٹیل کا رخ کیا۔ کمرا حاصل کرتے ہی مریسا نے سب سے پہلے رالف کو فون ملایا۔ وہ غالباً سو رہا تھا۔ پانچویں گھنٹی پر اس کا جواب موصول ہوا۔ آواز بھی خمار آلود تھی۔

''رالف، میں ہوں... مریسا۔''

''ہاں، پہچان لیا۔ کہاں ہو؟ ابھی تک مجھ سے نہیں ملیں؟''

''میں مشکل میں ہوں، بہت مشکل میں۔ اس وقت تمام باتیں نہیں بتا سکتی۔'' مریسا نے کہا۔ ''مجھے ایک اچھے وکیل کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ تم کسی کو جانتے ہو؟''

''او میرے خدا۔'' رالف کی آواز سے نیند کا خمار غائب ہو گیا۔ ''بہتر ہے کہ سب کچھ بتاؤ، میں سنوں گا۔''

''نہیں، میں تمہیں اس مصیبت میں گھسیٹنا نہیں چاہتی۔'' وہ بولی۔ ''معاملات بہت بگڑ گئے ہیں۔ میں اتھارٹیز سے بھی رابطہ نہیں کر سکتی۔ سمجھ لو کہ میری حیثیت مفرور کی سی ہے۔'' وہ کھوکھلے انداز میں ہنسی۔

''تم یہاں میرے پاس کیوں نہیں آ جاتیں۔ یہاں تم خود کو محفوظ پاؤ گی۔''

''شکریہ۔ فی الوقت میرے لیے وکیل کا بندوبست کرو۔''

''میں ہر قسم کی مدد کے لیے تیار ہوں، تم ہو کہاں پر؟'' رالف نے یقین دہانی کراتے ہوئے سوال کیا۔

''میں رابطے میں رہوں گی پھر شکریہ۔ تم ایک اچھے دوست ہو۔ وقت کم ہے، میں رابطہ کروں گی۔'' مریسا نے کچھ بتائے بغیر فون بند کر دیا۔

بڑی ہمت کر کے اس نے ٹیڈ کا نمبر ملایا۔ کارڈ کی بابت وہ ٹیڈ سے معذرت کرنا چاہتی تھی۔ کئی بار گھنٹی بجی، مریسا کے اعصاب جواب دے گئے۔ اس نے لائن کاٹ دی۔ ''سونے دو اسے۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا اور بستر پر بیٹھ کر اپنے کشیدہ اعصاب کو تھپکیاں دینے لگی۔

بات کہیں سے کہیں جا نکلی تھی۔ دوسری مرتبہ وہ بال بال بچی تھی۔ مریسا نے گہری سانس لی اور جیب سے گریسن کی ''لیب انجینئرنگ'' کا خط نکالا۔

☆☆☆

بُری طرح نڈھال ہونے کے باوجود وہ سکون کی نیند سے محروم رہی۔ ڈراؤنے خواب اسے ہراساں کرتے رہے۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ اس نے آنکھ کھول دی۔ واش روم سے نکل کر اس نے اٹلانٹا جنرل اینڈ کانسٹی ٹیوشن کی کاپی منگوائی۔

اس میں سی ڈی سی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ مریسا نے ٹی وی پر صبح کی نشریات دیکھنی شروع کیں۔

خبروں کے دوران سی ڈی سی میں ایک ٹیکنیشن کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی۔ جسے ایموری یونیورسٹی اسپتال میں ابتدائی طبی امداد کے بعد فارغ کر دیا گیا تھا۔

اس کے فوراً بعد مریسا نے اسکرین پر نورس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آواز پتھرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کے بیان کے مطابق مذکورہ حادثہ ایمرجنسی سیفٹی سسٹم میں خرابی کے باعث رونما ہوا تھا اور اب صورتِ حال پوری طرح قابو میں ہے۔ آخر میں نورس نے ڈاکٹر مریسا بلوم کا نام لے کر بتایا کہ حادثے سے ڈاکٹر مریسا کا تعلق ہے اور سی ڈی سی کو

ڈاکٹر مریسا کی تلاش ہے۔
کہیں بھی MCL کا ذکر نہیں تھا۔

نورس کا چہرہ غائب ہوگیا۔ میزبان کی شکل دوبارہ دکھائی دی۔ وہ عوام سے اپیل کر رہی تھی کہ کسی کے پاس ڈاکٹر مریسا کی کوئی اطلاع ہو تو وہ اٹلانٹا پولیس سے رابطہ کرے۔ دس سیکنڈ بعد اسکرین پر مریسا کی تصویر کی نمائش کردی گئی۔

عالمِ پریشانی میں اس نے ٹی وی بند کر دیا۔ وہ حقیقتاً مفرور کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ کم از کم اٹلانٹا میں وہ ایک ''وانٹڈ پرسن'' تھی۔

مریسا نے تیزی سے اپنی اشیا اکٹھی کرنی شروع کر دیں۔ سستی دکھانے اور سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ رات کے ڈیوٹی کلرک کے پاس مریسا کا پورا نام لکھا ہوا تھا اچھا ہی ہوا کہ وہ گھوڑے بیچ کر سونے میں ناکام رہی تھی۔ فوری طور پر سی ڈی سی سے موٹیل پہنچنے کا فیصلہ بھی درست ہی رہا۔ اسے اب تیز قدمی کے ساتھ درست فیصلے کرنے تھے، قبل اس کے کہ دن چڑھتا اور بات پھیل جاتی۔

علی الصبح اس نے کمرا چھوڑ دیا۔ ڈیوٹی کلرک ابھی رات والا ہی تھا۔ مریسا کی کشتیاں جل چکی تھیں۔

''ہیواے نائس ڈے۔'' کلرک نے اتنا ہی کہا۔

مریسا نے راستے میں ہاورڈ جانسن پر ڈونٹس کے ساتھ کافی چڑھائی۔ تھوڑا انتظار کر کے وہ بینک پہنچ گئی۔ ڈرائیو ان ونڈو پر اس نے چہرہ ایک سائڈ پر رکھا اور بیگ ٹٹولنے کے بہانے رخ نیچے کی جانب رکھا۔ کیشیئر نے کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ حسبِ عادت مشینی انداز میں کام کر رہا تھا۔ مریسا نے اپنی بچت کا بیشتر حصہ نکال لیا۔ یہ چار ہزار چھ سو پچاس ڈالرز تھے۔

شاہراہ انٹراسٹیٹ 78 پکڑ کر اس نے ریڈیو آن کر دیا۔ کار مناسب رفتار سے گریسن، جارجیا کی سمت دوڑ رہی تھی۔ یہ ایک لمبی ڈرائیو تھی۔

وہ گریسن ٹاؤن میں داخل ہوئی تو شہری علاقے سے کٹ چکی تھی۔ وہاں مرکزی سڑک کے علاوہ ذیلی سڑکیں تقریباً خالی تھیں۔ اس نے ایک فوڈ اسٹور اور ہارڈ ویئر اسٹور دیکھا۔ ایک بینک برانچ، ایک پرانا مووی تھیٹر، لگتا تھا کہ عرصے سے بند پڑا ہے۔ مریسا نے گاڑی کی رفتار کم کر دی۔ اس کی متلاشی آنکھیں یہاں وہاں چکرا رہی تھیں۔ پروفیشنل لیب (PL) کہاں ہوسکتی ہے؟ پولیس کے پاس وہ جا نہیں سکتی تھی۔

یوٹرن سے اس نے گاڑی گھمائی اور ایک سالخوردہ سائن بورڈ کے پاس رک گئی۔ بورڈ پر یو ایس پوسٹ آفس لکھا تھا۔ مریسا گاڑی سے اُتر گئی۔

''پروفیشنل لیب؟ ہاں، وہ برج روڈ سے آگے ہے۔'' مریسا کی انکوائری پر جواب ملا۔ ''واپس جاؤ، فائر ہاؤس سے دائیں مڑ کر پارسن کریک سے بائیں مڑ جانا۔ آگے ''پروفیشنل لیب'' ہے۔ وہاں کچھ نہیں ہے۔ لیب کے علاوہ گائے بھیڑیں مل سکتی ہیں۔'' جواب دینے والے نے اضافی نقرہ چست کیا۔

''مطلب ویران جگہ ہے۔'' مریسا مسکرائی۔ ''کیا ہو رہا ہے وہاں پر؟''

''میری بلا سے۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں، بل وغیرہ وقت پر دے دیتے ہیں۔ اتنا کافی ہے میرے لیے۔''

''اوکے، شکریہ۔''

مریسا واپس گاڑی میں آگئی اور بتائے ہوئے راستے پر چل پڑی۔ پارسن کریک کے بعد سڑک کے اطراف سے فٹ پاتھ بھی غائب تھی۔ سڑک، پائن کے جنگل میں داخل ہو رہی تھی۔ مریسا کار آگے بڑھاتی رہی۔ اچانک درختوں سے نکل کر سڑک پر پھیل کر پارکنگ ایریا میں تبدیل ہوگئی۔ مریسا نے وہاں ایک وین دیکھی جس پر پروفیشنل لیب اِنک لکھا ہوا تھا۔ دوسری گاڑی کریم کلر کی ایک مرسڈیز تھی۔ مریسا نے اپنی ہنڈا، وین کے برابر لگا دی۔ وہ ایک شاندار عمارت کے سامنے کھڑی تھی۔

عمارت کی چھتوں پر بکثرت آئینے لگے ہوئے تھے جن میں پائن کے درختوں کا عکس نظر آ رہا تھا۔ اطراف میں پائن کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

مریسا داخلی دروازے کی جانب گئی۔ اسے دروازے کی گھنٹی کہیں نظر نہ آئی۔ مریسا نے دروازہ کھینچ کر دیکھا پھر اسے دھکا دیا۔ دونوں کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ اس نے پیچھے ہٹ کر ایک بار پھر گھنٹی تلاش کی۔ ''یہ کیا ماجرا ہے؟'' وہ بڑبڑائی۔

اس نے کئی بار دستک دی۔ تاہم آواز اتنی بلند نہیں تھی کہ وسیع عمارت میں کسی کو متوجہ کرنے کا سبب بنتی۔ مریسا نے ادھر سے توجہ ہٹا کر دائیں بائیں دیکھا۔ پھر ایک کھڑکی کی طرف چل دی۔ بند کھڑکی پر دونوں ہتھیلیوں سے پیالہ بنا کر اندر جھانکنے کی ناکام کوشش کی۔ وہاں سے ہٹ کر اس نے مزید آگے جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن معاً ایک آواز نے اس کے قدم پکڑ لیے۔

''یہ پرائیویٹ پراپرٹی ہے۔'' آواز کرخت اور جارحانہ تھی۔ وہ ایک گٹھے ہوئے بدن کا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ لباس نیلے رنگ کا تھا۔ ''تمہیں پتا ہے کہ تم قانون شکنی کی مرتکب ہو رہی ہو۔'' نیلے لباس والے نے کہا۔

مریسا نے مجرمانہ انداز میں ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیے۔ اس کا ذہن تیزی سے کوئی مناسب جواب تلاش کرنے کی کوشش میں تھا۔ یہ صحیح تھا کہ اس نے نجی املاک پر بلااجازت قدم رکھا تھا۔

''تم نے وہ اشارہ نہیں دیکھا؟'' اس نے ہاتھ سے پارکنگ میں ایک بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں تنبیہ کا نوٹس لگا تھا۔

''جا... جی۔'' مریسا نے اعتراف کیا۔ ''دراصل میں ڈاکٹر ہوں۔'' وہ ہچکچائی۔ ڈاکٹر ہونا کوئی معقول جواز نہیں تھا۔ ''یہاں وائرل لیب کی موجودگی نے مجھے اکسایا۔ وائرل امراض کی تشخیص میں مجھے دلچسپی ہے۔ شاید تم لوگوں کے پاس نئی معلومات ہوں۔''

''تم نے کیسے سوچا کہ یہ کوئی وائرل لیب ہے؟'' نیلے کپڑوں والے نے الٹا سوال کیا۔

''میں نے سنا تھا۔''

''تم نے غلط سنا تھا۔'' اس نے خشک لہجے میں کہا۔ یہاں بیکٹیریا یا بائیولوجی پر کام ہوتا۔ بہتر ہے کہ تم روانہ ہو جاؤ ورنہ مجھے پولیس کو کال کرنی پڑے گی۔'' اس نے مریسا کو دھمکی دی۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' مریسا نے کہا۔ ''میں واقعی معذرت خواہ ہوں۔ تم لوگوں کے کام میں خلل انداز ہونے کا قطعی کوئی خیال نہیں تھا۔ اگر ممکن ہے تو کیا میں لیب دیکھ سکتی ہوں؟''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' ٹکا سا جواب ملا۔

''کوئی بات نہیں۔ میں پھر معذرت کرتی ہوں۔''

مریسا اپنی کار کی طرف بڑھ گئی۔ وہ وہیں کھڑا دیکھتا رہا۔ جب تک کار درختوں میں غائب نہیں ہوگئی۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔ مطمئن ہونے کے بعد وہ مڑا۔ وہ دروازے کے قریب پہنچا تو کسی آٹو میکنزم کے تحت دروازہ خود ہی کھل گیا۔

وہ آدمی کوریڈور سے گزرتا ہوا ایک لیب میں داخل ہوگیا۔ وہاں ایک سمت میں ڈیسک موجود تھی جبکہ مخالف سمت میں ایئرٹائٹ اسٹیل ڈور تھا۔ ڈور، سی ڈی سی میں موجود MCL کے اسٹیل ڈور سے مشابہ تھا۔ ڈور کے پیچھے خصوصی لیب تھی۔ جہاں ٹائپ-3 ہیپا فلٹریشن سسٹم کام کررہا تھا۔

ڈیسک پر موجود دوسرے آدمی نے سر اٹھایا۔

''تم نے مجھے کیوں نہیں جانے دیا؟ میں اسے سنبھال لیتا۔'' ڈیسک پر موجود آدمی نے شکوہ کیا اور کھانسنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں رومال تھا۔ آنکھوں میں بھی پانی آگیا۔

''پال، تھوڑی عقل استعمال کرو۔'' نیلے لباس والے نے سرد آواز میں کہا۔ ''ہمیں یہ نہیں معلوم کہ لڑکی کی موجودگی کا کس کس کو پتا ہے؟'' اس نے ڈیسک پر موجود فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور نمبر پنچ کیے۔

''ڈاکٹر جیکسن آفس۔'' دوسری جانب سے مترنم آواز آئی۔

''ڈاکٹر سے بات کراؤ۔''

''معذرت خواہ ہوں۔ ڈاکٹر، ایک مریض کے ساتھ ہیں۔''

''بی بی، مجھے پروا نہیں ہے اگر ڈاکٹر کسی کے ساتھ بھی موجود ہیں... پھر بھی میری... بات کراؤ۔'' نیلے کپڑوں والا غرایا۔

''ایک منٹ، پلیز۔''

اس نے گردن موڑ کر ڈیسک کے عقب میں بیٹھے ہوئے آدمی کو مخاطب کیا۔ ''پال، کاؤنٹر سے میرے لیے کافی لاؤ۔''

پال نے آنکھوں سے رومال ہٹایا۔ ڈیسک پر ہاتھ جما کر اس نے خود کو کرسی سے اٹھایا۔ پال ایک گیم تیم آدمی تھا۔ اس کا ایک ہاتھ کہنی کے جوڑ سے آگے مصنوعی تھا۔ نوجوانی میں ایک پولیس والے نے اس کے سینے میں گولی اتارنے کی کوشش کی تھی۔ پال کی قسمت تھی کہ بچ گیا۔ تاہم نصف ہاتھ سے اسے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔

''کون ہے؟'' لائن پر ڈاکٹر جیکسن کی آواز آئی۔ آواز میں ناگواری کا عنصر تھا۔

''ہمبر لنگ۔'' نیلے لباس والے نے جواب دیا۔

''ڈاکٹر ہمبر لنگ۔''

''ہمبر لنگ، میں نے تمہیں یہاں آفس میں فون کرنے کے لیے منع کیا تھا۔'' ڈاکٹر جیکسن نے یاددہانی کرائی۔

''مریسا بلوم یہاں آئی تھی۔'' ہمبر لنگ نے جیکسن کی یاددہانی کو نظرانداز کردیا۔ ''وہ کھڑکی سے اندر جھانک رہی تھی کہ میری نظر پڑ گئی۔''

''کیا بکواس ہے؟''

''ٹھیک بکواس ہے۔''

''اسے لیب کے بارے میں کیسے پتا چلا؟''

''میں نہیں جانتا۔ نہ مجھے اس کی پروا ہے۔''

ہیبر لنگ نے خشک لہجے میں کہا۔ ''وہ یہاں آئی تھی اور اب میں تم سے ملنے ٹاؤن آرہا ہوں۔ لڑکی کا بندوبست کرنا پڑے گا۔''

''نہیں، یہاں مت آنا۔'' جیکسن کی آواز میں اضطراب در آیا۔ ''میں خود وہاں آتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے لیکن آج کی تاریخ میں آنا۔''

''پانچ بجے سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔'' جیکسن نے فون پٹخ دیا۔

☆☆☆

مریسا کو بھوک ستانے لگی۔ اس نے گرین ٹاؤن میں ہی لنچ کا فیصلہ کیا۔ لنچ کے دوران میں اس کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔ وہ سی ڈی سی جا سکتی تھی نہ برٹن اسپتال... اس نے نیب انجینئرنگ کا خط نکالا۔ لے دے کر اس کے پاس ایک پتا باقی بچا تھا جس کا ذکر لیب انجینئرنگ والوں نے مریسا کے خط کے جواب میں کیا تھا یعنی پروفیشنل لیب (PL) وہ لیب تک پہنچ بھی گئی تھی۔ آخر PL میں سپر اسپیشل ہیپا فلٹریشن سسٹم کیوں استعمال ہو رہا ہے؟

سی ڈی سی کی MC لیب (MCL) میں تو ہیپا سسٹم، ٹائپ-3 کی وجہ ظاہر و باہر تھی لیکن یہاں مضافاتی علاقے میں موجود ''پروفیشنل لیب'' میں ''ہیپا سسٹم'' کا کیا کام ہے؟ اس سوال کے جواب میں بہت کچھ پوشیدہ تھا لیکن وہ جواب کیونکر حاصل کرے۔

پروفیشنل لیب کی عمارت مریسا کو کسی قلعے کی طرح لگی تھی۔ وہاں داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔ مریسا کو یقین تھا کہ نیلے لباس والے نے ''بیکٹیریا یا بائیولوجی'' کے بارے میں جھوٹ بولا تھا لیکن وہ اب کیا کر سکتی ہے؟ اسے خیال آیا کہ رالف کو فون کرے۔ رالف نے یقیناً کسی وکیل کا بندوبست کیا ہوگا۔ وکیل کے لفظ کے ساتھ ہی مریسا کے ذہن میں ایک خیال سرسرایا۔ اس نے جلدی جلدی کھانا پینا ختم کیا اور ادائیگی کرکے باہر نکل گئی۔ پروفیشنل لیب کی پارکنگ میں جو وین اس نے دیکھی تھی۔ اس پر نام کے آگے ''انک'' (Inc) لکھا ہوا تھا۔ یعنی ان کارپوریٹڈ۔

کچھ دیر بعد وہ ایک بار پھر پوسٹ آفس میں داخل ہو رہی تھی۔ اس مرتبہ اس کی مڈبھیڑ کسی اور آدمی سے ہوئی۔ مریسا کے سوال کے جواب میں اس نے ٹاؤن میں ایک وکیل کی نشاندہی کر دی۔

دس منٹ بعد مریسا وکیل کے دفتر کے سامنے تھی۔ اس نے بیرونی دروازے کی پلیٹ پر وکیل کا نام پڑھا۔ رونالڈ ڈیوس، اٹارنی۔

اندر سفید قمیص اور بوٹائی میں جو شخص تھا، اس کے چہرے پر عینک تھی۔ بال کنپٹیوں پر سے سفید ہو چلے تھے۔

''کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' اس نے سوال کیا۔

''مسٹر ڈیوس؟'' مریسا نے سوالیہ نظر ڈالی۔

''یس۔'' اس نے کرسی کی جانب اشارہ کیا۔

مریسا بیٹھ گئی۔ ایک طائرانہ نظر کمرے پر ڈالی پھر ڈیوس کو دیکھا۔ وہ منتظر اور ہمہ تن گوش تھا۔

''مجھے کارپوریٹ لاء سے متعلق چند سوالات کے جواب درکار ہیں۔ کیا میں ٹھیک جگہ پر آئی ہوں؟''

''ممکن ہے۔ آپ سوال بتایئے؟'' ڈیوس نے عینک درست کی۔

''اگر کوئی کارپوریشن، ان کارپوریٹڈ ہے۔'' مریسا نے کہنا شروع کیا۔ ''اور میں یا کوئی اور ایسی کارپوریشن کے مالکان کے نام جاننا چاہے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟ اور کیا یہ ممکن ہے؟''

ڈیوس نے دونوں کہنیاں میز پر ٹکا دیں۔ ''ممکن ہے اور نہیں بھی۔'' وہ مسکرایا۔

مریسا خاموش رہی۔

''اگر کمپنی، پبلک کارپوریشن ہے تو تمام اسٹاک ہولڈرز کے بارے میں جاننا بہت دشوار ہے تاہم اگر کمپنی پارٹنرشپ کی بنیاد پر ہے تو پھر یہ آسان کام ہوگا۔'' ڈیوس نے وضاحت کی۔

''پارٹنرشپ کی بنیاد پر کیا آسانی ہوگی؟'' مریسا نے

دانت

فلوریڈا میں ایک امریکی خاتون نے پاکستانی سیاح کے گلے میں خوب صورت مالا دیکھی تو پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

''یہ حسین مالا کس چیز سے بنی ہوئی ہے؟''

''مگرمچھ کے دانتوں سے تراشی گئی ہے۔''

''بہت پیاری ہے۔'' امریکی عورت بولی۔ ''تم لوگوں کے لیے مگرمچھ کے دانت اسی طرح قیمتی ہوتے ہیں جیسے ہمارے لیے موتی۔''

''نہیں......'' سنجیدگی سے کہا گیا۔ ''ہر کس و ناکس سیپی کھول کر موتی نکال سکتا ہے لیکن مگرمچھ کا جبڑا چیر کر اس کے دانت حاصل کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔''

امریکا سے آفتاب حمد کی سوغات

سوال کیا۔
''بہت آسان۔'' وہ بولا۔ ''تمہیں اٹلانٹا کے اسٹیٹ ہاؤس میں سیکریٹری سے ملنا ہوگا۔ وہ کارپوریٹ ڈویژن کے بارے میں بتائے گی یا بتائے گا۔ ڈویژن میں تم کلرک کو کمپنی کا نام بتاؤ گی اور کام ہو جائے گا۔ وہاں تم یہ بھی معلوم کر سکتی ہو کہ کمپنی کون سی ریاست میں لسٹڈ ہے۔''
''تھینک یو۔'' مریسا کو امید کی کرن نظر آئی، ساتھ ہی وہ سوچ رہی تھی کہ اسے پھر اٹلانٹا جانا پڑے گا۔ تاہم تاریک سرنگ کے سرے پر اسے روشنی دکھائی دینے لگی۔
''مسٹر ڈیوس، آپ کی فیس؟''
ڈیوس نے بایاں ابرو اچکایا۔ ''صرف اتنا ہی ہے تو بیس ڈالر۔''
مریسا نے فیس ادا کی اور وہاں سے نکل گئی۔
اس کی سرخ ہنڈا کار ایک بار پھر اٹلانٹا کی سمت دوڑ رہی تھی۔ مریسا کو دھڑکا صرف پولیس کا تھا۔
چار بجے وہ واپس اٹلانٹا پہنچ چکی تھی۔ اٹلانٹا میں تادیر رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ تاہم بدقسمتی سے اسٹیٹ ہاؤس کے کارپوریٹ ڈویژن میں پہلے ہی قطار لگی ہوئی تھی۔ چار و ناچار مریسا کو انتظار کرنا پڑا۔
وہ بمشکل اپنی بے صبری کو قابو کر کے اپنی باری کی منتظر تھی۔ پہچان لیے جانے کا خدشہ اسے پریشان کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا نمبر آ ہی گیا۔
''میں کیا کر سکتا ہوں؟'' سفید بالوں والے کلرک نے سوال کیا۔
''مجھے ایک کارپوریشن کے بارے میں معلومات درکار ہیں۔ اس کا نام ''پروفیشنل لیب'' ہے۔'' مریسا نے کلرک کو بتایا۔
''لوکیشن؟''
''گریسن، جارجیا۔'' مریسا نے جواب دیا۔
''او کے۔'' کلرک نے کمپیوٹر کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں۔
''ٹھیک ہے۔ گزشتہ برس اِن کارپوریشن عمل میں آئی تھی۔''
''پارٹنرشپ ہے یا پبلک کارپوریشن؟'' مریسا نے سوال کیا۔
''لمیٹڈ پارٹنرشپ، سب چیپٹر۔'' کلرک نے کہا۔
''کیا مطلب ہے اس کا؟''
''ٹیکس سے متعلق ہے۔'' جواب ملا۔ ''اگر کمپنی کو نقصان ہوتا ہے تو پارٹنرز ذاتی حیثیت میں یہ نقصان پورا کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد انفرادی طور پر ریٹرن فائل کر دیتے ہیں۔''
''پارٹنرز کے نام مل سکتے ہیں؟'' مریسا نے بے چینی محسوس کی۔
''بالکل۔'' کلرک کی نظریں اسکرین پر تھیں۔
''جوشوا جیکسن، راڈ بیکر۔۔۔''
''ایک سیکنڈ۔ میں لکھنا چاہوں گی۔'' مریسا نے قلم سنبھالتے ہوئے قطع کلامی کی۔ اس نے پھرتی سے دونوں نام قلمبند کیے۔ ''او کے۔'' مریسا نے کلرک کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔
''بیکر کے بعد سنکلیئر ٹائی مین، جیک کراس، گستاف سوانسن، ڈان موڈی، ٹرینٹ گڈرتج اور PAC۔''
''PAC؟'' مریسا کے ذہن میں گھنٹی بجی۔
''فزیشن ایکشن کانگریس۔'' کلرک نے وضاحت کی۔
''کیا ایک علیحدہ ادارہ، لمیٹڈ پارٹنر کمپنی کا حصہ بن سکتا ہے؟''
''لیڈی، میں وکیل نہیں ہوں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ یہ ممکن ہے۔ یہاں لاء فرم کا نام بھی ہے۔ کوپر، ہوجز، اینڈ میک کوئن لن۔''
''کیا وہ بھی پارٹنر ہیں؟''
''نہیں۔'' کلرک نے جواب دیا۔ ''لاء فرم، سروس ایجنٹ ہے۔''
مریسا نے کلرک کے انکار پر لاء فرم کا نام کاٹ دیا۔ کلرک کا شکریہ ادا کر کے وہ تیزی سے روانہ ہوگئی۔ اس نے سکون کی سانس اس وقت لی جب وہ پارکنگ گیراج میں اپنی کار میں جا کے بیٹھی۔ کار، مریسا کے کے لیے گوشۂ عافیت بن چکی تھی۔
اندر بیٹھ کر اس نے بریف کیس کھولا اور کانگریس مین مارکھم کے کنٹری بیوٹرز کی فہرست برآمد کی۔ فزیشن ایکشن کانگریس (PAC) کا نام وہ بھولی نہیں تھی۔ مارکھم کو پیسہ دینے والوں میں PAC کا نام سرفہرست تھا۔
ایک طرف PAC کاروباری کمپنی میں شراکت دار تھی تو دوسری جانب وہ الگ حیثیت میں ایک قدامت پسند سیاست داں کی ری الیکشن مہم میں رقم لگا رہی تھی۔
مریسا نے دلچسپی کے ساتھ پروفیشنل لیب کے مالکان کے نام فہرست میں تلاش کرنے شروع کیے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ سارے نام فہرست میں موجود تھے۔

وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ ایبولا پس منظر میں چلا گیا تھا۔ پتنگ کسی اور ہی سمت اڑ رہی تھی۔ کوئی چیستاں تھا، پراسرار تھی، معما تھا، مریسا کی چھٹی حس شور مچارہی تھی کہ وہ کسی ہوشربا انکشاف سے قریب تر ہے تاہم درمیان میں گہری دھند حائل تھی۔

وہ قدم بہ قدم آگے بڑھ رہی تھی۔ کڑی سے کڑی مل رہی تھی لیکن منظر دھواں دھواں تھا۔ تصویر صاف نظر نہیں آرہی تھی۔ PAC کا نام اس نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ PAC اور... PL، دونوں نام کانٹوں کی طرح مریسا کے ذہن میں چبھ رہے تھے۔ PL (پروفیشنل لیب) کا تو وہ دیدار کرآئی تھی۔ مالکان کے نام اور پتے بھی اسے مل گئے تھے۔ لیکن PAC کے بارے میں وہ قطعی اندھیرے میں تھی۔ معاً اس نے کاغذات واپس بریف کیس میں بند کیے اور کار سے باہر آگئی۔ وہ تیز قدمی کے ساتھ دوبارہ عمارت میں داخل ہورہی تھی۔

چند منٹ بعد مریسا ایک بار پھر قطار میں لگی ہوئی تھی۔ اس مرتبہ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

اس نے اسی کلرک سے PAC کے بارے میں معلومات مانگیں، 30 سیکنڈ بعد اسے جواب ملا۔

''نوتھنگ، کچھ نہیں ہے۔ نام میں پہلے بتا چکا ہوں۔ یہ نام پروفیشنل لیب کے پارٹنرز میں شامل ہے۔''

''کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں؟ کیا PAC کا وجود نہیں ہے؟''

''ضروری نہیں ہے کہ ایسا ہو۔ میرا مطلب ہے کہ وہ جارجیا میں لسٹڈ نہیں ہے۔'' کلرک بولا۔

مریسا نے چند سوالات اور کیے۔ تاہم وہ مزید کچھ معلوم کرنے میں ناکام رہی۔

کچھ دیر بعد وہ واپس کار کے اندر تھی اور اگلے قدم کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ PAC کے معاملے میں اسے ایموری میڈیکل اسکول کی لائبریری سے استفادہ کرنا چاہیے۔ تاہم مریسا نے یہ خطرناک خیال مسترد کر دیا۔ لائبریری جانے کا مطلب سی ڈی سی کی حدود میں قدم رکھنا تھا۔

اس نے AMA (امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن) سے رجوع کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اگر AMA سے بھی معلومات نہ ملیں تو اس کا مطلب ہوگا کہ PAC ایک فرضی نام ہے۔

مریسا نے گہری سانس لی اور ائرپورٹ کا رخ کیا۔

اب وہ تھکن محسوس کررہی تھی۔

☆☆☆

جوشوا جیکسن کی سیڈان، پروفیشنل لیب کی سمت بھاگ رہی تھی۔ اس کا موڈ خاصا برہم تھا۔ وہ لیب سے دور رہنا چاہتا تھا لیکن ہیبرلنگ کو ٹاؤن میں دیکھنا بھی اسے گوارا نہ تھا۔

ہیبرلنگ، روز بروز ناقابلِ اعتبار ہوتا جارہا تھا۔ اسے ہائر کر کے جیکسن نے زندگی کی بدترین غلطی کی تھی۔ ہیبرلنگ وہ شخص تھا کہ اگر اسے پٹاخہ چلانے کو کہا جاتا تو وہ نیوکلیئر وار کی باتیں کرنے لگتا۔ وہ بوتل کے جن کی طرح تھا جو بوتل سے نکلنے کے بعد قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ جیکسن اور اس کی ٹیم ہیبرلنگ کی بدمعاشی کے سامنے بے بس ہوتی جارہی تھی۔ سی ڈی سی کے تجربے کے باعث جیکسن نے اسے چنا تھا اور آج تک پچھتارہا تھا۔

پارکنگ میں جیکسن نے مرسیڈیز کے ساتھ اپنی گاڑی روکی۔ کریم کلر کی مرسیڈیز، ہیبرلنگ کی تھی۔ جیکسن کے علم میں تھا کہ ہیبرلنگ نے مرسیڈیز خریدنے کے لیے لیب کے فنڈز میں خردبرد کی تھی۔ رقم کا ضیاع... عیاشی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا گاڑی سے اُترا۔

پروفیشنل لیب کی شاندار عمارت پر نظر ڈالی۔ جیکسن ہی بہتر جانتا تھا کہ اس قلعے کو کھڑا کرنے میں کتنا کثیر سرمایہ لگا تھا اور یہ سب کچھ PAC نے ڈاکٹر آرنلڈ ہیبرلنگ کے لیے کیا تھا۔ وہی ہیبرلنگ ایک دردِسر بن چکا تھا۔ ہیبرلنگ ایک جنونی تھا۔ قطعی ناقابلِ اعتبار۔

جیکسن کے قریب جاتے ہی دروازہ ازخود کھل گیا۔

''میں کانفرنس روم میں ہوں۔'' اسپیکر سے ہیبرلنگ کی آواز آئی۔

کانفرنس روم میں دبیز قالین کے وسط میں ایک میز تھی۔ میز کے دونوں طرف آمنے سامنے دو بڑے سائز کے بیش قیمت صوفے موجود تھے۔ ایک صوفے پر تین افراد بیٹھ سکتے تھے۔

ہیبرلنگ اور جیکسن دونوں ظاہری اعتبار سے بھی ایک دوسرے کی ضد دکھائی دیتے تھے۔ جیکسن چھریرے بدن کا دراز قامت شخص تھا۔ لباس بھی سادہ لیکن نفیس تھا۔

''ہیلو، ڈاکٹر جیکسن۔'' ہیبرلنگ نے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا۔ جیکسن سرہلا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''وہ لڑکی یہاں تک کیسے پہنچی؟ کیا جانتی ہے؟ قطع نظر ان سوالات کے اسے فوری طور پر ٹھکانے لگانا پڑے گا۔''

ہیبر لنگ نے گویا فیصلہ سنایا۔

''تم اپنی باری لے چکے ہو۔ ایک بار نہیں بلکہ دو بار۔'' جیکسن نے رکھائی سے کہا۔ ''اور دونوں بار تم ناکام رہے۔ تمہارے ناکارہ آدمی کچھ نہ کر سکے۔ لڑکی کے گھر سے بھی انہیں بے نیلِ مرام بھاگنا پڑا۔ مزید یہ کہ ایک روز قبل سی ڈی سی میں بھی پانچ فٹ کی لڑکی منہ پر تھوک کر نکل گئی۔''

''کوئی پروا نہیں۔ اس مرتبہ میں اپنا جادو جگاؤں گا۔ وہ بچ نہیں سکتی۔ تم اوکے کرو۔''

''بہت خوب۔ تمہارا جادو میں دیکھ چکا ہوں۔ تمہیں بہت شوق ہے، ایبولا سے کھیلنے کا۔'' جیکسن نے طنز کیا۔

''کیا حرج ہے۔ وہ متاثرہ اسپتالوں میں جاتی رہی ہے۔ کسی کو شک نہیں ہوگا۔'' ہیبر لنگ نے اطمینان سے کہا۔

جیکسن کا ضبط جواب دے گیا۔ ''اٹلانٹا میں ایبولا کا حملہ برداشت نہیں کروں گا۔'' جیکسن کی آواز بلند ہوگئی۔ ''میں وائرس سے خوف زدہ ہوں۔ میری فیملی بھی اٹلانٹا میں ہے۔ لڑکی کا مسئلہ میرے اوپر چھوڑ دو، میں سنبھال لوں گا۔''

''اوہ، کیوں نہیں۔'' ہیبر لنگ نے دانت نکالے۔ ''یہی کہا تھا، پہلے بھی یہی کہا تھا۔ اس کا ٹرانسفر کرا دیا تھا۔ نتیجہ کیا نکلا؟ وہ یہاں سیر سپاٹے کرتی پھر رہی ہے۔ پورے ''پروجیکٹ'' کے لیے وہ خطرہ بن چکی ہے۔ اسے ختم کرنا ناگزیر ہے۔''

''تم یہاں کے باس نہیں ہو۔'' جیکسن نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ''تم نے خطرناک حد تک من مانی کی ہے۔ لڑکی اگر خطرہ بن گئی ہے تو اس کی وجہ بھی تم خود ہو۔ اگر تم خود کو اصل پلان تک محدود رکھتے اور انفلوئنزا وائرس استعمال کرتے تو کسی قسم کی ہلچل نہ ہوتی۔ ہم سب اس وقت سے نہ صرف پریشان ہیں بلکہ مشکلات کا شکار ہیں جب سے تمہاری خودسری ہمارے علم میں آئی۔ ایبولا وائرس استعمال کرنے سے قبل تم نے کس کو اعتماد میں لیا تھا؟ کسی سے اجازت لی تھی؟'' جیکسن کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

''بہت خوب۔ سب پریشان ہیں۔ وہی پرانا شکوہ۔'' ہیبر لنگ کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ ''مجھے تو یاد پڑتا ہے کہ رشفر اسپتال بند ہونے کی اطلاع ملنے پر تم بہت خوش تھے۔ عوام کے اندر نجی اسپتالوں کا بڑھتا ہوا اثر و اعتماد PAC کے لیے تکلیف دہ تھا۔ PAC کا مقصد اس اعتماد کو نقصان پہنچانا تھا۔ میں نے اس سے بڑھ کر کام کیا۔ ایبولا وائرس نے اسپتال ہی بند کرا دیا۔ اگر میں اصل منصوبے سے جڑا رہتا تو میرے کئی برس فیلڈ ریسرچ اور لیب ریسرچ میں ضائع ہو جاتے۔ میں نے کوئی زیادہ انحراف نہیں کیا۔ اپنا وقت بچایا اور PAC کا ٹارگٹ توقعات سے بڑھ کر حاصل کیا۔ شاید تمہیں ایبولا کی جان لیوا خونخواری پر افسوس ہے۔''

جیکسن دانت پیستے ہوئے ہیبر لنگ کو گھور رہا تھا۔ وہ حتمی نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ اس کا واسطہ ایک خطرناک ذہنی مریض سے پڑ گیا ہے۔ جیکسن کے دل میں نفرت کی لہر اٹھی۔ بدقسمتی سے بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ اب ''پروجیکٹ'' بند کرنا انتہائی دشوار تھا۔ PAC کی ایگزیکٹو کمیٹی نے جب پروجیکٹ کی ابتدا کی تھی، اس وقت منصوبہ بندی نہایت سادہ محسوس ہوئی تھی۔ ہیبر لنگ جیسے زہریلے آدمی نے انفلوئنزا وائرس کی جگہ خاموشی سے ایبولا وائرس متعارف کرا کے نت نئی دشواریاں کھڑی کر دی تھیں۔ سونے پر سہاگا، ہیبر لنگ کو تشویش تھی نہ ہی کوئی شرمندگی۔

جیکسن کے ذہن نے اشارہ دیا کہ اشتعال سے کچھ حاصل نہ ہوگا، اس نے ایک گہری سانس لے کر خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔

''میں تمہیں درجنوں بار مطلع کر چکا ہوں کہ PAC ناخوش ہے۔ میرے ساتھی، سیکڑوں ہلاکتوں پر سخت بددلے ہوئے ہیں۔ ہمارے منصوبے میں یہ اموات شامل نہیں تھیں اور تم شروع سے اس بات سے آگاہ ہو۔''

''بکواس۔'' ہیبر لنگ نے بلاتامل کہا۔ ''کیا انفلوئنزا وائرس سے اموات نہیں ہوتی؟ شاید تعداد کم ہوتی، تم لوگ کتنی برداشت کر سکتے ہو؟ دس، پچاس، سو یا سو سے زیادہ... اور ان اموات کے بارے میں کیا خیال ہے؟ جو تم جیسے امیر کبیر ڈاکٹرز کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ جب تم سرجری کے دوران غلطی کرتے ہو یا غیر ضروری سرجری کے بعد خاموشی سے پیٹھ پھیر کر چل دیتے ہو یا اپنے اسپتالوں میں اناڑی ڈاکٹرز کو تمام سہولیات کے ساتھ پریکٹس کی اجازت دیتے ہو۔''

''یہ سب جھوٹ ہے۔ ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا۔'' جیکسن چلّا اٹھا۔ اس کی برداشت کی حد ختم ہوگئی تھی۔

''تم نہیں بھی کرتے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ بہت سی جگہوں پر ایسا ہوتا ہے۔'' ہیبر لنگ ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا۔ ''کہیں گردے کی جگہ پتا نکال دیا جاتا ہے، کہیں سرجری کے بعد دستانہ، روئی وغیرہ پیٹ میں چھوڑ دی جاتی ہے... کہیں غلط تشخیص ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا بہت کم ہوتا ہو لیکن تم لوگ، خود کیا کر رہے تھے؟ اگر ''ایبولا''

میری غلطی تھی تو انفلوئنزا وائرس کا منصوبہ کس نے بنایا تھا۔ کیا اس کے پس پردہ اصل محرک معاشی مفادات کا حصول نہیں تھا... ڈاکٹرز کی تعداد مریضوں سے بڑھ گئی تھی۔ اچھے منافع بخش اسپتال تم لوگوں کی آنکھوں میں کھٹک رہے تھے جن کے مالکان غیر ملکی تھے۔ شاید تم لوگوں کو غیر ملکی مالکان سے دشمنی نہ ہو۔ لیکن ان کی کارکردگی اور شہرت، تم لوگوں کی مارکیٹ خراب کر رہی تھی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ میں نے صرف اس لیے تعاون کیا کہ تم لوگوں نے مجھے اس لیب کی سہولت فراہم کی تھی۔'' ہیبر لنگ کی آواز سے زہر ٹپک رہا تھا۔ ''تم لوگ جو چاہتے تھے، وہ میں نے کر کے دکھا دیا۔ فرق صرف طریقۂ کار کا تھا۔''

''لیکن ہم نے تمہیں رکنے کا حکم دیا تھا۔'' جیکسن کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ ''رشفرا اسپتال کی تباہی کے فوراً بعد ہم نے تمہیں روک دیا تھا لیکن تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے، یہ ہمیں نہیں معلوم تھا۔''

''ہاں نیم دلی کے ساتھ منع کیا گیا تھا۔ تم حاصل کردہ نتائج سے خوش تھے۔ پانچ سال میں پہلی مرتبہ PAC اور تم طبی میدان میں اپنے حریفوں سے آگے نکلنے کی پوزیشن میں آرہے تھے۔ ممکن ہے تم لوگوں کو تھوڑا بہت افسوس یا پریشانی رہی ہو مگر مجموعی طور پر سب خوش تھے۔ میں نے ثابت کر دیا کہ ایبولا بہترین بائیولوجیکل ہتھیار ہے۔ اس کا توڑ اور علاج موجود نہیں ہے۔ باوجود اس کے میں نے ثابت کر دیا کہ مخصوص علاقے اور آبادی میں اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بعد از اں محصور بھی کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر جیکسن، ہم دونوں خسارے میں نہیں رہے۔ فضول بحث لاحاصل ہے۔ مسئلہ صرف اس لڑکی کا ہے جسے جلد از جلد ٹھکانے لگانا ہے۔''

''میں تمہیں آخری بار آرڈر دیتا ہوں کہ ایبولا کا استعمال نہیں ہوگا۔''

ہیبر لنگ نے متاثر ہوئے بغیر قہقہہ بلند کیا اور آگے کی جانب جھک کر بولا۔ ''ڈاکٹر جیکسن! تم حقائق کو نظر انداز کر رہے ہو۔ PAC اب اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ مجھ پر حکم چلا سکے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا؟'' وہ مکاری سے مسکرایا۔ ''ہاں اگر تم مجھے اس لڑکی کے معاملے میں فری ہینڈ دیتے ہو تو میں سوچوں گا کہ تمہاری کون کون سی باتیں مان جاؤں۔''

جیکسن کا دل کر رہا تھا کہ اٹھ کر ہیبر لنگ کا گلا دبا دے۔ وہ تلملا کر رہ گیا۔ اتنا تو وہ سمجھ رہا تھا کہ PAC کے ہاتھ پاؤں بندھ چکے ہیں۔

''ٹھیک ہے جو دل چاہے، کرو لیکن لڑکی کا کیا کرو گے، مجھے مت بتانا۔ دوسری بات اٹلانٹا میں ایبولا استعمال نہیں ہوگا۔'' جیکسن کھڑا ہو گیا۔

''فائن۔'' ہیبر لنگ پُرسکون ہو گیا۔ ''تم اس طرح بہتر سمجھتے ہو تو میں ایسا ہی کروں گا۔ بہرحال میں اتنا نامعقول نہیں ہوں۔''

''ایک اور بات ذہن میں رکھو۔ آئندہ آفس فون مت کرنا۔ گھر پر کر دیا پرائیویٹ لائن استعمال کرو۔''

''ایسا ہی ہوگا۔'' ہیبر لنگ نے سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔

تاہم جیکسن کے دماغ میں چنگاریاں بھر گئی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں ہیبر لنگ کی شان میں انوکھی مغلظات ایجاد کرتا ہوا روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

اٹلانٹا سے شکاگو، فضائی رہ گزر پر اکثر رش رہتا تھا۔ مریسا کو بھی نصف گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ اس نے ڈک فرانسس کا ناول خرید لیا۔ تاہم وہ توجہ مرکوز کرنے میں ناکام رہی۔ مریسا نے ناول چھوڑ کر ٹیڈ کو فون کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اب تک ٹیڈ سے معذرت نہیں کر پائی تھی۔

''دس از مریسا۔'' رابطہ ہوتے ہی اس نے کہا۔ ''میں جانتی ہوں تم مجھ سے ناراض ہو۔''

''میں غصے میں ہوں۔''

''میں معذرت خواہ ہوں اور...''

''تم میرے گھر سے MCL میں رسائی کا کارڈ لے گئیں۔''

''ٹیڈ، میں دل سے شرمندہ ہوں۔ آئی ایم سوری۔'' میں جب تم سے ملوں گی تو ایک ایک بات بتا دوں گی۔''

''تم دراصل MCL میں گئی تھیں۔ کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟'' ٹیڈ کی آواز میں خفگی تھی۔

''ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''مریسا تمہیں پتا ہے کہ لیب میں کتنے تجرباتی جانور مر چکے ہیں اور ایک بندے کو اموری ایمرجنسی میں ہینڈل کیا گیا؟''

''لیب میں دو آدمی آئے تھے۔ وہاں مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟''

''ٹیڈ! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم

میری بات پر یقین کرو گے۔“

”میری سمجھ سے باہر ہے کہ کیا یقین کروں، کیا نہ کروں؟ آخر سب کچھ تمہارے ساتھ ہی کیوں ہو رہا ہے؟“

”ایبولا کی وجہ سے۔ کیونکہ میں اس لہو رنگ اسرار کا پردہ چاک کرنے والی ہوں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ لیب میں زخمی ہو کر ایمرجنسی میں پہنچنے والا آدمی کون تھا اور یہ کہ اس رات لیب میں دوسرا آدمی کون تھا؟“

”میں نہیں سمجھتا کہ یہ ممکن ہے۔ کیونکہ ہماری دوستی اب سب کے علم میں آچکی ہے۔ کوئی مجھے کچھ نہیں بتائے گا۔ میں اس لیے محفوظ ہوں کیونکہ میں نے ہر بار سچ بیانی سے کام لیا۔ اس کا مقصد محض اپنی جان یا نوکری بچانا نہیں تھا بلکہ واحد بہتر حل یہی تھا۔“

”ٹیڈ، میں سمجھتی ہوں۔“

”تم کہاں پر ہو؟“

”ائرپورٹ۔“

”تم پر حملہ ہوا۔ میں یقین کر لیتا ہوں لیکن بھاگنے سے مزید نقصان ہوگا۔“ ٹیڈ نے کہا۔

”میں بھاگ نہیں رہی ہوں۔ شکاگو میں AMA کے صدر دفتر جا رہی ہوں۔ وہاں مجھے ایک ادارے کے بارے میں معلومات کرنی ہے۔ اس کا نام فزیشن ایکشن کانگریس ہے۔ شاید تم نے نام نہ سنا ہو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ PAC تمام بحران کی ذمے دار ہے۔“

”مریسا، میرا خیال ہے کہ تمہیں واپس سینٹر آجانا چاہیے۔ تم خاصی مصیبت میں ہو۔“

”میں جانتی ہوں۔ تاہم میں جو کچھ کرنے جا رہی ہوں، وہ زیادہ اہم ہے۔ کیا تم اتنی مہربانی نہیں کر سکتے کہ بائیوسیفٹی کے دفتر چلے جاؤ۔“

”کیوں؟“

”یہ معلوم کرنے کہ رات میرے علاوہ کون دو آدمی وہاں داخل ہوئے تھے؟“

”مریسا! کیا تم نہیں سمجھتی ہو کہ کارڈ کے غیاب اور تمہارے MCL میں جانے کے بعد میری پوزیشن کتنی نازک ہو گئی تھی؟“

”ٹیڈ! میں سمجھتی ہوں لیکن اگر تم...“ مریسا کی بات ادھوری رہ گئی۔ ٹیڈ نے فون رکھ دیا تھا۔ مریسا نے سلوموشن میں ریسیور واپس رکھ دیا۔ وہ ٹیڈ کو کوئی الزام نہیں دے سکتی تھی۔

اس نے گہری سانس لے کر گھڑی کی جانب دیکھا پھر رالف کا نمبر ڈائل کیا۔ تیسری گھنٹی پر رالف کی آواز آئی۔

”مائی گاڈ، مریسا! تم کیا کرتی پھر رہی ہو؟ تمہارا نام شام کے اخبار میں ہے۔ پولیس تمہیں ڈھونڈ رہی ہے۔“

”ہاں مجھے اندازہ ہے۔“ وہ بولی۔ ہوائی سفر کا ٹکٹ خریدتے وقت مریسا نے اپنا نام استعمال نہیں کیا تھا۔ ادائیگی بھی نقد کی تھی۔ ”رالف! تم نے کسی وکیل کا انتظام کیا؟“

”آئی ایم سوری۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ ایمرجنسی ہے اور صورتِ حال اتنی بگڑ جائے گی۔“

”ایمرجنسی ہے۔ تاہم میں دو ایک دن کے لیے یہاں سے جا رہی ہوں۔ اس دوران میں تم کوئی وکیل نظر میں رکھو۔ اگر تمہارا شناسا ہو تو اور اچھا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے مگر ہو کیا رہا ہے؟ اخبار میں تفصیل موجود نہیں تھی۔“

”میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں تمہیں کسی الجھن میں نہیں ڈالنا چاہتی۔“

”الجھن یا پریشانی کی کیا بات ہے۔ مشکل وقت میں دوست ہی کام آتے ہیں۔ اگر تم یہاں آجاؤ تو سکون سے بات ہو جائے گی۔ وکیل کا انتظام بھی ہو جائے گا۔“ رالف نے اصرار کیا۔

”رالف! شکریہ۔ لیکن اس وقت ممکن نہیں ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کیا تم نے کبھی فزیشن ایکشن کانگریس کا نام سنا ہے؟“ مریسا نے اس کی پیشکش کو نظرانداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں۔“ رالف نے کہا۔ ”مریسا، پلیز بہتر ہے کہ تم یہاں آجاؤ۔ کوئی حل نکل آئے گا۔ اس طرح بھاگتے رہنے سے تمہاری پوزیشن مزید خراب ہوتی جائے گی۔“

روانگی کا اعلان ہو رہا تھا۔ مریسا نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ”میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں مذکورہ ادارے کی معلومات کے لیے AMA سے رابطہ کرنے جا رہی ہوں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔ ”کل پھر کال کروں گی۔“

☆☆☆

شکاگو میں مریسا کو پامز ہاؤس نامی ہوٹل میں کمرا مل گیا۔ وہاں مریسا نے کریڈٹ کارڈ استعمال کرنے کا رسک اٹھا لیا۔

ہر چیز بھلا کر وہ ایک لمبی نیند کے لیے بستر پر چلی گئی۔ صبح وہ تازہ دم تھی۔ روم سروس کو ناشتے کا آرڈر دے کر اس نے ٹی وی آن کیا اور واش روم میں چلی گئی۔

وہ اس وقت ڈرائیر سے بال خشک کر رہی تھی جب اس نے اینکر پرسن کو ایبولا کی بات کرتے سنا۔ ہیئر ڈرائیر چھوڑ کر وہ عجلت میں کمرے میں واپس آئی۔

وہ توقع کر رہی تھی کہ پنسلوینیا کی صورت حال کو اپ ڈیٹ کیا جا رہا ہوگا۔ تاہم ایسا نہیں تھا۔ مریسا پلکیں جھپکانا بھول گئی۔ ''نیویارک سٹی'' میں روزن برگ اسپتال پر ایبولا کے حملے کی خبر چل رہی تھی۔ شہر میں افراتفری پھیل گئی تھی۔ میڈیا نے پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ جس کے باعث دہشت میں اضافہ ہو رہا تھا۔

مریسا کے اعصاب کشیدہ ہو گئے۔ اس کے اندازے کے مطابق ابھی پنسلوینیا کا معاملہ پوری طرح نمٹا نہیں تھا کہ ایبولا نیویارک سٹی میں نمودار ہو گیا تھا۔

تاہم اسے اب ایبولا کے تعاقب میں نہیں جانا تھا۔ نہ ہی وہ جا سکتی تھی۔ اسے اپنی لائن پر چلنا تھا اور وہ پُرامید تھی۔ اس نے ناشتے کے بعد تیار ہونے میں زیادہ وقت نہیں لیا۔ AMA کا ہیڈ آفس ''رش اسٹریٹ'' پر تھا۔ بریف کیس ساتھ لے کر وہ روانہ ہو گئی۔

وہاں پہنچ کر مریسا نے انفارمیشن بوتھ کا رخ کیا۔ جہاں سے اس نے پبلک ریلیشن آفس کی ڈائریکشن حاصل کی۔ پی سی آفس میں ایک سیکریٹری کو جب وہ اپنی ضرورت سے آگاہ کر رہی تھی، اسی وقت جے فرینک نامی ڈائریکٹر وہاں سے گزرا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا۔ پھر مریسا کو اپنے دفتر میں مدعو کیا۔ وہ چمکیلی آنکھوں والا ایک ہنس مکھ شخص تھا۔ مریسا نے اس کے انداز میں دوستی اور خلوص کی جھلک دیکھی۔ فرینک کی شخصیت کچھ شناسا سا معلوم ہو رہی تھی۔ تاہم مریسا اسے شناخت کرنے میں ناکام رہی۔

دفتر میں فرینک نے اس کے لیے کافی منگوائی اور مسکراتے ہوئے مریسا کی یادداشت پر اعتراض کیا۔ مریسا نے ایک بار پھر اسے پہچاننے کی کوشش شروع کر دی۔

''ہائی اسکول کے کاؤنسلر کو بھول گئیں۔'' فرینک نے ہنستے ہوئے اس کی مدد کی۔ مریسا کے ذہن نے تیز رفتاری سے ماضی میں سفر کیا۔ وہ بھی خوش دلی سے مسکرائی۔

''جیمس فرینک۔'' اسے یاد آ گیا۔

فرینک نے سر ہلایا۔ پانچ منٹ بعد وہ ایک دوسرے سے متعارف ہو کر بے تکلف ہو چکے تھے۔ مریسا نے جلد ہی مطلب کی بات شروع کر دی۔

''میں نے یہ نام نہیں سنا۔'' فرینک نے پُرسوچ انداز میں فزیشن ایکشن کانگریس (PAC) کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی۔ ''تمہیں یہ نام کہاں سے ملا؟''

''یہ نام ایک کانگریس مین کی کنٹری بیوشن لسٹ پر ہے۔'' مریسا نے جواب دیا۔

''حیرت ہے۔ میں تقریباً تمام پولیٹیکل ایکشن کمیٹیز کو جانتا ہوں۔ رکو، دیکھتے ہیں کمپیوٹر کیا کہتا ہے؟'' فرینک کی کرسی دائیں جانب گھوم گئی۔ اس نے PAC کا نام کی بورڈ کے ذریعے فیڈ کیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی تھیں۔'' وہ بولا۔ ''فزیشن ایکشن کانگریس پولیٹیکل ایکشن کمیٹی عرف PAC یہاں موجود ہے۔ یہ ایک علیحدہ فنڈ کے طور پر رجسٹر ہے۔''

''کیا مطلب ہوا؟''

''ذرا ٹیکنیکل معاملہ ہے۔'' فرینک نے کان کی لو کو مسلا۔

''دراصل تمہاری PAC مختلف اراکین کے اشتراک پر مبنی ادارہ ہے۔ جسے تم ان کارپوریٹڈ آرگنائزیشن کہتی ہو۔ ایک ہی بات ہے مگر اس میں ایک کمیٹی علیحدہ فنڈ کی نگراں ہے جو سیاسی مہم کے لیے سرمایہ فراہم کرتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کس کو سپورٹ کرتی ہے؟''

''میں ٹھیک طرح نہیں سمجھی۔ تاہم ایک نام میرے پاس ہے، جس کو یہ سپورٹ کرتے ہیں۔'' مریسا نے مارکھم کا نام بتایا۔ فرینک سر ہلا کر کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''مارکھم کے نام کے ساتھ کئی اور نام ہیں۔ سب کنزرویٹو ہیں۔ یعنی یہ ایک مخصوص بازو ہے۔''

''دایاں بازو؟''

''یقیناً'' فرینک نے تصدیق کی۔ ''میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ دایاں بازو DRGs کو گرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ انہوں نے غیر ملکی میڈیکل گریجویٹس کو بھی محدود کیا ہے۔ اس کے لیے بل پاس کرایا گیا HMO کی سبسڈی کو روک دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ فیڈرل الیکشن کمیشن میں ایک دوست ہے۔ اس سے بات کرنی پڑے گی۔ کیا خیال ہے؟''

''ہاں، ضرور، میں مشکور رہوں گی۔''

''مزید کافی ہونی چاہیے؟'' فرینک مسکرایا۔

''کیوں نہیں۔ مزید شکریہ بھی۔'' مریسا نے مسکراہٹ لوٹائی۔ فرینک ہنسنے لگا۔ اس نے بیل بجائی پھر فون پر نمبر ملانے لگا۔

وفاقی الیکشن کمیشن میں دوست سے رابطے پر اس نے گپ شپ سے آغاز کیا۔ بعد ازاں گفتگو PAC کی جانب

موڑ دی۔ مریسا بے قراری سے فرینک کی بات چیت سن رہی تھی۔ معاً اس نے میز پر پڑے نوٹ پیڈ سے ایک پرچہ پھاڑا۔ اس پر کچھ لکھ کر پرچہ اس نے فرینک کی جانب کھسکا دیا۔

فرینک نے ایک نظر مریسا کی تحریر پر ڈالی۔ کاغذ پر لکھا تھا: PAC کے مالکان، بورڈ آف ڈائریکٹرز، ہوم آفس وغیرہ...؟

فرینک نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی اور اشارے سے قلم مانگا۔ فون پر بات کرتے ہوئے اس نے کاغذ کی پشت پر لکھنا شروع کیا۔

بات ختم کر کے اس نے انگوٹھا اوپر کیا اور کاغذ واپس مریسا کو دے دیا۔ مریسا نے اس کی تحریر پڑھنا شروع کی اور دنگ رہ گئی۔ فرینک نے لکھا تھا: بورڈ آف ڈائریکٹرز... پریذیڈنٹ، جوشوا جیکسن۔ ایم ڈی، وائس پریذیڈنٹ راڈ بیکر۔ ایم۔ ڈی، ٹریژرر۔ سنکلیئر ٹائی مین۔ ایم ڈی، سیکریٹری، جیک کراس۔ ایم ڈی ڈائریکٹرز: گستاف سوانسن، ڈان موڈی، ٹرینٹ گڈریج۔

مریسا نے بریف کیس کھول کر پروفیشنل لیب کے پارٹنرز کی فہرست نکالی۔ فہرست میں وہی نام تھے جو فرینک نے کاغذ کے ٹکڑے پر لکھے تھے۔

☆☆☆

مریسا AMA کی بلڈنگ سے نکلی تو اس کا ذہن چکرا رہا تھا۔ نیا انکشاف، نئے سوالات الٹرا کنزرویٹو، فزیشن ایکشن کانگریس جیسا ادارہ پروفیشنل لیب سے کیا تال میل رکھتا ہے۔ ایک ایسی لیب جہاں انتہائی جدید اور مخصوص آلات استعمال ہو رہے تھے جن کی ضرورت مہلک وائرسوں پر تجربات کے لیے پڑتی ہے۔

پروفیشنل لیب کے کرتا دھرتا وہی نام تھے جو PAC کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے تھے۔ صورتِ حال مزید پُراسرار ہوگئی تھی۔ ڈور کچھ اور الجھ گئی تھی۔

گرد و پیش سے بے نیاز مریسا، خیالات میں غلطاں و پیچاں چل رہی تھی۔ اس دوران کئی افراد سے وہ ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ تاہم وہ بے خبری کے عالم میں خیالات میں ڈوبی رہی۔

ایبولا نے ہر مرتبہ مخصوص پرائیویٹ گروپس میں سر اٹھایا۔ انڈیکس کیس ہر بار ایک ڈاکٹر تھا۔ جو متاثرہ پرائیویٹ گروپ سے تعلق رکھتا تھا یا اسی گروپ کے مالکان میں سے تھا۔ فرینک سے ملاقات کے بعد مریسا نئے اشارے پر غور کر رہی تھی۔ ہر انڈیکس کا نام ظاہر کرتا تھا کہ وہ باہر سے آ کر امریکا میں سیٹ ہوا تھا۔ جیسے ڈاکٹر رشٹر، ڈاکٹر زیبر سکی یا ڈاکٹر الیکسی وغیرہ...

انڈیکس کیسز، ایبولا کی خون آشامی کی نذر ہونے سے قبل رہزنی کا شکار ہوئے تھے۔ صرف فونیکس کو استثنا حاصل تھا۔ مریسا کو اب بھی یقین تھا کہ فونیکس کی تباہی فوڈ کی مرہونِ منت تھی۔ ایبولا کو کسی طرح کینٹین میں کسٹرڈ کے ذریعے متعارف کرایا گیا تھا مگر کیسے؟

دفعتاً آنکھ کے کونے سے، اس نے چارلس جورڈن شوز دیکھے۔ جورڈن شوز، مریسا کی کمزوری تھے۔ جوتے ایک دکان کے ڈسپلے میں رکھے تھے۔ شیشے کی دوسری جانب دیگر برانڈ بھی موجود تھے۔ خیالات کی غوطہ زنی ختم ہوگئی۔ وہ یکلخت رک گئی۔ اس کے عقب والا راہ گیر تقریباً ٹکرا ہی گیا تھا۔ اس نے سنبھل کر مریسا کو گھورا۔ تاہم مریسا کی توجہ اپنے پسندیدہ جوتوں کی طرف تھی۔

وہیں کھڑے کھڑے اسے خیال آیا کہ نیویارک سٹی میں بھی یقیناً کسی نجی اسپتال کا ڈاکٹر ہی انڈیکس کیس ہوگا جسے مرض میں مبتلا ہونے سے پہلے لوٹ مار کی آڑ میں زخمی کیا گیا ہوگا... مریسا نے سوچا کہ اسے نیویارک جانے کا خطرہ مول لینا پڑے گا۔

اس نے ہوٹل جانے کا قصد کیا اور دائیں بائیں نگاہ دوڑائی۔ اچانک خوف نے اسے گرفت میں لینا شروع کر دیا۔ تمام واقعات، اتفاقات اور انکشافات، بائی چانس نہیں تھے۔ اس پر گھر میں حملہ، ٹرانسفر... MCL میں حملہ... سب کسی گہری سازش کی نشاندہی کر رہے تھے معاً یہ خوش فہمی تحلیل ہوگئی۔ اسے احساس ہوا کہ خود اس کی زندگی شدید خطرات سے دوچار ہے۔

وہ چوکنا ہوگئی۔ ہر کوئی۔ سے دشمن نظر آ رہا تھا، اس کی جان کا دشمن۔ مریسا نے اطراف میں موجود افراد کو گہری نظر سے دیکھا۔ وہ اب تک اپنی ذات کے تحفظ کو بھلائے بیٹھی تھی۔

اس نے بیس فٹ کے فاصلے پر ایک آدمی کو ونڈو شاپنگ کرتے دیکھا۔ مریسا کو لگا کہ وہ اس کے تعاقب میں ہے۔ اسے رکتا دیکھ کر خود بھی ونڈو کے ساتھ رک گیا ہے۔ مریسا نے شک دور کرنے کے۔ لیے سڑک کراس کی۔ اسے خدشہ تھا کہ وہ بھی پیچھے آئے گا۔ تاہم ایسا نہیں ہوا۔ مریسا ایک کافی شاپ میں داخل ہوگئی۔ چائے کا آرڈر دے کر اس نے خود کو پُرسکون کرنے کی سعی کی۔ اس نے کھڑکی کے

قریب والی ٹیبل منتخب کی تھی۔ جس آدمی پر اسے شک ہوا تھا، وہ کیب پکڑ کر روانہ ہو چکا تھا۔

مریسا اب بھی شیشے کے پار جائزہ لے رہی تھی۔ شاید اس کی چھٹی حس نے خطرے کا اعلان کر دیا تھا یا اس کا وہم تھا۔ مریسا نے چائے کا کپ اٹھایا۔ لیکن کپ کو ہونٹوں تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا۔ کپ والا ہاتھ خلا میں معلق رہ گیا۔ وہ حلیے سے بزنس مین لگ رہا تھا۔ ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ دوسرا ہاتھ کہنی کے جوڑ سے آگے متواتر ایک غیر فطری زاویے پر مڑا ہوا تھا۔

مریسا کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ پلک جھپکتے ہی وہ اپنے گھر پہنچ گئی۔ جہاں اس پر حملہ ہوا تھا۔ وہ شکل نہیں دیکھ سکی تھی۔ بریف کیس کے بارے میں ٹیڈ نے بتایا تھا۔ بلاشبہ یہ وہی حملہ آور تھا۔ مریسا کا ہاتھ خفیف سا کانپا۔ اس نے کپ نیچے رکھ دیا۔

اس نے چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں کر لیا۔ اس نے امید کی کہ یہ اس کی تخیلاتی پرچھائیاں ہیں۔ مریسا نے اپنی آنکھیں مسلیں۔ ایک منٹ بعد اس نے سانس روک کر شیشے سے باہر جھانکا۔ بریف کیس والا غائب تھا۔

مریسا نے چائے ختم کی اور باہر آگئی۔ وہ نروس ہو چکی تھی بار بار سمت تبدیل کر رہی تھی۔ اس کا اپنا بریف کیس وقتاً فوقتاً ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو رہا تھا۔ وہ خود کو شانے پر سے عقب میں جھانکنے سے نہ روک سکی۔ وہی آدمی اس کی طرف آ رہا تھا۔ مریسا لرز اٹھی۔ اس نے سراسیمگی کے عالم میں سمت بدل کر سڑک پار کی اور کن انکھیوں سے دیکھا۔ مصنوعی ہاتھ والا بھی سڑک عبور کر رہا تھا۔

مریسا کا خوف اور بدحواسی بڑھ رہی تھی۔ وہ پتا نہیں کس طرف نکل آئی تھی۔ شاید لوکل اسٹیشن تھا۔ اس کے قریب ٹرین کا سلائڈنگ ڈور کھلا۔ وہ اندھا دھند اندر داخل ہو گئی۔ اسے یہی سمجھ آیا کہ وہ ہجوم میں رہے۔ مضطرب دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں۔

مریسا، مسافروں میں راستہ بناتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ وہ آگے بڑھتی ہوئی دوسری کار میں چلی گئی تھی۔ اچانک اس کے پیر جیسے برف کے ہو گئے۔ وہی آدمی کچھ فاصلے پر موجود تھا۔

اس مرتبہ مریسا نے اس کی شکل نمایاں طور سے دیکھ لی۔ اس کا چہرہ اس کی مجرمانہ فطرت کا عکاس تھا۔ وہ دروازے کے قریب ہو گئی۔ اس کا ارادہ تھا کہ جاسوسی فلموں کے مانند آخری لمحات میں ٹرین چھوڑ دے گی۔ تاہم اسے اپنے فلمی منصوبے پر عمل کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ٹرین نے معمولی جھٹکا لیا اور روانہ ہو گئی۔ مریسا نے سنبھلنے کے لیے قریبی پول پر ہاتھ ڈال دیا۔ کھڑے ہوئے مسافروں میں لہر سی پیدا ہوئی اور مصنوعی ہاتھ والا نظر سے اوجھل ہو گیا۔

مریسا نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سینے میں دل بری طرح اچھلا۔ وہ بہت قریب تھا۔ اس کا صحیح ہاتھ اسی پول پر تھا۔ مریسا نے بدک کر ہاتھ واپس یوں کھینچا جیسے پول میں کرنٹ دوڑ رہا ہو۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ مریسا نے اسے پول چھوڑ کر کھاتے دیکھا۔ اس کا ہاتھ جیکٹ کی جیب میں گیا۔

مریسا کے اعصاب جواب دے گئے۔ خوف و دہشت سے زیر بار اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ اس نے ہجوم میں سے نکلنا چاہا لیکن ناکام رہی۔ چیخوں نے دم توڑ دیا۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ بیشتر مسافر مریسا کو گھور رہے تھے۔

مریسا کا دل حلق میں دھڑک رہا تھا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ملحقہ کار میں موجود ایک پولیس افسر مسافروں کو چیرتا ہوا وہاں آن دھمکا۔ یقیناً اس نے مریسا کی چیخیں سن لی تھیں۔

''کیا، تم ٹھیک ہو؟'' افسر نے بلند آواز میں سوال کیا۔

''یہ آدمی میرا پیچھا کر رہا ہے۔'' مریسا نے اشارے سے بتایا۔

پولیس افسر نے کاروباری ملبوس میں بریف کیس والے کو دیکھا۔

''کیا خاتون ٹھیک کہہ رہی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

اس آدمی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ پتا نہیں کیا مسئلہ ہے؟''

''کیا تم شکایت لکھواؤ گی؟'' افسر نے مریسا کی طرف دیکھا۔

ٹرین پھر آہستہ ہو رہی تھی۔ ''نہیں۔'' وہ بولی۔ ''یہ مجھ سے دور رہے تو مجھے شکایت لکھوانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اگر لیڈی پریشان ہیں تو میں خوشی سے اتر جاتا ہوں۔'' اس آدمی نے پیشکش کی۔ ٹرین رک رہی تھی۔ افسر نے مریسا کو دیکھا۔

''ہاں، میں بہتر محسوس کروں گی۔'' مریسا نے کہا۔

کچھ اور لوگ بھی اتر رہے تھے۔ وہ آدمی بھی شانے

اچکا کر اُتر گیا۔

''ٹھیک ہے؟'' پولیس افسر نے استفسار کیا۔

''ہاں، تمہارا شکریہ۔'' مریسا کی جان میں جان آئی۔ چند منٹ بعد ٹرین پھر چل پڑی۔

اگلی بار ٹرین رکی تو مریسا بھی اُتر گئی۔ کیب ہائر کر کے اس نے ہوٹل پامز ہاؤس کا نام لیا اور سیٹ سے ٹیک لگا کر گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس نے خود کو نہ سنبھالا اور اسی طرح خوف و دہشت کا شکار رہی تو جلد ہی ماری جائے گی۔ وہ بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ واپسی کی گنجائش نہیں تھی۔ نہ وہ پسپائی اختیار کرنا چاہتی تھی۔ اس کا اثاثہ دماغ تھا۔ اسے دماغ حاضر رکھنا تھا۔

ہوٹل پہنچتے ہی اس نے کمرے کا رخ کیا۔ شکاگو میں کریڈٹ کارڈ استعمال کر کے اس نے غلطی کی تھی۔ اسے چاہیے تھا کہ یہاں بھی اصل نام استعمال نہ کرتی اور ادائیگی بھی کیش کی شکل میں کرنی چاہیے تھی۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے پرس اور بریف کیس ڈیسک پر رکھا اور واش روم کی طرف چلی۔ آنکھ کے کونے سے اس نے اجنبی حرکت محسوس کی اور اضطراری طور پر غوطہ لگایا۔ اس کے باوجود اس کے شانے پر پڑنے والی ضرب نے اسے زمین بوس کر دیا۔ وہ جڑواں بستروں کے قریب جا گری۔

موجودہ صورتِ حال، ٹرین سے زیادہ بدتر تھی۔ تاہم اس نے دہشت کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ مریسا لڑ کے مرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

اس نے پھرتی سے بستر کے نیچے لوٹ لگائی۔ لیکن اس کا اسکرٹ حملہ آور کی گرفت میں آ گیا۔ اس نے مریسا کو باہر گھسیٹنا چاہا۔ مریسا نے پلٹ کر دیوانہ وار لاتیں چلائیں۔ تھڈ کی آواز کے ساتھ کوئی دھاتی شے فلور پر گری۔

گن۔ مریسا کے ذہن میں یہی خیال آیا اور خوف کی لہر حملہ آور ہوئی۔

اجنبی گری ہوئی گن کی طرف متوجہ ہوا۔ اس دوران مریسا کروٹیں بدلتی ہوئی دوسرے بیڈ کے نیچے چلی گئی جو دروازے سے قریب تھا۔

حملہ آور نے پہلے بیڈ کے نیچے دیکھا۔ پھر تیزی سے گھوم کر دوسرے بیڈ کی طرف آیا۔ مریسا کو پکڑنے کے لیے اسے گھٹنوں کے بل بیٹھنا پڑا۔ وہ مزید جھکا۔ اس کے بڑے سے پنجے نے مریسا کی ٹانگ ٹخنے سے پکڑ لی۔ بے ساختہ مریسا چلا اٹھی۔ اس روز وہ دوسرا موقع تھا جب اس نے شور مچایا۔

شکار اور شکاری کے مابین رسّاکشی جاری تھی۔ شکاری نے غراتے ہوئے گن بستر پر چھوڑی اور مریسا لات چلا کر دوبارہ پہلے والے بستر کے نیچے چلی گئی۔ وہ رکی نہیں بلکہ باہر نکل کر دروازے کی طرف لپکی۔ حملہ آور بستر کے اوپر تھا۔ مریسا دروازہ کھول چکی تھی۔ جب وہ چھلانگ مار کر آیا اور شکار کے بال پکڑ لیے۔ وحشیانہ انداز میں مریسا کو گھما کر واپس اندر پھینکا۔ وہ وال مرر سے ٹکرا کر گری۔ شیشہ بھی چکنا چور ہو گیا۔ وہ ٹرین والے کو پہچان چکی تھی۔ سر جھٹک کر اس نے دھندلی نظر صاف کی۔

حملہ آور نے دائیں بائیں دروازے سے باہر دیکھا اور دروازہ بند کر دیا۔ مریسا اٹھ کر واش روم کی طرف بھاگی۔ وہ بستر پر پڑی گن اٹھانا نہیں بھولی تھی۔

وہ اندر گھس کے دروازہ تقریباً بند ہی کر چکی تھی۔ جب حملہ آور بیرونی دروازہ بند کر کے باتھ روم کے دروازے تک پہنچ گیا۔ مریسا نے ایک ٹانگ کموڈ پر جما کر پوری طاقت سے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی۔ حملہ آور نے مصنوعی بازو پھنسا کر دروازہ بند ہونے سے روکا۔ کہنی کے جوڑ سے آگے اس کا ہاتھ غیر قدرتی انداز میں حرکت کر رہا تھا۔ تندرست ہاتھ سے زور لگاتے ہوئے اس نے اپنا نیم معذور ہاتھ شانے تک اندر گھسیڑ دیا۔ زور کے پیچھے اس کے جسم کی طاقت بھی تھی۔ دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

دروازہ بند کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ مریسا اس کی قوت کے آگے کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ زندگی اور موت کا کھیل ہے جس میں دشمن کا پلہ بہت بھاری تھا۔ ڈاوا ڈولی کے تحت اس نے ہاتھ میں موجود گن کو دیکھا اور اس کا سرخ ہوتا ہوا چہرہ متغیر ہو گیا۔ منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

اس کے ہاتھ میں گن نہیں تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انوکھے ہتھیار کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ڈیکسی نیشن گن تھی۔

دروازہ لحہ بہ لحہ کھلتا جا رہا تھا۔

مریسا کے ذہن میں شرارہ سا لپکا۔ وہ ایک سیکنڈ میں سمجھ گئی کہ اس کے ہاتھ میں درحقیقت کیا چیز ہے اور حملہ آور اس کے ساتھ کیا کرنے جا رہا تھا۔ حقیقت کا ادراک ہوتے ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا اٹھی۔

حملہ آور کسی بھی وقت اندر گھسنے والا تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ بھی اندر آ گیا تھا۔ مریسا نے شدید نفرت کے عالم میں اندھا دھند ڈیکسی نیشن گن اس کے صحت مند بازو پر رکھی اور دباتی چلی گئی۔ چیخ بلند ہوئی مگر اس مرتبہ آواز مردانہ تھی۔ آنا

فاناً دروازے پر سے دباؤ ختم ہوا اور دونوں ہاتھ بھی غائب ہوگئے۔

مریسا ہانپ رہی تھی۔ بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ کمرے کا بیرونی دروازہ کھلا، حملہ آور افراتفری میں دوڑتا ہوا نکل گیا۔

مریسا لڑکھڑاتی ہوئی بستر تک آئی۔ فضا میں فینولک ڈس انفیکٹ کی مخصوص بو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔ اسے رتی بھر شبہ نہیں تھا کہ وہ ویکسی نیشن گن کے ذریعے حملہ آور کے خون میں ایبولا منتقل کر چکی ہے۔ وہ مریسا کو گولی مارنے کے لیے پیچھے نہیں لگا ہوا تھا بلکہ اسے ایبولا کے حوالے کرنے آیا تھا۔ مریسا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

دہشت نے پھر اسے جکڑنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے ہی قاتل کے جسم میں ہولناک وائرس منتقل کر چکی تھی۔ یعنی وہ اب ایک قاتل تھی۔ بلکہ ایبولا کی ایک اور وبا پھیلنے کے امکانات روشن ہو گئے تھے۔

قاتل کے اس طرح اچانک فرار نے مریسا کے تمام اندازوں پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔

''سنبھالو خود کو اور نکلو یہاں سے۔'' ذہن نے آواز دی۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ویکسی نیشن گن کو نہایت احتیاط سے ایک پلاسٹک بیگ میں منتقل کیا۔ ویسٹ باسکٹ میں اسے ایک اور پلاسٹک بیگ مل گیا۔ دوسرا بیگ اس نے پہلے والے پلاسٹک بیگ پر چڑھا کر اچھی طرح بند کر دیا۔ وہ ہچکچاہٹ کا شکار تھی۔ پولیس کو کال کرے یا نہ کرے۔ نہیں معاملہ الجھ جائے گا۔ پولیس کیا کرے گی؟ وہ لوگ الٹا اسے پکڑ کر اٹلانٹا پولیس کے حوالے کر دیں گے۔

مریسا نے ضروری اشیا سمیٹیں۔ پلاسٹک بیگ اٹھایا پھر دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ باہر نکل کر اس نے دروازے سے جھولتی تختی کو پلٹ دیا۔ اب تختی پر ''ڈوناٹ ڈسٹرب'' لکھا نظر آ رہا تھا۔

وہ نارمل انداز میں ہاؤس کیپنگ کی طرف چل دی۔ وہاں ایک خاتون مصروف کار تھی۔ وہ بھی چند منٹ بعد چلی گئی۔ مریسا کو وہاں اپنے مطلب کی نیز تو نہ ملی۔ تاہم لائی سول (Lysol) کی ایک بوتل ہاتھ آ گئی۔ اس نے پلاسٹک بیگ کو لائی سول کی مدد سے اچھی طرح ڈس انفیکٹ کیا۔ بعد ازاں اسی محلول سے اپنے ہاتھوں کو دھویا۔ احتیاطی تدابیر کے طور پر فی الحال وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

مریسا لابی میں نکل آئی۔ یہاں دیگر مہمانوں کی موجودگی میں وہ خود کو بہتر اور محفوظ خیال کر رہی تھی۔ تاہم اس کی اندرونی حالت از حد ابتر تھی۔

پہلا کام اس نے یہ کیا کہ الینوائے اسٹیٹ اپی ڈمیالوجسٹ کا نمبر ملایا۔ تعارف کرائے بغیر اس نے مختصر بات کی۔ ''پام ہاؤس، شکاگو کا روم نمبر 2410، میں ایبولا کا خطرہ ہے۔'' جواب سنے بغیر اس نے فون بند کر دیا۔

اب مریسا نے ٹیڈ کا نمبر ملایا۔ مریسا کی آواز میں ہسٹریائی کیفیت محسوس کر کے، ٹیڈ کی سرد مہری ہوا ہو گئی۔

''کیا ہنگامہ آرائی ہے؟ مریسا تم ٹھیک تو ہو؟''

''تمہیں میرے دو کام کرنے ہیں۔'' مریسا نے اس کے سوالات نظر انداز کر دیے۔ ''اگرچہ میں نے تمہیں بہت پریشان کیا ہے لیکن میں قسم کھاتی ہوں کہ یہ میری آخری درخواست ہے۔ میرے پاس اور کوئی چوائس نہیں ہے۔ لاس اینجلس کی وبا کے متعلق، کنویلنٹ سیرم کی ایک وائل فوراً چاہیے۔ تم کوریئر سروس سے روانہ کر سکتے ہو۔ کیرول بریڈ فورڈ کے نام پر بھیجنا، جو نیویارک کے پلازا ہوٹل میں مقیم ہے۔''

''وہ کون ہے؟''

''پلیز، میرے پاس وقت بہت کم ہے۔'' مریسا کی آواز بھرا گئی۔ ''دوسرا احسان یہ کرو، میں ایک پارسل تمہیں بھیج رہی ہوں۔ پلیز، اس کو کھولنا مت۔ اسے MCL میں لے جا کر چھپا دینا۔''

''صرف اتنا ہی کرنا ہے؟''

''ہاں، کیا تم مدد کرو گے؟''

''او کے، میں یہ کر سکتا ہوں۔''

''میں چند روز میں رابطہ کروں گی اور سب بتا دوں گی۔''

''تم ٹھیک ہو؟'' ٹیڈ کی آواز میں تشویش تھی۔

''پتا نہیں پھر کال کروں گی۔''

مریسا نے تیسرا نمبر ملایا۔ وہ ہوٹل پلازا میں کیرول بریڈ فورڈ کے نام سے کمرا ریزرو کروا رہی تھی۔ کیرول، کالج کے زمانے میں مریسا کی روم میٹ رہ چکی تھی۔ اٹلانٹا سے شکاگو آتے وقت بھی مریسا نے یہی نام استعمال کیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے لابی میں موجود افراد کا بغور جائزہ لیا۔

اس نے یہاں کریڈٹ کارڈ استعمال کیا تھا۔ لہٰذا اسے رسمی انداز میں چیک آؤٹ کرنے کی ضرورت نہیں

تھی۔
وہ ہوٹل سے نکل کر فیڈرل ایکسپریس کے دفتر پہنچ گئی۔ وہاں اس نے بتایا کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے اور ایک اہم ویکسی نیشن... اسے اٹلانٹا روانہ کرنی ہے۔ عملے نے اس کی مدد کی۔ پلاسٹک بیگ کو مضبوط دھاتی باکس میں محفوظ کر دیا گیا۔ مریسا نے ٹیڈ کا پتا لکھوایا اور ادائیگی کر کے باہر آ گئی۔
کیب کے ذریعے وہ ائرپورٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔
بیک سیٹ پر وہ بیماری کی مخصوص و ممکنہ علامات کو پہنچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایبولا سے اتنا قریبی ٹاکرا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اسے امید تھی کہ اگر خدانخواستہ مرض کی کوئی علامت ظاہر ہونے سے پیشتر وہ ٹیڈ کا بھیجا ہوا سیرم استعمال کر لیتی ہے تو رہے سہے خدشات ختم ہو جائیں گے۔
ائرپورٹ تک پہنچنے میں ابھی دیر تھی۔ مریسا نے گہری گہری سانسیں لے کر پشت سے ٹیک لگا دی۔ دماغ کو ٹھنڈا رکھتے ہوئے اس نے نئے سرے سے حالات کا تجزیہ کیا۔
یہ امر یقینی تھا کہ وہ سازشی عناصر کے بہت قریب ہے۔ اتنے قریب کہ وہ اسے ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ دوسری چیز، اسے ایک ٹھوس ثبوت ہاتھ لگ چکا تھا۔ تیسرے، انڈیکس کیسز پر رہزنی کے دوران اسی قسم کی گن استعمال کی جاتی رہی تھی۔ مریسا کے نزدیک APC کا کردار مشکوک نہیں رہا تھا بلکہ بھیانک "سازش" میں APC مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔
مصنوعی ہاتھ والے کو کیسے علم ہوا کہ وہ شکاگو میں ہے؟ یہ ایک بڑا سوالیہ نشان تھا۔ یہ وہی آدمی تھا جو سی ڈی سی اٹلانٹا کی MCL میں مریسا کو قتل کرنے آیا تھا۔ دونوں سوالات کے جوابات کے لیے مریسا کا ذہن ٹیڈ کی طرف جا رہا تھا۔ ٹیڈ پر شک کرنا اس کے لیے ایک دشوار مرحلہ تھا۔ تاہم منطقی سوچ و بچار۔ بار بار ٹیڈ کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔ ٹیڈ کو گمشدہ کارڈ کا پتا چلا ہوگا تو لازمی اس نے نورس کو فون کیا ہوگا۔ وہ بھی جانتا تھا کہ مریسا فوراً اسی رات MCL میں جانا چاہتی تھی اگر ٹیڈ نے ایسا کیا تو ممکن ہے اس نے اپنے ہاتھ صاف رکھنے کی کوشش کی ہو لیکن دونوں حملہ آور اسی رات MCL میں کیونکر وارد ہوئے؟ ٹیڈ یہ بھی جانتا تھا کہ مریسا شکاگو جا رہی ہے۔ تاہم یہ ممکن نہیں تھا کہ ٹیڈ اس کے پیچھے قاتلوں کو لگا دیتا۔ نہ ہی نورس سے یہ توقع کی جا سکتی تھی۔
مریسا کا ذہن قلابازی کھانے لگا۔ اسے ایک ہی خیال ستا رہا تھا کہ ایبولا گن اسے اپنی ملکیت میں رکھنی چاہیے تھی۔ کیب ائرپورٹ پہنچ چکی تھی۔
مریسا ٹکٹ خرید کر بغیر کسی پریشانی کے سیکیورٹی سے گزر گئی۔ دورانِ انتظار اس نے رالف کو فون کیا۔ وہ وکیل کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔
رابطہ ہونے پر مریسا کے ہیلو کہنے سے پہلے ہی رالف بول اٹھا۔ "امید ہے کہ تم اٹلانٹا واپس آ گئی ہو۔"
"جلد پہنچوں گی۔" مریسا نے یقین دہانی کروائی۔ "شکاگو میں امریکن ٹرمینل پر ہوں نیویارک جانا ہے۔ وہاں سے اٹلانٹا پہنچوں گی۔ وکیل کے بارے میں کچھ بتاؤ؟"
"میں نے چھان بین کے بعد ایک بندوبست کیا ہے۔" رالف نے بتایا۔ "اس کا نام مک کوئن لن ہے۔ کافی تیز بندہ ہے وہ سنبھال لے گا۔"
"تم سے یہی امید ہے، شکریہ رالف۔"
"مریسا، میں فکرمند ہوں آخر تم یہ بھاگ دوڑ ختم کر کے واپس اٹلانٹا کیوں نہیں آ جاتیں؟ کم از کم یہاں تم اکیلی نہیں ہوگی۔"
"وعدہ کرتی ہوں جلدی واپس آؤں گی۔"
"پلیز واپس آ جاؤ۔"
"رالف، بس چند روز اور۔" مریسا نے درخواست کی۔
"اوکے ڈیئر۔" وہ بولا۔ "اپنا خیال رکھنا۔"
"تھینکس۔" مریسا نے فون بند کر دیا۔
فون بند کرنے کے بعد بھی مریسا کا ہاتھ ریسیور پر تھا۔ رالف سے بات کر کے وہ ہمیشہ بہتر محسوس کرتی تھی۔ ایک اچھے دوست کی رفاقت کا احساس فزوں تر ہو جاتا تھا۔

☆☆☆

فضائی سفر کے دوران میں مریسا کی ملاقات ڈینی نامی شخص سے ہوئی وہ ایک باتونی شخص تھا اور شکاگو سے ہی سوار ہوا تھا۔ اس کی بہن ہوائی میں ڈاکٹر تھی۔
تاہم مثبت تاثر لینے کے باوجود مریسا نے اسے اپنا اصل نام بتانے کی غلطی نہیں کی۔ نیویارک پہنچنے پر دونوں کی راہیں جدا ہو گئیں۔
بکنگ کے باوجود کیرول کے نام سے مریسا نے پلازا ہوٹل کا رخ نہیں کیا۔ اس کے بجائے اس نے پلازا ہوٹل کے قریب ایسکس ہاؤس میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ یہاں اس نے اپنی ہائی اسکول کی سہیلی لزا کینڈرک کا نام استعمال کیا تھا۔

☆☆☆

جارج، ایوس رینٹ اے کار کے کاؤنٹر پر کھڑا تھا وہ لگیج ایریا میں موجود مسافروں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ جارج کو ہائر کرنے والوں نے اسے مینڈک کا نک نیم دے رکھا تھا۔ مینڈک کی عرفیت کا تعلق اس کی ظاہری شخصیت سے نہیں بلکہ اس کے بے مثال صبر کی خوبی سے تھا۔ وہ اپنا کام غیر معمولی صبر و سکون کے ساتھ سرانجام دینے کا عادی تھا۔ بالکل مینڈک کی طرح۔ جو گھنٹوں شکار کے قریب آنے کے انتظار میں خاموش اور ساکن ایک ہی حالت میں بیٹھا رہتا ہے۔

لیکن جارج کو ائرپورٹ پر اپنی خاص صفت کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ وہ وہاں تھوڑی دیر کے لیے آیا تھا۔ اطلاع کے مطابق لڑکی کی فلائٹ شکاگو سے پانچ یا چھ بجے وہاں پہنچ جاتی تھی۔ پانچ بجے والی فلائٹ پہنچ چکی تھی۔

جارج کو معمولی الجھن درپیش تھی لڑکی کا جو حلیہ بتایا گیا تھا وہ مبہم تھا۔ عمر تقریباً تیس سال، خوب صورت، چھوٹا قد، گہرے بھورے بال۔

عموماً جارج کے پاس ہدف کی تصویر ہوتی تھی لیکن اس مرتبہ تصویر حاصل کرنے کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔ معاً کاؤنٹر سے کہنی اٹھا کر وہ سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اس نے لڑکی کو دیکھ لیا تھا، لڑکی سوٹ کیس کھینچ رہی تھی۔

☆☆☆

چھوٹے قدموں کے ساتھ جارج اس قطار کی جانب چل دیا جو کیب کے حصول کے لیے آنے والے مسافر بنا رہے تھے۔ وہ مزید تصدیق کے لیے لڑکی کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔

''خوب صورت'' کا لفظ اس کے لیے مناسب نہیں تھا۔ لڑکی نمایاں طور پر حسین تھی۔ قد پانچ فٹ تھا شاید ایک آدھ انچ زیادہ رہا ہو۔ بالوں کی رنگت بھی حلیے کے مطابق تھی۔

جارج حیران تھا کہ اس نازک حسین گڑیا نے شکاگو کے ہوٹل میں پاٹ جیسے تجربہ کار اور جاندار بندے کو بھاگنے پر مجبور کردیا تھا۔ جارج کے ذہن میں خیال آیا کہ شاید لڑکی مارشل آرٹ کی ماہر ہے کوئی کنگ فو اسٹار ٹائپ کی چیز ہے۔ جارج، شکاگو کے ہوٹل میں ہونے والے ڈرامے کی جزئیات سے بے خبر تھا۔

کیب اسٹینڈ کے مخالف سمت ایک اور کیب کھڑی تھی۔ جارج سڑک پار کر کے اس کیب میں جا بیٹھا۔

''دیکھ لیا اسے؟'' کیب ڈرائیور نے گردن گھما کر جارج کو دیکھا۔

''جیک گاڑی اسٹارٹ رکھو۔'' جارج نے جواب دینے کے بجائے حکم جاری کیا۔ وہ دونوں چار سال سے ایل کے لیے کام کر رہے تھے اور اب تک کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ جارج نے ہی پرائیویٹ کار کے بجائے کیب کو ترجیح دی تھی۔

''وہ دیکھو لڑکی کیب میں بیٹھ رہی ہے۔'' جارج نے اشارے سے نشان دہی کی۔ ''اس کی کیب کی چھت پر ڈینٹ پڑا ہے۔ تعاقب آسان رہے گا۔ اسے آگے نکلنے دو۔''

جیک، جارج کی ہدایات کے مطابق عمل کر رہا تھا۔ چالیس منٹ کے کامیاب تعاقب کے بعد لڑکی کی کیب ایسکس ہاؤس کے سامنے رکی۔ جیک نے ہوٹل سے پچاس فٹ دور اپنی کیب روک لی۔

''ہونہہ، وہ کہاں ٹھہری ہے، یہ تو معلوم ہوگیا۔'' جیک نے کہا۔

''مجھے تصدیق کرنے دو۔'' جارج بولا۔ ''رجسٹریشن دیکھ کر واپس آتا ہوں۔'' وہ کیب سے اتر گیا۔

☆☆☆

ہوٹل پامز ہاؤس میں جو کچھ ہوا، اسے اتنی جلدی بھلایا نہیں جا سکتا تھا۔ مریسا پُرسکون نیند لینے سے قاصر رہی۔ وہ اب کبھی کسی ہوٹل میں اطمینان سے نہیں رہ سکے گی۔ پامز ہاؤس میں قاتلانہ حملہ ایک بھیانک خواب کے مانند اس کی یادداشت میں محفوظ ہوگیا تھا۔

ہر آہٹ، ہر کھٹکا اس کے خوف اور خدشات کو بیدار کر دیتا تھا۔ ایبولا کے مرض کی علامتوں کا خوف بھی گاہے بگاہے مریسا کے ذہن میں سر اٹھاتا۔ رات میں اس نے کئی مرتبہ اپنا ٹمپریچر چیک کیا۔ کچی پکی نیند کے بعد وہ صبح بیدار ہوئی تو اسے پھر بخار کا خیال آیا، اس نے نبض چیک کی۔

مریسا نے واش روم سے نکل کر ناشتے کا آرڈر دیا۔

ناشتے کے ساتھ نیویارک ٹائمز کی اعزازی کاپی بھی موجود تھی۔

فرنٹ پیج پر ایبولا سے متعلق آرٹیکل تھا۔ نیویارک میں مریضوں کی تعداد گیارہ تک بڑھ گئی تھی۔ ایک مریض چل بسا تھا جس کا نام گریش مہتا تھا۔ وہی پہلا مریض تھا اور متاثرہ اسپتال میں ڈاکٹر تھا۔ جبکہ پنسلوینیا میں چھتیس مریض تھے، سترہ اموات ہو چکی تھیں۔

مریسا نے دس بجے کے بعد سے وقتاً فوقتاً پلازا ہوٹل فون کرنا شروع کیا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ کیرول کے نام پر اٹلانٹا سے کوئی پارسل موصول ہوا یا نہیں۔

گیارہ بجے کے بعد اسے اپنی مطلوبہ خبر مل گئی اور مریسا نے ایسکس ہاؤس سے نکلنے کی تیاری شروع کر دی۔ ٹیڈ کے لیے اس کے دماغ میں شک بیٹھ چکا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ٹیڈ نے سیرم بھیجا ہے یا پارسل خالی ہے؟

شک کو یقین میں بدلنے کے لیے یا شک کو منانے کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے۔ مریسا کا ذہن صاف نہیں تھا۔ اسے چانس لینا ہی تھا مخصوص سیرم اس کی ضرورت تھی۔ اس نے صرف پرس ساتھ لیا اور محفوظ طریقہ کار سوچتی ہوئی باہر نکلی۔ اسے یہی سمجھ آیا کہ کیب استعمال کرے اور خود کو پبلک کے درمیان رکھے۔

☆☆☆

جارج ایسکس ہاؤس کی لابی میں بظاہر اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس قسم کی سچویشن اس کی پسندیدہ تھی۔ مینڈک کے سے سکون سے شکار کا انتظار کرو۔ کافی کے ساتھ وہ صورتِ حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ لڑکی تمام دن بھی کمرے میں بند رہتی، تب بھی وہ مینڈک کی طرح صبر سے صرف انتظار کرتا۔ یہی اس کی سب سے نمایاں خوبی تھی۔

ہاؤس ڈیٹکٹیو کی جانب سے کسی قسم کی چھیڑ خانی کا اندیشہ نہیں تھا۔ اس کا معزز انداز و حلیہ ہی ایسا تھا۔ جارج نے ارمانی کا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ پاؤں میں مگرمچھ کی کھال سے بنے بیش قیمت جوتے تھے۔ کلائی پر رولیکس چمک رہی تھی۔

بارہ بجے کے قریب اس نے اپنے ہدف کو ایلیویٹر سے نکلتے دیکھا۔ وہ اس رخ پر بیٹھا تھا کہ بہ آسانی نظر میں آئے بغیر گھومتے ہوئے شیشے کے دروازے سے باہر نکل جائے۔ وہ جوگنگ کے انداز میں جیک کی کیب تک پہنچا۔ وہ کیب میں بیٹھا تو جیک نے لڑکی کو ہوٹل سے نکلتے دیکھا۔

''بیوٹی۔'' جیک بڑبڑایا۔ جارج کو دیکھتے ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ کیب کی عقبی نشست پر بھی کوئی شخص براجمان تھا۔

''تمہیں یقین ہے کہ وہ ڈاکٹر مریسا بلوم ہے؟'' عقبی نشست سے استفسار کیا گیا۔ اس کا نام الفانسے ہک مین تھا۔ بیشتر شناسا اسے ''ایل'' بولتے تھے۔ وہ مشرقی جرمنی میں پلا بڑھا تھا۔ آنکھیں نیلے رنگ کی اور بال بھورے تھے۔ وہ اپنی عمر سے کم دکھائی دیتا تھا۔ چہرہ نوجوانوں کے جیسا تھا۔

''حلیے اور دیگر اطلاعات کے مطابق وہی ہے۔'' جارج نے ایل کے سوال کا جواب دیا۔ ''تاہم ہوٹل میں نام اس نے لز کینڈرک لکھوایا ہے۔''

''وہ بہت ہوشیار ہے یا پھر بہت خوش قسمت۔'' ایل نے تبصرہ کیا۔ ''ہمیں بہت احتیاط کرنی ہے۔ ہیبر لنگ کے مطابق یہ گڑیا نما لڑکی سارا معاملہ چوپٹ کر سکتی ہے اور میں ہیبر لنگ کے سامنے کوئی بُری خبر لے کر نہیں جانا چاہتا اسی لیے میں نے تمہیں منتخب کیا ہے۔''

مریسا کی کیب شرق کی سمت جا رہی تھی۔ جیک دو گاڑیوں کو درمیان میں رکھ کر تعاقب کر رہا تھا۔

☆☆☆

ڈرائیور منتظر تھا، جبکہ مریسا گھوم کر ایسکس ہاؤس کے داخلی دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ مطمئن ہونے کے بعد اس نے ڈرائیور کو پلازا ہوٹل کے بارے میں بتایا۔

پلازا ہوٹل پہنچ کر مریسا نے ہدایت دی۔ ''تم یہیں رکو گے، میں چند منٹ میں واپس آتی ہوں۔ یہ پانچ ڈالر اضافی رکھو۔''

کیب، ہوٹل کے دروازے سے تیس فٹ کے فاصلے پر تھی۔ مریسا جب تک ہوٹل میں داخل نہیں ہوگئی، ہر قدم پر اسے دھڑکا لگا رہا۔

ہوٹل میں آ کر اس نے لابی کراس نہیں کی بلکہ جیولری ڈسپلے کے سامنے رک گئی۔ زیورات دیکھنے کے بہانے وہ شیشے کے عکس میں جائزہ لے رہی تھی۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

بے قابو دھڑکنوں کے ساتھ لابی کراس کر کے وہ فرنٹ آفس پر پہنچی۔

پارسل کی درخواست پر جب اس کی شناخت طلب کی گئی تو مریسا کو ہوش آیا۔ وہ کنفیوز ہوگئی۔ اس نے وقتی طور پر معذرت کی۔ کاؤنٹر کی دوسری جانب کی لڑکے لڑکیاں تھیں۔ مریسا کے سامنے لڑکی تھی۔

''کوئی بات نہیں، آپ اپنے کمرے کی چابی دے دیجیے۔'' لڑکی شائستگی سے مسکرائی۔

''اوہ، میں نے ابھی چیک اِن نہیں کیا ہے۔ مجھے پہنچنے میں تاخیر ہوگئی۔''

''آپ پہلے چیک اِن ہو جائیے۔ میں بھی مجبور ہوں۔ آپ سمجھ سکتی ہیں یہ ذمے داری کی بات ہے۔'' لڑکی نے کہا۔

''اوکے، کیوں نہیں۔'' مریسا نے مسکرانے کی کوشش

کی۔ تاہم اس کا اعتماد متزلزل ہو گیا تھا۔

مریسا رجسٹریشن ڈیسک کی طرف چلی گئی۔ وہ کریڈٹ کارڈ استعمال نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پروسیس اسے کچھ پیچیدہ لگا۔ بہر حال جیسے تیسے نمٹا کر اس نے ہدایت کے بموجب کیش جمع کرایا۔

بالآخر کمرے کی چابی حاصل کر کے وہ اسی لڑکی کے پاس واپس آئی۔ چند منٹ بعد فیڈرل ایکسپریس کا پارسل اس کی تحویل میں تھا۔ وہ ایلیویٹر کی جانب چل پڑی۔ پھر وہاں سے رخ اس نے باہر کی جانب موڑ دیا۔ چلتے چلتے اس نے پارسل کا ریپر پھاڑ کے ڈسٹ بن کی نذر کیا۔ پیکٹ سے سیرم کی وائل نکال کر جیب میں رکھ لی۔ وہ ہوٹل سے باہر نکلی تو خاصی مطمئن تھی۔

اس نے سڑک کی دونوں جانب دیکھا۔ فٹ پاتھ پر رش تھا۔ دن چڑھنے کے باعث خوب روشنی تھی۔ مریسا کی کیب اپنی جگہ موجود تھی۔ وہ تیز قدموں کے ساتھ کیب کی طرف چل دی۔ عقبی نشست کے دروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر گردن گھما کر اطراف کا جائزہ لیا۔ آس پاس بھی افراد موجود تھے۔ اس نے کیب کا دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر بیٹھنے ہی والی تھی کہ بدن میں لہو کی گردش جیسے تھم گئی۔

مریسا سکتے کی حالت میں جھکی ہوئی اپنی جانب اٹھی گن کی نال کو گھور رہی تھی۔ وہ آدمی عقبی نشست کے ساتھ نیچے لیٹا ہوا تھا۔ اس کے بال بھورے تھے۔ اور وہ ایک دشوار حالت میں نشست کے ساتھ لیٹا تھا۔ تاہم انتظار ختم ہو گیا تھا۔ اس نے گن سیدھی رکھتے ہوئے، اٹھنے کی کوشش کی۔

بے اختیار مریسا کی ہسٹریائی چیخ فضا میں گونجی۔ وہاں رش کی وجہ سے ہلکا سا شور پھیلا ہوا تھا۔ نسوانی چیخ کے ساتھ ہی یکلخت شور، سکوت میں تبدیل ہو گیا۔ ریوالور بدست نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر اسے کچھ بولنے کا موقع نہیں ملا۔ چیخ کے ساتھ ہی مریسا کا سکتہ ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے کیب کا دروازہ پوری طاقت سے دوبارہ بند کر دیا۔ دھماکے کے بجائے پٹاخے جیسی آواز آئی اور کیب ڈور کا شیشہ چکنا چور ہو گیا۔ تاہم مریسا جبلی طور پر دروازہ بند کرتے ہی پیچھے کی سمت متحرک ہو چکی تھی۔ گولی شیشے میں سے گزر کر کدھر گئی، اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ وہ اندھا دھند اسی جانب بھاگی۔ وہ زندگی میں پہلی بار اتنا تیز بھاگی تھی۔ وہ لاعلم تھی کہ موقع ملتے ہی ڈرائیور بھی راہِ فرار اختیار کر گیا تھا۔ وہ بونٹ کی جانب سے ہوتا ہوا، مریسا کی مخالف سمت میں دوڑا تھا۔

مریسا نے بھاگتے ہوئے عقب میں دیکھا۔ حملہ آور راستہ بناتا ہوا آ رہا تھا۔ گن غالباً اس نے جیب میں رکھ لی تھی۔ پش کارٹس، پالتو کتے، بے بی کیریجز، عورتیں، مرد اور بچے... حملہ آور بھیڑ میں راستہ بناتے ہوئے مشکل میں تھا جبکہ مریسا، قد کاٹھ اور عورت ہونے کے ناتے بہتر پوزیشن میں تھی۔ وہ ہر ایک سے بے نیاز دھکم پیل کرتی نکل رہی تھی۔ تاہم گولی کا دھما کا سنائی نہیں دیا تھا اس لیے افراتفری نہیں پھیلی تھی۔ مریسا کو احساس تھا کہ وہ بھیڑ میں بھاگتے ہوئے زیادہ دیر محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ حملہ آور اکیلا ہے یا اس کے ساتھی بھی ہیں۔

وہ پلازا ہوٹل کی پارکنگ میں سے گزرتی ہوئی ایک پارک میں گھس گئی۔ جس کے مرکز میں فوارہ اچھل رہا تھا۔ اگرچہ وہ حواس باختہ ہو چکی تھی۔ تاہم اسے ادراک تھا کہ جو کچھ کرنا ہے، اسی کو کرنا ہے۔ اچانک پارک کی گرل کے دوسری طرف اسے ایک گھڑ سوار پولیس والا نظر آیا۔ وہ راستہ بناتی ہوئی گھڑ سوار کی طرف بھاگی۔ لوگ اس کی طرف دیکھ رہے تھے جبکہ وہ حملہ آور کو بھی دھیان میں رکھے ہوئے تھی۔ جو پلازا کی پارکنگ میں پہنچ گیا تھا۔

پولیس والا دلکی چال کے ساتھ نکل گیا تھا۔ وہ مریسا کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ مریسا نے چکراتے ہوئے ذہن کے ساتھ ہر جانب نظر دوڑائی۔ حملہ آور قریب آتا جا رہا تھا۔ مریسا واپس فوارے کی جانب بھاگی اور لڑتی بھڑتی ہجوم میں گھس گئی۔ کئی احتجاجی آوازیں بلند ہوئیں۔

دفعتاً مریسا نے خود کو کئی سو افراد کے درمیان پایا۔ وہ دائرہ بنائے کھڑے تھے۔ درمیان میں جگہ خالی تھی۔ مرکز میں مضبوط اور لچکدار جسم والے تین عدد کالے پتلون بنیان میں، ریپ میوزک پر بریک ڈانس کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ مریسا کی خوف زدہ ہرنی جیسی وحشت زدہ آنکھیں تینوں سے لڑیں۔ سیاہ فام رقص کنندگان کی آنکھوں میں غصے کی جھلک تھی۔ مریسا نے ان کے شو میں مداخلت کی تھی۔

تاہم کالوں کے پسینے میں دمکتے بدن میوزک کی لہروں پر متحرک رہے۔ اس سے پہلے کہ مریسا پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کوئی قدم اٹھاتی، حملہ آور بھیڑ میں سے نمودار ہوا۔ اسے بھی توقع نہیں تھی کہ بھیڑ کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ مریسا کو کچھ نہیں سوجھا تو وہ رقص کرتے ہوئے کالوں کی طرف بھاگی۔ ڈانسرز کا ردھم ٹوٹ گیا۔ حملہ آور رکتے

رستے بھی کالوں کے قریب آگیا۔ مریسا اس کی دیدہ دلیری پر حیران رہ گئی۔ وہ اتنے لوگوں کے سامنے گن نکال رہا تھا۔ اس کے تاثرات اشتعال کے باعث بگڑ گئے تھے۔ کالوں کی آنکھوں میں غصے کے ساتھ نفرت دکھائی دی۔

کیا وہ پاگل ہوگیا ہے؟ اس بھیڑ میں گولی چلائے گا؟ مریسا نے سوچا۔ غیر ارادی طور پر اس نے سانس روک لی۔ حملہ آور گن سیدھی کررہا تھا۔ ہجوم میں چند عورتوں کی چیخ و پکار سنائی دی۔ وہ ایک ناقابلِ یقین منظر تھا۔ سب کچھ چند سیکنڈ میں وقوع پذیر ہوا۔ ہلچل مچنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

ایک سیاہ فام رقاص کی ماہرانہ ٹانگ چلی اور گن فضا میں قوس بناتی ہوئی ہجوم میں جا گری۔ بھیڑ کائی کے مانند پھٹی...

حملہ آور بھی کوئی دیوانہ لڑاکا تھا۔ اس نے بھی ایڑی پر گھوم کر فضا میں کک چلائی۔ رقاص نے اس کی ٹانگ بازو پر روکی، لیکن نیچے گر پڑا۔ کالوں کی ٹیم میں تین اور بھی تھے۔ جو سائڈ لائن پر ڈانس کا لطف اٹھا رہے تھے۔ تینوں عقب سے حملہ آور پر ٹوٹ پڑے۔ ایک نیچے پڑا تھا۔ باقی دو سامنے سے لپکے... خاصا ہنگامہ کھڑا ہوگیا تھا۔

موقع غنیمت جان کر مریسا نے بھیڑ میں ڈبکی لگائی۔ ایک منٹ کے اندر وہ پارک سے باہر تھی۔ گزرتی کیب کو اشارہ کرکے وہ اس میں سوار ہوگئی۔ روزن برگ اسپتال کا نام لے کر اس نے پلٹ کر شیشے سے باہر دیکھا۔ فوارے کے پاس ہجوم بڑھ گیا تھا۔ گھڑ سوار پولیس والا پھر نظر آرہا تھا۔

مریسا نے گہری سانس لے کر نشست سے ٹیک لگائی اور رومال نکال کر پسینہ خشک کرنے لگی۔ رفتارِ قلب ابھی تک بے قابو تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ یہ سب کیونکر ہوا؟ ٹیڈ کے اوپر مریسا کا شک پختہ ہوگیا۔ سیرم کے حصول کا مقصد بھی زیرو ہوگیا تھا۔ اب وہ خود کو سی کا انجکشن نہیں لگا سکتی تھی۔

ٹیڈ پر شک پختہ ہونے کے باوجود مریسا نے صدمہ محسوس کیا۔ وہ مخصوص گن بھی ہاتھ سے نکل گئی۔ ایبولا کی مخصوص گن حفاظتی اقدامات کے تحت بنائی گئی ہوگی تاکہ اسے استعمال کرنے والا محفوظ رہے۔ مریسا کے لیے اس مفروضے پر یقین کرنے کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں تھا۔

اول اسے خیال آیا کہ روزن برگ کلینک نہ جائے لیکن اگر وہاں اسے اپنے مطلب کا کلیو مل گیا تو تمام شکوک رفع ہوجائیں گے۔ وہاں اس کی آمد کی کسی کو توقع بھی نہیں ہوگی۔ نہ قاتلوں کو ورنہ ہی ڈی سی والوں کو۔

مریسا نے روزن برگ کلینک سے ایک بلاک دور کیب رکوائی۔ باقی راستہ اس نے پیدل طے کیا۔ یہ بھی ایک شاندار اسپتال تھا۔ باہر ایک موبائل ٹی وی وین اور متعدد پولیس اہلکار نظر آرہے تھے۔

مریسا، حسبِ سابق سی ڈی سی کا کارڈ دکھا کر بہ سہولت نکل گئی۔ لابی میں افراتفری تھی۔ مریسا پوری طرح چوکس تھی۔ اس کی توقع کے مطابق روزن برگ غیر ملکی HMO کی فہرست میں شامل تھا۔ دوسرے سوال کا جواب حاصل کرنا دشوار تھا۔ کیونکہ ''انڈیکس کیس'' ہلاک ہوچکا تھا۔

''ڈاکٹر کوٹ روم'' سے اسے ایک سفید کوٹ مل گیا۔ کوٹ پہن کر وہ واپس لابی میں آگئی۔ معاً وہ بری طرح ٹھٹکا گئی۔ اس کی نظر ڈاکٹر لینڈا پر پڑی۔ قسمت ساتھ دے رہی تھی۔ ڈاکٹر لینڈا دوسری جانب مڑ گیا۔ مریسا نے اندازہ لگایا کہ وہ اسپتال سے باہر جارہا تھا۔ وہ نروس ہوگئی۔ کہیں، نورس سے مڈبھیڑ نہ ہوجائے مگر خطرہ مول لے کر وہ خالی ہاتھ واپس نہیں جاسکتی تھی۔

ڈائریکٹری کی مدد سے اس نے معلوم کیا کہ پیتھالوجی ڈپارٹمنٹ چوتھی منزل پر تھا۔

☆☆☆

''میں کیا مدد کرسکتی ہوں؟''

''میں ڈاکٹر ہوں، میرا تعلق سی ڈی سی سے ہے۔'' مریسا نے سیکریٹری کو جواب دیا۔ ''سی ڈی سی کا کوئی ڈاکٹر یہاں ہے؟''

''مجھے ڈاکٹر اسٹیورٹ سے معلوم کرنا پڑے گا۔'' سیکریٹری اٹھتے ہوئے بولی۔ ''وہ یہیں آفس میں ہے۔''

اس اثنا میں خود ڈاکٹر اسٹیورٹ وہاں آگیا۔ وہ ایک بھاری بھرکم اور باریش آدمی تھا۔ ''میں حاضر ہوں۔'' وہ بولا۔ ''سی ڈی سی کی ٹیم تیسری منزل پر آئسولیشن وارڈ میں ہے۔'' اس نے اطلاع فراہم کی۔

''ڈاکٹر، شاید تم میری مدد کرسکو۔'' مریسا نے کہا اور تعارف سے اجتناب برتا۔ ''ایبولا کی تباہ کاری کا آغاز لاس اینجلس سے ہوا تھا۔ ور جب سے ہی میں اس پر کام کررہی ہوں۔ بدقسمتی سے نیویارک پہنچنے میں مجھے تاخیر ہوگئی۔ اولین مریض، یعنی ڈاکٹر مہتا، زندگی کی بازی ہار گیا ہے؟''

''ہاں، آج صبح۔''

''اگر مائنڈ نہ کرو تو کیا میں چند سوالات پوچھ سکتی

ہوں؟''

''ابھی آٹوپسی نہیں ہوئی ہے۔'' ڈاکٹر اسٹیورٹ نے کہا پھر سیکریٹری کی جانب مڑا۔ ''ہیلن! تم کرٹ کو تلاش کرو۔'' یہ کہہ کر وہ مریسا کو اپنے خوب صورت آفس میں لے آیا۔

''ڈاکٹر! یقیناً تم ڈاکٹر مہتا سے واقف ہو گے؟'' مریسا نے بالمقابل نشست سنبھالی۔

''بہت اچھی طرح۔'' اسٹیورٹ نے تاسف سے سر ہلایا۔ ''وہ ہمارا میڈیکل ڈائریکٹر تھا۔ ہمارا بہت بھاری نقصان ہوا ہے۔'' بعدازاں، اسٹیورٹ نے وضاحت کی کہ مہتا اسٹاف اور مریضوں میں کتنا مقبول تھا اور روزن برگ کی ساکھ میں اس کا کتنا بڑا ہاتھ تھا۔

''مہتا نے طبی تعلیم کہاں حاصل کی تھی؟''

''میرا خیال ہے کہ وہ بمبئی سے تعلیم مکمل کر کے آیا تھا۔'' اسٹیورٹ نے جواب دیا۔ ''تاہم مجھے اتنا یقین ہے کہ اس نے لندن میں رہائش اختیار کی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ بمبئی سے آنے کے بعد لیکن یہ ایک غیر متعلق سوال معلوم ہوتا ہے؟''

''دراصل مجھے تجسس تھا کہ وہ غیر ملکی میڈیکل گریجویٹ تھا۔'' مریسا نے کہا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''شاید نہ پڑے۔ یا شاید یہ سوال اہم ہے کیونکہ ایبولا کے گزشتہ تمام حملے، ابتدا میں غیر ملکی ڈاکٹرز پر ہوئے تھے۔''

اسٹیورٹ کے لیے یہ نئی اطلاع تھی۔ اس نے تعجب کا اظہار کیا۔

''میرا خیال ہے کہ یہاں کا زیادہ تر اسٹاف غیر ملکی میڈیکل گریجویٹس پر مشتمل ہوگا۔'' مریسا نے یقین کے ساتھ رائے زنی کی۔

''یقیناً۔'' اسٹیورٹ نے تصدیق کی۔ ''تمام HMOs نے غیر ملکی گریجویٹس بھرتی کیے ہیں۔''

دروازہ کھلا اور ایک جوان آدمی اندر داخل ہوا۔

''یہ کرٹ وینڈرمی ہے۔'' اسٹیورٹ نے کہا۔

مریسا نے ہچکچاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔

''ڈاکٹر مریسا کو آٹوپسی کے بارے میں کچھ معلومات درکار ہیں۔'' اسٹیورٹ نے مقصد بتایا۔

''دراصل ابھی کارروائی مکمل نہیں ہوئی ہے۔'' کرٹ نے نشست سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال، اب تک جو ڈیٹا ہم نے حاصل کیا ہے، وہ میں بتا سکتا ہوں۔''

''درحقیقت میں بیرونی علامتوں کے متعلق متجسس ہوں۔'' مریسا نے کہا۔ ''بیرونی علامتوں میں کوئی ایسی چیز جو عمومی نوعیت کی نہ ہو... میرا مطلب ہے کہ جس کا تعلق مرض کی علامتوں سے نہ ہو؟''

''میں سمجھا نہیں؟''

''میرا مطلب ''ٹروما'' سے ہے... کوئی حادثاتی علامت؟'' مریسا نے وضاحت کی۔

''تم نے کیسے اندازہ لگایا؟'' کرٹ نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''میں بھول گیا تھا۔ مریض کی ناک ٹوٹی ہوئی تھی۔''

''کتنی پرانی بات ہوگی؟''

''چھ سات یا پھر دس دن۔'' کرٹ نے جواب دیا۔

''کیا چارٹ میں اس کا ذکر ہے؟''

''ایمان داری کی بات ہے کہ میں نے ناک کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ کیونکہ یہ تصدیق ہوگئی تھی کہ وہ ایبولا کی گرفت میں ہے اور مہلک وائرس کی وجہ سے ہی اس کی موت واقع ہوئی۔''

''میں سمجھ سکتی ہوں۔'' مریسا نے کہا۔ ''کیا میں چارٹ دیکھ سکتی ہوں۔''

''کیوں نہیں۔'' مثبت جواب ملا۔

چارٹ میں، مریسا کوئی اہم نکتہ دریافت نہ کرسکی سوائے اس کے کہ ڈاکٹر مہتا ای این ٹی اسپیشلسٹ تھا۔ ٹوٹی ہوئی ناک کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ کرٹ نے پیشکش کی کہ وہ اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرسکتا ہے، اگر اس میں کوئی خاص بات ہے۔

مریسا نے تشکر آمیز انداز میں سر ہلایا اور ناک کے مختلف زاویوں سے لیے گئے پولورائڈ شاٹ دیکھنے لگی۔ یہ شاٹ ڈاکٹر مہتا کے کولیگ نے لیے تھے، جو خود بھی ENT سرجن تھا۔

کرٹ نے دو، تین کالز ملانے کے بعد اطلاع فراہم کی کہ ڈاکٹر مہتا، مرض کا شکار ہونے سے قبل بدقسمتی سے رہزنوں کے ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔

مریسا کو 95 فیصد یقین تھا کہ اسی قسم کا جواب ملے گا۔ کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ ایبولا کے حملے مکروہ انسانی منصوبہ بندی کا حصہ تھے۔ مریسا کے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ تاہم اس نے اوسان بحال رکھتے ہوئے سوال جاری رکھے اور ڈاکٹر مہتا کی باڈی دیکھنے کی خواہش ظاہر

کی۔

حفاظتی اقدامات کے ساتھ وہ کرٹ کے ہمراہ آٹوپسی روم میں داخل ہوئی۔ اس نے بغور لاش کا جائزہ لیا۔ مریسا کی نگاہ ران کی خون آلود خراش پر جم گئی۔ خون خشک ہوچکا تھا۔

''یقیناً تم نے اس کا نوٹس لیا ہوگا۔'' مریسا نے خراش کی جانب اشارہ کیا۔ وہ دائرہ نما خراش تھی۔ ویسی ہی خراش یا نشان، مریسا نے ڈاکٹر رشٹر کی ران پر دیکھا تھا اس نے تصور کیا کہ ہتھیار نما ویکسی نیشن گن کا دہانہ اور دائرہ نما ران کے نشان میں مطابقت تھی۔ وہ سوالیہ نظروں سے کرٹ کو دیکھ رہی تھی۔

''دوران علاج دیگر ڈاکٹرز نے یقیناً اس نشان کو نظرانداز نہیں کیا ہوگا۔ میں تو اب قصائی نما کام کررہا ہوں۔'' وہ بولا۔ ''تاہم میرے پاس تمام پولورائڈز موجود ہیں۔'' اس نے تصاویر نکال کر تاش کے پتوں کے مانند پھیلائیں۔

مریسا نے تصاویر دیکھیں۔ ''کیا میں یہ تصویر رکھ سکتی ہوں؟'' اس نے ران کے نشان والی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

کرٹ نے نگاہ اٹھائی۔ ''کیوں نہیں تم اور تصاویر بھی لے سکتی ہو، ہمارے پاس کافی تعداد ہے۔''

مریسا نے شکریے کے ساتھ مخصوص تصویر کے ساتھ ایک اور تصویر بھی جیب میں رکھ لی۔ دوسری تصویر اس نے تو خوامخواہ ہی اٹھائی تھی۔

کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ گن تو اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ مریسا نے مصافحہ کرکے روانگی کا اشارہ دیا۔

''میں یہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ...'' انٹرکام سسٹم نے اسے بات پوری کرنے کا موقع نہیں دیا۔ انٹرکام پر بتایا جارہا تھا کہ کرٹ کے لیے لائن پر کال ہے۔ وہ انٹرکام کی جانب متوجہ ہوگیا۔

کیا اتفاق تھا مریسا کا جسم سنسنا اٹھا۔ جتنا اس نے سنا وہ بہت تھا۔ ''ڈاکٹر مریسا بلوم سے بات مکمل کرکے آپ سے ملتا ہوں...'' دوسری آواز نورس کی تھی۔

آگے اس نے کیا سنا اور کیا کہا مریسا کو جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے فوراً راہ فرار اختیار کی جتنی دیر میں کرٹ کو مریسا کی غیر معمولی روانگی کا احساس ہوتا، وہ کمرے سے باہر نکل چکی تھی۔ پھرتی کے ساتھ اس نے حفاظتی اشیا سے جان چھڑائی اور جوگنگ کے انداز میں ایلیویٹر کی طرف چلی گئی۔ اسی اثنا میں عقب سے کرٹ کی حیرت زدہ پکار سنائی دی، مریسا نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ایلیویٹر کے ساتھ فائر ایگزٹ کی سیڑھیاں تھیں۔ مریسا کا دماغ برق رفتاری سے کام کررہا تھا۔ اگر نورس تیسری منزل پر تھا تو وہ وقت بچانے کے لیے سیڑھیوں کا انتخاب کرے گا۔

مریسا نے ڈاؤن بٹن پش کیا اور دس سیکنڈ بعد ایلیویٹر میں داخل ہوگئی۔ اندر ایک لیب ٹیکنیشن پہلے ہی موجود تھا۔ دروازہ ابھی کھلا ہوا تھا۔ وہ بے قراری سے بار بار بٹن دبا رہی تھی۔ نورس کسی بھی لمحے وارد ہونے والا تھا۔

''ایمرجنسی؟'' ٹیکنیشن نے مریسا کی بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے سوال کیا۔ مریسا نے سر ہلانے پر اکتفا کیا اور اسی وقت دروازہ بند ہوگیا۔ نیچے کی جانب سفر شروع ہوچکا تھا۔

تیسری منزل پر لفٹ رکی۔ چند افراد اندر آئے مریسا، چھوٹے قد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مزید پیچھے دب گئی۔ ایک سفید بالوں والے ٹیکنیشن سے اس نے کیفے ٹیریا کے بارے میں سوال کیا۔

اسپتال کا سامنے والا دروازہ استعمال کرنے میں خطرہ تھا۔ لنچ ٹائم تھا اور وہ کیفے ٹیریا کے ہجوم میں زیادہ محفوظ تھی۔

ایلیویٹر سے نکلتے ہی اس نے ٹیکنیشن کے بتائے ہوئے کوریڈور کا رخ کیا اور ذرا دیر میں کیفے ٹیریا میں جا گھسی۔ وہ رکی نہیں بلکہ راستہ بناتی ہوئی سیدھی کچن میں چلی گئی۔ وہاں موجود اسٹاف میں سے کئی ایک سوالیہ نگاہیں اٹھیں۔ تاہم کسی نے زبان نہیں کھولی۔

مریسا، عقبی دروازے سے میڈیسن ایونیو پر نکل آئی۔ اس نے فوراً ہی کیب نہیں پکڑی۔ نصف بلاک کا فاصلہ شمال کی جانب طے کیا پھر مشرق کی سمت مڑ گئی۔ تعاقب سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے پارک ایونیو سے کیب حاصل کی، منزل پر پہنچنے سے قبل ہی اس نے کیب چھوڑ دی اور ایک سپر مارکیٹ میں داخل ہوگئی۔ وہاں سے نکل کر اس نے تھرڈ ایونیو سے دوسری کیب ہائر کی اور ایسکس ہاؤس پہنچ گئی۔

اس کے کمرے کے باہر ڈونٹ ڈسٹرب کی تختی اسی طرح موجود تھی۔ اگرچہ وہ اعتماد محسوس کررہی تھی تاہم شکاگو میں ہونے والے خوف ناک حملے کی دہشت پوری طرح محو نہیں ہوئی تھی۔ وہ قدرے، ہچکچائی اور دروازہ کھول دیا۔

اسے تقریباً یقین تھا کہ اب تک کسی کو نہیں معلوم کہ وہ یہاں فرضی نام سے مقیم ہے۔ محتاط انداز میں اندر داخل ہو کر اس نے کرسی پھنسا کر دروازہ آدھا کھلا رہنے دیا۔

کمرے کی تلاشی لی بیڈ کے نیچے جھانکا۔ کپ بورڈ چیک کیا باتھ روم کا جائزہ لیا۔ ہر چیز جوں کی توں تھی۔ مطمئن ہونے کے بعد اس نے کرسی ہٹا کر دروازہ بند کر دیا۔ اسے لاک کر کے تمام بولٹ اور چین جگہ پر فکس کی اور بستر پر جا گری۔ کچھ دیر بعد اٹھ کر باتھ روم میں گئی۔ فریش ہو کر دوبارہ بستر پر گری تو دو منٹ میں وہ سو چکی تھی۔

☆☆☆

روم سروس کے ذریعے صبح اس نے بھرپور ناشتا کیا پھر خیالات میں گم ہوگئی۔ اب کیا کرنا چاہیے؟ ایک ہی بات ذہن میں آرہی تھی کہ رالف کے ذریعے وکیل سے رابطہ کر کے تمام پتے اس کے سامنے رکھ دے اور بتادے کہ دائیں بازو کے فزیشنز کا ایک گروپ پرائیویٹ کلینکس اور اسپتالوں میں ایبولا کے ذریعے حملے کر رہا ہے۔ ان کا مقصد ہے کہ HMO پر عوام کا اعتماد ختم ہو جائے۔ مریسا کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا تاہم امکان تھا کہ وکیل اسے کسی سیف ہاؤس میں وقتی طور پر منتقل کرنے کے بعد اس کی بیان کردہ تفصیلات کی روشنی میں چھان بین شروع کر دے۔ وکیل کے لیے یہ ایک بہت بڑا کیس تھا۔ اپنے وسائل اور تجربے کے بل بوتے پر وہ کچھ نہ کچھ نکال ہی لے گا۔

مریسا پہلے ہی بہت زیادہ خطرات مول لے چکی تھی، قسمت اچھی تھی کہ اب تک زندہ تھی۔ تاہم زندگی کے ناقابل فراموش واقعات و حادثات سے گزر کر وہ بہت کچھ سیکھ بھی چکی تھی۔ وکیل سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کرنے کے بعد مریسا پُرسکون ہوگئی۔

اس نے فون قریب کیا اور رالف کے آفس کا نمبر ملایا۔ اسے حیرت ہوئی جب سیکریٹری کے ذریعے اس کا رابطہ فوراً ہی رالف کے ساتھ کرا دیا گیا۔

''میں فکرمند تھا اسی لیے میں نے عملے کو تمہارے بارے میں خاص ہدایات دے رکھی تھیں تاکہ تمہیں رابطہ کرنے میں کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔'' رالف کی آواز آئی۔

''تم ایک بہت اچھے دوست ہو رالف۔'' مریسا نے کہا۔ رالف کی ہمدردی و فکرمندی نے اسے متاثر کیا تھا۔ اسے لگا کہ وہ کسی بچے کے مانند ہے اور رونے والی ہے۔ تاہم اس نے خود پر قابو پا لیا۔

''تم آج واپس آرہی ہو؟''

مریسا نے ایک گہری سانس لی اور ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ ''رالف، کیا آج وکیل سے بات ہو سکتی ہے؟'' اس کی آواز معذرت خواہانہ تھی۔ (؟)

''تم ٹھیک تو ہو؟'' رالف کی آواز میں تشویش تھی۔

''آئی ایم اوکے۔''

''نہیں، آج ممکن نہیں ہے۔ وہ شہر سے باہر ہے۔ کل کسی وقت اس کی آمد متوقع ہے۔'' اس نے بتایا۔

''بری خبر ہے۔'' مریسا نے منہ بنایا۔

''تم ٹھیک ہو نا؟ پلیز تم یہاں آجاؤ۔''

''رالف، میرے ساتھ خطرناک حادثات پیش آئے ہیں۔''

''کیسے حادثات؟''

''میں فون پر نہیں بتا سکتی۔'' مریسا نے کہا۔ اسے علم تھا کہ ایسی کسی کوشش کے دوران میں وہ بچوں کی طرح رو پڑے گی۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے... تم فوراً یہاں آجاؤ۔'' رالف نے مشورہ دیا بلکہ زور دے کر کہا۔

''ہاں، شاید یہی ٹھیک ہے۔''

''شاید نہیں بلکہ یقیناً تمہیں یہاں آجانا چاہیے۔''

مریسا اثبات میں جواب دینے ہی جا رہی تھی کہ دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔ مریسا کا دل زور سے دھڑکا۔ ایک بار پھر دستک ہوئی۔

''مریسا کہاں ہو؟'' رالف کی مضطرب آواز آئی۔

''ایک منٹ، کوئی دروازے پر ہے۔'' وہ بولی۔

''لائن پر رہنا۔'' مریسا نے ریسیور سائڈ پر رکھا اور دھڑ دھڑ کرتے دل کے ساتھ دروازے کی طرف گئی۔

''کون ہے؟''

''مس کینڈرک کے لیے ڈلیوری ہے۔'' جواب ملا۔

مریسا نے دروازہ کھولا لیکن چین جگہ پر رہنے دی۔ دروازے میں معمولی خلا پیدا ہوا۔ مریسا نے بیل مین کو کھڑے دیکھا جس کے ہاتھ میں سفید کاغذ میں ملفوف ایک بڑا پیکٹ تھا۔

''ایک منٹ رکو۔'' وہ یہ کہہ کر تیزی سے پلٹی اور فون اٹھا کر رالف کو آگاہ کیا۔ ''میں دوبارہ فون کرتی ہوں۔''

''وعدہ؟''

''ہاں... وعدہ۔''

مریسا واپس ہوئی۔ نیم دروازے سے باہر کا جائزہ

لیا۔ بیل مین مخالف دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

کون ''مس کینڈرک'' کے نام پر یہاں کیا بھیج سکتا ہے؟ مریسا کی دوست ''ویسٹ کوسٹ'' میں آرام سے رہ رہی تھی۔

''کیا ہے اس میں؟''

''پھول۔'' بیل مین نے جواب دیا۔

مریسا پُرسوچ انداز میں پھر فون کی طرف گئی اور ڈیسک کو فون ملا کر تصدیق چاہی۔ جواب مثبت تھا۔ مریسا نے کچھ اطمینان محسوس کیا اور فون بند کر دیا۔ وہ ایک بار پھر دروازے پر تھی۔

''میں معذرت خواہ ہوں۔'' وہ بولی۔ ''تم خیال مت کرنا پیکٹ دروازے کے پاس چھوڑ دو میں چند منٹ میں لے لوں گی۔''

''نو پرابلم میڈم۔'' اس نے پیکٹ رکھا، ہیٹ کو چھوا اور روانہ ہو گیا۔

مریسا نے چین ہٹا کر دائیں بائیں جھانکا اور پیکٹ اٹھا کر دروازہ اچھی طرح لاک کر دیا۔ اس نے کاغذ پھاڑ کر پیکٹ کھولا موسم بہار کے خوش نما پھول نہایت خوب صورت انداز میں سجے ہوئے تھے۔

پھولوں کے ساتھ ایک لفافہ رکھا تھا۔ جس پر اس کی سہیلی کا نام ''لزا کینڈرک'' لکھا تھا۔

مریسا نے لفافے میں سے ایک تہ شدہ کارڈ برآمد کیا، کارڈ پر ''مریسا بلوم'' لکھا تھا۔

مریسا کے دل نے جیسے ایک دھڑکن مس کر دی۔ اس نے سانس روک کر کارڈ پڑھنا شروع کیا۔

''ڈیئر ڈاکٹر مریسا!

شاندار کارکردگی پر مبارک باد قبول کریں۔ بلاشبہ ہم سب متاثر ہوئے ہیں یقیناً ہم پھر آئیں گے لیکن یہ آپ کے معقول رویے پر منحصر ہے۔ ظاہر ہے ہمیں ہر بات کا علم ہے لیکن ہم آپ کو اکیلا چھوڑ دیں گے، بھول جائیں گے اگر آپ وہ طبی آلہ واپس کر دیں جو آپ نے شاید عاریتاً لیا ہے۔

خیر خواہ''

مریسا کے ہاتھ واضح طور پر کانپ رہے تھے۔ خوف کے اندھیرے نے اس کے وجود کو نگلنا شروع کیا۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے وہ خوش رنگ پھول نہیں، زہریلے بچھو ہوں۔

معاً اس کا سکتہ ٹوٹ گیا افراتفری اور بدحواسی میں اس نے سامان سمیٹنا شروع کیا۔ الماری کی درازیں کھول کر اس نے چند چیزیں نکالیں اشیا اٹھاتے اٹھاتے معاً وہ ایک بار پھر جم سی گئی۔ وہ ہاتھوں میں موجود ذاتی اشیا کو گھور رہی تھی جن کو اس نے وہاں نہیں رکھا تھا۔

اس کا ابتدائی اندازہ غلط تھا کہ کمرے میں کوئی نہیں آیا تھا۔ وہ خطرناک لوگ پہلے ہی اس کے کمرے کی تلاشی لے چکے تھے۔

''اوہ گاڈ۔'' مریسا نے سر تھام لیا۔ اس کا جسم لرز رہا تھا۔ نکلو یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔ وہ باتھ روم کی طرف بھاگی۔ وہ کاسمیٹکس کو اندھا دھند بیگ میں ٹھونس رہی تھی۔ اچانک اس کے خوف زدہ ذہن نے اشارہ دیا، وہ ٹھٹک گئی۔ کارڈ کی تحریر کے مطابق وہ لوگ ابھی تک ویکسی نیشن گن سے محروم تھے یعنی... یعنی ٹیڈ ملوث نہیں تھا۔ نہ ٹیڈ کو اور نہ ہی کسی اور کو پتا تھا کہ وہ فرضی نام سے ایسکس ہاؤس میں ٹھہری ہوئی ہے۔ ایک ہی راستہ تھا کہ وہ شکاگو ائرپورٹ سے ہی اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔

جتنی جلد ممکن ہو، مریسا کو ایسکس ہاؤس سے نکل جانا چاہیے۔ اس نے بدحواسی میں جو کچھ جمع کیا تھا، اسے سوٹ کیس میں بھر دیا لیکن سوٹ کیس نے اس بے تکی پیکنگ پر بند ہونے سے انکار کر دیا۔ وہ سوٹ کیس پر بیٹھ کر اسے بند کرنے کے لیے زور لگانے لگی۔

مریسا کی بہکی نظر پھولوں پر پڑی۔ دفعتاً ذہن میں جھماکا ہوا۔

''آہ... وہ اسے دہشت زدہ کر کے باہر نکالنا چاہتے تھے باہر نکلتے ہی وہ سیدھی ان کے شکنجے میں جا پھنستی جو وہ چاہتے تھے۔ مریسا بالکل وہی کر رہی تھی۔

اس نے سوٹ کیس چھوڑ دیا اور بستر پر بیٹھ کر ذہن کو پُرسکون کرنے کی سعی شروع کر دی۔ اس وقت اس کا سب سے قیمتی اثاثہ اور ہتھیار اس کا ذہن تھا اور وہ اپنے واحد ہتھیار کو بار بار کند کر رہی تھی۔ تلاشی کے دوران انہیں کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ مریسا کو ایک فی صد شک نہیں تھا کہ وہ اب اسے بدحواسی کے عالم میں باہر نکالنا چاہتے تھے۔ وہ پھولوں کو گھور رہی تھی۔ بدمعاش تلکوں کی چال وہ انہی پر الٹا دے گی۔

پھولوں نے جو دہشت پھیلائی تھی وہ ان کے لیے اس سے کہیں زیادہ افراتفری پھیلانے گی۔ مریسا نے PAC کے آفیسرز کی فہرست نکالی، وہ یقین کرنا چاہتی تھی کہ

سیکریٹری جیک کراس نیو یارک کا رہائشی ہے۔

426 ایسٹ 84 اسٹریٹ۔ مریسا نے پتا یاد کرلیا۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ جیک کے گھر ایک غیر اعلانیہ وزٹ کرے گی۔ ممکن ہے کہ گروپ کے تمام ڈاکٹرز کو اصل کہانی کا علم نہ ہو۔ اس بات پر یقین کرنا مشکل تھا کہ مخصوص گروپ میں شامل تمام ڈاکٹرز ایبولا کی خون آشامی سے خوش ہوں یا اس معاملے میں سب ہم خیال ہوں۔

دوسرے یہ کہ مریسا کی یہ ناقابلِ یقین حرکت کسی کے سان و گمان میں نہ ہوگی اور جو کھلبلی مچے گی، اس کے تصور سے ہی وہ بے اختیار مسکرا اٹھی۔

جو منصوبہ اس کے ذہن میں تشکیل پا رہا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ پہلے یہاں سے بحفاظت نکلنے کا بندوبست کرے۔

مریسا اٹھی اور منیجر کو فون ملایا۔ اس نے برہم آواز میں شکایت کی کہ فرنٹ آفس ڈیسک سے اس کے کمرے کا نمبر اس کے سابقہ بوائے فرینڈ کو فراہم کیا گیا جو اسے پہلے بھی پریشان کرتا رہا ہے۔

''یہ ناممکن ہے۔'' منیجر بوکھلا سا گیا۔ ''یہ ہماری پالیسی کے خلاف ہے۔''

''مجھے نہیں پتا، نہ میں بحث کے موڈ میں ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہو چکا ہے۔ وہ ایک پُرتشدد شخص ہے۔ میرے لیے خوامخواہ کی پریشانی کھڑی ہوگئی ہے اور میں خوف زدہ ہوں۔'' مریسا نے آواز مزید بلند کردی۔

''میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' منیجر کی آواز میں پریشانی تھی۔

''کس نے یہ حرکت کی ہے؟ یہ تمہارا مسئلہ ہے فی الوقت تم مجھے دوسرا کمرا فراہم کرو۔'' مریسا کی آواز میں درشتگی تھی۔

''میں خود ہینڈل کرتا ہوں، آپ پریشان نہ ہوں۔''

''ایک اور بات۔'' مریسا کی برہمی برقرار تھی۔ ''اس کے بال بھورے ہیں، آنکھیں نیلی ہیں دیکھنے میں ایتھلیٹ لگتا ہے۔ ناک اونچی ہے اگر وہ نظر آئے تو اپنے اسٹاف کو الرٹ رکھو۔''

''آپ بے فکر ہوجائیں۔'' منیجر نے جواب دیا۔

☆☆☆

ایل نے آخری کش لے کر سگریٹ کا ٹوٹا ایک جانب اچھال دیا۔ کیب میں جھانکا جہاں جارج پُرسکون انداز میں بیٹھا تھا۔ انتظار کرنے میں جارج کو کوئی تکلیف نہیں تھی۔

ایل نے سڑک کے پار ایسکس ہاؤس کو دیکھا۔ جیک اندر لابی میں تھا۔ ایل کو یقین تھا کہ لڑکی، جیک کی نظروں میں آئے بغیر ہوٹل کا عقبی راستہ استعمال نہیں کرسکتی۔

پھول ملتے ہی لڑکی اڑتی ہوئی ہوٹل سے نکلے گی۔ اس بارے میں ایل حد سے زیادہ پُریقین تھا اور اسے ہونا بھی چاہیے تھا لیکن اب اس کی سوچ میں حیرت کا عنصر در آیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ''لڑکی سپر اسمارٹ ہے یا سپر اسٹوپڈ۔''

ایل نے گھڑی دیکھی اور دوسری سگریٹ نکال کر کیب میں جھانکا۔ جارج کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ ایل نے مسکرانے کی کوشش کی تاہم اپنے تناؤ کو پوشیدہ رکھنے میں ناکام رہا۔ مزید برآں جارج کا مخصوص سکون، ایل کو اور ہیجان میں مبتلا کررہا تھا۔

تین واپس ملنے تک وہ صرف لڑکی کا تعاقب کرسکتے تھے۔ ان کی توقعات کے قطعی برعکس وہ ابھی تک ہوٹل میں تھی۔

''کیا وقت ہوگیا؟'' ایل سگریٹ پر سگریٹ سلگا رہا تھا۔

اچانک رند بلانوش، بدمستوں کا ایک ٹولہ جھومتا جھامتا قہقہہ بار، خرمستیوں میں مگن ہوٹل سے نمودار ہوا۔ ٹولے کے اراکین نے تیز رنگ کے سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ جن پر ان کے ناموں کے ٹیگ نمایاں تھے۔ آنکھوں پر پلاسٹک سن وائزر موجود تھے۔ ناموں کے ٹیگ کے ساتھ سائنو کا لوگو بنا ہوا تھا غالباً یہ بادہ نوش گروپ چھٹی پر تھا۔

ہوٹل کے قریب لیموزین گاڑیوں کی ایک قطار تھی۔ ڈور مین کے اشارے پر ٹولہ گاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔ گاڑیوں کے دروازے کھلنے لگے۔

ایل نے بے چینی سے جارج کے شانے پر ہاتھ مارا۔ وہ ہوٹل کے ریوالونگ ڈور کی جانب اشارہ کررہا تھا۔ ویسا ہی ایک اور لیکن زیادہ نفوس کا ٹولہ ہاؤ ہو کرتا باہر آرہا تھا۔ بڑے ٹولے کے دو افراد نے ایک خاتون کو، جو ویسے ہی حلیے میں تھی سنبھالا ہوا تھا۔ موصوفہ نے یقیناً اوقات سے زیادہ چڑھا رکھی تھی۔

جارج آنکھیں سکیڑ کر خاتون کو تاڑ رہا تھا۔ ذرا دیر میں وہ بھی دیگر افراد کے ساتھ ایک لیموزین میں غائب ہوگئی۔

جارج، ایل کی طرف مڑا۔ ''کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اس کے بال مختلف رنگت کے تھے۔ یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔''

''میں بھی پہچان نہیں سکا۔'' ایل نے جھلا کر ایک اور سگریٹ سلگائی تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد ایل دوڑ کر کیب میں گھس گیا۔

''تعاقب کرو دوسری گاڑی یہی رُخ کر دیکھے گی اگر وہ باہر نکلتی ہے۔'' اس نے حکم جاری کیا۔

☆☆☆

مریسا نے لیموزین میں سے عقب میں جھانکا۔ وہ ہوٹل کے داخلی دروازے کو تک رہی تھی۔ اس گروپ میں شامل ہونے کے لیے منیجر نے اس کی مدد کی تھی۔ کہانی وہی نامعقول ایکس بوائے فرینڈ کی تھی۔ آنکھ کے کونے سے اس نے کیب پارکنگ کی جانب سے ایک آدمی کو نکلتے دیکھا جو دوڑتا ہوا وہاں کھڑی کیب میں بیٹھ گیا۔ اسی اثنا میں ایک بس نے درمیان میں آکر منظر چھپالیا۔

مریسا سیدھی ہوکر بیٹھ گئی اسے یقین تھا کہ تعاقب شروع ہو چکا ہے۔ تاہم وہ پُرسکون تھی پیچھا کرنے والے قریباً ایک بلاک پیچھے تھے۔ جیسے ہی لیموزین نے ففتھ ایونیو کا موڑ کاٹا، مریسا نے شور مچادیا۔ وہ ڈرائیور کو رکنے کے لیے کہہ رہی تھی۔

مریسا نے منہ بنایا ہوا تھا جیسے قے کرنے والی ہے۔ ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ رکتے رکتے وہ دروازہ کھول کر کود گئی اور ڈرائیور کو جانے کا اشارہ کیا۔ اس نے کندھے اچکا کر لیموزین آگے بڑھادی۔

مریسا سامنے موجود بڑے سے بک اسٹور میں داخل ہوگئی۔ وہ زیادہ اندر نہیں گئی تھی اور ایک کتاب اٹھا کر شیلف کی آڑ سے شیشے کے باہر دیکھنے لگی۔ اس نے تعاقب کرنے والی کیب کو تیزی سے موڑ کاٹ کر لیموزین کے پیچھے جاتے دیکھا۔ عقبی نشست پر وہ بھورے سر کی جھلک دیکھنے میں کامیاب ہوگئی۔

☆☆☆

وہ مکان نیویارک کے لگژری ہاؤس سے مختلف تھا۔ کسی قدیم طرز کے قلعے کے مانند۔ اس کی تنگ کھڑکیوں میں بل کھاتی ہوئی آہنی گرلز نصب تھیں۔ سامنے کے دروازے کو آہنی گیٹ کے ذریعے تحفظ دیا گیا تھا۔ قلعہ نما، کئی منزل بلند تھا مریسا سڑک کی دوسری جانب سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ اپنے حیران کن فیصلے کے مضمرات کا تخمینہ بھی جوڑ رہی تھی۔

نہایت کم امکان تھا کہ ڈاکٹر کراس اپنے گھر نما اسپتال یا اسپتال نما گھر میں اس کے لیے خطرناک ثابت ہوگا۔ مریسا نے اطراف کا جائزہ لیا اور سڑک پار کی۔ رک کر پھر دائیں بائیں دیکھا پھر سیڑھیاں طے کر کے گیٹ تک پہنچ گئی۔ گیٹ کھلا تھا اس کے عقب میں چوبی دروازہ تھا۔

مریسا نے گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ ایک منٹ کے انتظار کے بعد اس نے دوبارہ بٹن کو پش کیا۔

''یس؟'' دروازہ اچانک کھلا۔ ایک خاتون سوالیہ نظروں سے مریسا کو دیکھ رہی تھی۔

''میں ڈاکٹر کراس سے ملنا چاہتی ہوں۔'' مریسا کی آواز مستحکم اور لہجہ بااختیار تھا۔

''آپ نے پہلے سے وقت لیا ہے؟''

''نہیں۔'' مریسا نے جواب دیا۔ ''ڈاکٹر کو بتاؤ کہ میں یہاں ایمرجنسی میں PAC کے معاملے میں بات کرنے آئی ہوں۔ اتنا کافی ہے۔''

خاتون کے چہرے پر الجھن ہویدا تھی۔ مریسا کے انداز کو دیکھ کر وہ نام پوچھنا بھی بھول گئی۔

چند منٹ بعد دروازہ کھلا۔ خاتون نے مریسا کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ مریسا، اس کی رہنمائی میں آگے بڑھتی رہی اور ایک لائبریری تک جا پہنچی۔ خاتون نے اسے لائبریری میں انتظار کرنے کے لیے کہا اور خود باہر چلی گئی۔ مریسا، لائبریری کا جائزہ لینے لگی۔ وہ حیرت انگیز طور پر پُراعتماد تھی۔

''انتظار کی زحمت کے لیے معذرت خواہ ہوں۔'' ایک مسکین سی آواز نے مریسا کو متوجہ کیا۔

مریسا نے پلٹ کر ڈاکٹر کو دیکھا۔ ڈاکٹر کی شخصیت، تاثرات اور آنکھیں مریسا کے ذہن میں جو تصویر بنا رہی تھیں، وہ بالکل مختلف تھی۔ وہ کسی رخ سے PAC کی گندگی کا حصہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔

''معذرت مجھے کرنی چاہیے۔'' مریسا نے کہا۔ ''میں نے غلط وقت پر آپ کو پریشان کیا۔'' مریسا نے شائستگی اختیار کی۔

''کوئی بات نہیں، بیٹھ جاؤ۔ میں کس کام آسکتا ہوں؟'' ڈاکٹر کراس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

مریسا نے آگے جھک کر ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔

''میرا نام مریسا ہے۔ ڈاکٹر مریسا بلوم۔'' مریسا نے بغور ڈاکٹر کو دیکھا۔ تاہم اسے ڈاکٹر کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی یا تو وہ مریسا کے نام سے ہی بے خبر تھا یا پھر بہت بڑا اداکار تھا۔

مریسا نے تعارف کو مزید آگے بڑھایا۔ ''میں سی ڈی

سی میں EIS آفیسر ہوں۔'' مریسا کی نگاہیں بدستور ڈاکٹر کے چہرے پر تھیں۔ مریسا نے اس کی آنکھوں کو سکڑتے ہوئے دیکھا۔

''میری ملازمہ نے بتایا تھا کہ تم PAC کے بارے میں بات کرنے آئی ہو۔'' ڈاکٹر کی آواز کا ابتدائی نرم تاثر بدل گیا۔

''ٹھیک بتایا تھا۔'' مریسا بولی۔ ''میں پہلے یہ جاننا چاہوں گی کہ آپ کے علم میں ایسی سرگرمیاں ہیں جو سی ڈی سی کے لیے تشویش کا باعث بن رہی ہوں؟''

''کس کی سرگرمیاں؟''

''PAC کی۔''

اس مرتبہ ڈاکٹر کراس کے جبڑے بھنچ گئے۔ اس نے ایک طویل سانس کھینچ کر خود پر قابو پایا اور بولنا شروع کیا۔ ''PAC، امریکن میڈیسن کی ساکھ کو بچانے کی کوشش کر رہی ہے جس کو بعض عوامل سے خطرہ ہے۔ PAC کا مقصد ..... شروع سے یہی ہے۔''

''یہ ایک نوبل کاز ہے۔'' مریسا نے اعتراف کیا۔ ''لیکن PAC یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے کن خطوط پر کام کر رہی ہے یا کیا ذرائع استعمال کر رہی ہے؟''

''PAC، سمجھ دار قانون سازی کرنے والوں کو سپورٹ کر رہی ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''ڈاکٹر، بدقسمتی سے آپ کی آدھی بات ٹھیک لگتی ہے لیکن PAC اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کر رہی ہے جس پر سی ڈی سی کو تشویش ہے اور یہ تشویش بجا ہے۔'' مریسا نے پیش قدمی کی۔ ''میں درحقیقت آپ کی شخصیت سے متاثر ہوں اور یہ بات کہنا چاہتی تھی لیکن اس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ PAC غیر قانونی اور خطرناک ذرائع کا سہارا لے رہی ہے۔''

''میرے خیال میں مزید گفتگو کی گنجائش نہیں ہے۔ میں معذرت خواہ ہوں۔'' ڈاکٹر کھڑا ہو گیا۔

''مجھے یقین ہے کہ مختلف مقامات پر بار بار ایبولا جیسے ہولناک وائرس سے جو ہلاکتیں ہو رہی ہیں، اس کی ذمے دار PAC ہے اور آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ PAC کے ذمے داران کے لیے یہ کتنی تباہ کن ثابت ہو گی۔'' مریسا نے لہجہ قدرے سخت کر لیا۔ وہ خود بھی کھڑی ہو گئی۔

''بکواس، ناقابلِ یقین۔'' ڈاکٹر ٹھٹک گیا۔

''میرے پاس تمام کاغذات ہیں۔ میں PAC کے تمام آفیسرز کو جانتی ہوں۔ گرے من، جارجیا میں پروفیشنل لیب سے ثبوت حاصل کر چکی ہوں کہ وہ لوگ ہیپا فلٹر سسٹم خرید چکے ہیں جو خطرناک وائرس پر تجربات کرنے کے لیے حفاظت کے نقطۂ نظر سے خاص قسم کی لیب میں استعمال ہوتا ہے۔ ایسا سسٹم صرف سی ڈی سی کے پاس ہے۔ پروفیشنل لیب میں اس کی موجودگی کا کیا مطلب ہے؟ میرے پاس وہ ویکسی نیشن گن بھی ہے جس کے ذریعے انڈیکس کیسز میں ایبولا کو متعارف کروایا جاتا ہے۔'' مریسا نے آخری کیل بھی ٹھونک دی۔

ڈاکٹر کے چہرے پر پہلے بوکھلاہٹ نظر آئی پھر اس کی جگہ غصے نے لے لی۔ ''گیٹ آؤٹ۔'' وہ برافروختہ نظر آنے لگا۔

''بخوشی۔'' مریسا نے جواب دیا۔ ''تاہم مجھے افسوس ہے کہ آپ جیسی معقول شخصیت غالباً انجانے میں اس چکر میں الجھ گئی ہے کاش آپ بات کو سمجھ لیں۔'' مریسا چل پڑی۔

ڈاکٹر اپنی جگہ کھڑا تھا۔ مریسا کچھ دور جا کر رک گئی۔ ''آپ کا شکریہ آپ نے ملاقات کے لیے وقت دیا۔'' مریسا نے اظہارِ تشکر کیا۔ ''آپ کو ڈسٹرب کرنے پر میں معذرت خواہ ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ PAC کے ان چند آفیسرز میں سے ایک ہیں جو اس ہارر موو ی کا اینڈ کرنے میں اپنا کردار ادا کریں گے۔ مجھے خوشی ہو گی شاید آپ گواہ بن کر اس بھیانک ڈرامے کو روک دیں۔ ایسا ہو سکتا ہے مجھے امید ہے۔ گڈ ڈے، ڈاکٹر کراس۔''

مریسا تیز قدموں کے ساتھ واپس جا رہی تھی اگرچہ اس کا دل پُرشور انداز میں دھڑک رہا تھا، ذہن کہہ رہا تھا۔ ''بھاگو۔''

اگر اس کا اندازہ غلط اور ڈاکٹر یا کسی اور آدمی نے اسے دبوچ لیا تو اس کی لاش اس قلعہ نما اقامت گاہ میں دفن ہو گی۔

عقب میں کوئی آہٹ نہیں تھی۔ مریسا نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر ہکا بکا کھڑا ہے۔ ملازمہ کی ہمراہی میں وہ باہر نکل گئی۔ سڑک پار کرتے ہی اس نے دوڑ لگائی اور ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئی۔

☆☆☆

کچھ دیر بعد ڈاکٹر کراس کے حواس بحال ہوئے۔ اس کے بدترین خواب کی تعبیر کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ اس کی گن دوسری منزل پر موجود تھی۔ اسے خود کو ہلاک کر لینا چاہیے یا پھر وکیل سے بات کرے۔ گواہ بننے کے بعد کتنی

بچت ہے؟ بدحواسی نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لی تھی بالآخر وہ تھکے تھکے قدموں سے چل کر ڈیسک تک پہنچا اور دروازہ کھول کر ایڈریس بُک نکالی۔ وہ اٹلانٹا کال کر رہا تھا۔

دوسری جانب سے جوشوا جیکسن کی آواز آئی۔ ''کیا بات ہے ڈاکٹر جیک کراس؟''

ڈاکٹر نے مریسا کی آمد کا احوال بتایا۔ ''جوشوا، تم نے وعدہ کیا تھا کہ لاس اینجلس کے بعد ایبولا سامنے نہیں آئے گا لیکن ایسا نہیں ہوا پھر تم نے کہا کہ دوسری بار یہ حادثاتی طور پر ہوا ہے لیکن یہ بھیانک سلسلہ مزید آگے بڑھ گیا ہے۔ PAC گلے گلے اس دلدل میں اُتر گئی ہے یہ.....''

''آرام سے ڈاکٹر آرام سے ... پُرسکون رہو۔'' جوشوا کی آواز آئی۔

''کون ہے یہ مریسا بلوم؟''

''کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''بہت خوب بتایا تو وہ یہاں آئی تھی اور ایبولا کی وباؤں کی ذمے داری PAC کے سر پر تھوپ گئی ہے۔''

''وہ جھوٹ بول رہی ہے۔''

''اس کے پاس ثبوت ہیں۔'' ڈاکٹر کراس نے کہا۔

''کیا وہ تمہارے گھر پر ہے؟'' جوشوا نے سوال کیا۔

''اتنی احمق نہیں ہے، وہ جا چکی ہے۔ آخر وہ ہے کون؟''

''سی ڈی سی کی ایپی ڈیمیالوجسٹ ہے۔ خوش قسمت ہے، ورنہ ہیبر لنگ اب تک اس سے جان چھڑا چکا ہوتا۔'' جوشوا نے بتایا۔

''صورتِ حال انتہائی خراب ہو چکی ہے۔ میں تمہیں یاد دلانا چاہوں گا کہ میں اس پروجیکٹ کے ہی خلاف تھا جبکہ بات اس وقت تک صرف انفلوئنزا وائرس تک تھی۔'' ڈاکٹر کراس کی آواز میں ناگواری کے ساتھ پریشانی تھی۔

''وہ تم سے کیا چاہتی تھی؟'' جوشوا جیکسن نے سوال کیا۔

''کافی پینے آئی تھی۔'' ڈاکٹر کراس نے بھڑک اٹھا۔

''پلیز ڈاکٹر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم پُرسکون رہو۔''

''میں حیران ہوں کہ وہ یہاں پہنچی کیسے؟ اس سے بڑھ کر اس کے پاس اتنی معلومات کہاں سے آئیں؟''

''بات کریں گے اس پر تم یہ بتاؤ، وہ تم سے کیا چاہ رہی تھی؟''

''وہ مجھے ڈرا رہی تھی اور اس نے اچھا خاصا ہوم ورک کر رکھا ہے۔ اس کے پاس PAC کے تمام آفیسرز کے نام اور پتے ہیں نیز وہ باری باری سب کے پاس جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔''

''کیا اس نے بتایا تھا کہ اب وہ کس طرف جائے گی؟''

''لگتا ہے کہ تم لوگ شروع سے اسے احمق خیال کر رہے ہو۔ جب ہی وہ اچھی خاصی مصیبت بن چکی ہے۔ بھلا وہ مجھے کیوں بتائے گی کہ اب وہ کس جانب روانہ ہو رہی ہے؟''

''تم کیوں اتنے پریشان ہو رہے ہو؟''

''بات پریشانی سے بڑھ کر ہے تم جانتے ہو کہ سان فرانسسکو کا ڈاکٹر نائی مین، مجھ سے زیادہ اس پروجیکٹ کے خلاف تھا۔ ذرا سوچو کہ اگر اس نے نائی مین سے ملاقات کر لی تو کیا ہوگا؟'' ڈاکٹر کراس نے حقیقی خطرے کا اظہار کیا۔

''گھبرانے کی بات نہیں ہے۔'' جوشوا نے پھر دلاسا دیا۔ ''میں تمہاری پریشانی سمجھ سکتا ہوں۔ اگر بات بگڑ بھی گئی ہے تو ہیبر لنگ وائرل لیب کو صاف کر دے گا۔ کسی ناگہانی کی صورت میں وہاں صرف کم خطرناک وائرس اور بیکٹیریا اسٹڈی کی لیب ہی دریافت ہو سکے گی۔ اسی دوران میں اسے لڑکی کے عزائم کی اطلاع کر دیتا ہوں۔ وہ کچھ نہ کچھ کر لے گا... ہم اسے ڈاکٹر نائی مین تک نہیں پہنچنے دیں گے۔''

''جوشوا، وہ لڑکی فتنہ ہے۔ وہ خود ایک وائرس ہے۔ تم کیا سمجھ رہے ہو کہ ایک نازک سی لڑکی تن تنہا اتنا سب کچھ کر سکتی ہے بغیر کسی پروٹیکشن اور سہارے کے؟''

''تمہیں شاید پتا نہیں ہے کہ وہ تنہا ہے۔ پولیس اسے تلاش کر رہی ہے اور سی ڈی سی بھی اس کی ہمنوا نہیں ہے۔''

''میں سمجھا نہیں؟'' ڈاکٹر کراس نے تعجب کا اظہار کیا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''لمبی بات ہو جائے گی پھر بتاؤں گا میری بات کا یقین کرو۔ ہم اسے جلد پکڑ لیں گے وہ کوئی فتنہ نہیں ہے بس قسمت کی دھنی ہے اور کچھ جنونی ہے بہرحال ہم سے بھی کچھ غلطیاں سرزد ہوئی ہیں اب تم آرام کرو۔ میں رابطہ کروں گا۔'' جوشوا نے بات ختم کرنے کا اشارہ دیا۔

ڈاکٹر کراس نے فون رکھ دیا۔ اس کا اعصابی تناؤ کچھ کم ہو گیا تھا۔ تاہم اس نے فیصلہ کیا کہ وہ صبح اپنے اٹارنی کو فون

کرے گا۔ اسے معلومات رکھنی ضروری تھی کہ وعدہ معاف گواہ بننے کی صورت میں کیا فوائد یا تحفظ حاصل ہوتا ہے۔

☆☆☆

مریسا کی کیب لانگ آئی لینڈ ایکسپریس وے پر تھی۔ وہ پرنٹ آؤٹ میں سے PAC کے آفیسرز کی فہرست نکال کر پڑھ رہی تھی۔ اس کا پہلا وزٹ کامیاب رہا تھا۔ اگرچہ اسے مکمل آگاہی نہیں تھی کہ وہاں سے نکلنے کے بعد کیا ہلچل مچی تاہم اس کے خیال میں اس نے اپنا کام صفائی سے کیا تھا۔ یہ بھی اتفاق ہی رہا کہ پہلی مڈبھیڑ ہی شریف النفس ڈاکٹر سے ہوئی تھی۔

فہرست کو دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اس کے پاس فیصلہ کرنے کے لیے کوئی منطق نہیں ہے کہ اب اسے کس سے ملنا چاہیے؟ اسے قریب ترین ڈاکٹر کی طرف جانا چاہیے تھا۔ یہ آسان تھا لیکن اس میں خطرہ بھی تھا کیونکہ اس کے پیچھے جو خطرناک افراد لگے ہوئے تھے، وہ بھی یہی توقع کررہے ہوں گے کہ اس کا اگلا وزٹ قریبی ڈاکٹر کا مسکن ہی ہونا چاہیے۔ مریسا نے دھوکا دینے کے لیے بعید ترین ڈاکٹر کے نام پر نشان لگایا۔ سان فرانسسکو کا ڈاکٹر سنکلیئر نائی مین۔

اس نے کیب ڈرائیور کو تبدیل شدہ پروگرام سے آگاہ کیا اور کینیڈی ائرپورٹ چلنے کے لیے کہا۔

ائرپورٹ پر اس نے کیش کی صورت میں ادائیگی کی، فرضی نام استعمال کیا اور نیوز اسٹینڈ سے اخبار خرید لیا۔

صورتِ حال ہی کچھ ایسی بن گئی تھی کہ وہ رالف کو ایسکس ہاؤس سے دوبارہ فون نہیں کرسکی تھی۔ مریسا نے ائرپورٹ سے اس کا نمبر ملایا۔

''میں تمہیں آخری بار معاف کررہا ہوں۔'' رالف کی آواز میں تکدر تھا۔ ''وہ بھی اس صورت میں کہ تم فوراً واپس آجاؤ۔''

مریسا کو واقعی افسوس تھا۔ اس نے احتیاط سے الفاظ کا چناؤ کیا۔ ''میری خواہش ہے کہ میں آج تم سے مل سکوں لیکن...''

''مجھے مت بتانا کہ تم نہیں آسکتیں۔'' رالف کی آواز سے پتا نہیں چلا کہ وہ ناراض ہے یا مایوس۔ ''کل دوپہر کو تمہیں اٹارنی کوئن لن سے ملنا ہے، میں نے انتظام کردیا ہے...''

''رالف، پلیز اس ملاقات کو ملتوی کرنا پڑے گا۔ نہایت اہم معاملہ درپیش ہے اور مجھے ہر صورت سان

بی پڑوسن! کیا مجھے دس انڈے اور آدھا کلو گوشت ادھار مل سکتا ہے

فرانسسکو جانا ہے۔ میں اس وقت یہاں سے تمہیں تفصیل نہیں بتاسکتی۔ بات طویل ہوجائے گی۔ مجھے افسوس ہے کہ اس روز میں مجبور تھی، تمہیں دوبارہ فون نہیں کرسکی۔ مجھے یقین ہے کہ تم معاف کردو گے۔''

''مریسا، آخر کیا تماشا ہورہا ہے؟ تم کہاں کہاں ماری پھررہی ہو؟'' رالف کی آواز میں فرسٹریشن نمایاں ہوگیا۔

''رالف مجھے تمہاری پریشانی کا احساس ہے۔ تمہارے احساسات مجھے سہارا دیتے ہیں لیکن سب کچھ انڈر کنٹرول ہے۔ میں جو کچھ کررہی ہوں، وہ اٹارنی میک کوئن لن...'' اچانک وہ رک گئی۔ میک کوئن لن؟ اسے یہ نام شناسا سا لگا تھا۔ اس نے دماغ پر زور دیا لیکن ناکام رہی۔ اس نے یہ نام کہاں سنا تھا یا اس کا وہم ہے۔

''کیا ہوا؟'' رالف نے استفسار کیا۔

''میں کہہ رہی تھی کہ جو کچھ میں کررہی ہوں، وہ اٹارنی کے کام کے لیے از حد مددگار ثابت ہوگا، مجھ پر بھروسا کرو۔''

''میرا دماغ چکرا گیا ہے، سمجھ نہیں آتا کیا کہوں، ہر مرتبہ تم آتے آتے غائب ہوجاتی ہو یا بات ادھوری چھوڑ دیتی ہو۔'' رالف کی آواز میں مایوسی جھلک رہی تھی۔

''مجھے جہاز میں سوار ہونا ہے۔ میں ہر ممکن کوشش کروں گی کہ جلد ہی تمہیں فون کروں۔''

رالف خاموش رہا۔ مریسا نے فون رکھ دیا۔ اس نے گہری سانس لی۔ رالف حساس تھا اور واقعی مریسا کی جانب

سے فکر مند تھا لیکن وہ ابھی الٹا واپس نہیں جا سکتی تھی۔

☆☆☆

''اپنی بکواس بند کرو۔'' ایل بھنا اٹھا۔ جیک چپ ہو گیا۔ جیک اور ایل کیب میں تھے جبکہ جارج ایسکس ہاؤس کی لابی میں بیٹھا تھا۔ ایل کو احساس تھا کہ لڑکی ان سب کو غچا دے کر نکل گئی ہے۔ وہ کہیں ہے یا نہیں تاہم ہوشیار ضرور تھی۔ وہ لوگ واپس ایسکس ہاؤس آ گئے تھے۔

واپس آ کر اس نے جیک کو ہوٹل میں بھیجا کہ وہ چیک کرے آیا مس کینڈرک کی رجسٹریشن موجود ہے یا نہیں... رجسٹریشن موجود تھی۔

ایل خود اندر گیا اور لڑکی کے کمرے کے پاس سے گزرا، کمرا خالی تھا اور اس کی صفائی کی جا رہی تھی مزید براں یہ ہوا کہ ہاؤس ڈیٹیکٹیو نے منیجر کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق اسے پہچان لیا اور وارننگ دے ڈالی کہ وہ لڑکی کا پیچھا چھوڑ دے۔

ایل دنگ رہ گیا۔ لڑکی نے اسے بدمعاش سابقہ بوائے فرینڈ کی حیثیت دے کر منیجر سے شکایت کر دی تھی۔

''مکار حسینہ۔'' وہ بڑبڑایا۔ بہرحال اسے ہوٹل سے نکلنا پڑا۔ اس کی پیشہ ورانہ حس کہہ رہی تھی کہ چڑیا اڑ گئی ہے اور وہ لوگ وہاں محض وقت ضائع کر رہے ہیں۔ وہ بڑبڑاتا ہوا دائیں بائیں ٹہل رہا تھا۔ اسے شک ہونے لگا کہ لڑکی ڈاکٹر ہے بھی یا نہیں یا کوئی اور معاملہ ہے۔

اس نے فی الفور ہیبر لنگ کو فون ملایا۔ پہلا سوال ہی یہ کیا کہ لڑکی کون ہے ڈاکٹر یا ایف بی آئی ایجنٹ؟

ہیبر لنگ نے سخت جواب دیا۔ ''احمقانہ سوال ہے، اپنی ناکامی کو چھپانے کی کوشش مت کرو۔ پانچ فٹ قد کی 100 پونڈ کی چھوکری تم مسٹنڈوں کو متواتر چکر دے رہی ہے۔ میں نے تمہیں ریمبو کو پکڑنے نہیں بھیجا ہے۔ PAC تم لوگوں پر ہزاروں ڈالرز فی یوم خرچ کر رہی ہے اور اب ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا ہے۔ کہاں دفن ہو گئی تم لوگوں کی پیشہ ورانہ مہارت؟''

''اس کی قسمت اچھی ہے۔'' ایل کی آواز لٹک گئی۔

''تاہم وہ عام ڈاکٹروں سے زیادہ ہوشیار ہے۔''

''میں کچھ نہیں جانتا۔'' ہیبر لنگ نے ترخ کر کہا۔ ''صاف بولو کہ وہ پھر تمہارے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ کہاں ہے وہ اس وقت؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔'' ایل نے مردہ دلی سے جواب دیا۔

''شاندار... بہت اچھے۔'' ہیبر لنگ نے کھلا مضحکہ اڑایا۔ ''میں یہاں بیٹھے بیٹھے بتا سکتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔ وہ ڈاکٹر کراس کے گھر پہنچ گئی تھی اور اسے اچھا خاصا خوف زدہ کر کے نکل گئی ہے۔ اس کا ارادہ ہے کہ وہ PAC کے ہر آفیسر سے ملے گی۔ ڈاکٹر ٹائی مین کا معاملہ سب سے نازک ہے۔ دفع ہو جاؤ اور اسے ٹائی مین تک نہ پہنچنے دو۔'' ہیبر لنگ نے فون پٹخ دیا۔

ریسیور ابھی تک ایل کے کان سے لگا ہوا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے ابھی ابھی کیا سنا ہے، آہستہ آہستہ اس نے ریسیور نیچے رکھ دیا۔ اس کی غلط فہمی دور ہو چکی تھی کہ وہ ایک آسان شکار کے پیچھے ہے۔

☆☆☆

وہ لوگ سان فرانسسکو کے سینٹرل ٹرمینل میں تھے۔ امریکن فلائٹ قبل ازیں ڈیڑھ گھنٹے ڈلاس میں رکی تھی پھر لاس ویگاس میں تاخیر ہوئی۔

جیک کے ہاتھ میں بریف کیس اور بریف کیس میں ویکسی نیشن گن تھی۔ اسی گن کے ذریعے ڈاکٹر مہتا اور ہرنی کی آڑ میں ایبولا وائرس منتقل کیا گیا تھا۔ ان سب کا حلیہ خاصا بگڑ چکا تھا۔ شیو اور شاور کا موقع بھی نہیں ملا تھا اور سوٹ بھی سلوٹوں سے پُر تھے۔

موجودہ سچویشن کے بارے میں ایل جتنا سوچتا، مزید فکر مند ہو جاتا۔ لڑکی چار شہروں میں سے کہیں بھی ہو سکتی تھی، یہ کوئی سیدھا صاف نشانہ نہیں تھا۔ اگر وہ بروقت ہاتھ آ بھی گئی تو وہ ویکسی نیشن برآمد کیے بغیر اسے ٹھکانے نہیں لگا سکتے تھے۔ اس نے نقشہ نکالا۔ ٹائی مین ایک غیر معروف علاقے میں رہائش پذیر تھا۔ صبح کے سات بج رہے تھے۔

☆☆☆

مریسا فیئر مونٹ ہوٹل میں رکی تھی۔ صبح ساڑھے سات بجے اس کی ویک اپ کال تھی۔ ناشتا کرتے ہوئے وہ غور کر رہی تھی کہ اگر ٹائی مین، ڈاکٹر کراس کے برعکس ثابت ہوا تو مشکل ہو جائے گی۔

کمرے میں پہنچنے والا ناشتا شاندار تھا۔ پھل چھیلنے کے لیے ایک خوب صورت تیز دھار چھری بھی موجود تھی جس کا منقش دستہ لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ ناشتا کرتے ہوئے وہ ٹائی مین کے ایڈریس کے بارے میں متفکر تھی۔ ڈاکٹر کراس سے ملاقات کے بعد بہت ممکن تھا کہ ٹائی مین تک اطلاع پہنچا دی گئی ہو اگر ایسا ہوا تو وہ اچانک وزٹ کے ذریعے ڈاکٹر ٹائی مین کو چونکانے میں ناکام رہے گی، وہ پہلے سے ہی تیار

ہوگا۔

مریسا نے فیصلہ کیا کہ گھر کے بجائے ڈائریکٹ اس کے دفتر میں ملاقات کی جائے۔ یہ زیادہ بہتر اور محفوظ راستہ ہوگا۔ ایک تو مریسا کا تعاقب کرنے والے توقع کررہے ہوں گے کہ وہ ڈاکٹر کراس کے مانند ٹائی مین سے گھر پر ملاقات کرے گی۔ دوسرے اگر ٹائی مین مجرمانہ فطرت کا نکلا تو اپنے آفس میں مریسا کے خلاف کسی جارحانہ حرکت سے پرہیز کرے گا۔

یلو پیجز کے ذریعے اس نے ٹائی مین کی میڈیکل پریکٹس کا مقام معلوم کرلیا۔ مریسا نے آفس فون کرکے شہر میں اس کی موجودگی کی تصدیق کی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آفس 8.30 سے قبل نہیں کھلے گا۔

مریسا نے تیاری مکمل کرکے پھر آفس فون کیا تو علم ہوا کہ ڈاکٹر کی آمد تین بجے متوقع ہے۔ ٹائی مین کو سان فرانسسکو جنرل اسپتال میں ایک سرجری نمٹانی تھی۔

مریسا، فون رکھ کر سوچ میں پڑگئی۔ تین بجنے میں بہت وقت تھا۔ اس کے شکاری کہاں ہوں گے، اسے علم نہیں تھا۔ صرف اتنا پتا تھا کہ ڈاکٹر کراس کے ذریعے انہیں خبر ہوگئی ہوگی کہ مریسا PAC کے دیگر آفیسرز سے بھی ملاقات کرے گی۔ ان کے لیے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ دوسری ملاقات کس سے کرے گی۔

مریسا نے آفس جانے کا ارادہ ملتوی کردیا احتیاطاً جنرل اسپتال میں مڈبھیڑ اور بھی زیادہ بہتر تھی۔ کمرا چھوڑنے سے بیشتر اس نے دروازے کی پیشانی پر ڈونٹ ڈسٹرب کا نشان آویزاں کردیا۔ نیویارک کے مقابلے میں وہ یہاں بہتر محسوس کررہی تھی۔ پیچھا کرنے والوں سے وہ کافی آگے تھی۔

سان فرانسسکو جنرل اسپتال کی عمارت متاثر کن تھی۔ اسپتال میں داخل ہوکر پہلے اس نے ڈاکٹرز لاکر روم تلاش کیا وہاں سے اس نے ایک اسکرب سوٹ منتخب کیا۔ اس وقت ایک اٹینڈنٹ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

''کس قسم کی مدد؟'' اس نے سوال کیا۔

''میں ڈاکٹر بلوم ہوں۔'' وہ لفظ مریسا گول کرگئی۔

''میں یہاں ڈاکٹر ٹائی مین کی سرجری کے مشاہدے کے لیے آئی ہوں۔''

''میں آپ کو ایک لاکر اسائن کردیتا ہوں۔'' اس نے ایک چابی، مریسا کے حوالے کی جس پر نمبر پڑا تھا۔

مریسا نے شکریہ ادا کیا اور کچھ دیر بعد مخصوص لباس میں باہر آگئی۔ اب اس کا رخ سرجیکل لاؤنج کی جانب تھا۔

لاؤنج میں تقریباً 20 افراد تھے۔ کوئی گپ لگا رہا تھا، کوئی کافی سے لطف اندوز ہورہا تھا اور کوئی اخبار میں کھویا ہوا تھا۔ بعض کی نظریں ٹی وی پر تھیں۔

مریسا، سیدھی گزرتی چلی گئی۔ ذرا دیر بعد وہ آپریٹنگ ایریا میں تھی۔ اس نے ہڈ اور ماسک لگایا۔ دستانے چڑھائے پھر کمرے میں آویزاں شیڈولنگ بورڈ کو پڑھنے لگی۔ ٹائی مین کے نام کے آگے روم نمبر 11 لکھا تھا۔

''یس؟'' ایک نرس اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ڈاکٹر ٹائی مین۔''

''روم نمبر 11۔'' نرس نے اشارہ کیا۔

''یس، میں نے دیکھ لیا ہے۔'' مریسا نے کہا اور شکریہ ادا کرکے کوریڈور میں چل پڑی۔ آپریٹنگ رومز، کوریڈور کے دونوں جانب تھے۔

روم نمبر 11 میں پانچ افراد تھے۔ بے ہوش کرنے والے ڈاکٹر کا رخ ٹیبل پر موجود مریض کے سر کی جانب تھا۔ ایک موبائل نرس احکامات کے انتظار میں ایک جانب اسٹول پر بیٹھی تھی۔ مریسا کو دیکھ کر وہ اس کی جانب آئی۔

''کیس میں کتنا وقت لگے گا؟''

''45 منٹ۔'' نرس نے جواب دیا۔ ''ڈاکٹر ٹائی مین تیز اور اپنے کام کے ماہر ہیں۔''

''ان میں ڈاکٹر ٹائی مین کون ہے؟''

نرس کے چہرے پر استعجاب کا عکس نظر آیا۔ ''وہ دائیں جانب۔'' اس نے جواب دیا۔ ''تم کون ہو؟''

''ڈاکٹر کی دوست، اٹلانٹا سے۔'' مریسا نے کہا اور مریض کے سر کی جانب چلی گئی وہاں سے وہ ٹائی مین کا مکمل جائزہ لے سکتی تھی۔

اسے اندازہ ہوا کہ نرس نے حیرانگی کا تاثر کیوں دیا تھا۔ ڈاکٹر ٹائی مین سیاہ فام تھا۔

''عجیب تضاد ہے۔'' اس نے سوچا۔ اس کے خیال میں PAC کے تمام آفیسرز عمر رسیدہ کھلاڑی تھے اور رنگت کے معاملے میں متعصب جبکہ ڈاکٹر ٹائی مین کی شخصیت میں دونوں عناصر مفقود تھے۔

وہ اسکرین پر آپریشن کی اندرونی جزئیات دیکھنے لگی۔ ٹائی کے ہاتھ کسی مشین کے مانند متحرک تھے۔ اس کی مہارت اور ہاتھوں کی حرکت قابل دید تھی۔ یہ ٹیلنٹ تھا جسے سکھایا نہیں جاسکتا تھا یہ خداداد صلاحیت تھی۔ ایسی بے عیب صلاحیت طویل تجربے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتی۔

☆☆☆

''اسٹارٹ کرو منحوس گاڑی کو۔'' ایل نے کڑوی آواز میں کہا۔ اس کے ایک ہاتھ میں سیل فون تھا، وہ ساسولیٹو میں ہل سائڈ پر ٹائی مین کے گھر پہنچ گئے تھے۔ تاہم وہاں ٹائی مین ملا نہ ہی لڑکی کا کچھ اتا پتا تھا۔ جیک نے اگنیشن میں چابی گھمائی۔

''کہاں چلوں؟'' اس وقت کم سے کم بولنا ہی بہتر تھا، ایل مشتعل ہو چکا تھا۔

''واپس شہر۔'' ایل نے بھی خشک لہجے میں مختصر جواب دیا۔

''ٹائی مین کے آفس سے کیا خبر ملی؟'' جارج نے استفسار کیا۔ جیک چاہتا تھا کہ وہ خاموش رہے تاہم اسے کچھ بولنے کی ہمت نہیں پڑی۔

''ڈاکٹر کو اچانک ایمرجنسی میں سان فرانسسکو جنرل اسپتال سرجری کے لیے جانا پڑا۔'' ایل نے جواب تو دیا تاہم غصے کی شدت سے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ ہیبرلنگ نے بھی اسے خاصی جھاڑ پلائی تھی۔ اس گریہ... جیسی لڑکی سے ایل کو نفرت ہو چلی تھی۔

''ٹائی مین کو ایک سرجری اپنے آفس میں صبح ساڑھے سات بجے کرنی تھی۔ سان فرانسسکو جنرل سے وہ تین بجے تک لوٹے گا۔''

''یعنی ہم نے ٹائی مین کو مس کر دیا ہے۔'' جارج نے نتیجہ اخذ کیا۔ اس کی آواز میں بھی ناگواری کا عنصر تھا۔

''وہ ہمارے یہاں پہنچنے سے تقریباً ایک گھنٹا قبل نکل چکا تھا۔ واٹ اے ویسٹ آف ٹائم۔'' ایل غرایا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں ایک اور گاڑی درکار ہے، ہمیں دونوں طرف نگاہ رکھنی پڑے گی۔ جتنی جلدی ہماری ٹائی مین سے ملاقات ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔''

☆☆☆

مریسا کے پاس خاصا ٹائم تھا اور وہ پُراعتماد تھی۔ ڈاکٹر ٹائی مین کو وہ پہچان چکی تھی۔ وہ آپریٹنگ روم سے نکل آئی اپنے عام لباس میں واپس آنے کے بعد وہ واپس سرجیکل لاؤنج میں آ کر ڈاکٹر ٹائی مین کا انتظار کرنے لگی۔ تیس پینتیس منٹ بعد ٹائی مین آپریٹنگ روم سے برآمد ہوا، اس کی چال بھی باوقار تھی۔ ڈاکٹر سے زیادہ وہ کسرتی جسم والا کوئی جوان کھلاڑی معلوم ہوتا تھا۔

باہر آنے کے بعد ٹائی مین نے ایک طرف رکھی مشین سے کافی کپ لبریز کرنا شروع کیا۔ مریسا نے اپنی نشست چھوڑ دی۔

''میں ڈاکٹر مریسا بلوم ہوں۔'' اس نے قریب پہنچ کر تعارف کروایا۔ متلاشی نگاہیں، ٹائی مین کے تاثرات پر تھیں۔ ٹائی مین کا چہرہ مردانہ کشش کا حامل تھا۔ مونچھیں نفاست سے تراشی گئی تھیں آنکھوں میں اداسی کا غیر مبہم تاثر تھا، اس نے مریسا کو دیکھا اور مسکرایا۔ اس کے تاثرات اور ردِعمل گواہ تھے کہ وہ مریسا کو نہیں جانتا۔

''میں آپ سے پرائیویٹ بات کرنا چاہتی ہوں۔''

ٹائی مین نے سر کو خم دے کر اپنی طرف آتے اسسٹنٹ کو دیکھا وہ قریب پہنچ چکا تھا۔ ''میں تم سے تھوڑی بعد میں ملتا ہوں۔'' ٹائی مین نے کہا۔ اسسٹنٹ سر ہلا کر وہاں سے ہٹ گیا۔

لاؤنج سے دو سوئنگ ڈورز سے دور... چند ٹیلی فون بوتھ نما چھوٹے کمرے بنے تھے۔ ٹائی مین، مریسا کو وہاں ایک بوتھ میں لے آیا۔ ''میں نے تمہیں آپریشن روم میں دیکھا تھا۔'' اس نے مریسا کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہاں دو ہی کرسیاں تھیں۔

''ہاں اب بتاؤ، میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''مجھے کچھ حیرت ہوئی ہے کہ آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟'' وہ ٹائی مین کو دیکھ رہی تھی جس کی آنکھوں میں اب تک سوالیہ تاثر کے ساتھ دوستانہ رنگ بھی تھا۔

''کیا نام بتایا تھا تم نے؟''

''ڈاکٹر مریسا بلوم۔''

''مجھے شرمندگی ہو رہی ہے۔'' وہ دھیمے سے ہنسا۔ ''میں واقعی تم کو نہیں پہچان سکا۔ مجھے بہت سے افراد سے ملنا پڑتا ہے۔'' وہ کافی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کیا ڈاکٹر کراس نے میرے بارے میں نہیں بتایا؟''

''مجھے یقین نہیں ہے کہ میں اس نام سے واقف ہوں۔''

''پہلا جھوٹ۔'' مریسا نے سوچا۔ ایک گہری سانس لی اور بغیر رکے وہی سب کچھ دہرا دیا جو اس نے ڈاکٹر کراس کے گوش گزار کیا تھا۔ اس دوران ایک لمحے کے لیے بھی مریسا کی نگاہ ٹائی مین کے چہرے سے نہیں ہٹی تھی۔ اگرچہ وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ نروس ہو گیا ہے۔ اس نے ٹائی مین کے ہاتھ میں کافی کا کپ چھلکتے دیکھا۔

''مجھے معمولی سا بھی آئیڈیا نہیں ہے کہ تم یہ کہانی مجھے

کیوں سن رہی ہو؟'' ٹائی مین نے کپ رکھ کر اٹھنا شروع کیا۔ ''بدقسمتی سے مجھے ایک اور کیس نمٹنا ہے۔''

مریسا نے اپنی افتادِ طبع کے برعکس نرمی سے ٹائی مین کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے دوبارہ بٹھا دیا۔ ''میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ میں مشکور ہوں گی اگر آپ مجھے بات ختم کرنے کا موقع دیں۔'' وہ بولی۔ ''آپ کو احساس ہو یا نہ ہو لیکن آپ اس خطرناک سازش کا حصہ بن چکے ہیں۔ میرے پاس معقول ثبوت موجود ہیں کہ جگہ جگہ ایبولا کی وبا کو پھیلانے کی ذمّے دار PAC ہے۔ آپ PAC میں شمولیت رکھتے ہیں۔ آپ سے مل کر مجھے شاک پہنچا ہے کہ آپ جیسا ہائی پروفائل پروفیشنل کا نام اس مکروہ دھندے میں موجود ہے...''

''تمہیں صدمہ ہوا ہے۔'' ٹائی مین پھر کھڑا ہو گیا۔ وہ کسی ٹاور کے مانند مریسا کے مختصر وجود پر جھکا ہوا تھا۔ ''مجھے حیرت ہے کہ اتنے غیر ذمّے دارانہ الزامات لگانے کے لیے تمہارے اندر ہمت کہاں سے آئی؟''

''یہ پبلک ریکارڈ کا حصہ ہے کہ آپ PAC کے افسران میں شامل ہیں۔ آپ کی پروفیشنل لیب میں شراکت داری ہے۔ لیب ان تمام ضروری لوازمات سے مزین ہے جو ایبولا جیسے خونخوار وائرس کو بخوبی ہینڈل کر سکتی ہے جبکہ یہ اختیاری ڈی سی کے پاس ہے۔ پروفیشنل لیب قانون شکنی کی مرتکب ہو چکی ہے۔''

''مجھے امید ہے کہ تم نے اپنی خاصی بڑی انشورنس کروا رکھی ہو گی۔'' ٹائی مین کی آواز بلند ہو گئی۔ ''تمہیں میرے اٹارنی سے نمٹنا پڑے گا۔''

''گڈ۔'' مریسا نے کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ آپ کا وکیل آپ کو اتھارٹی سے تعاون کا مشورہ دے گا۔'' وہ کھڑی ہو گئی۔ ''آپ سے ملنے کے بعد میں یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ وائرس استعمال کرنے کی منظوری میں آپ جیسا سرجن شامل ہو سکتا ہے۔ یہ آپ کے لیے ایک دہرا المیہ ہو گا کہ کسی اور کے غلط فیصلوں کی وجہ سے آپ کو خوامخواہ بہت کچھ بھگتنا پڑے گا۔ ڈاکٹر ٹھنڈے دماغ سے سوچیے آپ کے پاس وقت کم ہے۔'' مریسا نے بات ختم کر دیا۔ اس کا تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ ٹائی مین کے تاثرات بدل چکے تھے اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا جا رہا تھا۔

☆☆☆

''وہ رہی۔'' [illegible] کی آواز تھی۔ [illegible] نے جیک کے شولڈر [illegible] کے سامنے سڑک کی دوسری جانب موجود تھی۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ جارج ان کے عقب میں دوسری گاڑی میں موجود تھا۔ ایل نے مڑ کر جارج کو دیکھا۔ جارج نے انگوٹھا بلند کیا یعنی وہ مریسا کو اسپتال سے نکلتے دیکھ چکا تھا۔

''آج نہیں بچے گی، کتیا۔'' ایل نے دانت پیسے۔

مریسا کے کیب میں بیٹھتے ہی جیک نے گاڑی اسٹارٹ کر دی اور کیب سے پہلے روانہ ہو گیا۔ ایل نے عقب کے آئینے میں کیب کو دیکھا۔ کیب کے پیچھے جارج کی گاڑی تھی۔ وہ اپنے شکار کو مطلوبہ انداز میں گھیر چکے تھے۔

''اگر وہ جا رہی ہے تو یقیناً ٹائی مین سے مل چکی ہے۔'' جیک نے خیال آرائی کی۔

''کون پروا کرتا ہے۔'' ایل بولا۔ ''اب وہ ہماری گرفت میں ہے۔ اگر ہوٹل جاتی ہے تو کام اور آسان ہو جائے گا۔''

جارج کی گاڑی، مریسا کی کیب سے آگے نکل گئی اور جیک اپنی گاڑی عقب میں لے آیا۔

مریسا نے ہوٹل کا ہی رخ کیا تھا۔

''میں گاڑی میں ہوں، تم اس کا کمرا دیکھ کر آؤ۔'' ایل نے جیک کو ہدایت دی۔

مریسا ابھی کیب میں ہی تھی کہ جیک نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور ہوٹل کی لابی میں پہنچ کر ایک اخبار لے کر بیٹھ گیا۔ وہ اس رخ سے بیٹھا تھا کہ ہر آنے جانے والے پر نگاہ رکھ سکے۔ مریسا سیدھی فرنٹ ڈیسک پر گئی۔

باہر، ایل نے اسے ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اب وہ بے چینی سے جیک کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ جارج کے مانند سکون سے انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ پہلے ہی اس بوٹے قد والی لڑکی نے اس پر کافی قرض چڑھا دیا تھا۔

بالآخر اس کی بے تابی ختم ہوئی۔ جیک کی شکل نظر آئی۔ وہ تیز قدموں سے ایل کی جانب آ رہا تھا۔

''کیا رہا؟''

''وہ کمرا نمبر 727 میں مقیم ہے۔'' جیک نے اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے۔ اب تم یہاں بیٹھو۔'' ایل نے بتیسی کی نمائش کی۔ [illegible] نظر آنے لگے تھے۔ جیک نے [illegible] انداز میں مسکراتے دیکھا تھا۔ ایل، جارج کی گاڑی کی طرف گیا۔ ''تم اچھا خاصا اپنی گاڑی میں بیٹھ [illegible]۔'' ایل نے جارج سے فرمائش کی۔ [illegible]

ایل ہوٹل میں آ گیا۔ وہ فرنٹ ڈیسک پر گیا۔ سرسری نگاہ سے باکس نمبر 1127 تلاش کیا۔ جہاں چابیوں کا فالتو سیٹ موجود تھا۔ تاہم وہاں اتنے لوگ تھے کہ وہ چابیاں بغیر کسی ہنگامہ آرائی کے حاصل نہیں کرسکتا تھا۔

وہ ایلیویٹر کی طرف چلا گیا۔ گیارھویں منزل پر اس نے ہاؤس کیپنگ کارٹ تلاش کیا۔ جس پر صاف چادریں، تولیے، اسپرے اور صفائی کا دیگر سامان موجود تھا۔ وہ اسے سوئٹ کے باہر کھڑی مل گئی تھی۔ ایل نے ایک تولیا اٹھایا اسے بل دے کر ایک مضبوط موٹے رسے کی شکل دی۔ اطراف کا جائزہ لیا اور دبے قدموں سوئٹ میں داخل ہوگیا۔ اس کے اندازے کے عین مطابق سوئٹ خالی تھا۔ ایک ملازمہ گھٹنوں کے بل صفائی میں مشغول تھی۔ اس کے قریب ایک کین رکھا تھا۔

بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ایل نے عقب سے رسے نما تولیا ملازمہ کے گلے میں ڈال کر پھرتی سے ... کسنا شروع کیا۔ ملازمہ کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز نکلی۔ اس کی سانس فوراً ہی بند ہوگئی تھی۔ ملازمہ نے معمولی جدوجہد کی، اس کا چہرہ سرخ ہوا پھر بینگنی رنگت اختیار کرگیا۔ پانچ منٹ کے اندر اندر وہ ختم ہوچکی تھی۔

ایل نے اس کی تلاشی لینا شروع کی اور چابیوں کا گچھا برآمد کرلیا جو تانبے کے رنگ کے ساتھ منسلک تھا۔ باہر نکل کر اس نے دروازہ بند کیا۔ ڈونٹ ڈسٹرب کا اشارہ اس نے دروازے کی ناب کے ساتھ لٹکا دیا تھا۔

سامان کی ٹرالی کو دھکیل کر اس نے سیڑھیوں کے قریب اسٹور میں پہنچا دیا پیانو پلیئر کے مانند انگلیوں کو حرکت دی اور روم نمبر 1127 کا رخ کیا۔

☆☆☆

بستر پر جانے سے پہلے مریسا نے صبح کے بچے ہوئے پھل نکال کر ٹیبل پر رکھے اور چوبی دستے والے چاقو سے چھیل کر کھانے شروع کیے۔ وہ تھکن محسوس کررہی تھی۔ بچی ہوئی اشیا اس نے ٹیبل پر ہی چھوڑ دیں اور بستر پر جاگری۔ وہ اپنے اگلے قدم کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ سوچ ادھوری رہ گئی اور نیند نے اسے تھپکنا شروع کردیا۔

آہنی کلک کی معمولی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ شاید اس کے لاشعور میں خوف چھپا تھا جس نے اسے بیدار کردیا۔

اسے یاد تھا کہ دروازے کے باہر اس نے ڈونٹ ڈسٹرب کا کارڈ لگایا ہوا تھا پھر وہ آواز کیسی تھی۔ اس کی نظریں دروازے پر جم گئیں جس کی گول ناب آہستگی سے گھوم رہی تھی۔

مریسا کو شکاگو کا جان لیوا حملہ یاد آیا۔ دہشت کی لہر بجلی کے کرنٹ کے مانند اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر فون کی جانب لپکی۔ وہ ابھی ریسیور اٹھا بھی نہ پائی تھی کہ ہلکے دھماکے کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ لاک کھلنے کے بعد دروازہ چین اور بولٹ کی مدد سے اٹکا ہوا تھا۔ اس لیے ایل نے شانے کی ضرب لگا کر اسے کھولا۔ چین لاک کی پلیٹ بھی اپنی جگہ سے اکھڑ گئی تھی۔

ایل نے دروازہ بند کیا اور بروقت مریسا کو دبوچ لیا۔ اس کے دونوں ہاتھ مریسا کی گردن پر تھے۔ وہ پاگل کتے کی طرح جھٹکے دے رہا تھا۔ اس نے مریسا کا چہرہ قریب کرلیا۔ ''کچھ یاد آیا؟'' وہ عالم وحشت میں غرایا۔ مریسا نے بھورے بالوں والے کو پہچان لیا جو پارک میں سیاہ فام ڈانسرز کے ہاتھوں پٹا تھا۔

''ویکسی نیشن گن کے بارے میں بتانے کے لیے تمہارے پاس صرف دس سیکنڈ ہیں۔'' ایل کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اس نے مریسا کی گردن پر سے موت کی گرفت کم کی۔ ''اگر اس دوران میں کچھ نہیں بتایا تو گردن توڑ دوں گا۔'' وہ خونی بھیڑیے کی طرح غرایا۔ اپنی دھمکی میں وزن پیدا کرنے کے لیے اس نے شدید جھٹکا دیا۔ اذیت کی لہر مریسا کی ریڑھ کی ہڈی تک میں اتر گئی۔

وہ بمشکل سانس لے پارہی تھی۔ اس نے بے اختیار اس کی مضبوط کلائیوں کو پکڑا۔ ایل نے جھلا کر اسے دیوار کی طرف پھینکا۔ مریسا کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ دیوار کے تصادم سے بچنے کے لیے مریسا نے اضطراری طور پر دونوں ہاتھوں سے عقب میں دیوار کا سہارا لیا۔ لیمپ، ٹیبل سے لڑھک کر فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔ کمرا اس کی نظروں میں گھوم رہا تھا۔ سر کی چوٹ نے اسے چکرا دیا تھا۔

''آخری موقع دے رہا ہوں۔'' ایل نے دانت کچکچائے۔ ''کہاں ہے ویکسی نیشن گن؟'' وہ مریسا کی جانب بڑھا۔

عقب میں مریسا کے ہاتھ سے انگلیاں ٹیبل پر پڑے تیز دھار چاقو سے مس ہوئیں۔ اس کے گھومتے ہوئے سر میں امید کی کرن جگمگائی۔ اس نے چاقو کا دستہ مضبوطی سے تھام لیا۔ ایل جارحانہ عزائم سے اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ مریسا نے پوری طاقت کے ساتھ چاقو ایل کے پیٹ میں اتار دیا۔

مریسا کو کوئی احساس نہ تھا کہ اس نے چاقو کے ساتھ کیا کیا ہے اور وہ دستے تک کہاں جا گھسا ہے؟ تاہم ایل نہ صرف رک گیا تھا بلکہ اس کا فقرہ بھی ادھورا رہ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور غیر یقینی کے واضح تاثرات نمودار ہوئے۔ وہ کچھ بوکھلایا تھا اور شرٹ پر ابھرتے پھیلتے خون کے دھبے کو دیکھ رہا تھا...

مریسا نے چاقو واپس کھینچ لیا۔ اسے امید تھی کہ دروازے کی راہ سے فرار کا موقع مل جائے گا۔ وہ دوڑ پڑی۔ چاقو ہاتھ میں تھا جس کا تیز دھار پھل سرخ رنگت اختیار کر چکا تھا۔ تاہم وہ ناکام رہی۔ ایل بھوکے درندے کے مانند اچھل کر آیا تھا، وہ رخ بدل کر باتھ روم کی طرف بھاگی۔ باتھ روم کا دروازہ بند ہونے سے قبل ایل نے ہاتھ پھنسا کر اسے بند ہونے سے روکا۔ مریسا نے اندھا دھند چاقو کا وار کیا۔ اس بار ایل کے حلق سے چیخ نما آواز برآمد ہوئی۔ اس نے زخمی ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ مریسا نے تیزی سے دروازہ بند کر کے لاک کر دیا اور باتھ روم فون اٹھایا لیکن نمبر ڈائل کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

ایل، پاگل ہو گیا تھا۔ اس کا اشتعال انتہا کو چھو رہا تھا۔ دھماکا ہوا اور پورے کا پورا دروازہ ٹوٹ کر باتھ روم میں جا گرا۔ مریسا کو فون چھوڑنا پڑا۔ ریسیور کورڈ کے ساتھ لٹکتا رہ گیا۔ وہ ایک بار پھر زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار تھی۔ اس نے دیوانہ وار ایل کے پیٹ میں چاقو کے وار کیے۔ تاہم یوں لگ رہا تھا کہ وہ ہر چیز نظرانداز کر کے مریسا کو ختم کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس کا چہرہ کسی خونی جانور کا چہرہ معلوم ہو رہا تھا۔ غضب، اشتعال اور اشتعال کی شدت نے اذیت کے تاثر کو پسپا کر دیا تھا۔

چاقو نظرانداز کر کے اس نے مریسا کے بال مٹھی میں جکڑے اور اسے گھما کر سنک پر پھینکا۔ مریسا ایک اور وار کرنے میں ناکام رہی۔ ایل نے اس کی نازک کلائی پکڑ کر دیوار سے ٹکرائی۔ دوسری، تیسری کوشش کے بعد مریسا چاقو چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔ چھوٹا سا ہتھیار فرش پر جا گرا۔ ایل کا لباس خاصا خون آلود ہو چکا تھا۔ مریسا، اس کی سخت جانی پر ششدر تھی۔ ایل، مریسا کو بے بس سمجھ کر چاقو اٹھانے کے لیے جھکا۔ مریسا نے لٹکتے ہوئے ریسیور کی کورڈ تھامی اور بچی کھچی طاقت جمع کر کے ریسیور گھما کر ایل کے سر کی پشت پر بجایا۔ ریسیور ٹوٹ گیا۔ ایل کھڑا ہوتے ہوتے تھما لیکن دوبارہ سیدھا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

مریسا کو مایوسی نے گھیر لیا۔ ایل کھڑا تو ہو گیا تھا لیکن نشے میں لگ رہا تھا۔ نیلی آنکھوں کی پتلیاں اوپر گھوم گئیں پھر وہ فلمی انداز میں سلوموشن میں دھڑام سے ٹب کے اندر جا گرا اس کا سر ٹب کے ٹونٹی نما نلکوں میں ایک سے ٹکرایا۔ اس آخری ضرب نے اسے بے حرکت کر دیا۔

مریسا اس کے دوبارہ اٹھنے کا انتظار کر رہی تھی، وہ ڈاکٹر تھی۔ اسے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ ایل ناکارہ ہو چکا ہے۔ اگر اسے جلد ہی طبی امداد نہ ملی تو محض جریانِ خون ہی تیزی سے اسے موت کی سرحد پار کروا دے گا۔ اس کا سر بھی خون آلود ہو چکا تھا۔ اس کی ناک بھی ٹب میں گرنے سے زخمی ہو گئی تھی۔

مریسا کا پورا بدن بری طرح لرز اٹھا۔ دل سینے میں ڈھول بجا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ایل تنہا نہیں ہوگا، اس نے باہر نکل کر پرس دبوچا اور دوڑ لگا دی۔ ایلیویٹر کے ذریعے گراؤنڈ فلور پر پہنچ کر اس نے عقبی راستے کو ترجیح دی۔

عقبی جانب سے نکلنے کے لیے اسے دروازہ کھول کر سیڑھیاں اترنی تھیں۔ اسی نے دروازہ تھوڑا سا کھولا اور وہیں کھڑی رہی وہ کیبل کار کا انتظار کر رہی تھی۔ جو کچھ دیر بعد آتی دکھائی دی۔ مریسا بھرپور پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کیبل کار میں سوار ہو گئی۔ اگر کوئی عقبی سمت کی نگرانی کر رہا تھا تو وہ مریسا کو اس انداز میں نکلتے نہ دیکھ سکے گا تاہم مریسا کا اندازہ غلط تھا۔

کیبل کار دوبارہ حرکت میں آئی۔ مریسا بھیڑ کے درمیان چلی گئی اور پلٹ کر ہوٹل کے عقبی دروازے کو دیکھا وہاں سے کوئی باہر آتا دکھائی نہ دیا۔

☆☆☆

جارج کو یونہی سینڈک کے نام سے نہیں پکارا جاتا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ مریسا کی جھلک نہ دیکھ پاتا لیکن جارج نے دیکھ لیا، یہ الگ بات ہے کہ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ اس نے فوراً جیک کو فون ملایا۔

''کیا ایل بھی ساتھ نکلا ہے؟'' جیک نے جھٹ سوال کیا۔

''نہیں۔''

''اوہ گاڈ، کوئی گڑبڑ ہے... لیکن یہ کیسے ہو گیا؟''

''تم کیبل کار کا پیچھا کرو، میں ہوٹل ... جاتا ہوں۔'' جارج نے ہدایت کی۔

''او کے۔'' جیک نے جواب دیا۔

☆☆☆

کیبل کار نے موڑ کاٹا۔ اور فیئرمونٹ ہوٹل اوجھل ہو گیا۔ مریسا اپنے اعصاب کو سنبھالنے میں مصروف ہو گئی

اچانک اسے خون کا خیال آیا اس نے اپنے لباس کا جائزہ لیا، کپڑے بظاہر صاف ہی دکھائی دے رہے تھے۔

بعدازاں کرایہ ادا کر کے وہ ایک خالی ہونے والی نشست پر بیٹھ گئی۔ جان لیوا کشمکش کے بعد اس کا بدن کئی جگہ سے دکھ رہا تھا۔ خاص طور پر گردن زیادہ متاثر ہوئی تھی حتیٰ کہ گردن پر سیاہی مائل نیلاہٹ اُجاگر ہوگئی تھی۔

ذہن دوبارہ خیالات میں غلطاں ہوگیا۔ مریسا نے بہت احتیاط کی تھی پھر وہ کیسے اس تک پہنچ گئے۔ ایک ہی وجہ اس کی سمجھ میں آئی یقیناً وہ لوگ ڈاکٹر ٹائی مین کی نگرانی کر رہے تھے۔

مریسا کا اعتماد متزلزل ہوگیا۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ اسے ہوٹل میں ہی رک کر پولیس کا سامنا کرنا چاہیے تھا۔ اسے لگا کہ وہ ایک مشتبہ مفرور کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

رالف کے مشورے اور تشویش اسے صحیح لگنے لگی۔ صورتِ حال مزید بگڑ گئی تھی اب وہ دو افراد کی قاتل تھی۔ اب وقت آگیا تھا کہ وہ رالف کے پاس جائے اور اس کے وکیل سے بات کرے۔ PAC کے مزید ڈاکٹرز سے ملنے کا خیال اس نے دل سے نکال دیا۔ وہ بار بار موت کو جل نہیں دے سکتی تھی۔ وہ اکیلی تھی، بے وسیلہ تھی۔ صورتِ حال بھی بگڑی ہوئی تھی بلکہ بگڑتی ہی جارہی تھی۔

کیبل کار کی رفتار کم ہورہی تھی، اس نے اترنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ چائنا ٹاؤن کے قریب اُتری تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر گردن مسلی، وہ ہچکچاتی ہوئی چائنیز ریسٹورنٹ میں چلی گئی۔

سرخ رنگ کے مخصوص ریشمی لباس میں ایک عورت نمودار ہوئی اور شائستگی سے اطلاع دی کہ ریسٹورنٹ کھلنے میں ابھی نصف گھنٹا باقی ہے۔

''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کا ریسٹ روم استعمال کرسکتی ہوں؟'' مریسا نے میٹھی آواز میں درخواست کی۔

چینی عورت نے غور سے مریسا کو دیکھا پھر مطمئن ہونے کے بعد اسے اندر لے گئی۔ پے فون کے ذریعے سب سے پہلے مریسا نے فیئر مونٹ ہوٹل فون کر کے بتایا کہ کمرا نمبر 1127 میں ایمبولینس کی ضرورت ہے۔ فون بند کر کے وہ پولیس کے متعلق سوچنے لگی پھر اس نے یہ خیال مسترد کردیا اور اٹلانٹا واپس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ فیصلہ کر کے وہ اپنا حلیہ درست کرنے میں مصروف ہوگئی۔

☆☆☆

جیک درجنوں بار جارج کو فون کر چکا تھا۔ جواب آرہا تھا نہ ریکارڈنگ۔ جیک سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر ہو کیا رہا ہے؟ ایل اور جارج کو بہت پہلے گاڑی میں واپس ہونا چاہیے تھا۔

مریسا کا تعاقب وہ کامیابی سے کر رہا تھا۔ وہ اس حد تک مطمئن تھا کہ لڑکی اس کی نظر میں ہے کہ وہ چینی ریسٹورنٹ سے فاصلے پر گاڑی میں بیٹھا تھا۔

لڑکی جب ریسٹورنٹ سے نکل کر کیب میں سوار ہوئی تو وہ بھی گاڑی اسٹارٹ کرچکا تھا۔ تاہم ایک گھنٹے بعد وہ بے بسی سے ہاتھ مل رہا تھا۔ جب لڑکی، نان اسٹاپ ڈیلٹا فلائٹ کے ذریعے اٹلانٹا روانہ ہونے والی تھی۔ اسے ٹکٹ خریدنے کا خیال آیا لیکن ایل اور جارج ابھی تک غائب تھے اور وہ اٹلانٹا جانے کا فیصلہ ایل کی مرضی کے بغیر نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اب تک پچاس سے زیادہ مرتبہ فون پر رابطے کی کوشش کرچکا تھا، یہ کیا معما ہے، اس کا ذہن الجھ گیا تھا۔

واپس ہوٹل فیئر مونٹ جانے کے علاوہ اسے کچھ سجھائی نہیں دیا۔ ہوٹل کی طرف روانہ ہوتے ہوئے اس نے ایک بار پھر جارج کا نمبر ملایا، اسے امید نہیں تھی تاہم جارج کی آواز سن کر وہ چونک اٹھا۔

''تم دونوں کہاں غائب ہو؟ نمبر ملا ملا کر میری انگلی گھس گئی ہیں۔''

''جیک، مسئلہ ہوگیا ہے۔'' اس کی آواز پہلی مرتبہ دبی ہوئی معلوم ہورہی تھی۔ ''ایل لڑکی کے ہاتھوں خاصا زخمی ہوچکا ہے۔''

''کیا...'' جیک چلا اٹھا۔ اسے سماعت کا دھوکا معلوم ہوا۔

''لڑکی کے پاس چاقو تھا... ایل اسپتال میں ہے۔''

جیک کا دماغ گھوم گیا۔ اس نے اضطراری طور پر سر پکڑ لیا پھر گھبرا کر اسٹیئرنگ سنبھالا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا تاہم یہاں اطلاع یہ ہے کہ لڑکی جہاز میں سوار ہوکر اٹلانٹا روانہ ہوچکی ہے اور میرا دماغ چکرایا ہوا ہے کہ اب کہاں سر پھوڑوں؟''

''ایل بری طرح زخمی ہے، میں خود حیران ہوں۔''

''اوہ گاڈ، ہم کہاں پھنس گئے ہیں۔'' جیک پھر سر پکڑتے پکڑتے رہ گیا۔ ''چڑیا جیسی لڑکی، ایل کا یہ حال کرے گی اوہ جارج میرا دماغ ماؤف ہورہا ہے۔''

''ایک اور بری خبر ہے۔'' جارج کی آواز آئی۔

''اس سے زیادہ بُری خبر کیا ہوسکتی ہے؟''

''ایل نے ہوٹل کی ایک ملازمہ کو قتل کردیا ہے اور اس پر کیس بن چکا ہے... کچھ تاخیر ہوجاتی تو خود ایل بھی مقتول ملازمہ کے ساتھ ہی ہوتا۔'' جارج نے دھماکا کیا۔

جیک گنگ رہ گیا۔
''تم کہاں ہو؟'' جارج نے سوال کیا۔
''فری وے پر ہوں، ائرپورٹ سے نکل رہا ہوں۔''
''واپس جاؤ اور اٹلانٹا کے دو ٹکٹوں کا بندوبست کرو۔ اب یہ خالصتاً ذاتی معاملہ بن گیا ہے۔ ایل کا قرض چکانا پڑے گا۔''

☆☆☆

مریسا نے مطالعے کی ضرورت محسوس کی۔
''میگزین یا اخبار؟'' اٹینڈنٹ نے استفسار کیا۔
''اخبار، نیویارک ٹائمز۔''
''او کے میم۔''
مریسا، ائرپورٹ پر خاصی خوف زدہ تھی کہ کہیں کوئی ناگہانی نہ ہو جائے۔ اب وہ بلندیوں پہ تھی اور بہتر محسوس کر رہی تھی۔
مریسا نے اخبار کے صفحے پلٹنے شروع کیے۔ وہ اپنے مطلب کی خبریں اور رپورٹس دیکھ رہی تھی۔ فلاڈیلفیا میں اموات 58 کے ہندسے کو چھو رہی تھیں۔ نیویارک 49 لیکن نیویارک میں مزید مریضوں کی آمد جاری تھی۔ اخبار کے ذریعے ہی اسے معلوم ہوا کہ روزن برگ اسپتال دیوالیہ ہو چکا ہے۔ ایبولا پر ایک آرٹیکل الگ سے موجود تھا۔ آرٹیکل کے ساتھ ایپی ڈیمیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ کی تصویر چھپاں تھی۔ مریسا نے دلچسپی سے نام پڑھا۔ ڈاکٹر احمد فخری، تحریر کے مطابق ایبولا کی متعدد وباؤں کے سلسلے میں احمد فخری سی ڈی سی کا وزٹ کرنے والا تھا۔ WHO نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ صورتِ حال یونہی رہی تو ایبولا وائرس، اٹلانٹک کے پار جا پہنچے گا۔
مریسا نے آنکھیں بند کر لیں۔ احمد فخری، مریسا کی مدد کر سکتا تھا۔ رالف کے وکیل کے ذریعے وہ حمد فخری سے بھی مل سکتی تھی۔

☆☆☆

ساڑھے نو بجے، کے دروازے کی گھنٹی گنگنائی، اس نے حیرت سے گھڑی دیکھی۔ کون ہو سکتا ہے، اس نے اٹھ کر سائڈ پینل سے باہر جھانکا اور بھونچکا رہ گیا۔ باہر مریسا کھڑی تھی۔
''مریسا'' وہ بے یقینی سے بڑبڑایا اور تیزی سے دروازہ کھولا۔ مریسا کے عقب میں ایک کیب دور ہوتی جا رہی تھی۔
مریسا بلا ارادہ اس سے لپٹ گئی۔ وہ زاروقطار رو رہی تھی۔
''اوہ... مریسا سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' رالف نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ ''تم نے مجھے کال کیوں نہیں کی۔ میں تمہیں ائرپورٹ سے لے لیتا۔''
محفوظ پناہ گاہ میں آتے ہی مریسا کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ رالف اسے تسلیاں دیتا ہوا کاؤچ تک لے آیا۔ وہ مریسا کا سر سہلا رہا تھا۔ اس نے مریسا کے آنسو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ایسی کوئی بھی کوشش مریسا کی رقت میں اضافہ کر دیتی۔
دس منٹ میں دھیرے، دھیرے اسے قرار آ ہی گیا۔ آنسو، ہچکیوں میں اور ہچکیاں سسکیوں میں تبدیل ہوئیں، بالآخر اس کے بدن کی لرزش ختم ہوئی اور وہ بات کرنے کے قابل ہوگئی۔
رالف کی نگاہ فون پر تھی لیکن اس وقت مریسا کے قریب سے اٹھنا ٹھیک نہیں تھا، نہ وہ اسے اٹھنے دیتی۔
''تم کچھ پی لو، بولو کیا لے کر آؤں؟''
مریسا نے نفی میں سر ہلایا۔
''وائن لاؤں بہترین شارڈونی ہے۔'' مریسا نے مضبوطی سے اس کا بازو پکڑا ہوا تھا۔ پانچ منٹ اور گزر گئے۔ رالف نے ایک گہری سانس لی۔
''تمہارا سامان کہاں ہے؟''
مریسا نے جواب نہیں دیا اور جیب سے ٹشو نکال کر چہرہ صاف کرنے لگی۔
''کچن میں، چکن بھی ہے۔'' رالف نے پھر کوشش کی۔ آخر مریسا نے لب کشائی کی۔
''کچھ دیر بیٹھے رہو، میں بہت ہراساں ہوں۔''
''تم مجھے فون کر دیتیں اور تمہاری گاڑی کہاں ہے؟''
''رالف لمبی داستان ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری واپسی کی خبر کسی کو ملے۔''
رالف نے ایک ابرو اوپر چڑھایا۔ ''یعنی تم یہیں رکو گی؟''
''اگر تم مائنڈ نہ کرو۔''
''کیسی باتیں کر رہی ہو اگر تم چاہو تو چل کر تمہارے گھر سے تمہاری کچھ اشیا لے کر آ جاتے ہیں۔''
''نہیں... نہیں آج رات کہیں نہیں جاؤں گی۔ ایسا کرنا ہوتا تو میں پہلے ٹیڈ کے ذریعے وہ پیکٹ حاصل کرتی جو اس نے میرے لیے MCL میں کہیں رکھا ہوا ہے۔ میں صبح

پہلے وکیل سے ملوں گی میرا جیل سے باہر رہنا ضروری ہے۔''

''آہ تم نے خود کو کس مصیبت میں ڈال لیا ہے۔ اگر چاہو تو کچھ بتاؤ، تمہارے ساتھ کیا بیتی؟''

''ہاں سب بتادوں گی۔ مجھے کچھ کھالینا چاہیے۔''

''کیوں نہیں، میں چکن تیار کرتا ہوں۔''

''اوہ تو، شکریہ میں آملیٹ بنالیتی ہوں۔''

''جیسا تم چاہو مجھے ایک فون کرنا ہے۔'' وہ حوصلہ افزا انداز میں مسکرایا۔

مریسا، کچن میں چلی گئی وہ پہلے بھی کچن دیکھ چکی تھی۔ جب جنوری میں رالف نے گھر پر پارٹی رکھی تھی۔ گھر کی مناسبت سے کچن بھی شاندار تھا۔ اس نے طائرانہ نظر کچن پر ڈالی اور ریفریجریٹر کی طرف بڑھ گئی۔ انڈوں کے ساتھ اس نے بریڈ سے چند سلائس الگ کیے۔

اچانک اسے خیال آیا کہ اس نے رالف سے تو پوچھا ہی نہیں کہ وہ بھی کچھ لینا پسند کرے گا یا نہیں۔ مریسا نے اسے پکارنا چاہا پھر رک گئی۔ وسیع و عریض گھر میں اسے چیخنا پڑتا۔ ورنہ آواز رالف تک نہ پہنچ پاتی۔ اس نے انڈے نیچے رکھے اور انٹر کام کی طرف متوجہ ہوگئی۔

مریسا نے انٹر کام کونسول پر بٹن دبائے۔ اسے ٹھیک کمبی نیشن کا علم نہیں تھا۔

''ہیلو ہیلو۔'' کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس نے کئی کمبی نیشن ملا کر دیکھے دفعتاً اسے رالف کی آواز سنائی دی، وہ اس کا نام لیتے لیتے تھم گئی۔

''وہ سان فرانسسکو میں نہیں ہے۔'' رالف کہہ رہا تھا۔ ''وہ یہاں میرے گھر پر ہے۔''

وقفہ...

''جیکسن، مجھے کچھ نہیں معلوم کہ وہ اٹلانٹا سے باہر کیا کرتی رہی ہے وہ یہاں ہسٹریائی کیفیت میں آئی تھی۔ مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ اس نے کوئی پیکٹ ٹیڈ کے ذریعے سی ڈی سی کی خاص لیب میں رکھوایا ہے۔ سنو میں زیادہ بات نہیں کرسکتا، مجھے اس کے ساتھ رہنا ہے۔''

وقفہ

''فکر مت کرو وہ یہیں ہے لیکن تم لوگ جلد از جلد پہنچو۔''

وقفہ

''نہیں، نہیں یہاں اس کی موجودگی کا کسی کو نہیں پتا۔''

وقفہ

''ہاں ہاں مجھے سو فی صد یقین ہے۔ بائے۔''

مریسا نے کاؤنٹر ٹاپ کا سہارا لیا۔ یوں لگا کہ وہ بے ہوش ہونے والی ہے۔ کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں دل... دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ شدید صدمے کے باعث اسے زوردار چکر آیا وہ گرتے گرتے بچی۔

آہ... کون ہے اس کے ساتھ۔ جس کو وہ شروع سے اچھا دوست سمجھتی رہی، وہ بھی رندوں کی ٹولی میں شامل تھا۔ جیکسن... جیکسن PAC کا ہیڈ جوشوا جیکسن وہ اس روز اسی گھر میں پارٹی میں موجود تھا۔

''اوہ گاڈ'' مریسا نے چھت کی طرف دیکھا۔ وہ لوگ اٹلانٹا آرہے ہیں اور رالف کچن کی طرف آرہا ہے۔

رالف دوست نہیں، وہ سب سے بڑا دشمن ثابت ہوا۔ برق کے مانند شروع سے لے کر اب تک۔ رالف کی تمام باتیں ایک سیکنڈ میں اس کے ذہن میں گھوم گئیں۔ مریسا کو متعدد سوالات کے جوابات مل گئے۔

خوف، دہشت اور نفرت... شدید نفرت۔ مرنا ہی ہے تو وہ ایسے نہیں مرے گی، نفرت نے خوف و دہشت کو پسپا کرنا شروع کیا۔

اس نے انڈے توڑ کر پین میں ڈالے خول کے چند چھوٹے ٹکڑے بھی پین میں گر گئے۔ اسی وقت رالف کچن میں نمودار ہوا۔ مریسا نے دوسرا انڈا توڑ کر پین میں ڈالا اور پھینٹنا شروع کیا۔

''اچھی خوشبو آرہی ہے۔'' وہ خوش دلی سے بولا۔ اس نے گلاس ایک طرف رکھا اور مریسا کے شانے پر ہاتھ رکھا، مریسا تقریباً اچھل پڑی۔

''اوہ ہو... تم ابھی تک گھبرائی ہوئی ہو، میں کس طرح تمہیں پُرسکون کروں؟''

مریسا خاموش رہی۔ اس کی بھوک اڑ چکی تھی۔ تاہم اس کے ہاتھ متحرک رہے۔ سلائس ٹوسٹر میں ڈالے جام اور مکھن نکالا گاہے گاہے وہ رالف پر بھی نظر ڈال لیتی تھی۔ قیمتی ریشمی شرٹ، طلائی کف لنکس۔

اس کے جسم پر موجود ہر چیز شاندار مکان کی بیش قیمت اشیا سے مطابقت رکھتی تھی۔ سب کچھ ایک ایسے متمول ڈاکٹر کی نمائندگی کرتا تھا جسے نہ صرف اپنے پیشے میں مسابقت کا سامنا تھا بلکہ مارکیٹ کے بدلتے ہوئے اطوار اس کے لیے مسائل کھڑے کررہے تھے۔

وہ PAC کا ایک اہم رکن تھا جو سی ڈی سی کے قلب میں بیٹھا تھا۔ مریسا کا دوست نہیں، جانی دشمن۔

آہ... کتنا بڑا دھوکا کھایا تھا اس نے۔ ٹیڈ پر خوامخواہ

شک کیا۔ نورس سے بدظن ہوئی جہاں رومینس کی ابتدا میں ہی اس سے چوک ہوگئی یا نورس سے ہی غلطی ہوئی تھی۔ دونوں کے درمیان فاصلے بڑھ گئے تھے لیکن وہم تھا یا خواب تھا۔ آس تھی، چبھن تھی دل بھی ایک فتنہ گر ہے۔ خود ہی ساقی، خود ہی بادہ اور خود ہی پیمانہ... دل... نہیں سوزِ دل خود شمع اور خود ہی پروانہ تھا۔ دل کی بستی بے سوز و صدا تھی نہ مہ و مہر، نہ رنگ و طرب بس اک پرتو خیال، دل کے کسی گوشے میں نہاں تھا۔ پس پردہ مقصود تمنا موجود تھی یا شاید محض خود فریبی تھی۔ آشفتہ سری تھی، نہیں تیرنگی بے خودی تھی... نہیں شوق کی کافری تھی... نہیں کوئی طلسم تھا، راز تھا، دیوانگی تھی، مستی تھی۔

مریسا نے اک آہ سرد کھینچی رو برو اجل آخر نورس کا خیال کیوں آیا۔ کیا اختتام قریب ہے؟

''کہاں کھوگئی ہو؟'' رالف کی آواز اسے کچن میں واپس لے آئی۔

''میں بنالیتا تمہاری طبیعت ناساز لگ رہی ہے۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔'' اس نے نرمی سے کہا۔

''ہاں شاید۔'' مریسا نے آہستہ سے کہا۔ ''بس بن گیا ہے۔''

وہ کانگریس مین کا سپورٹر تھا۔ مریسا کو اسی وقت ہوشیار ہوجانا چاہیے تھا۔ اُف کیسی بھیانک غلطی تھی۔ وہ ٹیڈ نہیں بلکہ رالف تھا جسے ہر مرتبہ فون پر پتا چل جاتا تھا کہ مریسا کہاں پر ہے۔ رالف کے وکیل سے ملنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اسے یاد آگیا کہ ایک بار اٹارنی کا نام اسے کیوں چبھا تھا۔ کوئن لن نہیں بلکہ کوپر ہوچ اینڈ سکوئن لن لا فرم PAC کے لیے خدمات انجام دیتی تھی۔

مریسا، چوہے دان میں آن پھنسی تھی۔ قاتل ٹولے کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ یہ ہاتھ ٹوٹنے والے تھے اگر رالف بھی ان میں شامل نہ ہوتا۔ جان پر کھیل کر مریسا نے تن تنہا ان لمبے مضبوط ہاتھوں کو تقریباً توڑ ہی ڈالا تھا۔

سب کچھ ادراک و یقین، وہم و گماں سے پرے تھا۔ سازش کی جڑیں اتنی گہری ہوں گی، اسے یہ خیال کیونکر آسکتا تھا۔ کانگریس مین کا اہم رول تھا جو سی ڈی سی کا بجٹ کنٹرول کرتا تھا۔

خیالات کا ایک برق رفتار بھنور تھا جو ذہن میں چکرا رہا تھا۔ کون مریسا پر یقین کرے گا؟؟ ایک ٹھوس ثبوت تھا جو کمزور کڑیاں بھی ملا دیتا ہے۔ ویکسی نیشن گن اور دشمنوں کو پتا چل گیا تھا کہ گن گنوا لی ہے۔ گن سامنے آئے گی نہ مریسا کی موت یا غیاب کی حقیقت سے پردہ اٹھے گا۔

مریسا کے تصور نے اپنی کی تصویر کشی کی جو رالف کے مکان میں گھس رہا تھا۔ بے اختیار اس کے ہاتھ سے کانٹا گر گیا۔ اس نے کانٹا اٹھایا۔ ایل، سان فرانسسکو کے ہوٹل میں باتھ روم کا دروازہ توڑ کر اندر آگیا تھا کانٹا پھر گر گیا۔ وہ لرز اٹھی پھر جھکی لیکن فوراً سیدھی ہوگئی۔ یوں لگا تھا کہ وہ بے ہوش ہونے والی ہے۔

''بس بہت ہوگیا۔'' رالف نے اس کا بازو پکڑا۔ ''تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے، آرام کرو۔ کھانے سے زیادہ تمہیں دوا کی ضرورت ہے۔'' وہ اسے لیونگ روم میں لے آیا۔

نفرت کی موج پھر اُچھلی۔ اسے ہر صورت یہاں سے نکلنا ہے وہ آخری سانس تک لڑے گی۔ مہینوں کی جاں گسل تگ و تاز کے بعد وہ ایسے ہی ہتھیار نہیں ڈالے گی۔

''فی الحال میرے خیال میں صرف خواب آور دوا کافی ہے۔ صبح اٹھوگی تو فریش ہوگی، میں ابھی لے کر آیا۔''

''او کے۔'' مریسا نے کہا اور رالف سیڑھیاں طے کرکے بالائی منزل پر چلا گیا۔ مریسا نے نئے سرے سے کمر کسی اور کھڑی ہوگئی۔ گاڑی کے بغیر وہ مکان سے نکل بھی جاتی تو دوبارہ جلد ہی پھنس جاتی۔ پہلے اس نے فون اٹھایا لیکن ڈائل ٹون مفقود تھی یعنی رالف پوری طرح محتاط تھا۔

مریسا نے تیزی سے اس کی مرسڈیز کی چابیاں ڈھونڈنی شروع کیں۔ کچن باتھ روم مختلف کیبنٹ کی درازیں۔ کم وقت میں اس نے خیال کے مطابق تلاشی لی۔ کچھ چابیاں اسے نظر بھی آئیں۔ تاہم مطلوبہ چابی کے حصول میں وہ ناکام رہی۔ وہ ایک ڈیسک کی دراز کھول رہی تھی کہ اچانک رالف واپس آگیا۔

''مریسا کیا چاہیے؟''

اضطراب کو دباتے ہوئے وہ پلٹی رالف اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گلاس دوسرے میں شاید کوئی گولی دبی تھی۔

''میں نے سوچا کہ شاید کوئی ٹرینکولائزز آس پاس ہی مل جائے۔'' اس نے اوسان بحال رکھے۔

''کچن میں ہے لیکن وہ مین کلر ہے۔''

''اوہ تو تم کیا لائے ہو؟'' مریسا نے رالف کی بند مٹھی کو دیکھا۔

''ڈالمین ہے۔'' [illegible] مٹھی کھولی اور کیپسول مریسا کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ کیپسول آدھا سرخ اور آدھا نیم سفید رنگ کا تھا۔

''ڈالمین؟''

''ہاں یہ تمہیں سکون پہنچائے گی اور نیند بھی اچھی آئے گی۔'' رالف نے جواب دیا۔

''یہ مجھے سوٹ نہیں کرتی۔'' مریسا نے کیپسول واپس کر دیا۔

''پھر... ولیم ٹھیک ہے؟''

''ہاں، ولیم ٹھیک رہے گی۔''

''ابھی لایا۔'' رالف واپس چل پڑا۔

مریسا نے تلاشی کا عمل پھر شروع کر دیا۔ اس کی بے قراری بڑھ گئی تھی۔ اس مرتبہ مریسا نے سماعت قدموں کی آہٹ پر رکھی ہوئی تھی اسی لیے بروقت جگہ پر واپس آگئی۔

''یہ لو۔'' رالف نے نیلے رنگ کی گولی اس کے حوالے کی۔

''دس ملی گرام؟ زیادہ نہیں ہے؟'' مریسا نے اعتراض کیا۔

''تم خاصی پریشان ہو دس ملی گرام مناسب رہے گی۔'' رالف نے پانی کا گلاس اٹھا کر اسے دیا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' مریسا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ لمحہ بھر کے لیے بیٹھتے بیٹھتے رالف کی نگاہ ہٹی اور مریسا نے گولی منہ میں ڈالنے کے بجائے جیکٹ کی جیب میں گرادی۔ رالف نے اس کی طرف دیکھا تو وہ گلاس منہ سے لگا چکی تھی۔ مریسا گلاس واپس کرتے ہوئے مسکرائی۔ رالف کی آنکھوں طمانیت کی ہلکی سی جھلک، مریسا کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

''کچھ کھاؤ گی؟''

''نہیں ولیم کے اوپر مناسب نہیں ہے۔'' وہ بولی۔

''ڈرنک چلے گی؟''

''میں بناتی ہوں۔'' وہ خوامخواہ ہنسی۔

''میرے لیے اسکاچ۔'' رالف مطمئن نظر آرہا تھا۔

مریسا نے اسے وال کلاک پر نظر ڈالتے دیکھا۔ مریسا کو احساس تھا کہ وقت کم ہے اور گاڑی کی چابیوں کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ وہ متواتر سوچ رہی تھی کہ چابیاں کہاں ہو سکتی ہیں۔ وہ بار کاؤنٹر کی طرف چل دی۔ خیال آیا کہ براہِ راست چابیاں مانگ لے لیکن اس میں خطرہ ہی خطرہ تھا مریسا کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔

اس نے عمداً رالف کے لیے عمومی مقدار سے زیادہ اسکاچ انڈیل دی۔ پشت رالف کی جانب تھی، اس نے گولی نکال کر اس کے دو ٹکڑے کیے پوری گولی ذائقہ بدل سکتی تھی، اسے خطرہ تھا کہ گولی اسکاچ میں حل پذیر نہیں ہوگی۔ مریسا نے احتیاط سے بوتل کے ساتھ رگڑ کر نصف گولی کو پاؤڈر کی شکل میں بدل دیا اگرچہ سفوف قدرے موٹا تھا تاہم اس سے بہتر تھا کہ وہ نصف گولی ویسے ہی جام میں ڈال دیتی۔

''میں مدد کروں؟'' عقب سے رالف نے پیشکش کی۔

''نہیں، بس لا رہی ہوں۔'' مریسا نے اپنے گلاس میں برانڈی لی اور دونوں جام لے کر پلٹی دفعتاً ایک خیال نے اس کے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ گاڑی کی چابیاں اس نے پینٹ کی جیب میں تو نہیں رکھی ہوئیں۔ اس نے بمشکل دوبارہ اس خیال کو رد کیا، براہِ راست چابیوں کے بارے میں پوچھ لے۔

ایک ہی حل تھا گرچہ خطرہ تھا لیکن کم کم مگر اس کے لیے مریسا کو جو کرنا پڑتا، وہ اس نے پہلے بھی سوچا نہیں تھا۔ کم از کم رالف کے لیے نہیں اور اب ان حالات میں تو یہ ایک نہایت کڑوا گھونٹ تھا بہرصورت یہ کڑوا گھونٹ اسے نگلنا ہی تھا۔

وہ نشیلی آنکھوں کے ساتھ بیٹھی اور رالف کے ساتھ لگ کر بیٹھی۔ رالف نے عالم حیرت میں جام منہ سے لگایا۔ مریسا کو غور سے دیکھا۔ وہ آپے میں نہیں تھی۔ برانڈی چھوڑ کر وہ مزید قریب ہوگئی اور ایک ہاتھ رالف کی ران پر رکھ دیا۔ رالف نے سنسنی محسوس کی اور جلدی سے ایک گھونٹ بھرا۔

''رالف... ف...'' مریسا کی آواز بہکنے لگی اور ہاتھ رالف کی پینٹ پر پیچھے چلا گیا۔

''تت... تم... بہت اچھے ہو۔'' دوسرا ہاتھ اس نے رالف کی گردن میں حمائل کر دیا۔

''اوہ، سوئٹ مریسا۔'' رالف کو یقین کرنا ہی پڑا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہا ہے۔ اس نے بھی گلاس ایک طرف رکھ دیا۔ پتلون کی عقبی جیب میں ہی چابیاں محسوس کرتے ہی مریسا جبر کر کے رالف سے پٹ ہی گئی۔

اتنی قربت، وارفتگی... اسکاچ تو رالف پر کیا اثر کرتی۔ مریسا کے معطر حسن جہاں سوز اور خود سپردگی نے اس کے ہوش اڑا دیے۔ مریسا نے خود کو بدقت تمام اس حرکت کے لیے آمادہ کیا تھا۔ مریسا کا ہاتھ اس کی پتلون کی عقبی جیب پر تھا۔

''اوہ... پلیز گاڈ۔'' اس نے دعا کی اور دو انگلیاں جیب میں ڈال دیں۔ اسے نہیں پتا تھا کہ رالف گردوپیش سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ وہ مریسا کے چہرے سے یہاں وہاں سے طلسمی رنگ چرانے میں کھویا ہوا تھا۔ کہیں سے رنگ کہیں سے مٹھاس وہ جیکسن اینڈ کمپنی کو بھی بھلا بیٹھا تھا۔

مریسا کی انگلی کی رِنگ سے ٹکرائی اور اس نے آہستگی سے چابیاں نکال کر اپنی جیب میں منتقل کر لیں۔
رالف لحہ بہ لمحہ بے قابو ہوتا جا رہا تھا۔ مریسا کو بروقت اسے روکنا تھا، دل کڑا کر کے اس نے ایک بڑا معرکا سر کر لیا تھا۔
''ڈارلنگ۔'' وہ اچانک چہرہ ایک طرف ہٹا کر بولی۔ ''تمہارے ساتھ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ مگر وہ گولی کیسی تھی؟ میں یکدم ہی بہک گئی، مجھے سوجانا چاہیے۔''
رنگین سپنا ٹوٹ گیا تھا۔ وہ سپنا نہیں جادو تھا۔ رالف کی آنکھیں خمار آلود تھیں۔
''ہاں سوجاؤ۔ یہیں سوجاؤ میرے پاس۔''
''مگر بعد میں تمہیں مجھے اٹھا کر اوپر کمرے تک پہنچانا پڑے گا۔'' مریسا نے فنکاری سے خود کو الگ کر لیا۔ ''مجھے خود کمرے تک جانا چاہیے۔''
''تم نہیں چاہتیں کہ میں تمہارے ساتھ رہوں؟''
رالف کی آواز میں امید تھی، آرزو تھی، تشنگی تھی۔
''ڈارلنگ تم ہمیشہ میرے ساتھ ہو اور رہو گے۔ تم بہت اچھے ہو تاہم اس وقت میں سو جاؤں تو بہت اچھا رہے گا۔'' وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔
''لباس تبدیل نہیں کرو گی؟''
''رالف، میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں۔''
''اوکے، کسی چیز کی ضرورت پڑے تو میں یہیں ہوں۔'' رالف نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔
کمرے کا دروازہ بند کرتے ہی مریسا پنجوں کے بل چلتی ہوئی قریب ترین کھڑکی سلائڈ کر کے بالکونی میں اتر گئی۔ اس نے پورا دھیان رکھا ہوا تھا کہ معمولی سی آواز بھی پیدا نہ ہو۔ موسم بہار کی خاموش رات تھی، ہوا بند تھی۔ آسمان کے تارے، بالکونی میں اترنے والے چاند کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ اونچے درختوں کی قطار سیاہی مائل بھوتوں کے مانند تھی دور سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ فوراً بعد مریسا کی سماعت سے کسی کار کے انجن کی آواز ٹکرائی۔
مریسا نے تیزی سے اپنی پوزیشن کا جائزہ لیا۔ وہ اسفالٹ سے پندرہ فٹ بلندی پر تھی۔ اتنی بلندی سے کودنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ پورچ کی ترچھی چھت بھی بالکونی سے فاصلے پر تھی۔ بالکونی کی نچلی سطح سے چوکور ستون نما ڈنڈے سے افقی سمت میں آگے نکلے ہوئے تھے۔ یہ ایک قسم کا آرائشی ڈیزائن تھا۔
مریسا ہمت کر کے بالکونی پر چڑھی اور ایک ستون پر لیٹ گئی۔ وہ انچ انچ کر کے رینگتی ہوئی آگے جا رہی تھی۔ تاہم اس کا اندازہ غلط نکلا۔ ستون کے سرے سے پورچ کی چھت اب بھی دس فٹ دور تھی۔ اس نے واپس پیچھے کی جانب کھسکنا شروع کیا۔ یہ عمل آگے جانے سے زیادہ دشوار تھا۔ تاہم وہ کسی نہ کسی طرح واپس بالکونی میں آگئی۔ اس کی سانس چڑھی ہوئی تھی، وہ وہیں لیٹ کر آسمان کے تاروں کو گھورنے لگی۔
جس کار کے انجن کی آواز اس نے سنی تھی، وہ ڈرائیو وے میں کھڑی تھی۔ وہ خاموش لیٹی رہی۔ نیچے سے آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں پھر خاموشی چھا گئی غالباً رالف ... دوراز ہ کھول کر انہیں اندر لے گیا تھا۔
مریسا کی سانس بحال ہوئی تو وہ واپس کمرے میں آگئی۔ کمرے کا دروازہ کھول کر وہ دبے قدموں ہال وے میں آگئی۔ یہاں اسے رالف کی آواز سنائی دی۔ تاہم وہ اتنی بلند یا قریب نہیں تھی کہ وہ کچھ سمجھ سکتی۔
مریسا عقبی سیڑھیوں کی طرف جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کئی تاریک کمروں کے پاس سے گزری۔ کئی موڑ کاٹے اس کی حسِ سماعت پوری طرح بیدار تھی۔ وہ دوسری منزل کے ایسے مقام پر آگئی جہاں سے نیچے کچن کی روشنی نظر آ رہی تھی۔
آوازوں کے ساتھ قدموں کی آہٹیں بھی اُبھر رہی تھیں۔ وہ بوکھلا گئی۔ دل بھی زخمی پرندے کے مانند پھڑپھڑایا۔ آوازوں کی سمتیں مختلف تھیں۔ مریسا نے گھبرا کر اپنا ارادہ بدل دیا اور تیسری منزل کی سیڑھیوں پر قدم رکھ دیا۔ وہ بلا آواز تیزی سے تیسری منزل پر پہنچ گئی۔
وہاں رکنے کے بجائے وہ چھت پر پہنچ گئی۔ اسے فائر اسکیپ کی تلاش تھی۔ وہ نفسیاتی طور پر بلندی سے خوف کھاتی تھی لیکن اس وقت جان پر بنی ہوئی تھی۔ تمام تر ہمت جمع کر کے اس نے فائر اسکیپ کی آہنی سیڑھی پر قدم رکھ دیا۔ وہ بچوں کے مانند قدم بہ قدم نیچے جا رہی تھی ابھی وہ دوسری منزل تک ہی پہنچی تھی کہ شور شرابے کا آغاز ہوا۔
بلند آوازیں، دروازوں کے کھلنے بند ہونے کا شور مکان میں روشنی بڑھنے لگی۔ تاریک کمروں کے سوئچ بھی آن کر دیے گئے تھے صاف عیاں تھا کہ مریسا کے فرار کا بھانڈا پھوٹ چکا تھا۔
مریسا نے اپنے ساتھ زبردستی کرتے ہوئے قدرے تیزی سے اترنا شروع کیا۔ اس کی تلاش ابھی گھر کے اندر ہی جاری تھی۔

سیڑھی گھاس کے قطعے سے اوپر ہی ختم ہوگئی تاہم یہ اتنی بلندی نہیں تھی کہ وہ کود نہ سکتی۔ سیڑھی کا آخری ڈنڈا پکڑ کر وہ لٹکی تو زمین اس کے پیروں سے چند فٹ ہی دور تھی۔

مریسا نے آہنی سیڑھی کا آخری ڈنڈا چھوڑ دیا۔

☆☆☆

جیسے ہی اس کے قدموں نے گھاس کو چھوا، وہ سنبھلتے سنبھلتے بھی گر گئی۔ تاہم دوبارہ اٹھنے میں اس نے لمحہ ضائع نہیں کیا تھا۔ وہ پوری رفتار سے گیراج کی جانب دوڑی۔

قاتلوں کا ٹولہ گھر کے اندر ہی تھا لیکن کسی بھی وقت وہ باہر آنے والے تھے۔ مریسا دعا مانگ رہی تھی کہ گیراج لاک نہ ہو جیسے ہی وہ گیراج میں داخل ہوئی قدرے فاصلے پر مکان کی جانب سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

اندر رالف کی قیمتی مرسڈیز، سیڈان موجود تھی۔ مریسا کے اعصاب تنے ہوئے تھے، سانس پھولی ہوئی تھی دروازہ کھول کر وہ اندر گھس گئی۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے چابی اگنیشن میں لگا کر گھمائی۔ اسٹیئرنگ کے پیچھے مختلف پینلز کے انڈیکیٹرز روشن ہوگئے۔ تاہم انجن اسٹارٹ نہیں ہوا۔ رالف کے ساتھ ماضی میں اس نے ایک بار مرسڈیز ڈرائیو کی تھی۔ اس نے ذہن کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔

مریسا کو رالف کی ہدایات یاد آئیں۔ لگژری کار میں وزنی ڈیزل انجن لگا تھا مخصوص نارنجی رنگ کا انڈیکیٹر بجھے گا تو کار اسٹارٹ ہوگی۔ مریسا نے سوچ لگا رہنے دیا اور بے چینی سے انڈیکیٹر کو گھورنے لگی، اسے باہر سے دوڑتے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ نارنجی اشارے نے آنکھ بند کر لی اور مریسا نے سیلف لگایا۔ ساتھ ہی پھرتی سے اس نے ڈور لاک پر ہاتھ مارا۔ چاروں دروازوں کے آٹو لاک ہوگئے۔

طاقتور ڈیزل انجن ہلکی سی غراہٹ کے ساتھ بیدار ہوگیا۔ عقبی آئینے میں گیراج ڈور کے قریب کوئی سایہ لہرایا۔ مریسا نے ایکسیلیٹر دبایا۔ انجن کی غراہٹ بلند ہوگئی۔ کسی نے ڈرائیونگ سیٹ کے دروازے کے بند شیشے پر گھونسے بازی کی۔ مریسا نے ریورس گیئر میں آکر ایکسیلیٹر دبایا۔ لمحوں کا کھیل تھا، وہ کار میں نہ ہوتی تو کھیل ختم ہو چکا تھا۔ وہ ڈرائیونگ ٹیسٹ نہیں دے رہی تھی زندگی کی بازی کھیل رہی تھی۔ خلافِ معمول وہ پیڈل دباتی چلی گئی۔ وزنی لمبی مرسڈیز بپھرے ہوئے درندے کے مانند اچھلی، لہرائی اور بلند غراہٹ کے ساتھ پیچھے کی طرف بھاگی۔ مریسا کو جھٹکا لگا۔ پشت نشست گاہ سے چپک گئی۔ اس نے پوری طاقت سے اسٹیئرنگ جکڑا ہوا تھا۔ عقب میں دو افراد گیراج کا دروازہ بند کرنے کی حماقت میں مصروف تھے۔ بدمست ہاتھی کی مشتعل یلغار نے انہیں دائیں بائیں اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ مریسا نے جیکسن کی گاڑی کے قریب بریک لگائے تاہم مرسڈیز گاڑی کو ٹکر مار چکی تھی۔ دھماکا ہوا۔

مریسا نے گیئر باکس فارورڈ میں شفٹ کیا۔ اس دوران لمحاتی وقفے کا فائدہ اٹھا کر کوئی مرسڈیز کے بونٹ پر چڑھ گیا تھا۔ مرسڈیز نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ غالباً اس کا عقبی حصہ جیکسن کی گاڑی میں الجھ گیا تھا۔ مریسا نے اوسان بحال رکھے۔ دوبارہ ریورس میں گئی اور بھاری مرسڈیز کو پیچھے پھینکا۔ اس مرتبہ مرسڈیز نے دوسری گاڑی کو تقریباً روند ہی ڈالا۔ اس بار دھماکے کی آواز بلند تھی۔

مریسا پھر فارورڈ میں آئی اور پیڈل دباتی چلی گئی۔

گاڑی نے اوپر تلے دو جھٹکے لیے، دوسرا جھٹکا، الجھا ہوا عقبی دامن چھڑانے کا تھا۔ بونٹ پر چڑھے ہوئے بدمعاش کو گاڑی نے مردہ مرغی کی طرح جھٹک دیا تھا۔

مرسڈیز کمان سے نکلے تیر کی طرح پرواز کر گئی۔

مریسا کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے۔ اس نے رکی ہوئی سانس خارج کی۔

☆☆☆

''بھول جاؤ، جیک۔'' جیکسن مجروح گاڑی کے نیچے سے نکلا اور ہاتھوں پر سے گریس کے دھبے صاف کرنے لگا۔

''لونڈیا نے تمہاری گاڑی کا ریڈی ایٹر تباہ کر دیا ہے اور بھی زخم لگا گئی ہے۔ پانی بھی لیک ہوگیا ہے۔ گاڑی اسٹارٹ بھی ہوگئی تو کسی کام کی نہیں۔'' اس نے جیکسن کو بتایا۔

جیکسن نے بگڑے ہوئے تاثرات کے ساتھ ناشائستہ تبصرہ کیا اور مشتعل انداز میں ہیبر لنگ کو گھورا۔

''ائرپورٹ پر تم لوگوں کا انتظار کرنے کے بجائے اگر

میں سیدھا یہاں آتا تو ایسا نہ ہوتا۔'' جیکسن نے تلخی سے کہا۔
''ہونہہ... جیک اور جارج کے بغیر تم کیا تیر چلاتے۔ وہ تو یہاں سب کے منہ پر تھوک کر چلی گئی۔'' ہیمر لنگ نے تیوریاں چڑھائیں۔
''تم میری دوسری گاڑی استعمال کر سکتے ہو لیکن وہ فوسیٹر ہے۔'' رالف نے پیشکش کی۔
''وہ ہاتھی لے گئی ہے بکرے کے ساتھ ہم اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔'' جارج نے تبصرہ کیا۔ ''ہم اسے پکڑ ہی نہیں سکتے۔'' اس نے فیصلہ سنا دیا۔
''کیا مطلب؟'' جیکسن غرایا۔
''بعض باتیں سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں یا بہت دیر سے سمجھ میں آتی ہیں، نہ وہ ڈاکٹر ہے نہ لڑکی ہے۔''
''چڑیل ہے؟'' جیک نے پوچھا۔
''چڑیل ہے، بلا ہے، چھلاوا ہے... یہ نہیں پتا لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ ہم اسے نہیں پکڑ سکتے۔''
''وجہ؟''
''وجہ نہیں پتا۔''
''پھر ایسے ہی بولے جا رہے ہو؟''
''ایل کا جو حال ہوا تھا۔ ایک بار نہیں دو بار اس کی منطق بتا دو۔''
خاموشی۔
''ایبولا گن اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی، وجہ بتا دو؟''
خاموشی۔
''MCL میں دو آدمی مل کر اسے قابو میں نہیں کر سکے وضاحت کر دو؟''
''ولیم کھا کر بے ہوش پڑی تھی پھر کیا ہوا وجہ بتا دو؟''
خاموشی... سکوت۔
''مزید یہ...''
''بس بس۔'' جیکسن نے ہاتھ اٹھایا۔ ''سیدھا بولو تم پیچھے ہٹ رہے ہو۔''
''میں پیچھے نہیں ہٹتا۔'' جارج نے دانت پیسے۔ ''لیکن ہم اسے نہیں پکڑ سکتے۔''
''پھر...؟''
''پھر یہ کہ میں ساتھ ہوں۔''
''تمہاری بکواس سمجھ میں نہیں آئی۔'' ہیمر لنگ نے کڑوی آواز میں کہا۔
''میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔'' جارج کی آواز پرسکون تھی۔

''کوئی آئیڈیا؟'' جیکسن نے جارج کو نظرانداز کر کے رالف سے سوال کیا۔
''وہ پولیس کے پاس نہیں جائے گی۔'' رالف بولا۔
''اب وہ ہر کسی سے خوف زدہ ہے۔ ہر ایک پر شک کرے گی۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ ایبولا گن کے حصول کے لیے اکیلی سی ڈی سی جائے گی، یہ ہمارا آخری چانس ہوگا۔''

☆☆☆

مریسا کو فرار ہوئے پندرہ منٹ گزر چکے تھے۔ اس کی گھبراہٹ کم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بے مقصد ادھر اُدھر چکرا رہی تھی۔ اس نے متعاقبین کو ذہن میں رکھتے ہوئے اندھا دھند بہت سارے موڑ کاٹے پھر ایک گیس اسٹیشن پر رک گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کہاں آنکلی ہے۔ شیشہ نیچے کر کے اس نے معلومات کیں۔ جواب دینے والا مرسیڈیز کے عقبی متاثرہ حصے کو دیکھ رہا تھا۔ تاہم اس نے کسی تبصرے سے احتراز کیا۔ بہرحال ایموری یونیورسٹی کے بارے میں گیس اسٹیشن والے نے الٹا سیدھا کچھ نہ کچھ بتا ہی دیا۔
مریسا نے شکریہ ادا کیا۔ تھوڑی جدوجہد کے بعد سی ڈی سی کی عمارتوں کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے رفتار کم کر دی تھی۔ وہ ابھی تک حتمی فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔ کیا اسے خود کسی اچھے وکیل کو تلاش کرنا چاہیے۔
اس کے ذہن میں عالمی ادارۂ صحت کے ڈاکٹر احمد نخری کا نام بار بار سر اٹھا رہا تھا۔ وہ پیچ ٹری پلازا میں ٹھہرا ہوا تھا لیکن کیا وہ اس کی کہانی پر یقین کر لے گا یا نورس اور سی ڈی سی کے کسی اور افسر سے رابطہ کرے گا۔
اس کے خوف زدہ ذہن میں گاہے گاہے منطقی خیال آ رہے تھے کہ پہلے ویکسی نیشن یا ایبولا گن پر قبضہ کیا جائے گا۔ اس کے پاس واحد ٹھوس ثبوت وہی گن تھی۔ ٹیڈ کا کارڈ ابھی تک اس کے پاس محفوظ تھا۔ اگرچہ اس بات کا احتمال تھا کہ سیکیورٹی والے اسے اندر داخل نہ ہونے دیں۔
بالآخر دل کڑا کر کے اس نے ایک دلیرانہ فیصلہ کیا اور پراعتماد انداز میں سی ڈی سی کی حدود میں داخل ہو گئی۔
سامنے والے دروازے پر اسے گارڈ نظر آیا۔ وہ ایک ڈیسک کے عقب میں بیٹھا کوئی ناول پڑھ رہا تھا۔ مرسیڈیز کی آواز سن کر اس نے سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ مریسا نے نچلا ہونٹ چبایا،ور کار سے اتر گئی۔ اس نے اپنی چال اور تاثرات کو نارمل رکھا ہوا تھا۔
اس نے کچھ کہے بغیر لاپروائی سے قلم اٹھا کر سائن اِن بک پر نام لکھا پھر گارڈ کو دیکھا مریسا کو توقع تھی کہ وہ کچھ

بولے گا تاہم وہ سستی سے مریسا کو دیکھ رہا تھا۔ غالباً اس کی توجہ ناول کی طرف سے نہیں ہٹی تھی۔

''کیا پڑھ رہے ہو؟'' وہ مسکرائی۔

''کیمس۔'' وہ بولا۔

مریسا، مرکزی ایلیویٹر کی جانب بڑھ گئی۔ اس کی نسوانی حس بتا رہی تھی کہ گارڈ کی نگاہ اس کی پشت پر ہے۔ اس نے مطلوبہ فلور کا بٹن دبایا اور مڑ کر دیکھا۔ گارڈ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

مریسا، ایلیویٹر میں داخل ہوئی۔ ایلیویٹر کا دروازہ بند ہوتے ہی گارڈ کی سستی ختم ہوگئی۔ اس نے ڈیسک پر موجود فون اٹھایا۔

''بہت اچھے، جیروم۔ بہت عمدہ۔'' نورس نے بھرائی ہوئی آواز میں گارڈ کی تعریف کی، آواز سے نورس تھکا ہوا بیمار لگ رہا تھا۔ ''ہم پہنچ رہے ہیں اور کسی بھی فرد کو اندر مت جانے دینا۔ غور سے سنو کسی بھی صورت میں کسی اور کو اندر مت جانے دینا۔'' نورس نے تاکید کرتے ہوئے فقرہ دہرایا۔ ''اپنے دونوں بندوں کو چوکس کر دو۔''

''باس آپ بے فکر ہو جائیں۔'' جیروم نے مستعدی سے جواب دیا۔

☆☆☆

مریسا ایلیویٹر سے نکلی۔ کچھ دیر دونوں ایلیویٹر کے انڈیکیٹر کی نگرانی کرتی رہی۔ دونوں ساکت تھے۔ عمارت میں خاموشی کا راج تھا۔ بعدازاں اس نے پھرتی سے پیش قدمی شروع کر دی۔ اس کی منزل MCL لیب تھی۔

MCL میں پہنچ کر اس نے تمام حفاظتی اقدام کیے۔

وہ اس جگہ پہنچ گئی جہاں ٹیڈ اپنی ذاتی اشیا رکھتا تھا۔ دل ہی دل میں وہ دعا گو تھی کہ اس کا مطلوبہ پیکٹ ٹیڈ نے کسی اور جگہ نہ چھپایا ہو۔

اس کا دل بلیوں اچھل پڑا۔ پیکٹ اسے با آسانی مل گیا۔ ''شکریہ ٹیڈ۔'' وہ بڑبڑائی۔ مزید یقین کرنے کے لیے اس نے پیکٹ کی تحریر دیکھی۔

ٹیڈ کے نام اس نے اپنی ہینڈ رائٹنگ پہچان لی تھی۔

پیکٹ اس نے نئے گاربیج بیگ میں منتقل کیا۔ واپسی پر اس نے تمام حفاظتی سامان الگ کیا۔ کپڑے تبدیل کیے فلٹر سسٹم آف کیا اور باہر نکل گئی۔ اب ڈاکٹر فخری یا اتھارٹی میں سے کسی ایسے شخص سے ملنے کا وقت تھا جو قابلِ اعتماد ہو۔ کپڑے تبدیل کرنے سے قبل وہ فینولک ڈس انفیکٹ کے شاور میں مخصوص وقت گزارنا نہیں بھولی تھی۔

پیکٹ حاصل کر کے مریسا ہیجانی کیفیت میں آ گئی تھی۔

☆☆☆

نورس بہت تیز ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ اس نے بیں سی ڈی سی کے داخلی دروازے کے سامنے بریک لگائے۔ پہیوں کی چیخ بلند ہوئی۔ گاڑی پھسلی اور ترچھی ہو کر رک گئی۔

گارڈ جیروم، گلاس ڈور کے ساتھ چوکس کھڑا تھا۔

نورس نے کچھ پوچھنے کی زحمت نہیں کی۔ جیروم کی خاموشی بتا رہی تھی کہ مریسا عمارت میں ہے۔ تینوں اندر داخل ہو گئے۔ نورس دوڑتا ہوا ایلیویٹر کی طرف گیا۔ اس کے ساتھی اس کے پیچھے تھے۔

نورس نے تیسری منزل کا بٹن دبا دیا۔

☆☆☆

مریسا وائرلوجی ڈیپارٹمنٹ کے پاس سے گزری ہی تھی کہ مرکزی عمارت کا دروازہ اچانک کھلا اور تین آدمی نمودار ہوئے۔ مریسا لٹو کے مانند گھوم کر واپس بھاگی۔

''مریسا... رک جاؤ۔'' کوئی چیخا۔

مریسا کو سماعت کا دھوکا معلوم ہوا۔ وہ نورس کی آواز تھی۔

''اوہ گاڈ... کیا وہ بھی اس کے تعاقب میں ہے؟''

وہ ایک کھلے دروازے میں گھسی اور اسے بند کر دیا۔ دائیں جانب ایلیویٹر تھا بائیں جانب سیڑھیاں۔ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔

نورس دروازہ کھول کر اندر گھسا تو ایلیویٹر کا اشارہ بتا رہا تھا کہ مریسا لابی کے لیول پر ہے۔ تینوں سیڑھیوں کی طرف لپکے۔

مریسا جانتی تھی کہ نورس زیادہ دور نہیں ہے۔ گارڈ کو الرٹ کیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ وہ اپنی رفتار کم نہیں کر سکتی تھی۔ گارڈ جیروم ڈیسک پر تھا۔ دل تو اسے گمان نہیں تھا کہ مریسا اکیلی واپس آئے گی اور وہ بھی اس انداز میں۔ جب تک اس کی توجہ پوری طرح ناول سے ہٹتی مریسا اڑتی ہوئی اس کے قریب سے گزر گئی۔ جیروم بھونچکا کھڑا تھا۔ تاہم اس نے وزنی پسٹل نکال لیا تھا اور مرسیڈیز کے قریب گھات لگائے دونوں ساتھیوں تک بذریعہ وائرلیس نورس کی آخری ہدایت پہنچا دی تھی۔

جب تک وہ مریسا کو زبردستی روکنے کا فیصلہ کرتا، وہ رالف کی کار تک پہنچ چکی تھی۔

عقب میں چیخ و پکار بلند ہوئی۔ مریسا نے مرسیڈیز میں گھس کر پیکٹ ایک طرف ڈالا اور دروازہ بند کر کے

اسٹیئرنگ سنبھالا۔ اسی وقت مریسا کی سانس رک گئی۔ پسنجر سیٹ خالی نہیں تھی۔ عقبی نشست پر بھی کوئی موجود تھا۔ سب سے خوف ناک وہ بڑا سا ریوالور تھا جس کا رخ مریسا کی جانب تھا۔

مریسا کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے گھومنا چاہا لیکن جسم میں جان نہیں تھی۔ مسامات نے پسینہ اگل دیا۔ آنکھوں میں نمکین پانی اتر آیا۔ حسین چہرے پر کرب اور اذیت کے سوا کچھ نہ تھا۔

اس نے ایک بے آواز سسکی لی۔ یہ تھا اختتام مہینوں کی بھاگ دوڑ، جان لیوا کشمکش کا دی اینڈ... پیشے سے دیانت اور وابستگی کا انجام۔

مدھم روشنی میں اس نے دھندلی نظر سے ریوالور والے کا چہرہ دیکھا، ایک آواز آئی۔ ''گڈ بائے۔'' دھماکا ہوا، وقت کی گردش رک گئی۔ کائنات میں کچھ نہ تھا... گھور اندھیرے کے سوا۔

☆☆☆

مریسا کو ہوش آیا تو کوئی اسے پکار رہا تھا۔ وہ کسی نرم چیز پر لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔

''کیا میں زندہ ہوں؟'' اس کے ذہن نے پہلا سوال کیا۔

''مریسا... مریسا...'' آواز پھر سنائی دی۔

مریسا نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ نگاہ چھت پر گئی پھر پتلیوں نے آہستہ سے گردش کی۔ سی ڈی سی کا کمرا اس نے پہچان لیا تھا۔ کمرے میں کافی لوگ آجا رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں اس کے ہوش وحواس بحال ہو رہے تھے۔ وہ ریوالور والا کہاں گیا؟ اس نے سوچا اسے یقین آتا جا رہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔

''مریسا...'' وہی آواز پھر آئی۔ آواز میں درد تھا۔ مریسا کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ نورس کی آواز تھی۔ اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

وہ رنگین خواب تھا یا دلکش تصورات تھے۔ عجب نیرنگیِ حیرت تماشا تھی۔ غالباً اظہار تمنا سے غمِ پنہاں تک دشوار مراحل طے ہوچکے تھے۔ وہ محبوب نظر، آفتِ جاں پر تفکر انداز میں اس پر جھکا ہوا تھا۔ سیاہ آنکھیں، غم وخوف سے مزید سیاہ ہوگئی تھیں۔ مریسا پلکیں جھپکانا بھول گئی۔

نورس کا اندازِ نظر بدلا ہے یا مزاجِ غم؟ یا اخفائے غمِ عشق اب منظور نہیں۔ کیا وقتِ اظہار آن پہنچا... وہ مقناطیسی آنکھوں کی سیاہی میں غوطہ زن تھی۔

''مریسا تم ٹھیک ہو؟'' اس نے پھر لب کشا کیے۔

مریسا نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا اور مسکراہٹ دبائی۔ رابطہ نطق وزباں کیا جواب دوں؟

''کچھ بولو، گھورے جا رہی ہو۔''

وہ چپ رہی۔ مفہوم تیری نظر کا پالوں تو کہوں۔ حسنِ یقین پر مسکرالوں تو کہوں یا خود ہی بتادو کہ سربکف ونغمہ بلب کیا بیتی... میں کیا کہوں؟ مسحور جمال کرتے ہو، آنکھوں آنکھوں میں دل لیے جاتے ہو اور پوچھتے ہو، حال کیا ہے۔ کیوں کہوں کہ نظارہ طلب ہے جانِ نظارہ... تسکین نظر سے، شوق بے پایاں تک، دیدۂ حیراں کو حیراں ہونے دو۔

''مریسا، کیا محسوس ہو رہا ہے؟'' وہ اس کے نفی میں سر ہلانے پر مزید زار وزبوں نظر آیا۔ مریسا اندر ہی اندر لطف اندوز ہو رہی تھی۔ کیوں آج نوائے درد ہے ہوش طلب؟ اس نے بے آواز نورس سے سوال کیا۔ کہاں معدوم ہوئی بے رخی وبے اعتنائی۔

''کچھ تو بولو۔'' اس نے بے قرار ہوکر مریسا کے شانے پر ہاتھ رکھ لیا پھر چونک کر ہاتھ ہٹایا۔ ''سوری۔'' شاید اسے ماضی کی حرکت یاد آگئی تھی۔ مریسا بے اختیار ہوگئی۔ کشمکش بیم ورجا معدوم ہوگئی۔ اس نے نورس کا ہاتھ پکڑ کر واپس شانے پر رکھ لیا۔

''سوری کیوں؟'' اس کے لبوں پر مسکراہٹ کی کلی پھوٹی۔ ''اتنی دور سے سوالات کیے جا رہے ہو؟'' مریسا کے چہرے پر شرارت ناچ رہی تھی۔

نورس کی آنکھوں میں تحیر نے انگڑائی لی۔ وہ کئی سوالات کے جواب پا گیا۔ مسکرا کر سیدھا ہوا تاہم ہاتھ مریسا کے شانے پر ہی رہنے دیا۔

''ڈر بٹھا دیا ہے تم نے سینے میں، ورنہ قریب سے جواب حاصل کرلیتا۔''

''اور ورد بٹھا دیا تھا تم نے دھڑکنوں میں، ورنہ اتنی دیر خاموش نہ رہتی۔'' مریسا نے ترنت جواب دیا۔

☆☆☆

''ہمیں بہت دیر سے اندازہ ہوا کہ آخر ہوا کیا ہے اور تم کیوں اپنی تحقیقات پر اڑی ہوئی ہو؟'' نورس، مریسا کے سوالات کے جواب دے رہا تھا۔ ''تمہارے تحفظ سے متعلق میں شدید پریشانی کا شکار رہا کیونکہ ہمیں ادراک ہوگیا تھا کہ تمہیں راستے سے ہٹا دیا جائے گا لیکن تم نے موقع ہی نہیں دیا کہ میں تم سے رابطے میں آتا۔'' میں نے ایف بی آئی کی

مددحاصل کی۔ معاملہ نیشنل ایمرجنسی کی شکل اختیار کر چکا تھا۔
''میں اس غلط فہمی کا شکار رہی کہ تم مجھ سے بدظن ہوچکے ہو یا پھر سازش کا حصہ ہو۔'' مریسا کی آواز میں معذرت تھی۔
''مجھے یہ شک ہوچلا تھا کہ تم میرے بارے میں کس طرح سوچ رہی ہو۔'' نورس نے اظہارِ افسوس کیا۔ ''لیکن قصور میرا تھا میں سی ڈی سی کی ساکھ بچانے میں لگا رہا اور متواتر تمہارے نظریات اور خیالات کورد کرتا رہا لیکن یقین کرو کہ اس میں میری کوئی بدنیتی شامل نہیں تھی۔''
مریسا نے اس کا ہاتھ پکڑلیا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں نے بھی تمہیں سمجھنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی اور متواتر اصول توڑنے میں لگی رہی۔''
اسی دوران میں ایک ملازم نے آکر اسپتال کے بارے میں پوچھا۔
''اسپتال چلوگی؟'' نورس نے سوال کیا۔
''کیوں؟''
نورس سر کھجانے لگا۔ ''میرا مطلب ہے۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے تمہاری۔''
''اب تو ٹھیک ہوئی ہوں البتہ تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔''
''وہ کیسے؟''
''بتادوں؟'' مریسا نے اس کا ہاتھ دبایا۔
''یہاں پر؟'' نورس اس کے ذومعنی انداز پر حیران تھا۔
''چلو معاف کیا پھر سہی۔''
''تم بے ہوش کیوں ہوگئی تھیں؟''
''میں جس پوزیشن میں تھی، دھماکا ہوتے ہی یہی سمجھی کہ...''
''نہیں گولی ایف بی آئی کے آدمی نے چلائی تھی۔ انہیں میں پہلے ہی الرٹ کرچکا تھا۔ گارڈ بھی ایف بی آئی کا تھا۔ چار آدمی اور تھے۔ دو میرے ساتھ تمہیں بچانے کے لیے سی ڈی سی میں گئے تھے۔ باہر موجود باقی تینوں کو بشمول جیروم، ہدایت تھی کہ ہر قیمت پر تمہیں بچانا ہے۔''
''بڑی فکر تھی میری؟'' مریسا کی آنکھوں میں شرارت ناچی۔
''شروع سے تھی۔'' نورس خجل سا دکھائی دیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر کاربونورا کے اصرار پر مریسا نے دو ہفتے کی چھٹی قبول کی۔ واپسی پر وہ سامان کھول رہی تھی۔ چھٹی کے دوران میں ورجینیا میں وہ اپنی فیملی سے بھی ملی تھی۔ جہاں اس کی خوب ہی خاطر تواضع کی گئی۔ واپسی پر ٹفی جیسا ایک کتا بھی اس کے حوالے کیا گیا۔ جس کا نام مریسا نے ٹفی 2 رکھ دیا۔
اچانک دروازے کی گھنٹی کی آواز گونجی۔ مریسا نے حیرت محسوس کی، کون ہوسکتا ہے۔ اس نے کسی کو بھی اپنی واپسی کی ٹھیک ٹھیک تاریخ نہیں بتائی تھی۔ اس نے دروازہ کھول کر حیرت سے نورس کو دیکھا۔ نورس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ مریسا نے ذہن پر زور دیا۔
''امید ہے کہ اس طرح اچانک وارد ہونے پر معذرت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' نورس مسکرایا۔ ''ڈاکٹر کاربونارا کے ذریعے معلوم ہوا تھا کہ تم واپس آگئی ہو اور ڈاکٹر فخری تم سے ملنا چاہتے تھے۔ یہ ان کا امریکا میں آخری دن ہے۔ ڈاکٹر فخری آج رات جنیوا واپس چلے جائیں گے۔''
ڈاکٹر فخری نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''میرے لیے یہ ایک اعزاز ہے۔'' وہ بولا۔ ''میں اس شخصیت کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا جس نے نامساعد حالات میں شاندار جاسوسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بدترین سازش کا پردہ چاک کیا۔''
''اور ہماری مدد و تعاون کے بغیر۔'' نورس نے لقمہ دیا۔
مریسا نے گلابی چہرے کے ساتھ خجالت محسوس کی۔ اسے کوئی مناسب جواب نہیں سوجھا۔ ''شکریہ ڈاکٹر۔'' وہ احمد فخری کا ہاتھ تھام کر اتنا ہی کہہ سکی۔
''ہم نے سوچا کہ تمہیں حقائق بتائے جائیں۔'' اس نے کہا۔ ''پریس نے اختصار سے کام لیا ہے۔ تاہم پولیس اتفاق کرتی ہے کہ تم نامعلوم اطلاعات کی حق دار ہو۔''
''اوہ، نائس ... یقیناً مجھے خوشی ہوگی پلیز اندر آجائیے۔''
وہ تینوں اطمینان سے بیٹھ گئے تو ڈاکٹر فخری نے ایک بار پھر اظہارِ تشکر کیا۔ ''ایبولا سے متعلق ہر آدمی گرفتار ہوچکا ہے۔ جس آدمی کو تم نے سان فرانسسکو میں زخمی کیا تھا، اس نے سرجری کے بعد ہوش میں آتے ہی ہیبرلنگ کو ذمے دار ٹھہرادیا شاید اسے اپنی جان خطرے میں نظر آرہی تھی کیونکہ ہوٹل میں ایک قتل کا مرتکب ہوچکا تھا۔''
''وہاٹ؟'' مریسا کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔
''تمہارے کمرے میں گھسنے سے قبل اس نے چابی کے حصول کے لیے اسی فلور پر ایک ملازمہ کو قتل کردیا تھا۔'' مریسا جھرجھری لے کر رہ گئی۔
''تم نے فائٹنگ کب اور کہاں سیکھی؟'' نورس اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا۔ ''تمہارا قاتل خود تمہارے ہاتھوں

مقتول ہوتے ہوتے رہ گیا۔ وہ جیل میں رہنا چاہتا تھا۔ اس کے بیان کا ایک حصہ اس خطرے کو ظاہر کررہا تھا کہ ہیبر لنگ اسے مروا دے گا۔ اس کا بیان کافی طویل تھا۔ وہ پولیس سے بھرپور تعاون کررہا تھا۔ اسی میں اس کی بچت کا پہلو نکلتا تھا۔ تاہم زیادہ سے زیادہ وہ سزائے موت سے بچ جائے شاید۔''

''ہیبر لنگ کا کیا بنا؟'' مریسا نے سوال کیا۔

''اسے گرینڈ جیوری کا سامنا ہے۔ اس کے جرائم کی فہرست طویل ہے جن میں قتل کی وارداتیں بھی شامل ہیں جو اس نے خود کیے یا کروائے۔''

''جس نے مجھ پر ایبولا گن سے حملہ کیا تھا، کیا وہ زندہ ہے؟''

''ہاں، اسے بروقت سیرم انجکٹ کردی گئی تھی تاہم کچھ عرصے بعد مرض کی پیچیدہ علامتیں ظاہر ہونے لگیں۔ وہ اسپتال میں ہے شاید ہی بچ پائے۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔''

''تو میں بھی قاتل ہوئی؟''

''وہ تو تم شروع سے ہو۔'' نورس رکتے رکتے بھی بول گیا۔

ڈاکٹر فخری دلچسپی سے دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ فخری کی موجودگی کی وجہ سے ہی مریسا نے نورس کے آخری فقرے کا جواب نہیں دیا بس گھور کر رہ گئی۔

''اور PAC کے دیگر افسران؟'' مریسا نے ایک اور سوال کیا۔

''کئی ایک نے اسٹیٹ ایویڈینس کے طور پر گواہ بننے کی پیشکش کی ہے جس کے باعث تحقیقات اور تفتیش سہل تر ہوگئی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر ممبر اصل سازش سے بے خبر تھے یا پھر اس کے خلاف...''

''ڈاکٹر تائی مین کے بارے میں بتاؤ؟''

''تم نے اس سے مل کر جس دیری کا مظاہرہ کیا، وہ قابلِ قدر ہے۔ تائی مین کی جان بہت آسانی سے چھوٹ جائے گی کیونکہ اس میں قوتِ فیصلہ تھی۔ اس نے فوری ردعمل کا مظاہرہ کیا، اپنے وکیل سے رابطہ کرنے کے بعد اولین تعاون کی پیشکش اسی کی جانب سے آئی تھی۔''

''گروپ دیوالیا ہوچکا ہے کیونکہ سیکڑوں اموات ہوگئیں تمام متاثرہ خاندانوں نے کیس دائر کردیے ہیں۔'' ڈاکٹر فخری نے بتایا۔ ''نہ صرف PAC بلکہ ڈاکٹروں پر بھی انفرادی طور پر [illegible]''

''اور جوشوا جیکسن کا؟''

''ہیبر لنگ اور وہ مرکزی مجرم [illegible]

ختم سمجھو۔''

''رالف؟'' مریسا نے یک لفظی سوال کیا۔

''ہاں وہ ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ تاہم اس کے خلاف شواہد اتنے مضبوط ہیں کہ اب طویل عرصے تک سلاخوں کے پیچھے تجربات کرے گا۔''

''میں سمجھتی ہوں۔'' مریسا نے گہری سانس لی۔ ''تو آناً فاناً سب کچھ ختم ہوگیا۔''

''سب تمہاری مستقل مزاجی اور سرتوڑ محنت کے باعث ہوا جس کا شکریہ ادا نہیں کیا جاسکتا۔''

''کیا تو جاسکتا ہے۔'' مریسا کو ذو معنی فقرہ اچھالنے کا موقع مل گیا۔ اس مرتبہ نورس نے خاموشی اختیار کی اور بات بدلی۔

''تو سی ڈی سی کب واپس آرہی ہو؟ MCL کی کلیرنس تمہارے لیے تیار پڑی ہے۔ کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی چاہو تو وہیں بستر لگالو۔''

''میں نے ابھی فیصلہ نہیں کیا۔'' وہ بولی۔ ''میں پیڈیاٹرک کے شعبے میں واپسی کا سوچ رہی ہوں۔''

''واپس بوسٹن؟'' نورس کا چہرہ لٹک گیا۔

''سی ڈی سی کے لیے یہ ایک بہت بڑا نقصان ہوگا۔'' فخری نے تبصرہ کیا۔ ''تم امریکا میں نہیں بلکہ بین الاقوامی ایپی ڈیمیالوجیکل ہیرو بن چکی ہو۔''

''میں نظرثانی کے بارے میں غور کروں گی۔'' مریسا نے وعدہ کیا۔ ''تاہم اگر میں نے پیڈیاٹرک کا شعبہ واپس منتخب کیا تو میرا قیام اٹلانٹا میں ہی رہے گا۔'' وہ رکی اور پھر گویا ہوئی۔ ''لیکن میری ایک درخواست ہے؟''

''میں مکمل تعاون کی یقین دہانی کراتا ہوں۔'' فخری نے کہا اور مریسا کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

مریسا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ کام صرف نورس ہی کرسکتا ہے کہ میں پیڈیاٹرک میں واپس جاؤں یا نہیں مجھے امید ہے کہ وہ ایک بار پھر مجھے ڈنر کی آفر کرے گا۔''

نورس بیٹھے بیٹھے ڈگمگا گیا۔ اس کی نظر فخری کے الجھن زدہ تاثرات پر پڑی۔ نورس ہنسنے لگا۔ فخری کو کچھ نہیں پتا تھا اس کے سامنے کیا ہورہا ہے۔ اپنے باس کو [illegible] دیر سے نورس کچھ کہہ رہا تھا وہ نفی [illegible] آخری جملے نے [illegible] تھا۔ فخری [illegible] وہاں [illegible]

نورس [illegible]

مت سوچ [illegible]

اکیلے دکیلے

منظر امام

فکرِ روزگار کی پریشانی ہر شخص کو لاحق ہے... بے روزگاری اور تنگ دستی سے نالاں ایسے ہی تین دوستوں کی کہانی... دوستی... تعلق داری اور کام چوری ان تینوں کی فطرت میں یکجا تھیں... انہی یکساں خصوصیات نے انہیں ایک دوسرے سے باندھ رکھا تھا...

ایک کہاوت کا دامن تھام کر چلنے والوں کا مشترکہ انجام
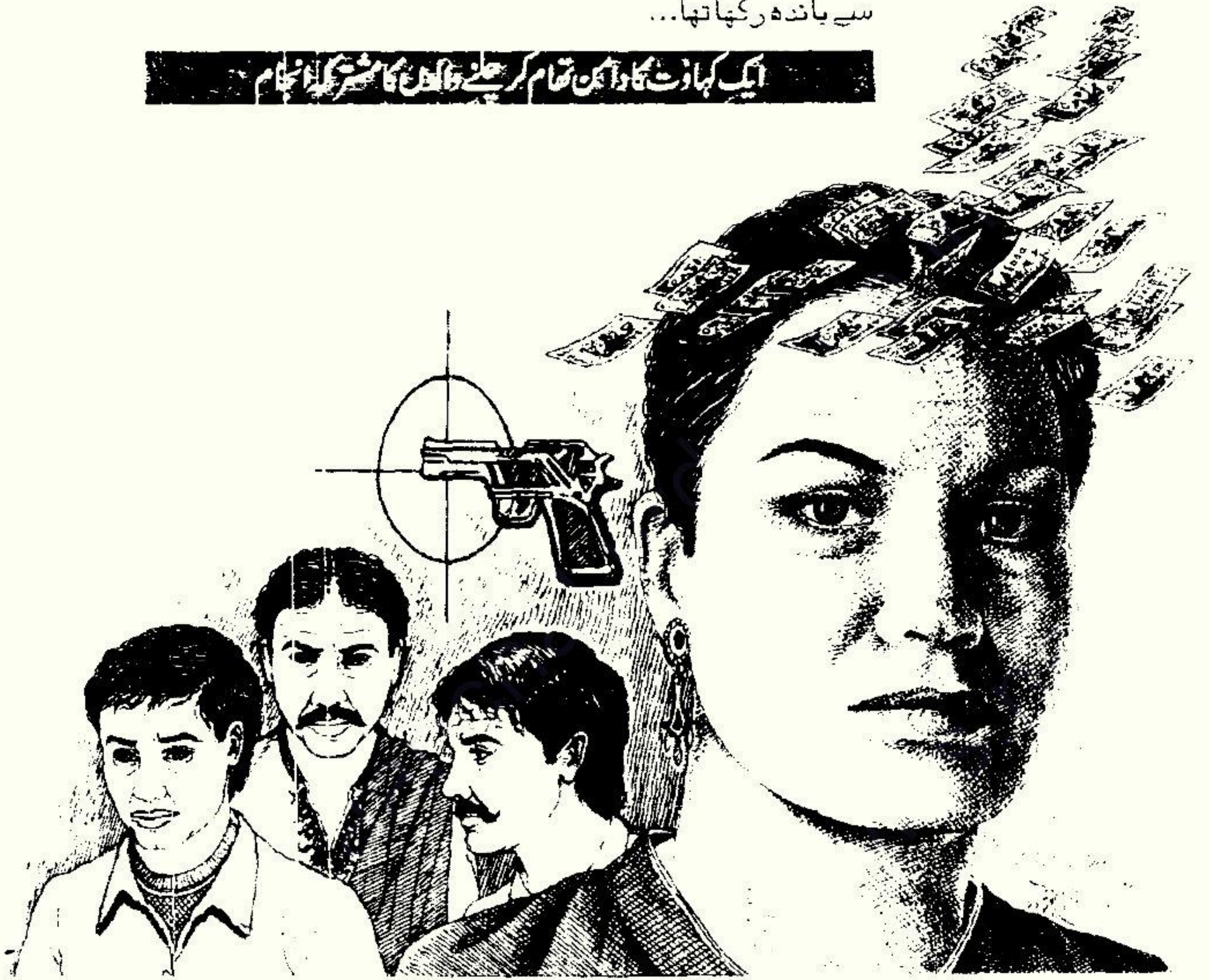
ایک بہت پرانی کہاوت ہے۔ ''اکیلے دکیلے کا اللہ بیلی۔''

اس کہاوت کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ پرانی دہلی سے کچھ فاصلے پر ایک راستہ جنگل کے اندر سے جاتا تھا۔ اس راستے پر ایک بوڑھی عورت بیٹھ کر بھیک مانگا کرتی تھی۔ جھاڑیوں کے پیچھے اس کی جھونپڑی تھی۔ جس میں اس کا پورا خاندان رہا کرتا تھا۔ وہ سب کے سب ڈاکو تھے۔ اب اگر ایک یا دو مسافر اس راستے سے گزرتے تو بڑھیا آواز

لگاتی۔ ''اکیلے دکیلے کا اللہ بیلی...''
اس کے خاندان والوں کو پتا چل جاتا کہ کوئی اکیلا جا رہا ہے۔ پھر سب جھاڑیوں سے نکل کر اس بے چارے مسافر پر ٹوٹ پڑتے اور اس کو لوٹ لیتے تھے۔
اب اگر زیادہ لوگ گروپ کی شکل میں آ رہے ہوتے تو آواز لگاتی۔ ''جمعہ، جمعرات کی خیر۔''
پھر وہ لوگ سمجھ جاتے اور جھاڑیوں سے باہر نہیں آتے تھے۔ اس کہاوت کا سبق یہ تھا کہ گروپ کی صورت میں چلنا زیادہ محفوظ ہے۔
اب اس کہاوت کو ذرا آج کے تناظر میں دیکھیں کہ اگر کوئی کہانی بنتی ہے تو وہ کیا ہوگی۔
وہ تینوں بالکل ناکارہ تھے۔
تینوں ایک دوسرے کے رشتے میں بھائی ہوتے تھے۔ بالے کی دو خالائیں تھیں۔ شکور ایک خالہ کا بیٹا تھا اور اکرم دوسری خالہ کا۔ اس طرح وہ تینوں خالہ زاد بھائی تھے۔ ان کا بچپن بھی ایک ساتھ گزرا تھا۔ تینوں کی عادتیں بھی تقریباً ایک ہی جیسی تھیں۔ یعنی تینوں ہی ناکارہ تھے۔ بالے کے باپ کے انتقال کے بعد اس کی ماں کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ ایک بہن تھی جو شادی ہو کر کسی اور شہر چلی گئی تھی۔
شکور اور اکرم کے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی بلکہ ان کے مالی حالات اور بھی خراب تھے۔ کیونکہ بالے کے پاس تو دو کوٹھریوں کا ایک کچا گھر بھی تھا جبکہ ان دونوں کے پاس وہ بھی نہیں تھا اس لیے وہ دونوں بالے ہی کے پاس آ کر رہنے لگے تھے۔
انہوں نے نہ تعلیم حاصل کی تھی اور نہ ہی ان کے پاس کوئی ہنر تھا۔ بالے کے گھر میں کچھ راشن رکھا ہوا تھا۔ وہ کچھ دنوں تک چلتا رہا لیکن کب تک... آہستہ آہستہ وہ بھی خرچ ہوتا چلا گیا۔
ایک رات وہ تینوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ اب زندگی کیسے گزاری جائے۔ گھر کا خرچ کیسے چلے۔
شکور نے مشورہ دیا۔ ''کیوں نہ ہم تینوں کسی دفتر میں ملازمت کر لیں۔''
بالے یہ سن کر بھنا گیا۔ ''ابے کیا پاگل ہو گیا ہے۔ کون ہمیں دفتر میں نوکری دے گا۔ ہم نے کون سا لکھنا پڑھنا سیکھا ہے۔ دفتروں میں پڑھے لکھے رکھے جاتے ہیں۔''
''کیوں نہ چھوٹا موٹا کام ڈھونڈ لیں۔'' اکرم نے کہا۔ ''جیسے مزدوری۔ قلی بن جائیں۔''
''ابے قلی بننا کوئی اتنا آسان نہیں ہے۔'' شکور نے کہا۔ ''ایک بار میں نے ٹرائی کی تھی لیکن جو قلی ہیں وہ باہر کے بندے کو آنے نہیں دیتے اور ٹھیکیدار سے بات کرو تو ہزاروں روپے کی رشوت مانگتا ہے۔''
''اس کے علاوہ آج کل ٹرینیں چلتی ہی کہاں ہیں؟'' بالے نے کہا۔ ''زیادہ تر تو کھڑی ہی رہتی ہیں۔''
''پھر ایک راستہ رہ جاتا ہے۔'' اکرم کچھ سوچ کر بولا۔ ''کیوں نہ کسی ہوٹل میں کام کریں۔''
''کس ہوٹل میں۔''
''کسی بھی چھوٹے، موٹے ہوٹل میں۔ جیسے چائے کے ہوٹل ہوتے ہیں۔ باہر والے کا کام۔ کچھ نہ کچھ اس میں مل ہی جاتا ہے۔''
''ہاں یہ مشورہ ٹھیک ہے۔'' بالے نے تائید کی۔
''لیکن ایسا کون سا ہوٹل ہوگا جو ہم تینوں کو ایک ساتھ رکھ لے۔''
''کیا ضروری ہے کہ ہم تینوں ایک ہی ہوٹل میں کام کریں۔'' اکرم نے کہا۔ ''الگ الگ بھی کر سکتے ہیں۔''
''ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔'' شکور نے گردن ہلائی۔
''اب ایک بات اور بھی سن لو۔'' بالے نے کہا۔ ''اس پر ہم تینوں کو عمل کرنا ہوگا اور وہ یہ ہے کہ فرض کرو کہ کسی ایک کو کام مل گیا اور دوسرے کو نہیں ملا تو ہم یہ کر سکتے ہیں کہ وہ کام کرنے والا بقیہ دونوں کا خرچہ اٹھائے گا۔''
''ہاں ہاں، یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔'' شکور جلدی سے بولا۔ ''جب ساتھ رہ رہے ہیں تو خرچہ بھی ساتھ مل کر ہی کریں گے۔''
جب یہ بات طے ہوگئی تو تینوں سکون کی نیند سو گئے۔
اور یہ اتفاق ہی تھا کہ دوسرے دن ان تینوں کو ہی نوکری مل گئی یہ اور بات ہے کہ الگ الگ ہوٹلوں میں ملی تھی لیکن تینوں برسرِ روزگار ہو گئے۔
رات دس بجے کے قریب جب تینوں اکٹھا ہوئے تو تینوں ہی بہت جھنجلائے ہوئے تھے۔
''یارو، کُتّے کی سی خواری ہوئی ہے۔'' شکور اپنی کمر کو دباتے ہوئے بولا۔ ''کام کروا کروا کے مار دیا کم بختوں نے۔''
''مجھ سے یار جھاڑو بھی لگوائی ہے۔'' بالے نے کہا۔ ''کبھی زندگی میں اتنی محنت نہیں کی۔ جتنی آج کر کے آ رہا ہوں۔''
''اور میرا تو حال ہی مت پوچھو۔'' اکرم بھی بول پڑا۔ ''دو باہر والے ہوتے ہیں۔ آج ایک نے چھٹی کر لی تھی

تو سارا ملبا مجھ پر گر گیا۔ یار دوڑتے دوڑتے میری تو ٹانگیں جواب دے گئی ہیں۔''
''نہیں بھائی، اس قسم کی محنت اپنے بس کی بات نہیں ہے۔'' شکور نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔
''تو پھر کیا کریں؟''
''ایک ترکیب ہے میرے پاس۔'' اکرم نے کہا۔
''لیکن آج نہیں بتاؤں گا۔کل بتاؤں گا۔''
دوسرے دن ان میں سے کوئی کام پر نہیں گیا۔شام کے وقت اکرم کہیں چلا گیا تھا اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دو شاپرز تھے۔ ایک میں سالن تھا۔ دوسرے میں گرما گرم روٹیاں۔
''ابے یہ سب کہاں سے لے آیا۔ کس نے دلوائی ہیں؟'' بالے نے پوچھا۔
''اِس نے۔'' اکرم نے اپنی جیب سے ایک پستول نکال لیا تھا۔ اس نے دلوائی ہیں۔''
''یہ کیا؟'' بالے اور شکور بدک اٹھے۔''یہ کیا لے آیا ہے۔ یہ کہاں سے مل گیا تجھے؟''
''اپنے ایک جاننے والے سے لیا ہے۔'' اکرم نے بتایا۔''اور اس نے وہ کام دکھایا ہے کہ بس کچھ مت پوچھو، پورے دس ہزار ہاتھ لگے ہیں۔''
''ابے کھل کر بتا، کیا کر کے آیا ہے۔'' بالے نے کہا۔
''دیکھو بھائیو ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہا ہے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر اس کام کا ارادہ کیا ہے۔ یہ جو چڑیا ہے نا (اس نے پستول کی طرف اشارہ کیا) یہ ہے تو بہت چھوٹی سی چیز۔لیکن اس کو دیکھ کر بڑے بڑوں کا جگر پانی ہو جاتا ہے۔''
''تو تو نے کسی کو لوٹا ہے؟''
''ہاں۔'' اکرم مسکرا دیا۔''اے ٹی ایم مشین سے باہر نکلا ہی تھا کہ میں نے اسے چھاپ لیا۔کم بخت کی جیب سے صرف دس ہزار ہی نکلے۔''
''یار، یہ تو بہت خطرناک کام ہوا۔''
خطرے کے بغیر تو گاڑی بھی نہیں چلتی پیارے۔ بھوکا مرنے سے تو بہتر ہے نا۔ پھر ہم لوگ بہت ہوشیاری سے کام کریں گے۔ زیادہ کی ہوس بھی نہیں کرنی۔ بس دن بھر میں صرف ایک دو بندوں کو چھاپا اور گھر واپس آ گئے۔''
بالے اور شکور اکرم کی طرف دیکھنے لگے۔ اکرم نے اپنی جیب سے نوٹ نکالے۔''دیکھو بھائیو! دس ہزار ملے تھے۔ سب کا برابر برابر کا حصہ ہوگا۔ ایمانداری کے ساتھ۔
تین تین ہزار۔ رہ گیا ایک ہزار تو پانچ سو کا کھانے پینے کا سامان لے آیا ہوں اور پانچ سو پستول کا کرایہ دینا ہے۔''
''پستول کا کرایہ؟''
''ہاں یار! پستول کرائے پر لے کر آیا ہوں۔ پانچ سو روپے روز۔''
سامنے پڑے ہوئے نوٹوں کو دیکھ کر ان دونوں کی آنکھوں میں بھی چمک آ گئی۔ بالآخر یہ طے ہو گیا کہ اب سب کو یہی کام کرنا ہے۔''
''اب ایک بات بتا۔'' بالے نے کہا۔''تیرے پاس تو پستول ہے تو تو اپنا کام چلا لے گا۔ ہم کیا کریں گے؟''
''اول تو ایک ہی پستول کافی ہوگا۔ پھر بھی ایک کام ہو سکتا ہے کہ بازار سے نقلی پستول خرید لیں۔ اب ایسے ایسے نقلی پستول آ گئے ہیں کہ کسی کے باپ کی مجال نہیں ہے کہ پہچان سکے۔''
''ٹھیک ہے یار۔ تو پھر ڈن ہو گیا۔'' شکور نے کہا۔
''میں بھی ایسی مفلسی سے تنگ آ چکا ہوں۔''
دو چار دنوں کے بعد سے ان کا کام شروع ہو گیا۔
شروع شروع میں تو وہ اس معاہدے پر عمل کرتے رہے کہ دن بھر میں صرف ایک یا دو کو لوٹنا ہے لیکن بعد میں جب پیسے آنے شروع ہو گئے تو یہ تعداد بھی بڑھنے لگی۔
وہ بہت کامیابی سے یہ کام کر رہے تھے۔ پولیس کی نگاہوں سے بچنے کے لیے انہوں نے کوئی ایک جگہ مخصوص نہیں کی تھی بلکہ وہ مختلف علاقوں میں جا کر وارداتیں کیا کرتے۔
ایک ہی مہینے کے بعد ان کے پاس پچاس ساٹھ ہزار روپے جمع ہو چکے تھے۔
''بس یارو۔'' ایک رات کھانا کھانے کے دوران بالے نے اعلان کیا۔''میں نے یہ سوچ رکھا ہے کہ کچھ پیسے جمع ہو جائیں تو پھر یہ کام چھوڑ دوں گا۔''
''تو پھر کیا کرو گے۔''
''کوئی چھوٹا موٹا کاروبار۔''
''ہاں یار، میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' شکور نے ہاں میں ہاں ملائی۔''اس کام میں ہر وقت پکڑے جانے کا ڈر لگا رہتا ہے۔''
''لیکن کاروبار کے لیے تو بہت پیسوں کی ضرورت ہوگی۔'' اکرم نے کہا۔
اس کے لیے ہمیں کام کی اسپیڈ بڑھانی ہوگی۔'' بالے نے کہا۔''اور بڑی آسامیوں پر ہاتھ ڈالنا ہوگا۔ اس

طرح چھوٹے موٹے دھندوں سے کام نہیں چلے گا۔''
اسی شام اکبری بیگم ان کے گھر آگئیں۔
اکبری بیگم ان کی ممانی ہوتی تھیں۔ وہ چونکہ تینوں ہی ایک دوسرے کے خالہ زاد بھائی ہوتے تھے۔ اسی لیے ممانی بھی مشترکہ تھیں اور ان کے اکلوتے مرحوم ماموں کی اکلوتی نشانی۔ جن کی کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔
ماموں کی موت کے بعد تو بہت دنوں تک وہ کہیں اور رہی تھیں اور اب ان کے گھر رہنے کے لیے آگئی تھیں۔
وہ اچھی خاصی عمر کی خاتون تھیں۔ ان تینوں نے ان کے لیے ایک کمرا خالی کر دیا تھا اور پوری سعادت مندی سے ان کی خدمت میں مصروف ہوگئے تھے۔
اب ان کے گھر میں باقاعدگی سے کھانا بننے لگا تھا۔ پہلے تو سوائے چائے کے کچھ نہیں بنتا تھا لیکن ممانی نے آکر باورچی خانہ سنبھال لیا تھا۔ کم از کم اس بات کی تو آسانی ہو گئی تھی۔
ایک رات ممانی کے ایشو پر وہ تینوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ''ابے، یہ ممانی کہاں سے ٹپک گئیں۔'' بالے نے کہا۔
''بالے بھائی، ان کے آنے سے کھانے پینے کی کتنی آسانی ہوگئی ہے۔'' اکرم نے کہا۔
''آسانی تو ہوگئی ہے لیکن ہماری آزادی بھی تو ختم ہو گئی ہے۔ اب ممانی کو کیا معلوم کہ ہمارا کام کیا ہے؟''
''بھائیو! میں تو کچھ اور سوچ رہا ہوں۔'' شکور نے کہا۔
''تم کیا سوچ رہے ہو؟''
''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ہمارے اس کام میں ممانی کی وجہ سے بہت فائدہ ہوگا۔''
''ابے کیا ممانی کو ساتھ لے جا کر لوگوں کو لوٹیں گے۔'' بالے بھنا کر بولا۔
''میری پوری بات تو سن لو۔ پوری پلاننگ کر کے بیٹھا ہوں۔''
''بتاؤ کیا پلاننگ ہے۔''
''یار، ایک راستہ ہے جو سرجانی ٹاؤن سے ہوتا ہوا فیکٹری تک جاتا ہے۔ اس راستے پر دونوں طرف اونچی اونچی جھاڑیاں اور بہت سے درخت ہیں۔ دونوں طرف میدان ہیں۔ جن پر کسی کا دعویٰ نہیں ہے۔ ہم وہاں اپنی ایک بڑی سی جھگی بنالیں گے۔''
''اور وہاں رہ کر بھوکے مریں گے۔'' بالے نے کہا۔
''پوری پلاننگ تو سن لو۔ ہماری انکم پہلے سے کہیں زیادہ ہو جائے گی۔''
''وہ کس طرح؟''
''فیکٹری کے کچھ مزدور اسی راستے سے پیدل سرجانی ٹاؤن کی طرف آتے جاتے ہیں۔ انہیں کوئی ڈر نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ بالکل ویران علاقہ ہے۔ اس لیے وہ تنخواہ والے دن بھی تنخواہ جیب میں رکھ کر اسی راستے سے گزرتے ہیں۔ ان کو لوٹنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''
''ابے لگتا ہے تو نے پوری پلاننگ کر رکھی ہے۔'' اکرم ہنس کر بولا۔
''ہاں بھائیو سب، کچھ بہت سوچ سمجھ کر بتا رہا ہوں۔ دیکھو تو سہی۔ اب یہاں ہمارے لیے خطرے بہت بڑھ گئے ہیں۔ پولیس کو ہمارے حلیے تو نہیں معلوم لیکن چوکی ضرور ہوگئی ہے۔ بہت سی شکایتیں چلی گئی ہیں اس کے پاس۔''
''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ممانی کس کام آئیں گی؟''
''ہم انہیں اسی سڑک پر بھیک مانگنے بٹھا دیں گے۔'' شکور نے کہا۔
''ابے کیا بالکل ہی پاگل ہوگیا ہے۔ یہ ممانی سے کیا کام لے رہا ہے۔''
''میرے بھائیو، وہ بڑھیا اور کس کام آئے گی۔'' شکور مسکرا کر بولا۔ ''دیکھو، اسکیم یہ ہے کہ ہم تینوں جھاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوں گے۔ ممانی دور سے جب اکیلے دکیلے کسی بندے کو آتے ہوئے دیکھے گی تو آواز لگائے گی۔ اکیلے دکیلے کا اللہ بیلی۔''
''ابے یہ پوری پلاننگ کہاں سے آگئی تیرے پاس؟'' اکرم نے پوچھا۔
''میں نے ایک کہانی پڑھی ہے۔ اس میں یہی ہے۔'' شکور نے بتایا۔ ''تو جب وہ آواز لگائے گی کہ اکیلے دکیلے کا اللہ بیلی تو ہم سمجھ جائیں گے کہ کوئی بندہ اکیلا آرہا ہے پھر اس کو لوٹ لیں گے۔''
''اگر زیادہ بندے ہوئے تو کیا آواز لگائے گی؟''
''جمعہ جمعرات کی خیر۔'' شکور نے کہا۔ ''پھر ہم سامنے نہیں آئیں گے۔ چھپے رہیں گے۔''
''یار، تو تو بہت چالاک نکلا یار۔'' بالے نے اس کی پشت پر ہاتھ مارا۔
''بھائیو، ایک کہاوت پڑھ لی ہے میں نے۔'' شکور نے کہا۔ ''اور اس کہاوت کی کہانی بھی جان لی ہے۔ وہی کہاوت ہے اکیلے دکیلے کا اللہ بیلی۔ اور اتفاق سے ممانی
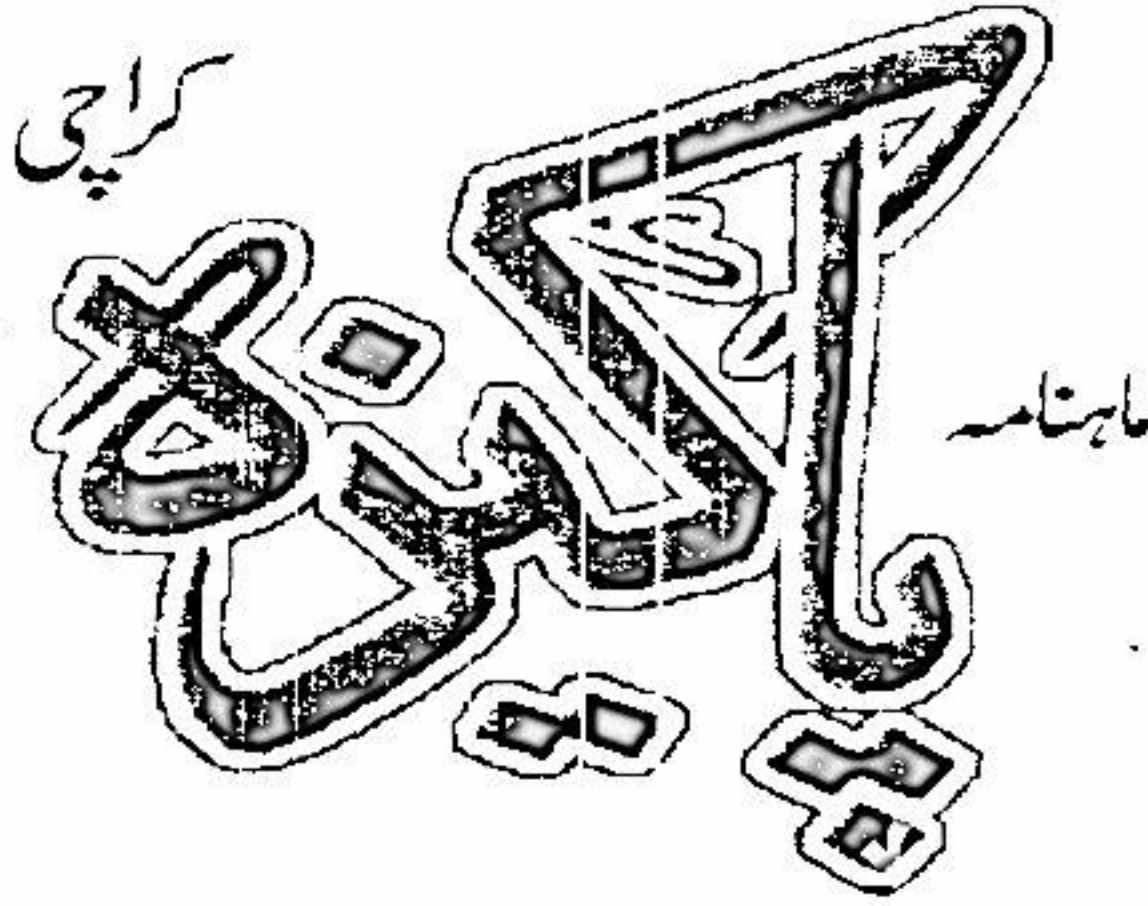
بھی ہاتھ لگ گئی ہے۔ تو کیوں نہ فائدہ ہی اٹھالیا جائے۔''
''لیکن بھائی، یہ تو بتا، ممانی کو راضی کون کرے گا۔ وہ بھیک مانگنے کے لیے کیوں تیار ہوں گی؟''
''ہو جائیں گی۔'' شکور نے کہا۔ ''ہم تینوں مل کر ان سے بات کریں گے وہ خود بھی گھر میں رورہ کر بیزار ہوگئی ہیں۔''
''فرض کروا گر ممانی کو بھیک ملنی شروع ہوگئی تو...؟''
''وہ پیسے ان کے اپنے ہوں گے۔'' شکور نے کہا۔ ''ان پر ہمارا کوئی حق نہیں ہوگا۔ وہ ان کی محنت کی کمائی ہوگی۔''
ان کا خیال تھا کہ ممانی کو راضی کرنا بہت مشکل ہوگا۔ لیکن وہ تو جیسے تیار ہی بیٹھی تھیں۔ اس تجویز کو سن کر پھڑک اٹھیں۔ ''ارے واہ! مزہ آ گیا۔ میں نے بھی وہ کہاوت پڑھ رکھی ہے۔ پھر جب ہمارے پاس پیسے ہو جائیں گے تو ہم کوئی اچھا سا مکان بھی لے لیں گے۔''
''بس ممانی توکل سے کام شروع۔'' بالے نے کہا۔ ''ہم نو دس بجے تک دھندے پر نکل جایا کریں گے اور شام چھ بجے تک گھر واپس۔''
''ٹھیک ہے۔'' ممانی خوش ہو کر بولیں۔ ''لیکن ہم رہیں گے کہاں؟ اس کہاوت والی بڑھیا کی جھونپڑی تو اسی جنگل میں تھی۔''
''وہ زمانہ اور تھا ممانی۔ ہم جنگل میں تو نہیں رہ سکتے نا۔ ہم فی الحال اسی مکان میں رہیں گے۔ بعد میں جب پیسے آگئے تو کسی بڑے مکان میں شفٹ ہو جائیں گے۔''
ان کا یہ دھندا دوسرے ہی دن سے شروع ہو گیا۔
صبح نو بجے کے قریب انہوں نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر ممانی کو بٹھا دیا۔ ان کے سامنے کپڑے کا ایک ٹکڑا بچھا دیا گیا۔ تا کہ سکے پھینکنے والے اسی کپڑے پر سکے ڈالتے جائیں۔
ممانی نے اپنی کارکردگی دکھانی شروع کر دی۔
جہاں دور سے کوئی بندہ اکیلا یا کسی اور کے ساتھ دکھائی دیتا۔ وہ آواز لگانا شروع کر دیتی۔ ''اکیلے دکیلے کا اللہ بیلی۔'' اور وہ تینوں جھاڑیوں سے نکل کر اس پر ٹوٹ پڑتے اور جب زیادہ بندے دکھائی دیتے تو آواز لگاتی۔ جمعہ جمعرات کی خیر۔ پھر وہ تینوں جھاڑیوں ہی میں چھپے رہتے اور ان بندوں میں سے کوئی ممانی کے کپڑے پر سکے بھی ڈال جاتا۔
پہلے دن کی کمائی پندرہ سو روپے ہوئی تھی جبکہ ممانی کو بھیک میں چالیس روپے ملے تھے۔ آغاز برا نہیں تھا۔
آہستہ آہستہ ان کی کمائی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

تینوں وقت کے بہت پابند تھے۔ ٹھیک نو بجے دھندے پر پہنچ جانا اور پانچ بجے شام کو واپس آجانا۔
جتنے بھی پیسے ملتے، خرچ کے لیے رکھ کر باقی ممانی کے پاس جمع کرا دیے جاتے۔ پہلی تاریخ سے لے کر دس تاریخ تک کی آمدنی بہت زیادہ ہوا کرتی۔ کیونکہ مزدوروں کو نئی نئی تنخواہیں ملا کرتی تھیں۔
ایک مہینے کے بعد جب گنتی کی گئی تو اسّی ہزار روپے جمع ہو چکے تھے جبکہ ممانی کی اپنی کمائی ساڑھے چار ہزار تھی۔
''بھائیو، یہ تو مزہ آگیا۔'' بالے نے کہا۔ ''یوں سمجھو کہ کھا پی کر... اسّی ہزار بچے ہیں تو ہم نے ایک لاکھ کی کمائی تو کر ہی لی ہوگی۔''
''ارے یہ سب ممانی کے قدموں کی برکت ہے۔'' اکرم نے کہا۔
''دیکھو بچو، میں نے یہ سنا ہے کہ جرم کرنے والے اسی لیے پکڑے جاتے ہیں کہ جب ان کے پاس دولت آجائے تو خوب عیاشیاں شروع کر دیتے ہیں۔''
''ہاں ممانی، لیکن ہم ایسا نہیں کریں گے۔ ہمیں پیسے جمع کرنے ہیں۔'' شکور نے کہا۔ ''ہمیں مکان جو لینا ہیں۔''
اس رات وہ سب بہت خوش تھے۔ کیونکہ اکرم کی فرمائش پر آج باہر سے پزا منگوائے گئے تھے۔ ممانی نے زندگی میں پہلی بار پزا کھایا تھا جو اس کو بہت مزے کا لگا تھا۔
ایک مہینا، دو مہینے، تین مہینے۔ اور چوتھے مہینے کے آخر تک ان کے پاس بارہ لاکھ جمع ہو چکے تھے۔ ممانی کے پیسے الگ تھے۔
اس گھر میں ممانی کو ویسے تو ہر قسم کا آرام تھا لیکن دو کمروں کی وجہ سے پریشانی بھی ہونے لگی تھی۔ اب تو شکور بھی ان کے کمرے میں سویا کرتا تھا۔
اس کے علاوہ ایک بات ایسی ہوئی جس کی وجہ سے ممانی ان سبھوں سے بدگمان ہوگئیں۔ ایک رات انہوں نے ان کی باتیں سن لیں۔ اکرم اور بالے کا ارادہ یہ تھا کہ جب مکان خریدنے کے پیسے ہو جائیں تو اس کے بعد کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر کے یہ لوٹ مار کا سلسلہ ختم کر دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی ممانی کی ضرورت بھی ختم ہو جائے گی۔ ان کو بھی الگ کر دیا جائے گا جبکہ شکور اس کے حق میں نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ان کے پاس جو کچھ بھی آیا ہے۔ وہ ممانی کی وجہ سے آیا ہے۔
پھر ان دونوں نے.... کسی نہ کسی طرح شکور کو بھی راضی کر ہی لیا تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ مکان کے ہوتے ہی ممانی کو ادھر ہی میں جمع کرا دیں گے۔ اس کے بعد ان کو وہیں رکھنا ہے۔
ممانی یہ سب سن کر سناٹے میں رہ گئی تھی۔ اسے اپنا مستقبل مخدوش دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ ساری زندگی اب آرام سے گزر جائے گی۔ لیکن ان تینوں کے تیور ہی کچھ اور تھے۔
ممانی نے ان پر ظاہر نہیں کیا کہ اس نے ان کی باتیں سن لی ہیں۔
ایک مہینا اور گزر گیا۔
اب ان کے پاس تیرہ لاکھ چالیس ہزار ہو چکے تھے اور ایک روز ممانی کو ایک سنہری موقع مل ہی گیا تھا۔
سامنے کی طرف سے رینجرز کی ایک گاڑی آرہی تھی۔ اس گاڑی کے آگے دو رینجرز والے موٹر سائیکلوں پر سوار تھے۔
ممانی نے آواز لگانی شروع کر دی۔ ''اکیلے دکیلے کا اللہ بیلی۔''
وہ تینوں بھی اسلحہ لہراتے ہوئے جھاڑیوں سے باہر آگئے۔ ان کا یہی اسٹائل ہوا کرتا تھا۔ رینجرز والوں کو دیکھ کر انہوں نے واپس بھاگنا چاہا لیکن انہیں دیر ہو چکی تھی۔
رینجرز نے ان پر فائر کھول دیے تھے۔ ذرا سی دیر میں ان تینوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور ممانی ایک طرف کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔
رینجرز والوں نے اس بوڑھی بھکارن مائی کو بہت حفاظت کے ساتھ بستی تک پہنچا دیا۔
اس دن کی بریکنگ نیوز یہ تھی کہ تین دہشت گرد رینجرز پر حملہ کرتے ہوئے مارے گئے.... ان وہشت گردوں کی ممانی نے اب ایک چھوٹا سا مکان خرید لیا ہے۔ اس میں صرف دو کمرے ہیں لیکن وہ اس کے اپنے ہیں۔
یہاں کوئی اس کے خلاف سازش کرنے والا نہیں ہے۔ مکان خرید لینے کے بعد بھی دو لاکھ روپے بچ گئے تھے۔ اس نے مکان کی ایک دیوار تڑوا کر ایک چھوٹا سا کیبن بنوا کر اس میں ایک چھوٹی سی دکان کھول لی ہے اور آرام کی زندگی گزار رہی ہے۔
اس کہانی کا سبق یہ ہے کہ پیسوں کے معاملے میں کسی پر بھروسا نہ کرو۔ چاہے وہ اپنی ممانی ہی کیوں نہ ہو۔
اور ہاں ویران راستوں پر اگر کسی کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھیں تو ہوشیار ہو جائیں۔

ڈھونگ

سکندر علیم

یسے بہت سے افراد سے واسطہ پڑتا رہتا ہے... جو اس مہارت سے سوانگ بھرتے ہیں کہ ہر ایک اس سے متاثر ہو جاتا ہے... اور اُن پر حقیقت کا گمان ہی ہوتا ہے... اس پُر مہارت فن کی معراج پر پہنچنے کے لیے ایک عرصہ گزارنا پڑتا ہے... ایک ایسے ہی ڈھونگی کا قصہ جو اپنے فن میں یکتا تھا...

مغرب سے موصول شدہ ایک دلچسپ و حیرت انگیز کہانی

کل ہی کی بات ہے، میری بیوی نے اپنے انتہائی چارمنگ انداز میں مجھے تنبیہ کی تھی۔ ”جونی سینڈرز، اپنے دماغ کو قابو میں رکھنا اور مغرور مت ہو جانا۔ اخبارات تمہارے بارے میں حیرت انگیز باتیں لکھ رہے ہیں۔ تمام عورتیں مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ میں کتنی خوش قسمت ہوں جو تم میرے شوہر ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ یاد رکھنا کہ کہیں آپے سے باہر نہ ہو جاؤ۔“

”یقیناً میں اب بھی یہ یقین کرنے کے لیے اپنے آپ کو چٹکی بھرتا ہوں کہ کیا یہ واقعی حقیقت ہے۔“

اس لیے کہ گزشتہ ماہ تک میں بی اسکواڈ سے منسلک ٹریفک کا ایک عام سپاہی تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میری زندگی سڑک پر کاروں کو آنے جانے کی ہدایات دیتے، بار بار تبدیل ہوتی ہوئی ٹریفک لائٹس کو دیکھتے رہنے، بچوں کو رواں ٹریفک کے درمیان سے گزرنے سے باز رکھنے میں ہی گزر جائے گی۔ کبھی بھار مجھے بوڑھی خواتین کو سڑک پار کرنے میں مدد بھی دینا پڑتی تھی اور جہاں تک عدالت میں

طلبی کے حکم ناموں کی بات تھی تو وہ کہتے تھے کہ پولیس فورس میں میرا اوسط کم ترین ہے۔ کوئی بھی شخص مجھے ٹکٹ ایشو کرنے کے معاملے میں اپنی باتوں سے باز رکھ سکتا تھا۔ اسی بنا پر میرا اوسط سب سے کم تھا۔

اور اب میں ایک پکا فرسٹ گریڈ سراغ رساں ہوں۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ پولیس کمشنر نے مجھے سیکنڈ گریڈ سراغ رساں یا تھرڈ گریڈ سراغ رساں نہیں بنایا۔ اس نے مجھے سب سے اوپری درجے پر ترقی دی ہے اور وہ بھی شہر کے تمام سرکاری افسران کے روبرو۔

اس نے کہا تھا۔ ”جب کوئی سپاہی اپنا دماغ اس طرح استعمال کرتا ہے جس طرح جونی سینڈرز نے کیا تھا تو وہ یقینی طور پر اس ترقی کا مستحق ہوتا ہے۔“

اور یہ ترقی میرے لیے خوش کن تھی۔ خاص طور پر تنخواہ میں اضافہ۔ اشیا کی قیمتوں کے بارے میں مجھے آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میری بیوی کے یہاں ولادت متوقع ہے، لہٰذا کچھ اضافی رقم کارآمد ثابت ہوگی۔

شاید آپ اس وقت مصروف رہے ہوں گے اور آپ نے اخبارات میں اس قاتل بلیک میلر کے بارے میں تمام تفصیلات نہیں پڑھی ہوں گی۔ سو میں آپ کو اس کیس کی موٹی موٹی باتیں گوش گزار کرتا ہوں۔

کالم نگار لیوراجرز نے اپنے مخصوص اور دلچسپ انداز میں یہ لکھنا شروع کیا کہ شہر میں ایک نئے ٹائپ کا بلیک میلر دندناتا پھر رہا ہے۔ وہ اپنے شکار کو فون کرتا ہے اور کہتا ہے۔ ”کل میں فلاں فلاں کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔ اگر تم نے میری منہ مانگی رقم مجھے ادا نہ کی تو میرا اگلا شکار تم ہوگے۔ اگر پولیس کو خبر کی تو اپنا کام تمام سمجھو۔“

یہ دھمکی آپ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی پھیلانے اور آپ کے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب آپ اگلے روز اخبار اٹھاتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ فلاں شخص قتل ہو چکا ہے۔

پولیس کمشنر نے کالم نگار لیوراجرز کو پولیس ہیڈ کوارٹر طلب کیا لیکن اس نے ایک گھنٹے تک اپنی زبان نہیں کھولی۔ بالآخر وہ بولنے پر مجبور ہو گیا۔

”اوکے، کمشنر۔ یہ گویائی میرے لیے ڈیتھ وارنٹ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ شہر میں ایک جنونی قاتل موجود ہے۔ یا تو وہ ایک سیدھا سادہ پاگل ہے۔ یا پھر ایک انتہائی سفاک مجرم ہے جو اس کمیونٹی میں آج تک پیدا نہیں ہوا۔ اس نے مجھ سے دو لاکھ ڈالرز کی رقم طلب کی ہے۔ یہ مطالبہ اس نے فون پر کیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ مین اسٹریٹ پر ایڈ گریسن نامی شخص کو قتل کر دے گا۔

”میں سمجھا کہ یہ کوئی مذاق ہے۔ لیکن اگلے روز ایک نامعلوم کار نے مین اسٹریٹ پر ایڈ گریسن کو اس وقت ہلاک کر دیا جب وہ سڑک پار کر رہا تھا۔ ڈرائیور کار سے کر جائے حادثہ سے فرار ہو گیا۔ اب میرے پاس نقد رقم کی ادائی کے لیے صرف چوبیس گھنٹے کی مہلت ہے، یا پھر میں بھی مرنے کے لیے تیار ہو جاؤں۔ اور مجھے اب تک تین ایسے افراد کے بارے میں پتا چلا ہے جو اس بلیک میلر کو نقد ادائی کر چکے ہیں۔“

چونکہ میری اس سہ پہر کی شفٹ ڈیوٹی 'ڈیلی کال' اخبار کے دفتر کے باہر تھی جہاں لیوراجرز کام کرتا تھا تو مجھے آرڈر موصول ہوئے کہ میں اپنی آنکھیں کھلی رکھوں۔

”اگر ضروری ہوا تو تم اپنی پوسٹ چھوڑ بھی سکتے ہو۔“ کیپٹن اوریلی نے مجھ سے کہا۔ ”میں علاقے میں دو سراغ رسانوں کی ڈیوٹی لگا رہا ہوں۔“

حکم، حکم ہوتا ہے اور میرا موٹا گنجا باس ہمیشہ ڈسپلن پر زور دیتا تھا۔

اس سہ پہر تین بجے کے لگ بھگ یہ سب کچھ ہو گیا۔ لیوراجرز اپنے دفتر سے نکل کر گھر کی جانب روانہ ہوا تو سڑک پار کرتے ہوئے اس نے خود پر جبر کرتے ہوئے خوشی کے سے انداز میں مجھے ہیلو کہا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میرا کیا مطلب ہے۔ وہ رکھائی اور غیر حاضر دماغی کا ملا جلا انداز تھا۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ اگلے موڑ سے گھوم گیا تاکہ تپلی گلی کا شارٹ کٹ راستہ اختیار کر سکے۔ تب میری نگاہ اس نابینا شخص پر پڑی جس کی راہنمائی ایک پالتو کتا کر رہا تھا۔ وہ نابینا کالم نگار لیوراجرز کے پیچھے چل رہا تھا۔

تب ایک خیال میرے ذہن میں کوندا۔ ”اگر لیوراجرز اس گلی سے گزرتا ہے تو یہ قتل کے لیے ایک پرفیکٹ سیٹ اپ ہوگا۔“

میں نے اپنی پوسٹ چھوڑ دی اور سڑک پار کرنے لگا تو ایک کار کی زد میں آنے سے بال بال بچ گیا۔ میرا رخ اس گلی کی جانب تھا جسے کالم نگار لیوراجرز شارٹ کٹ کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔

تب مجھے ایک ہولناک چیخ سنائی دی۔

میں نے دوڑ لگا دی۔ وہاں گلی میں ایک بلڈنگ کے پہلو میں مجھے کالم نگار کا بے حس و حرکت جسم پڑا دکھائی دیا۔ لکڑی کے دستے والا ایک چاقو اس کی گردن میں گھسا ہوا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔

گلی کے آخری سرے پر مجھے وہ نابینا دکھائی دیا جو اپنے کتے کے ہمراہ جارہا تھا۔ میں اس کے پیچھے دوڑ پڑا اور ایک منٹ میں اسے جالیا۔

''کیا تم نے کسی شخص کی چیخ سنی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''یقیناً سنی تھی۔'' نابینا نے جواب دیا۔ ''اور اس کے بعد کسی شخص کو اپنی جانب دوڑتے ہوئے بھی سنا تھا۔''

میں نے سڑک کے دونوں جانب نگاہ دوڑائی۔ دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اب اس نابینا شخص کو بطور درکار گواہ پولیس اسٹیشن لے جانا ضروری تھا۔ اس نے ابتدا میں تو قدرے احتجاج کیا۔ لیکن جب میں نے اس سے کہا کہ ایک شہری کی حیثیت سے یہ اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ میرے ساتھ تھانے چلے تو وہ رضامند ہوگیا۔

☆☆☆

اگلے روز کیپٹن اوڈلی نے میری کلاس لیتے ہوئے مجھے خوب ڈانٹ پلائی۔ ''تم احمق آدمی۔'' وہ اپنے دفتر میں مجھ پر برس رہا تھا۔ ''تم اس محکمے کو ملک بھر کا ہدف تمسخر بنانا چاہتے ہو؟ تم نے اس قتل کا واحد گواہ ایک نابینا شخص کو چنا ہے۔ تمہیں تو چاہیے تھا کہ تم خود اس قاتل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ اس کے بجائے تم ایک ایمان دار باعزت شہری کو ہمارے پاس لے آئے۔ اس کا نام پیٹر سمپسن ہے اور وہ تن تنہا پرکسن لین کے ایک مکان میں رہتا ہے۔ وہ اپنے پالتو کتے کی راہنمائی میں مختلف دفاتر میں میگزین کی سبسکرپشن فروخت کرتا ہے اور تم اسے ایک درکار گواہ کے طور پر یہاں لے آئے ہو۔''

''لیکن۔'' میں نے احتجاج کیا۔ ''ہوسکتا ہے کہ اس قتل کا ارتکاب اسی نے کیا ہو۔''

''لیکن اسے دکھائی نہیں دیتا۔'' میرے چیف نے غراتے ہوئے کہا۔ ''اور میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ مجھے کب تک تمہاری ان حماقتوں کو برداشت کرنا ہوگا۔''

میں نے اپنی عزت نفس کو دل ہی دل میں گھونٹ دیا اور اس نابینا شخص سے معافی مانگنے کے لیے بیرونی دفتر میں چلا گیا۔ اس شخص کی سپاٹ نگاہیں، اس کے سیال بال جن میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی، اس کے آگے کو نکلے ہوئے سامنے کے دو دانت...... مجھے اپنے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہونے لگیں۔

''ہم سب ہی غلطیاں کرتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ اور پھر ایک طریقے سے حتمی بے عزتی کرتے ہوئے بولا۔

''میں تمہیں معاف کرتا ہوں، بیٹے۔''

پھر وہ پولیس اسٹیشن سے نکل گیا۔ اس نے سڑک پار کرلی۔ چونکہ میں بھی اپنے گھر جارہا تھا تو میں بھی اسی سمت روانہ ہوگیا۔ میں آہستہ آہستہ قدموں سے اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔

پائن اور میپل اسٹریٹ کے سنگم پر وہ اپنے کتے کے ہمراہ سڑک پار کرنے کا انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں ایک تیز رفتار موٹر سائیکل سوار آتی ہوئی کار کو کراس کرتے ہوئے آگے نکل آیا۔ اس نابینا کے کتے نے سڑک پار کرنے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ میں نے نابینا کو یہ کہتے سنا۔ ''بیٹھ جاؤ، لسٹر۔ ٹریفک کے کلیئر ہونے کا انتظار کرو۔'' چند لمحوں بعد وہ گویا ہوا۔ ''اٹھو لسٹر۔ اب پار کرتے ہیں۔''

میں نے بھی ان کے پیچھے پیچھے سڑک پار کرلی اور اپنے گھر کی سمت روانہ ہوگیا۔

اس رات میں صحیح طور پر کھانا بھی نہ کھا سکا۔ رات دس بجے کے قریب میں سونے کے لیے بستر پر چلا گیا۔

رات تین بجے کے لگ بھگ میری آنکھ اچانک کھل گئی۔ میرا جسم ٹھنڈے پسینے میں نہا رہا تھا۔ رات بھر کوئی بات مجھے پریشان کرتی رہی تھی۔ میں بستر پر کبھی ایک پہلو اور کبھی دوسرے پہلو کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ مجھے رات بھر ہر طرف کتے ہی کتے دکھائی دیے تھے۔

لیکن اب مجھے اپنی بے چینی کا جواب مل گیا تھا۔

پیٹر سمپسن نابینا نہیں تھا۔

وہ صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہی قاتل اور بلیک میلر تھا۔ مجھ پر سچ آشکار ہوتے ہی سب کچھ واضح ہوگیا۔ میں حیران تھا کہ مجھ سے یہ حقیقت پہلے کیوں مس ہوگئی۔

ایک حقیقی راہنما کتے کو اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے آقا کی راہنمائی کرے۔ اس کی ٹریننگ اتنی پرفیکٹ ہوتی ہے کہ اگر اس کا آقا کوئی غلطی کرنا چاہتا ہے تو اس کا راہنما کتا اپنی ذہانت سے کام لیتے ہوئے اس کا حکم ماننے سے انکار کردیتا ہے۔

سڑک پار کرتے ہوئے یہ کتا ہوتا ہے جو نابینا فرد کی راہنمائی کرتا ہے نہ کہ وہ فرد جو کتے کی راہنمائی کررہا ہوتا ہے۔

جب سڑک پار کرتے وقت پیٹر سمپسن نے اپنے کتے کو حکم دے کر سڑک پار کرنے سے روک دیا تھا تو یہ اس بات کا خفیہ اشارہ تھا کہ وہ نابینا نہیں ہے اور اس کا پالتو کتا اس کا راہنما کتا نہیں ہے۔

بکرا برائے تاوان

کاشف زبیر

عیدالاضحی کے موقع پر جانور ہر گھر کی رونق بنے ہوتے ہیں۔ بچوں سے لے کر بزوں تک کی سرگرمیاں انہی تک محدود ہو جاتی ہیں... تو پھر جلیل میاں اور راجا بکروں اور گائے، بیل سے دور کیسے رہ سکتے ہیں مگر اس بار انوکھی بات گدھے کی موجودگی ہے... وہ اچانک ہی غائب ہوا اور سب کو حیران و پریشان کر دیا...

ہنستے مسکراتے ماحول میں نٹ کھٹ جلیل کی شگفتہ بیانی و حیلہ سازی

راجا کی ماں پر سکتہ طاری تھا، البتہ ایک لمحے کے لیے سکتے سے باہر آکر ''ہائے میرا لال'' کہتی اور دوبارہ سکتے میں چلی جاتی۔ محلے کی عورتیں اسے سنبھال رہی تھیں۔ دوسری طرف راجا کا باپ دہاڑیں مار کر رو رہا تھا اور میں اسے تسلی دینے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ''صبر کرو، اللہ تمہیں اس کا نعم البدل دے گا۔''

''کہاں سے دے گا۔'' راجا کا باپ بلبلا کر بولا۔ ''کیسے پالا تھا۔ کتنے ارمانوں سے پالا تھا۔ سب مٹی میں ملا
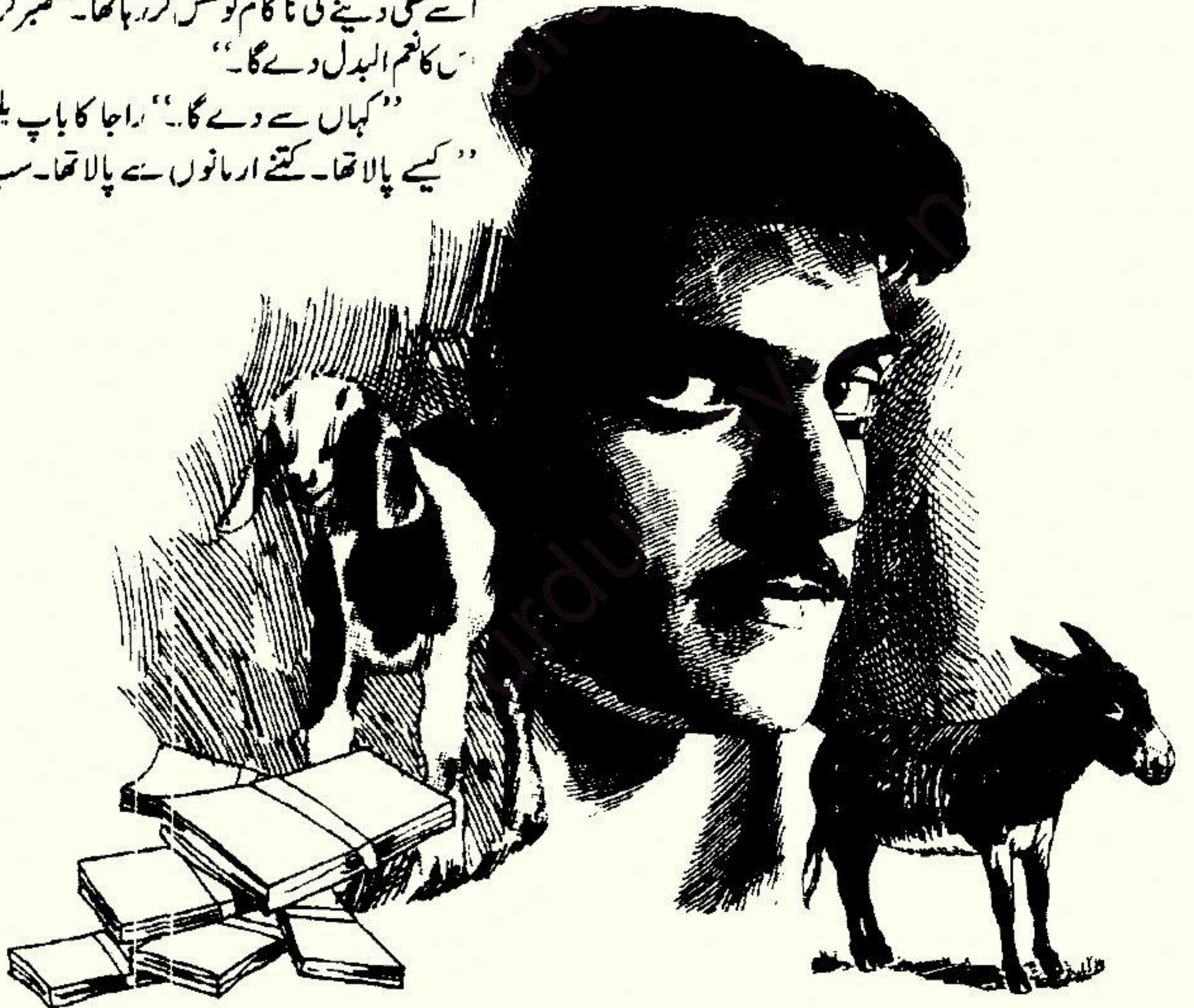
کر چلا گیا۔''

''ایک دن سب نے جانا ہے۔'' میں نے تعزیت کا روایتی جملہ کہا۔

''لیکن ایسے کون جاتا ہے۔'' راجا کے باپ نے فریاد کی۔ ''میں نے تو اس کا منہ تک نہیں دیکھا۔ کیسے صبر کروں، کہاں سے لاؤں اتنا صبر ..... ہائے میرا کماؤ پوت۔''

میں سوچ رہا تھا کہ راجا کے باپ کا دماغ شاید صدمے سے خراب ہوگیا ہے۔ راجا نے ساری عمر ایک روپیہ کما کر گھر میں نہیں دیا اور جو کمایا، وہ باہر ہی خرچ کیا تو شاید اس جیسی ناخلف اولاد کے ماں باپ کا دکھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں راجا کے گھر کے صحن میں کھڑا تھا۔ کچھ محلے والے تھے اور راجا کے ماں باپ تھے۔ سوچ میں یہ رہا تھا کہ راجا کی لاش کہاں ہے؟ بکرا عید کی آمد آمد تھی اور اماں نے صبح سویرے دس بجے مجھے اس الٹی میٹم کے ساتھ اٹھایا کہ میں بکرے کو ٹہلانے ندی تک لے جاؤں۔ اماں کا الٹی میٹم تو میں نے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا مگر ایسے موقع پر کے الیکٹرک والے اماں کی مدد کو آئے اور بلاوجہ یعنی بغیر لوڈشیڈنگ کے وقت کے بجلی بند کردی۔ گرمی اچھی خاصی تھی اس لیے مجھے اٹھنا ہی پڑا اور دس بجے میں نہار منہ گھر سے بکرے سمیت نکلا۔

اس بار اماں نے سال بھر پہلے بکری کا بچہ لے کر چھت پر رکھ چھوڑا تھا۔ جہاں پہلے ہی جلیل کے کبوتروں نے ماحول کو معطر کر رکھا تھا۔ اب یہ بکرا بھی ان کے ساتھ شامل ہوگیا۔ میری اور شنو کی ملاقات سخت غیر رومانی ماحول میں ہوتی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے کہے سے زیادہ غٹرغوں اور بکرے کی میں میں سنتے تھے۔ اب شنو کا رخ روشن بھی کم نظر آتا تھا کیونکہ اس کا دوپٹا جو عام طور سے گلی میں ہوتا اب بیشتر وقت اس کی ناک پر رہتا تھا۔ ندی کی طرف جانے والا راستہ سوئے دار یعنی میرے یار بیکار راجا کے گھر کے پاس سے گزرتا تھا اور صبح صبح وہاں محلے والوں کا ہجوم دیکھ کر میں بھی اندر چلا گیا۔ راجا کے ماں باپ کی حالت دیکھ کر میرا دل بیٹھنے لگا اور مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میرا یار اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ راجا کا باپ بھوں بھوں کر کے رو رہا تھا۔

اگرچہ میں نے اور راجا نے ہمیشہ سوچا تھا کہ اگر راجا فوت ہوا تو اس کا باپ بغلیں ضرور بجائے گا مگر روئے گا نہیں۔ مگر اب اسے دیکھ کر لگ رہا تھا کہ راجا کی جواں مرگی نے اس کا کلیجا شق کر دیا تھا۔ اس کی ماں بھی رہ رہ کر راجا جیسے رُوسیاہ لال کو یاد کر رہی تھی۔ اولاد بہرحال اولاد ہوتی ہے، چاہے وہ راجا جیسی کیوں نہ ہو۔ مجھے خیال آیا کہ بعد از مرگ راجا کے بارے میں اسی طرح سوچ رہا ہوں جیسے اس کی زندگی میں سوچتا تھا اور میرا شرمندگی سے برا حال ہوگیا۔ خود کو لعنت ملامت کرتے ہوئے میں نے راجا کے باپ سے پوچھا۔ ''خالو، ہوا کیا تھا؟''

''ارے کیا بتاؤں۔'' اس نے سینہ پیٹ کر کہا۔ ''رات کو یہیں تھا اور صبح دیکھا تو جا چکا تھا۔''

یہ ایک اور ناقابل یقین بات تھی کہ راجا کی رات گھر میں گزری تھی۔ جب سے اسے عارفہ سے عشق کا کینسر لاحق ہوا تھا اس کی کوئی رات گھر میں نہیں گزری تھی۔ شاید آخری وقت میں اس کی حالت ایسی نہیں رہی تھی کہ عارفہ کے مزید ارمان پورے کرسکتا اور اس نے راجا کو اپنے بیڈروم سے عاق کر دیا تھا۔ شاید اسی لیے گھر منتقل ہوا تھا کہ سکون سے مر سکے۔ آخر اس دل کے مرض نے راجا کا کام تمام کیا تھا۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ ''کیا وہ بہت بیمار تھا؟''

''بیمار۔'' راجا کے باپ نے خشک آنسوؤں کے ساتھ روتے ہوئے کہا۔ ''نہیں تو بالکل ہٹا کٹا اور ٹھیک ٹھاک تھا۔''

اب میں زیادہ تشویش زدہ ہوگیا۔ ''کیا کوئی حادثہ ہوا تھا؟''

''نہیں۔'' راجا کے باپ نے اس کی بھی تردید کر دی۔ ''دو ہفتے پہلے بائیک والے نے ٹکر ماری تھی۔ پاؤں میں سوچ آئی تھی مگر اب تو وہ بھی ٹھیک ہوگئی تھی۔''

''پھر کیا ہوا تھا؟'' میں نے زچ ہو کر کہا۔ ''کیا بیٹھے بٹھائے راجا کا وقت آگیا تھا۔''

''راجا۔'' آنکھوں کی طرح راجا کے باپ کا لہجہ بھی خشک ہوگیا۔ ''ابے میں اپنے گدھے کو رو رہا ہوں۔''

ابھی میں دم بخود ہوا ہی تھا کہ ایک خاصا وزنی کنکر آکر میرے سر پر لگا۔ شکر ہے کہ میں نے بال ذرا بڑھا رکھے تھے ورنہ سر پھٹ جاتا۔ پھر بھی اچھی خاصی چوٹ آئی تھی۔ میں نے بھنا کر اس طرف دیکھا تھا کہ راجا کا منحوس چہرہ دیوار سے جھانکتا نظر آیا اور اس نے دانت بھی نکالے تھے۔ میں باہر آیا تو راجا دیوار کے کونے سے جھانک رہا تھا۔ میں اس کے پاس آیا۔ ''خبیث تو یہاں شرفا پر سنگ برسا رہا ہے اُدھر تیرے باپ نے اپنے گدھے کے لیے محلہ سر پر اٹھایا ہوا ہے۔ میں تو آدھے گھنٹے سے تیری تعزیت کر رہا تھا۔''

''اگر گدھے کی جگہ میں ہوتا تو شاید ابا مٹھائی بانٹ رہا ہوتا۔ بڑی دی وے برادر خر کو ہوا کیا تھا؟''

''میں تو سمجھا کہ تجھے کچھ ہو گیا ہے۔ عارفہ کی ''صحبت'' بالآخر رنگ لے آئی ہے۔ یہاں سے گزرا تو بالکل میت کے گھر والا نقشہ دیکھا اندر گیا تو تیری اماں پرسکتہ تھا اور ابا یوں رو رہا تھا کہ میں چکرا گیا۔ میں نے تو تیری لاش تلاش کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔''

''تیری کوشش ہمیشہ کی طرح ناکام رہی۔'' راجا نے اطمینان سے کہا۔ ''جلیل فکر مت کر، تجھے قبر میں اتار کر مروں گا۔''

''خاصی دیر بعد جا کر تیرے باپ نے اُگلا کہ اس کا گدھا نہیں رہا ہے۔''

''مگر گدھے کی لاش کہاں ہے؟''

راجا کے سوال نے مجھے چونکا دیا تھا کہ مرحوم کی لاش تو میں نے نہیں دیکھی تھی۔ میں نے خیال ظاہر کیا۔ ''شاید مرحوم کا انتقال دھوبی گھاٹ پر ہوا ہو اور وہیں نہلانے دھلانے کے بعد دھلنے کے لیے آنے والی چادروں سے اس کا کفن بھی ہو جائے گا۔ قبرستان میں تو اجازت نہ ملے مگر ندی کے کنارے اسے دفنایا جا سکتا ہے۔''

راجا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ کیس کچھ اور ہے۔ تو نے غور نہیں کیا گدھا گاڑی تو گھر کے باہر موجود ہے، کیا گدھا اکیلا دھوبی گھاٹ چلا گیا مرنے کے لیے۔''

میں نے غور کیا تو واقعی گدھا گاڑی باہر موجود تھی۔ اکیلے گدھے کے دھوبی گھاٹ جانے کی تک تو نہیں بنتی تھی اور اگر اس کا انتقال یہاں ہوا ہوتا تو اسے گاڑی میں ہی ڈھو کر لے جایا جا سکتا تھا بہ شرط کہ اس گاڑی کو کوئی دوسرا گدھا کھینچ رہا ہوتا۔ میں نے راجا کی طرف دیکھا۔ ''تیرا مطلب ہے گدھا فوت نہیں ہوا ہے؟''

''میرا یہی خیال ہے۔'' راجا نے پتلون کی جیب سے اپنے کرتوتوں سے بھی زیادہ خراب حالت میں ایک مڑی تڑی بیڑی نکالی اور اسے سیدھا کر کے سلگایا۔

''پھر کہاں گیا؟''

''میرا خیال ہے وہ اغوا ہو گیا ہے۔'' راجا نے انکشاف کرنے کے انداز میں کہا۔

''اغوا؟'' میں بھونچکا رہ گیا۔ ''تیرا مطلب ہے اسے تاوان کے لیے اغوا کیا گیا ہے؟''

''اگر اغوا کرنے والا اس وقت کہیں آس پاس موجود ہے تو وہ ابا کی حالت دیکھ کر تاوان ہی مانگتا لیکن میرا خیال کچھ اور ہے۔ گدھے کا اغوا اس کی کڑاہی وغیرہ بنانے کے لیے کیا گیا ہے۔''

''گدھے کی کڑاہی؟''

''لگتا ہے تو آج کل اخبار وغیرہ سے پرہیز کر رہا ہے۔ ویسے تو گدھا نہ جانے کب سے ہماری خوراک میں شامل ہے مگر جب سے بیرون ملک اس کی کھال کی مانگ اور قیمت بڑھی ہے تب سے گدھا گوشت اکثر ہوٹلوں میں پکنے اور بکنے لگا ہے۔ لوگ بہت شوق سے کھاتے ہیں۔''

''تو نے کھایا ہے؟''

''کئی بار، لیکن جیسے ہی مجھے پتا چلتا ہے کہ پکنے والا گوشت گدھے کا ہے میں اس ہوٹل کا رخ کرنا چھوڑ دیتا ہوں۔''

''فائدہ.... دوسرے ہوٹلوں میں بھی تو خر کڑاہی ہی چل رہی ہوتی ہے۔''

''تو نے ٹھیک کہا لیکن مجھے پتا تو نہیں ہوتا ہے۔ ذائقہ بالکل مٹن جیسا بلکہ کس سے اچھا ہوتا ہے۔ اس کا پتا یوں چلا کہ ایک ہوٹل پر چھاپا پڑا اور وہاں سے گدھے کا گوشت پکڑا گیا تو مجبوراً اس شام اس نے مٹن سے کڑاہی بنائی۔ وہ اتنے مزے کی نہیں تھی۔'' راجا نے اطمینان سے کہا۔ ''تو سنا اتنی صبح یہاں کیسے آ گیا؟''

''صبح سے پتا نہیں کس کا منہ دیکھا تھا، پہلے نہار منہ تیرے باپ کا واویلا دیکھا اور اب تجھے دیکھ رہا ہوں۔''

''تو نے یقیناً آئینہ دیکھا ہوگا۔'' راجا نے مزید اطمینان سے کہا اور بچ جانے والی بیڑی ایک طرف اچھال دی۔ ''ذرا یہ مجمع چھٹ جائے تو ہم دونوں کچھ جاسوسی کریں گے۔''

''جاسوسی.... وہ کس خوشی میں؟''

''یہی کہ گدھا کب اور کیسے گیا۔ اگر لے جایا گیا ہے تو لے جانے والا کون ہے؟''

''میرا جاسوسی کے بجائے ناشتے کا خیال ہے۔'' میں نے بکرے کی طرف دیکھا۔ ''اس کے بعد اسے ناشتے کے لیے ندی لے جانا ہے۔''

''اگر تو میرا ساتھ دے، تو ناشتا میری طرف سے۔'' راجا نے کمال فراخ دلی سے کہا۔ مگر میں راجا کے جھانسے میں آنے والا نہیں تھا۔ پچھلے دنوں اس نے ایک ڈیو لنچ کرانے کے لیے ایک خیراتی دسترخوان کا رخ کیا تھا۔ چکن کڑاہی اور قورمے کی ڈکاریں لیتے ہوئے اس نے کہا کہ اس پر جو لنچ ڈیو تھا، وہ اس نے کرا دیا ہے۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''میرا اس خیراتی دسترخوان پر ناشتے کا کوئی ارادہ

نہیں ہے۔''
''ناشتا فتو کے ہوٹل میں ہوگا۔ اب وہاں انڈا پراٹھا بھی ملتا ہے۔''
''اور بکرے کا ناشتا؟'' میں نے نقطہ اٹھایا۔ ''میں اس بے زبان کی بددعا نہیں لے سکتا۔ خود سوچ کہ بھوکے پیٹ ہمیں ناشتا کرتے دیکھ کر اس کے دل پر کیا گزرے گی اور پھر اس دل سے کیا نکلے گا۔''
''چل یار اسے بھی ناشتا کرادوں گا۔'' راجا نے بادلِ ناخواستہ کہا۔
''سوال یہ ہے کہ تو اپنے باپ کے گدھے کی بازیابی کے لیے اتنا پریشان کیوں ہے؟''
''کیونکہ اگر گدھا نہیں ملا تو ابا مجھے اس کی جگہ گاڑی میں جوت دے گا۔'' راجا نے اصل بات اُگل دی۔ ''آج کل کام بہت زیادہ ہے اور ابا کا گدھے کے بغیر گزارا نہیں ہے۔ دیکھ جلیل تجھے میرا ساتھ دینا ہوگا۔''
کیونکہ کچھ عرصے پہلے راجا نے اماں والے کیس میں میری بے لوث مدد کی تھی جب اماں نے ابا مرحوم کے کچھ عشقیہ خطوط پکڑے تھے اور ان کی تفتیش میرے سپرد کی تھی اس لیے میں مجبوراً مان گیا۔ ''مگر یاد رکھ میں تیرا اَن لمیٹڈ ساتھ نہیں دے سکتا۔ مسئلہ ایک دو دن میں حل ہوگیا تو ٹھیک ہے ورنہ ....''
''اس کے بعد ضرورت ہی نہیں پڑے گی، میں ابا کی گاڑی میں لال کی جگہ بندھا ہوں گا۔'' راجا نے ٹھنڈی سانس لی۔ میں چونکا اور اب سمجھا کہ راجا کی ماں بار بار ''میرا لال'' کیوں کہہ رہی تھی؟ گدھے کا نام ہی لال تھا۔
بکرا اندی کی طرف جانا چاہتا تھا کیونکہ وہاں ہری گھاس تھی اور سچی بات ہے کہ میں بھی بکرے کا ہمنوا تھا کیونکہ وہاں ناصر دھوبی کی کوہ نور بیوی موجود ہوتی تھی مگر راجا نے ہم دونوں کے پروگرام میں خلل ڈالا تھا۔ میں راجا کی دوستی سے مجبور تھا بکرا نہیں، اس لیے اس نے موقع پا کر راجا سے بدلہ لیا اور عین اس وقت راجا کو عقب سے ٹکر ماری جب وہ کھلے مین ہول کے سامنے تھا۔ مگر ٹکر خاصی زوردار تھی اس لیے راجا مین ہول پار کر کے آگے جا گرا تھا۔ اس نے اٹھ کر خفگی سے مجھے دیکھا۔ ''خبیث.... یہ کیا حرکت تھی۔''
میں خود بکرے کی حرکت پر دنگ رہ گیا۔ ''سوری یار، بکرے نے اچانک وار کیا۔ اس سے اندازہ کرلے کہ یہ کس قدر کینہ پرور بکرا ہے۔''
''اب میں اسے ناشتا نہیں کراؤں گا۔'' راجا نے وہ جگہ سہلائی جہاں بکرے نے ٹکر رسید کی تھی۔ ''خبیث نے کولھے کی ہڈی توڑ دی ہے۔''
''راجا معاہدے سے مت مُکر۔'' میں نے اسے خبردار کیا۔ ''اس کے نتائج اس سے بھی زیادہ سنگین برآمد ہو سکتے ہیں۔ بکرے کے ساتھ مجھے اپنا مخالف نہ کر۔''
بات راجا کی سمجھ میں آگئی اور اس نے بکرے کا ناشتا فوری بحال کر دیا مگر وہ جا کہاں رہا تھا، یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اپنی گلی سے نکل کر وہ بڑی گلی میں آیا اور یہاں موجود ایک فقیر کے پاس رکا جو پیدائشی نابینا تھا مگر آنکھ والوں سے زیادہ کماتا تھا۔ راجا نے اسے پانچ کا ایک متروک نوٹ دیا۔ ''بابا دعا کرنا کہ ابا کا گدھا مل جائے۔''
وہ چونکا۔ ''تیرے باپ کا گدھا کوئی لے گیا ہے؟''
''پتا نہیں بابا صبح سے غائب ہے۔''
فقیر نے منہ اوپر کیا اور بولا۔ ''تبھی میں کہوں گدھے کی ٹاپ بالکل تیرے گدھے والی تھی پر جس کے ساتھ وہ جا رہا تھا اس کی پیروں کی چاپ، تیرے باپ جیسی نہیں تھی۔''
راجا چونکنا ہوگیا۔ ''بابا یہ کب کی بات ہے؟''
''فجر کے کچھ دیر بعد کی۔'' اندھے فقیر نے جواب دیا۔
''بابا دوسرے آدمی کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو۔'' راجا نے ایک اور نوٹ اسے پیش کیا۔ یہ بھی متروک تھا۔
''وہ یوں چل رہا تھا جیسے اس کے پاؤں میں نقص ہو۔'' فقیر نے انکشاف کیا۔
''پاؤں میں نقص۔'' راجا نے زیرِ لب کہا اور پھر اچھل پڑا۔ ''میں سمجھ گیا۔''
''سمجھ گیا نا۔'' فقیر نے خوش ہو کر کہا اور دونوں نوٹ اس کے منہ پر مارے۔ ''اب یہاں سے دفع ہو جا گدھے کے بچے، مجھے بے وقوف سمجھا ہوا ہے۔ تجھ جیسے دس آنکھ والوں سے زیادہ دیکھتا ہوں۔''
راجا شرمندہ ہوگیا مگر اس ڈھیٹ نے فقیر کو اصل نوٹ پھر بھی نہیں دیا... میں نے ایک پچاس کا نوٹ نکال کر اس گنی آدمی کی خدمت میں پیش کیا۔ ''بابا اسے معاف کر دو اور یہ بھیک نہیں تمہاری صلاحیت کو خراجِ تحسین ہے۔''
اس نے بے نیازی سے نوٹ لیا اور اپنے لباس میں کہیں غائب کر دیا۔ ''بچہ اللہ تجھے اور دے۔''
''ایک بات اور بابا، کیا وہ اسی سڑک پر آگے کی طرف گیا تھا؟''

’’نہیں چورا ہے سے دائیں طرف مڑ گیا تھا۔‘‘

راستے میں راجا نے پوچھا۔’’تو نے سمت والا سوال کیوں کیا؟‘‘

’’جب تو چونکا تو میرا ذہن بھی شہزادہ کڑاہی ہاؤس کی طرف گیا تھا۔‘‘

قارئین کو یاد ہوگا کہ میرے یاروں کی چنڈال چوکڑی میں ایک شہزادہ بخت اور عرف بدبخت بھی تھا۔ دوسروں کی آنکھوں سے سرمہ چُرا لے جانے والا اور سر سے کی جگہ چونا لگانے والا۔ مگر جب اس نے کڑاہی ہاؤس کھولا تو خود اس کی آنکھوں میں اس کا اپنا ہی بال آ گیا اور اس نے ہم یاروں کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیا۔ خاص طور سے بِل لیتے ہوئے وہ آنکھیں بالکل ہی ماتھے پر رکھ لیتا تھا۔ ویسے تو گزارا ہمیشہ سے مالِ حرام پر رہا مگر پاؤں میں لنگ آ جانے کے بعد اس کے لیے دھندا کرنا مشکل ہو گیا تھا کیونکہ اس دھندے میں کامیابی کا تعلق دماغ سے کم اور پیروں سے زیادہ ہوتا تھا۔ بہ وقت ضرورت اسے فوری فرار ہونا پڑتا تھا ورشہزادہ بدبخت نے اس میں اتنی مہارت حاصل کی ہوئی تھی کہ ایک بار فرار کے دوران وہ کھیل کے میدان میں جا نکلا اور عین اس وقت ریس میں شامل ہوا جب ریفری پستول سے فائر کر چکا تھا۔ بدحواس شہزادہ بدبخت اسے خود پر فائر سمجھا اور سو میٹرز کی دوڑ میں جب دوسرے ابھی آدھے راستے میں تھے، وہ فنشنگ لائن عبور کر چکا تھا۔

پھر شہزادہ بدبخت یوں نظر آیا کہ اس کے لیے چند قدم چلنا بھی محال تھا۔ اس کا ایک پاؤں ٹخنے سے یوں مڑ گیا تھا جیسے وہ دیوار پر چلنے کی مشق کرتا رہا ہو۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک غریب بیوہ کے جھگڑے میں ٹانگ اڑانے سے اس کا یہ حال ہوا ہے۔ مگر واقفانِ حال کا کہنا تھا کہ فتو کے ہوٹل سے فرار کی کوشش میں وہ بدقسمتی سے اس کے سالوں کے ہتھے چڑھ گیا اور پاؤں کے اس غیر فطری زاویے میں ان کا کمالِ دست تھا۔ البتہ شہزادہ بدبخت نے اس کا اعتراف نہیں کیا۔ پھر اس نے کڑاہی ہاؤس کھول لیا۔ وہ خود کڑاہی کا شوقین تھا اور اسے کڑاہی پکانا بھی آتی تھی اس لیے کڑاہی ہاؤس چل نکلا۔ شروع میں، میں اور راجا بھی گئے مگر شہزادہ بدبخت کو وہاں ہمارا آنا گوارا نہیں تھا اس لیے وہ جان بوجھ کر گھٹیا سلوک کرتا تھا۔ ایک بار راجا سے اس کی منہ ماری ہوئی اور اس کے بعد ہم نے وہاں جانا بند کر دیا۔ یہی وہ چاہتا تھا۔ شہزادہ کڑاہی ہاؤس اسی علاقے میں تھا یعنی زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اسی لیے جب فقیر بابا نے گدھا لے جانے والے کی

چال میں نقص کی نشان دہی کی تو قدرتی طور پر ہمارا ذہن اسی طرف گیا تھا۔ کچھ دیر بعد فتو کے ہوٹل پر چائے پراٹھے کا ناشتا کرتے ہوئے راجا نے کہا۔

’’اگر یہ بدبخت ہوا تو سمجھ لے کہ اس کی بدبختی آ گئی ہے۔‘‘

’’مگر تو ثابت کیسے کرے گا۔ ٹھیک ہے وہ گدھا لے جا سکتا ہے مگر ذاتی طور پر گدھا نہیں ہے جو اسے اپنے کڑاہی ہاؤس کے باہر لے جا کر باندھ دے اور باربی کیو کرے وہ گدھا لے کر کیوں گیا ہے؟‘‘

راجا نے یوں میری طرف دیکھا جیسے مجھ پر گدھا ہونے کا شک کر رہا ہو۔ ’’تجھے بتایا تو تھا کہ آج کل گدھے کا گوشت چل رہا ہے۔‘‘

’’اوہ ہاں میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی، تو شہزادہ بدبخت لوگوں کو بیف، مٹن کے نام پر گدھا کڑاہی کھلاتا ہے۔‘‘

’’آج کل ایسا ہی چل رہا ہے۔‘‘ راجا نے کہا۔ ہمارے نزدیک ہی بکرا ہوٹل سے ناشتا کر رہا تھا۔ مگر جب اس نے ناشتے کے بعد دوسری کارروائی شروع کی تو فتو نے اپنے ڈیک کی طرح چلا کر کہا۔

’’جلیل اسے یہاں سے لے کر دفع ہو جا ورنہ میں کاٹ دوں گا۔‘‘

’’اگر تو نے بکرے کو ہاتھ لگایا تو میں بھی کچھ کاٹ دوں گا۔‘‘ میں نے جوابی دھمکی دی مگر جب ایک کونے سے فتو کا سالا اٹھا تو بادلِ ناخواستہ مجھے اٹھنا پڑا تھا۔ باہر آ کر میں نے راجا سے کہا۔ ’’پہلے اسے گھر چھوڑ دوں ورنہ اس کے ساتھ سکون سے ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔ جہاں جائیں گے یہ ایسے ہی ذلیل کر کے نکلوائے گا۔‘‘

سچی بات ہے کہ میں خود بھی بکرے کے ساتھ گھر جانا چاہتا تھا کیونکہ ان دنوں مجھ پر کاہلی کا موسم آیا ہوا تھا اور کچھ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ حد یہ کہ رومانس کرنے کو بھی نہیں۔ کل ہی شنو نے ڈیٹ پوائنٹ یعنی چھت پر ملاقات کے دوران شکوہ کیا کہ میں بالکل ٹھس ہو کر رہ گیا ہوں۔ میں نے اس کا ذمے دار ماں اور خالہ لاؤڈ اسپیکر کو قرار دیا جنہوں نے میرے جوان گرم خون کو ٹھنڈا کرنے میں وہی کردار ادا کیا تھا جو ہمارے سیاست داں کرپشن کے خلاف کارروائی کرنے والوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ یعنی بالآخر وہ کارروائی کرنے والوں کو ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہو ہی جاتے ہیں۔ راجا میرا موڈ بھانپ گیا اور میرے ساتھ ہو

لیا۔ مجبوراً مجھے بکرا گھر ڈراپ کر کے اس کے ساتھ شہزادہ
کڑاہی ہاؤس آنا پڑا تھا۔ راجا کا خون کھول رہا تھا جیسے
سوڈے میں ابال آتا ہے مگر میں کڑاہی ہاؤس تک آتے
آتے اس کا ابال ختم کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

”دیکھ بے راجا تو جانتا ہے کہ نفرٹے پھندے اور
ہاتھا پائی شرفا کا شیوہ نہیں ہے۔“

”دھکیل بے شک آج کل ملک میں شریفوں کا راج
ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم جیسے لوگ بھی شرفا
ہونے کا دعویٰ کریں۔“ راجا...... نے مجھے آئینہ دکھایا۔

”میرا مطلب ہے کہ یہ میرا اسٹائل نہیں ہے۔“

”تو کیا کہنا چاہ رہا ہے کہ ہم لکھنوی انداز میں اس
کمینے کے آگے آداب بجالائیں اور اس سے التجا کریں کہ وہ
والد حضور کا خر سیاہ واپس کر دے ورنہ بخدا ہم ابا حضور کی
قرولی اپنے پیٹ میں بھونک کر خودکشی کر لیں گے۔“

”یہ گھونپنے کا مترادف ہے۔“ میں نے تصحیح کی۔
”اس لیے صرف ایک بار بھونکنا کافی ہوگا۔“

مگر راجا کا ارادہ کچھ اور تھا۔ ”میں اس کی کڑاہی والی
کفگیر اس کی ...... میں گھونپ دوں گا۔“

اگرچہ راجا نے جو دھمکی دی تھی، وہ عملی طور پر ناممکن
تھی مگر میں نے اسے باز رکھنے کی کوشش جاری رکھی۔ ”یار
سمجھا کر، فرض کر ہم وہاں جاتے ہیں اور گدھا وہاں نہیں ملتا
جیسا کہ ایک سو ایک فیصد امکان ہے کہ گدھا وہاں نہیں ہوگا
تب تو کیا کرے گا۔ کفگیر کیا بے شک کڑاہی گھونپ دے،
گدھا تو نہیں ملے گا۔“

”نہ ملے میں اسے کسی قابل نہیں چھوڑوں گا۔ رفع
حاجت کے بھی نہیں۔“

میں چلتے چلتے رک گیا۔ ”راجا فیصلہ کر لے تجھے گدھا
لینا ہے یا انتقام۔“

”دونوں۔“ اس نے کہا۔

”تب مجھے معاف رکھ، میں صرف گدھے کی بازیابی
تک تیرے ساتھ ہوں۔“ میں نے یوٹرن لینے کا ارادہ کیا
کہ راجا انتقام سے دست بردار ہو گیا اور ناقابلِ بیان الفاظ
میں اس نے مجھ سے درخواست کی کہ اس کی مدد جاری
رکھوں۔ میں نے اس کی بکواس کو نظرانداز کرتے ہوئے قدم
آگے بڑھائے۔ ”اس صورت میں یہ بات اپنے گدھے
جیسے دماغ میں بٹھا لے کہ تجھے میرے کہنے پر عمل کرنا ہے۔
ورنہ تو خود جو چاہے کر۔“

بادلِ ناخواستہ راجا نے حلف لینے کے انداز میں ہاتھ
اٹھا کر اقرار کیا کہ وہ صرف میرے کہنے پر عمل کرے گا۔
اپنی ذاتی عقل قطعی استعمال نہیں کرے گا۔ ہم کڑاہی ہاؤس
کے پاس پہنچے تو وہاں ایک ملازم دکان کھول رہا تھا۔ کھانے
کا باقاعدہ آغاز لنچ سے ہوتا تھا اور پھر ڈنر کے بعد ختم ہوتا
تھا۔ ناشتے کا کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے شہزادہ بدبخت آرام
سے دکان کھولتا تھا۔ مگر وہ خود اس وقت دکان میں موجود نہیں
تھا۔ سڑک کے پاس سے راجا نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔

”یہاں تو کوئی نہیں ہے۔“

”مجھے پہلے ہی توقع تھی۔“ میں نے جواب دیا۔
”گدھا یہاں نہیں ہوگا۔“

”پھر کہاں ہوگا؟“

”میرے ساتھ آ۔“ میں نے کہا اور دکانوں کے اوپر
بنے فلیٹوں کی سیڑھیوں کا رخ کیا۔ راستے میں راجا نے
پوچھا۔

”تیرا کیا خیال ہے، گدھا اوپر ہوگا؟“

”راجا گدھے جیسی باتیں نہ کر۔ اگرچہ گدھا باتیں
نہیں کرتا لیکن اگر کر سکتا تو بالکل تیرے جیسی بات کرتا۔ چار
منزل اوپر گدھا کون لے جائے گا اور اسے لے جانے کون
دے گا؟“

”تب تو اوپر کیوں جا رہا ہے؟“

”جلد تو دیکھ لے گا۔“ میں نے کہا اور کچرے کے
ڈسٹ بن سے بچ کر اوپر قدم رکھا۔ راجا نہیں بچ سکا اور
ڈسٹ بن سیڑھیوں پر گرا اور کچرا بکھیرتا ہوا نیچے جانے لگا۔
ہم نے زیادہ رفتار سے اوپر کا رخ کیا کیونکہ ڈسٹ بن کی
مالکہ فلیٹ سے نکل آئی تھی اور ناقابلِ یقین رفتار کے ساتھ وہ
ناقابلِ بیان الفاظ اپنی زبان سے ادا کر رہی تھی۔ شکر ہے وہ
ہمارے پیچھے نہیں آئی۔ راجا مجھ سے پہلے اوپر پہنچ گیا تھا اور
پھولی سانس کے ساتھ چھت کا جائزہ لے رہا تھا جہاں ٹوٹا
پھوٹا کباڑ اور اس کے ساتھ الگنیوں پر کپڑے پھیلے تھے۔
راجا دلچسپی سے ان کا معائنہ کر رہا تھا کہ میں نے اسے کھینچا۔

”ملبوسات پر باقی ریسرچ بعد میں کر لینا۔“

راجا مجبوراً کھنچا آیا۔ میں نے بلڈنگ کے پچھلے حصے
میں جھانکا تو وہاں ایک چھوٹا سا صحن تھا اور اس صحن کو
دیواریں اٹھا کر مختلف حصوں میں تقسیم کر لیا گیا تھا۔ یہاں
بھی زیادہ تر کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا اور ایک صحن میں گدھے
کے سائز کا بکرا بیٹھا ناشتے سے فارغ ہو کر جگالی کر رہا تھا۔
راجا اتنا زیادہ جھک گیا کہ ایک موقع پر نیچے جاتے جاتے
بچا۔ میں نے بروقت اسے گدی سے پکڑ لیا تھا۔ حواس بحال

ہونے پر اس نے سوال کیا۔ ''گدھا کہاں ہے؟''

''یہاں نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن وہ آنے گا یہیں۔''

''تو کیسے کہہ سکتا ہے؟''

''تو نے غور نہیں کیا بکرا جس جگہ ہے وہ شہزادہ کڑاہی ہاؤس کی دکان کے عین پیچھے ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ جگہ بھی شہزادہ بدبخت کے پاس ہے اور بکرا بھی اسی کا ہے۔''

''چل مان لیا کہ بکرا اور جگہ اسی کی ہے مگر یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ گدھا بھی یہیں آئے گا؟''

''وہ اس طرح کہ گدھا دکان کے سامنے سے تو اندر لایا نہیں جا سکتا ہے۔ اس کے لیے سب سے مناسب جگہ یہی ہے۔ تو غور کر سکتا ہے کہ عقبی گلی میں ایک دروازہ بھی کھل رہا ہے۔''

''مگر گدھا یہاں لا کر کاٹا نہیں جا سکتا ہے۔ صرف چھت سے نہیں بلکہ پیچھے کھلنے والی بالکونیوں سے بھی نیچے جھانکا جا سکتا ہے۔'' راجا نے اتنی دیر میں پہلی عقل مندی کی بات کی اور میں قائل ہوا۔

''تو ٹھیک کہہ رہا ہے گدھا یہاں کاٹا نہیں جا سکتا ہے مگر اسے ٹکڑے کر کے یہیں سے دکان میں لایا جاتا ہوگا اور کچن میں پکا کر گاہکوں کو کھلایا جاتا ہوگا۔''

''لیکن ہمیں تو گدھا سالم چاہیے۔'' راجا نے اعتراض کیا۔ ''زندہ سلامت۔ اگر ہم یہیں گدھے کا انتظار کرتے رہے تو وہ زندہ تو نہیں ملے گا۔''

راجا کی یہ بات بھی درست تھی۔ اب ہمیں شہزادہ بدبخت کے سلاٹر ہاؤس کا پتا چلانا تھا۔ اس سے پہلے وہ حرام گدھا حلال کر لیتا۔ مگر یہ خاصا مشکل کام تھا۔ اتنے بڑے شہر میں کسی سلاٹر ہاؤس کا پتا چلانا کون سا آسان تھا اور پھر شہزادہ بدبخت اسے کسی سرکاری سلاٹر ہاؤس میں تو لے جانے سے رہا اور نہ ہی وہ اس کام میں زیادہ لوگوں کو شامل کر سکتا تھا، اس سے راز کھل جانے کا خطرہ رہتا تھا۔ امکان یہی تھا کہ وہ اپنے چند ایک رازدار ملازمین کے ساتھ یہ کام خود کرتا ہوگا اور گدھا کاٹنے کے بعد اس کا گوشت ٹکڑوں کی صورت میں عقبی دروازے سے کڑاہی ہاؤس لایا جاتا ہوگا اور فریزر میں رکھا جاتا ہوگا۔ کیونکہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا اس لیے میں نے راجا سے پوچھا۔ ''تیرا کیا خیال ہے گدھا اس وقت کہاں ہو سکتا ہے؟''

راجا بھنا کر بولا۔ ''اگر میں گدھا ہوتا تو ضرور اس بات کا جواب دے سکتا۔''

''تو تب بھی اس کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''دیکھ راجا میرے پاس جادو کی چھڑی نہیں ہے کہ میں گھماؤں اور گدھے کا پتا چلا لوں۔ وہ اس وقت اس شہر بیکراں میں کہیں بھی ہو سکتا ہے۔ ایک سروے کے مطابق شہر میں گدھوں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ ہے اور اگر اسے معنوی انداز میں لیا جائے تو اصل تعداد کہیں زیادہ ہوگی۔ مگر ہم اصل گدھوں میں بھی تلاش کرنا چاہیں تو تیرے باپ کا گدھا تلاش کرنا بہت مشکل کام ہوگا۔ اس کے باوجود کوشش کی جا سکتی تھی مگر مسئلہ یہ ہے کہ وقت کم ہے اور جب تک ہم تلاش کریں گے گدھا لوگوں کے معدوں میں جا کر ہضم بھی ہو جائے گا۔''

''تب کیا کریں؟'' راجا نے زچ لہجے میں کہا۔ اتنے میں ایک خاتون چھت پر آئی جس نے نوکری اٹھا رکھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ہم منہ دوسری طرف کر کے کھڑے ہو گئے کیونکہ اگر وہ شور مچاتی تو ہمارے پاس فرار کے لیے صرف سیڑھیاں تھیں اور ان پر جگہ جگہ رکاوٹیں تھیں۔ امکان یہی تھا کہ ہم ڈسٹ بن کی طرح لڑھکتے ہوئے نیچے جاتے۔ جو کسر اس سے بچ جاتی وہ بلڈنگ والے پوری کر دیتے۔ اس لیے ہم خاتون کو اپنے شریف ہونے کا یقین دلا رہے تھے اس کے باوجود وہ جاتے ہوئے ہمیں بہت کچھ سنا گئی تھی۔ اس نے ہمیں ایسا ٹھرکی قرار دیا تھا جو عورت تو عورت اس کے کپڑوں تک کو تاڑنے سے باز نہیں آتے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے پُرملامت نظروں سے راجا کی طرف دیکھا۔

''تاڑا تو نے تھا اور سننا ہمیں پڑا۔''

''کوئی بات نہیں یار۔'' راجا نیچے جھانکتے ہوئے بولا۔ ''اللہ نے تجھے دو کان کیوں دیے ہیں۔ اسی لیے تاکہ ایک سے سن کر دوسرے سے نکال دے۔''

''میں پوچھ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے؟''

''اگر اس نے گدھا کاٹ دیا ہو تو ہم اسے رنگے ہاتھوں پکڑوا سکتے ہیں۔''

''بیکار ہے وہ رشوت دے کر چھوٹ جائے گا۔ گدھا فروشی میں اس نے خاصا مال کمایا ہوگا۔''

''تب کیا کیا جائے؟'' راجا بولا اور پھر یوں اچھلا کہ دوبارہ نیچے جاتے جاتے بچا۔ میں نے ایک بار پھر اس کی گدی پکڑ کر کھینچا تھا۔

''کیا بات ہے، اب تیرے باپ کا گدھا اتنا اہم بھی نہیں ہے کہ تو اس کی خاطر حرام موت مر جا۔''

"کون مر رہا ہے۔ مجھے تو ایک خیال آیا تھا۔"
"پل صراط سے بھی تو اسی طرح گرے گا۔ ویسے خیال کیا ہے؟"
اگرچہ وہاں چھت پر کوئی نہیں تھا سوائے چند کوؤں کے، مگر راجا نے یوں میرے کان میں گھس کر اپنا خیال سنایا جیسے ہم کسی دھرنے میں بیٹھے ہیں اور وہ دھرنے کے خلاف کوئی بات کرنے جا رہا ہے۔ مگر اس نے جو خیال سنایا، اس پر میں اچھلا اور اس بار راجا نے مجھے نیچے جانے سے بچایا تھا۔ میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ "خیال تو بہت اچھا ہے مگر اس پر عمل درآمد کیسے ہوگا؟"
"یہ سوچنا تیرا کام ہے۔" راجا نے دانت نکالے۔ "ویسے بھی تو ایسی ہیرا پھیریوں کا ماہر ہے۔"
"چور چوری سے بھلے ہی چلا جائے مگر لوگ اسے ہیرا پھیریوں سے جانے نہیں دیتے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ اوپر اب دھوپ ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی اس لیے ہم نے نیچے کا رخ کیا۔ ڈسٹ بنوں سے بچتے بچاتے یوں باہر آئے کہ پیچھے نصف درجن خواتین ہماری جانوں کو رو رہی تھیں جن کے ڈسٹ بن ہم نے گرائے تھے۔ راجا نے باہر آکر خفگی سے کہا۔
"یار ان لوگوں کو خیال رکھنا چاہیے، سیڑھیاں انسانوں کے آنے جانے کے لیے ہوتی ہیں۔"
"بیٹے خیال تو رکھا ہے۔ خیال رکھنے کی آوازیں ہی تو باہر تک آرہی تھیں۔"
تربوز کا شربت پی کر ہمارے حواس ذرا بحال ہوئے تو میں نے راجا سے کہا۔ "اب ہمیں طویل سفر طے کرنا ہوگا۔"
"وہ کیوں؟"
"ان فلیٹوں کے عقب میں جانے کے لیے، اسی سے بچنے کے لیے تو سیڑھیوں کا شارٹ کٹ استعمال کیا تھا۔"
راجا کی جان نکل گئی، اس نے جلدی سے کہا۔ "ہم اوپر سے رسی کی مدد سے نیچے نہیں اتر سکتے؟"
"اتر تو سکتے ہیں مگر نہ تو ماہر ہے اور نہ میں اس لیے امکان ہے کہ ہماری لاش بکرے کے ساتھ پڑی ہوگی۔"
راجا نے فوراً اپنی تجویز واپس لی اور میرے ساتھ چلنے لگا۔ "تیری بائیک کہاں ہے؟"
"خلیل کی بائیک کا انجن سیز ہوگیا تھا۔ آج کل وہ میری بائیک پر دفتر آجا رہا ہے۔"
"اپنا انجن کبھی سیز نہیں ہوتا۔" راجا نے سرد آہ بھری۔ "ابا کے پاس آدھے ہارس پاور کا گدھا تھا اب وہ بھی نہیں رہا۔"
"بیٹے تیرے ابا کے پاس پیسا بہت ہے مگر وہ خرچ نہیں کرتا ہے۔"
"ہاں لیکن وہ اسے اپنے ساتھ قبر میں بھی نہیں لے جا سکتا۔" راجا کا لہجہ اس بار پُرامید تھا۔ "ایک نہ ایک دن یہ سب میرا ہوگا۔"
"لے کر تو تو بھی قبر میں نہیں جائے گا مگر یقین ہے کہ تو اپنے نہ ہونے والے وارثوں کے لیے کچھ چھوڑ کر بھی نہیں جائے گا۔"
راجا نے اس سچ بیانی کا برا منایا مگر ایسی ہی نوک جھوک میں یہ طویل سفر آسانی سے کٹ گیا۔ چلتے ہوئے راجا نے کسی بچے کی کاپی سے پھاڑ کر رنگ کر دیا جانے والا ایک کاغذ اٹھا لیا تھا اور ذرا سی جستجو کے بعد اسے ایک بال پوائنٹ بھی پڑا مل گیا۔ جس میں ذرا سی سیاہی باقی تھی۔ اس نے ایک تھڑے پر بیٹھ کر کاغذ پر اس پین سے اپنی ٹیڑھی میڑھی رائٹنگ میں ایک سطر لکھی اور ہم آگے روانہ ہوئے۔ میں نے راجا سے کہا۔ "کہیں تیری تحریر نہ پکڑوا دے۔"
"اپنی تحریر تو میں بھی دوبارہ نہیں دہرا سکتا اس لیے کوئی پہچانے گا کیسے۔ میرے ایک ٹیچر اپنی محبوبہ کو جو اتفاق سے میری دوسری ٹیچر تھی۔ پکڑے جانے کے خوف سے مجھ سے لو لیٹر لکھواتے تھے۔ ان کی فرمائش پر میں ہر بار تحریر بدل کر لکھتا تھا۔ اس کی اتنی مشق ہوئی کہ اس کے بعد کبھی ایک جیسا لکھا ہی نہیں۔ میٹرک میں اسی وجہ سے فیل قرار دیا تھا کہ ایک ہی پرچے میں دس طرح کی رائٹنگ تھی اور کوئی آپس میں میچ نہیں کر رہی تھی۔"
"پرچہ چیک کرنے والا بھی چکرا گیا ہوگا کہ دس افراد نے ایک پیپر دیا اور پھر بھی پاسنگ مارک والا نہیں ہے۔"
اس سچ بیانی پر راجا نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا کہ میں نے اوپر دیکھا اور بروقت ایک طرف سرک گیا۔ راجا نے اوپر سے آنے والے کپڑوں کے دھوون سے غسل کیا اور اچانک ہی اس کی سفید شرٹ دھانی رنگوں سے رنگ گئی تھی۔ یقیناً جن کپڑوں کا دھوون تھا وہ رنگ چھوڑتے تھے اور بالٹی الٹنے والی کے رنگ ڈھنگ میں دیکھ ہی رہا تھا۔ بالٹی پھینک کر وہ جس اور بالکونی سے غائب ہو گئی۔ اس سے پہلے راجا آتش فشاں کی طرح پھٹتا اور گالیوں کا لاوا اگلتا، میں نے اس کا منہ دبایا اور اسے کھینچ کر

ایک دیوار کے ساتھ لے گیا۔ یہاں ہم آنے والی دوسری بوچھاڑ سے بچ نکلے تھے۔ راجا مچل رہا تھا اور خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''راجا آرام سے یار...... گدھے مچلنا بند کر... خود پر قابو پا...۔ ہم منزلِ مقصود پر ہیں اور یہاں تیری کسی قسم کی ہنگامہ آرائی بلاوجہ لوگوں کو متوجہ کر لے گی خاص طور سے اس حسین خاتون کو جس نے تجھے اپنے رنگ میں رنگ دیا ہے۔''

راجا نے مچلنا بند کیا اور منہ چھوڑنے پر سرگوشی میں غرایا۔ ''جلیل تو نے اچھا نہیں کیا، بھاڑ میں گئی منزلِ مقصود یہ شرٹ عارفہ کا تحفہ تھی۔''

''کوئی بات نہیں یار جاتے ہوئے کسی اچھے ڈرائی کلینرز کو دے دینا۔ وہ اس کے سارے رنگ نکال دے گا ورنہ میں لنڈے سے تجھے امپورٹڈ شرٹ دلا دوں گا بالکل ایسی ہی۔''

''یہ لنڈے کی نہیں ہے۔''

''بیٹے مالِ حرام عارفہ کے پاس ہوتا ہے، میرے پاس نہیں اور اب تو بکواس بند کر کے کام کی طرف متوجہ ہو۔ میرا خیال ہے یہی دروازہ ہے۔''

ہم جس دیوار کے ساتھ کھڑے تھے یہ فلیٹوں کے عقبی صحن کے آغاز میں تھی اور اس میں پہلا دروازہ تھا۔ یہاں عقب میں پرانی آبادی تھی اور چھوٹی چھوٹی گلیوں میں تین چار منزلہ مکان سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ان میں سے بہت سے تو بس گرنا چاہتے تھے مگر اس لیے نہیں گر رہے تھے کہ دائیں بائیں اور پیچھے کے مکانوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ راجا نے سال خوردہ اور زنگ آلودہ لوہے کے چھوٹے سے دروازے کی درزوں سے جھانکنے کی کوشش کی اور اطلاع دی۔ ''کچھ نظر نہیں آرہا۔''

''مجھے نظر آرہا ہے۔'' میں نے دیوار سے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ دیوار دروازے سے ذرا کم ہی اونچی تھی اور میں نے آرام سے اچک کر دوسری طرف جھانک لیا۔

''کیا نظر آرہا ہے؟'' راجا نے بھی اچک کر جھانکنے کی کوشش کی مگر اس کا چھوٹا قد رکاوٹ بن گیا۔

''بکرا۔'' میں نیچے ہوا۔ ''ہم شہزادہ کڑاہی ہاؤس کے عین پیچھے ہیں۔''

''اب کیا کریں؟''

''وہی جو تو نے کہا تھا اور تو نے ہی کرنا ہے۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''دیر مت کر، موقع اچھا ہے۔ بڑے اور بچے کام اور اسکول گئے ہیں، ان کی مائیں مارکیٹ گئی ہیں یا چولہے ہانڈی میں لگی ہیں اس لیے ہر طرف امن وسکون ہے تو فٹافٹ اپنا کام کر۔''

راجا نے دائیں بائیں دیکھا اور اعتراف کرنے کے انداز میں بولا۔ ''یار مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے تب واپس چلتے ہیں۔'' میں نے قدم بڑھائے تھے کہ راجا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اچھا یار میں جاتا ہوں۔'' اس نے کہتے ہوئے ایک بار پھر آس پاس کا جائزہ لیا اور پھرتی سے دروازے کی کنڈی پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھا اور دیوار سے اندر کودا۔ فوراً ہی اندر سے ایک عجیب سی آواز آئی۔ پہلی آواز راجا کے کودنے کی تھی مگر دوسری آواز واضح نہیں تھی۔ اس کی وضاحت اس وقت ہوئی جب مشتعل راجا نے دروازہ کھولا اور بکرے کی رسی پکڑ کر کھینچتا ہوا نمودار ہوا۔ رازداری کی وجہ سے وہ بولنے سے قاصر تھے مگر اس کے تاثرات چیخ چیخ کر بکرے کو گالیاں دے رہے تھے۔ بکرا صرف سائز میں ہی نہیں طاقت میں بھی گدھے کے برابر تھا۔ راجا اسے کھینچ نہیں پا رہا تھا اس لیے مجھے بھی شامل ہونا پڑا مگر میں نے رسّا کشی میں حصہ لینے کے بجائے گلی سے ایک نکیلی اور کانٹوں والی سوکھی شاخ اٹھائی اور بکرے کے جسم پر ایک موزوں جگہ پر آزمائی تو وہ فوراً چل پڑا اور راجا جو پہلے اسے کھینچ رہا تھا اب خود اس کے پیچھے کھنچا جا رہا تھا۔ ہمارا مقصد بکرے سمیت جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا اس لیے میں نے بکرے کی صبا رفتاری پر اعتراض نہیں کیا البتہ راجا کو خبردار کیا۔

''اس کی رسّی مت چھوڑنا ورنہ یہ غائب ہو جائے گا۔''

''میری مدد کر۔'' راجا نے دوڑتے ہوئے فریاد کی۔ بکرا جیسے رکاوٹوں کی دوڑ میں حصہ لے رہا تھا اور رکنے پر آمادہ نہیں تھا۔ مجبوراً مجھے اس بار رسّاکشی میں شامل ہونا پڑا، اس سے بکرے کی رفتار میں دس فیصد کمی آئی اور آتے ہوئے جو فاصلے ہم نے پندرہ منٹ میں طے کیا تھا، وہ بکرے نے جاتے ہوئے پانچ منٹ میں ختم کرا دیا اور ہم سڑک پر آگئے۔ بہ مشکل ایک کھمبے کے گرد رسی لپیٹ کر میں نے اور راجا نے بکرے کو روکا اور راجا نے اس بار کھل کر گالیاں دیتے ہوئے بتایا کہ بکرے نے اندر کودتے ہی اسے ٹکر ماری تھی۔ دوسری آواز اسی کی آئی تھی۔ راجا نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''سخت گھٹیا نسل کا بکرا ہے۔''

اس پر بکرے نے پھر راجا کو ٹکر مارنے کی کوشش کی

مگر رسی تنگ پڑ جانے سے خود پلٹ کر واپس گرا۔ راجا نے قہقہہ مارا تھا۔ ''اب مزہ آیا بیٹے؟''

''راجا اسے رکھنا کہاں ہے؟''

''ایک جگہ ہے میرے ذہن میں۔'' راجا نے مسرور لہجے میں کہا۔ ''ایک جاننے والا ہے۔ وہ قربانی کے لیے بکرے پالتا ہے۔ اسے اپنا بکرا کہہ کر رکھوا دوں گا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اگر تیرا جاننے والا ہے تو کبھی یقین نہیں کرے گا کہ تو نے قربانی کے لیے بکرا لیا ہے اور وہ بھی اتنا بڑا۔''

''بول دوں گا کہ ابا نے لیا ہے تب وہ یقین کر لے گا۔''

''اور اگر وہ تیرے ابا کا بھی واقف کار نکلا اور ان کی آپس میں کہیں ملاقات ہو گئی تو....''

''ہو جانے دے۔'' راجا اس جرح سے بھنّا گیا۔ ''کیا کر لے گا بکرا تو ضبط کرنے سے رہا۔ میں اس کی کچھ کمزوریوں سے واقف ہوں اس لیے مجھ سے بگاڑ نہیں سکے گا۔''

ماما بکرے والا جسے بعض بے تکلف ماما بکرا بھی کہتے تھے۔ بکرے کی سی صورت والا تھا اور وہ تمباکو کی جگالی بھی بکرے کے انداز میں کر رہا تھا۔ حسبِ توقع اس نے بکرے کو راجا کا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ''چوری کر کے لایا ہے؟''

''دیکھ ماما بکرے۔'' راجا نے لہجہ بدل کر کہا۔ ''زیادہ سوال مت کر، بکرا رکھ لے اور اپنا خرچہ بتا دے جب میں بکرا لینے آؤں گا تو دے دوں گا۔''

ماما بکرا سمجھ گیا کہ اسے مزید سوالات نہیں کرنے ہیں۔ اس نے بکرا کان سے پکڑا اور اندر احاطے میں لے گیا۔ بکرا بھی آدمی شناس تھا اس کے ساتھ نہایت شرافت سے گیا تھا۔ واپسی میں، میں اور راجا بہت خوش تھے کہ ایک مشکل کام آسانی سے ہو گیا۔ میں نے کہا۔ ''جب اس شہزادہ بدبخت کو تاوان کا پرچہ ملے گا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ جائیں گے۔''

راجا چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے جیب پر ہاتھ مارا اور مرے لہجے میں بولا۔ ''پرچہ....''

میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ ''تو نے رکھا ہی نہیں۔''

''اس منحوس بکرے نے ٹکر مار کر ذہن سے سب نکال دیا۔''

''کیا اس نے جہاں ٹکر ماری تھی تیرا دماغ وہیں پایا جاتا ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ بکرا پار کر کے اس کی جگہ پرچہ رکھ دیا جائے گا جس میں راجا نے لکھا تھا۔

''اگر بکرا واپس چاہتا ہے تو گدھا واپس وہیں چھوڑ دے جہاں سے لیا تھا۔ بکرا واپس مل جائے گا۔''

''میں دوبارہ جاتا ہوں رکھنے کے لیے۔'' راجا نے خون کے گھونٹ پی کر کہا۔

''ضرور، اب تک وہاں پولیس آ چکی ہوگی۔ یہ کنگ سائز بکرا ہے جس کی مالیت کم سے کم بھی پچاس ہزار ہوگی اور ممکن ہے اسے عید پر فروخت کرنے کے لیے پالا گیا ہو۔ تب اس کی قیمت کہیں زیادہ بنے گی۔''

''تب کیا کریں؟''

''کوئی اور ترکیب سوچتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ہم سڑک پر واپس شہزادہ کڑاہی ہاؤس کی طرف جا رہے تھے۔ راجا بھی ترکیب سوچ رہا تھا اور پھر اسی نے سوچ لی۔ اس نے راہ چلتے ہوئے ایک پتھر اٹھایا اور اس پر کاغذ لپیٹا۔ حسبِ توقع ہم شہزادہ کڑاہی ہاؤس کے سامنے پہنچے تو وہاں ہنگامی صورتِ حال دکھائی دے رہی تھی۔ شہزادہ بدبخت ملازموں پر گرج برس رہا تھا جن کے ہوتے ہوئے کوئی بکرا اتنی آسانی سے لے گیا۔ ہم تماش بینوں میں یوں شامل ہوئے کہ شہزادہ بدبخت کی نظر ہم پر نہ جائے۔ یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی کہ بکرا ایک لاکھ روپے مالیت کا تھا اور شہزادہ بدبخت نے اس کی قیمت کا اعلان کرتے ہوئے ملازموں کو دھمکی دی تھی کہ یہ رقم ان کی تنخواہ سے کٹے گی۔ میں نے سرگوشی میں راجا سے کہا۔ ''موقع اچھا ہے، اپنا کام کر جا۔''

میں اور راجا سڑک پار گئے اور راجا نے وہاں سے رقعہ لپٹا پتھر اتنی مہارت سے پھینکا کہ وہ سیدھا شیشے کے شوکیس پر جا لگا اور شیشہ ٹوٹنے کی آواز ہمیں اس گلی میں بھی آئی جس میں ہم پہلے ہی مڑ چکے تھے۔ اب شہزادہ بدبخت یا اس کے ملازمین ہمیں پکڑنا بھی چاہتے تو نہیں پکڑ سکتے تھے۔ گلی پار کر کے ہم سانس لینے کے لیے رکے اور راجا نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''یار بکرا ایک لاکھ کا ہے اگر ستر اسّی میں نکل جاتا ہے تب بھی ابا کو گدھا دلوا کر خاصا کچھ بچ جائے گا۔''

''بکواس نہ کر تیرے باپ کا گدھا واپس لاتا ہے۔ کیا تو نے اسے گدھے کے فراق میں روتے نہیں دیکھا۔ وہ نقصان پر نہیں رو رہا تھا، تیرا باپ بلکہ ماں کو بھی اس جانور سے پیار ہے جو اُن کا وہ بوجھ اپنے شانوں پر اٹھاتا ہے جو
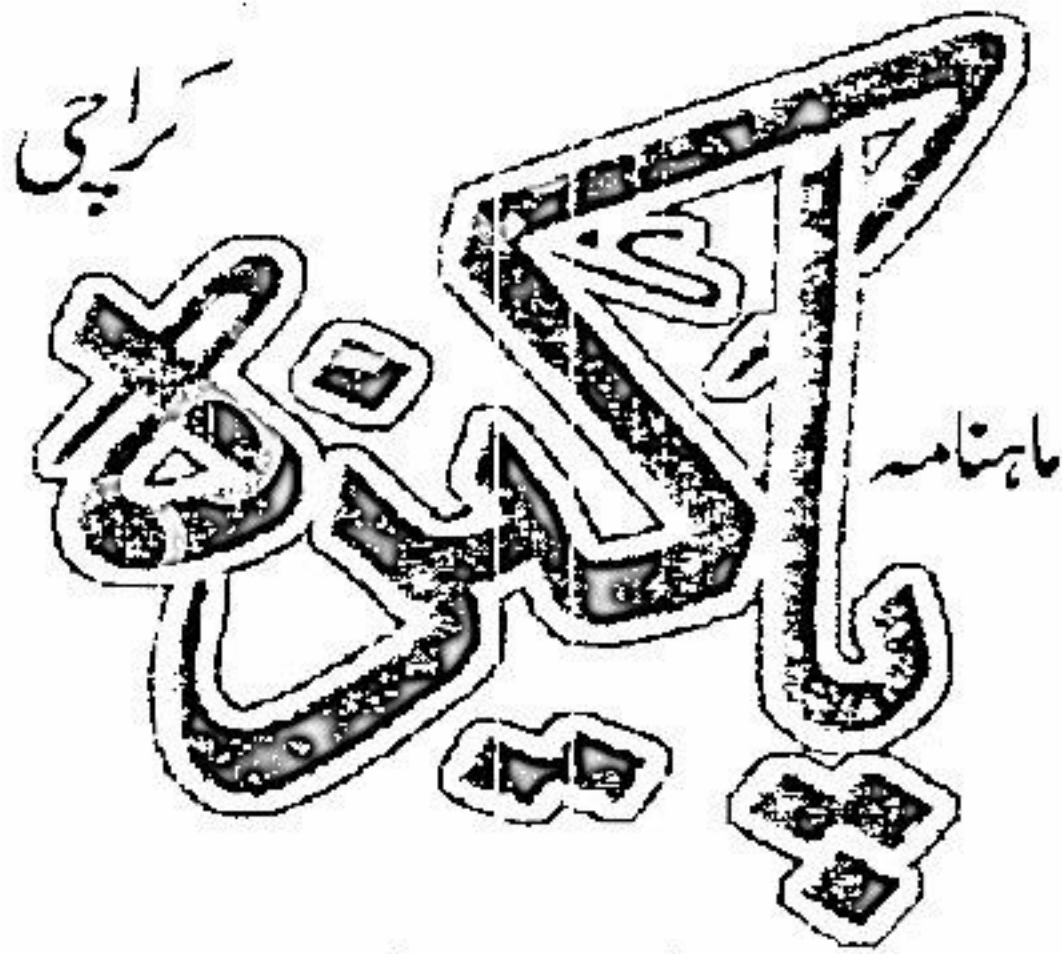
اصل میں بیٹے اٹھاتے ہیں۔ انہوں نے اسے بچپن سے پالا ہے۔ گدھا تو تیرا باپ بھی دوسرا لے سکتا ہے بلکہ دو لے سکتا ہے۔ مگر اسے تو اپنا لال چاہیے۔ راجا تو کمینہ ہی لیکن مجھے تجھ سے یہ امید نہیں تھی۔''

میری جذباتی تقریر پر راجا شرمندہ ہو گیا۔ ''یار تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔''

''دیکھ ہمارے بس میں جو تھا، وہ ہم نے کر دیا ہے اب اگر گدھا واپس آ گیا تو تو بکرا واپس کر دے گا اور اگر گدھا نہیں آیا تو پھر تیری مرضی کہ تو بکرے کے ساتھ کیا کرتا ہے۔''

''نہیں یار تو ٹھیک کہہ رہا ہے میں نے اس طرح تو سوچا ہی نہیں تھا۔ لالی سے ابا اور اماں کو پیار ہے۔ میرے ساتھ ہی پلا بڑھا ہے اور اس کے ساتھ مجھ سے کہیں اچھا سلوک ہوتا تھا۔''

''کیونکہ وہ ان کی توقع پر پورا اترتا تھا اور تو نہیں اترتا تھا۔'' میں نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔ ''اب شام کو کیفے ڈی پھونس میں ملیں گے۔''

ٹیلر شاپ پھر سے چلنے لگی تھی اور استاد اکرم نے چلے جانے والے گاہک بھی واپس کھینچ لیے تھے۔ شنو خوش تھی کہ اب اس کے سوٹ فری میں اور اس کی مرضی کے مطابق سل رہے تھے جبکہ درمیان میں اسے سوٹ ٹیلرز سے سلائی دے کر سلوانے پڑتے تھے جو بعض اوقات اس کے کپڑوں کا ستیاناس مار دیتے تھے۔ میری شاپ پر شنو کے کپڑے بہت توجہ سے سیے جاتے تھے۔ ابھی بھی شنو کے دو سوٹ تھے جو سل کر تیار تھے اور مجھے شام کو ڈیٹ پوائنٹ پر ڈلیور کرنے تھے۔ میں پہلے دکان گیا۔ وہاں سے سوٹ اور حساب لیا۔ پھر ایک جگہ چکن بریانی کھائی۔ احتیاطاً میں نے سوچ لیا تھا کہ میں چکن والی چیزیں ہی کھاؤں گا کیونکہ فی الحال اس کا کوئی حرام متبادل نہیں آیا تھا جیسا کہ گوشت کے معاملے میں آ چکا تھا۔ اتفاق سے ہوٹل کے ٹی وی پر اسی بارے میں رپورٹ آ رہی تھی جس میں بتایا جا رہا تھا کہ وطنِ عزیز میں لوگوں نے کوئی ایسا جانور نہیں چھوڑا تھا جس میں گوشت ہوتا ہو اور وہ سب پبلک کو کھلائے جا رہے تھے۔

دن میں خاصی گرمی تھی اور میں نہا دھو کر سو گیا۔ شام کو اٹھا اور شنو کے سوٹ لے کر چھت پر آیا۔ وہ حسینہ ہمیشہ دیر سے آتی تھی اور مجھے عاشق کی حیثیت سے انتظار کرنا پڑتا تھا۔ مگر اس انتظار میں بھی لذت ہے کہ خیال تو اسی دل ربا کا ذہن میں ہوتا تھا اس وقت بھی میں شنو کے بارے میں

مناسب اور غیر مناسب سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ چھت پر آہٹ ہوئی اور میں نے عاشقانہ نیاز مندی کے ساتھ دونوں سوٹ دیوار کے دوسری طرف کرتے ہوئے سخت عاشقانہ لہجے میں کہا۔ ''کاش کہ میں تیرا کوئی سوٹ ....''

باقی جملہ حلق میں ہی رہ گیا کیونکہ سامنے خالہ لاؤڈ اسپیکر کھڑی تھی اور میری گھگی بندھ گئی۔ ''خالہ وہ میرا مطلب ہے....''

''تیرا مطلب میں اچھی طرح سمجھتی ہوں میرے بچے۔'' خالہ نے شاپر اچک لیا۔ ''فکر مت کر وہ وقت بھی زیادہ دور نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہی ہوتے ہیں۔'' خالہ نے نیچے جاتے ہوئے کہا اور مطلب سمجھ کر میں نے ایک چیخ ماری بھی جس پر اماں کا بکرا بدکا اور اس نے منمنا کر اماں کو پکارا تھا۔ اس سے پہلے اماں آتیں، میں دوڑتا ہوا نیچے آیا اور اتفاق سے اسی وقت خلیل ڈیوٹی سے آیا تھا۔ میں نے اس سے بائیک کی چابی لی اور گھر سے نو دو گیارہ ہو گیا۔ پچھلی بار اماں نے خوش خبری سنائی تھی کہ میری منزل قریب ہے اور آج خالہ لاؤڈ اسپیکر نے تصدیق کر دی۔ کیفے ڈی پھونس آ کر میں نے فتو کے چھوٹے کو دودھ پتی کا آرڈر دیا جب سے فتو کی بیوی کپڑے سلوانے میری دکان پر آنے لگی تھی فتو نے پیشگی پیسے مانگنا ترک کر دیے تھے۔ ابھی میں نے دودھ پتی کا پہلا سپ لیا تھا کہ کوئی سامنے آ بیٹھا اور میں سمجھا راجا ہے۔

''یار راجا اس بکرے ....'' میرا باقی جملہ حلق میں اٹک گیا کیونکہ سامنے شہزادہ بدبخت بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔

''میں بھی بکرے کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں۔ وہ کہاں ہے؟''

''کون سا بکرا کہاں ہے؟'' میں نے سنبھل کر کہا۔

''میں سمجھا کہ راجا آیا ہے اور ہمیں یک بکرے کا سودا کرنے جانا تھا۔''

''جلیل مجھے بے وقوف مت بنا۔'' شہزادہ بدبخت نے آگے جھک کر کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ بکرا تم دونوں نے غائب کیا ہے میں راجا کی رائٹنگ اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ میں خود اس چیز کا ماہر ہوں اور ہم ایک ہی اسکول میں پڑھے ہیں۔''

میں نے گہری سانس لی۔ بات کھل گئی تھی اس لیے میں نے بھی کھل کر بات کی۔ ''دیکھ یار راجا کے باپ کا گدھا غائب ہے اور وہ اس کے غم میں بے حال ہے۔''

شہزادہ بدبخت نے سر ہلایا۔ ''اب سمجھا کہ رقعے میں کس گدھے کا ذکر تھا۔''

''تب اسے اس کی جگہ واپس پہنچا دے اور اپنا بکرا لے جا۔''

''یہی تو مسئلہ ہے، گدھا میں نے نہیں لیا۔''

''تو نے ہی لیا ہے۔'' میں نے یقین سے کہا۔

''اس یقین کی وجہ؟''

میں نے اسے نابینا فقیر کے بارے میں بتایا جو عینی گواہ تھا اور اس نے چور کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ ایک پاؤں گھسیٹ کر چل رہا تھا۔ میری بات سن کر شہزادہ بدبخت نے سکون کا سانس لیا۔ ''تب وہ میں نہیں ہو سکتا کیونکہ میرا پاؤں اب ٹھیک ہے اور میں نارمل چلتا ہوں۔''

شہزادہ بدبخت نے صرف کہا نہیں بلکہ چل کر بھی دکھایا۔ وہ واقعی اب نارمل چل رہا تھا۔ وہ واپس آ کر بیٹھا۔ ''میں نے پاؤں کی سرجری کرائی ہے۔ اس میں راڈ ڈالی گئی ہے اس لیے میں اب ٹھیک سے چل رہا ہوں۔''

''تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' میں متفکر ہو گیا۔ ''تب گدھا کون لے گیا ہے؟''

''یہ تم لوگ معلوم کرتے رہو اور میرا بکرا واپس کرو۔'' اس نے مطالبہ کیا۔ ''اصل میں وہ میرا بھی بکرا نہیں ہے کسی نے امانتاً رکھوایا تھا۔''

''تیرا نہیں ہے۔'' میں چونکا۔ ''تب تو لوگوں کو مٹن کے نام پر کیا کھلاتا ہے۔''

میرے سوال پر شہزادہ بدبخت بدکا۔ ''ظاہر ہے مٹن ہی کھلاتا ہوں مگر میرا کڑاہی ہاؤس اتنا بڑا نہیں ہے کہ میں روز بکرے ذبح کروں۔ ہفتے میں مشکل سے دو بکرے نکلتے ہیں اور وہ بھی سلاٹر ہاؤس سے لانے پڑتے ہیں۔''

مجھے لگا کہ وہ درست جواب نہیں دے رہا ہے مگر وہ لوگوں کو کیا کھلاتا ہے اور لوگ راضی خوشی کیا کھاتے ہیں، یہ ان کا آپس کا معاملہ تھا۔ میں نے کہا۔ ''چل بکرا ہی سہی، لیکن یہ جو بکرا ہے، راجا نے کہیں رکھا ہے اور وہی تجھے واپس کر سکتا ہے۔''

''راجا کہاں ہے؟''

''میرا خیال ہے اپنے گھر پر ہو گا۔'' میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا اور وہ فوراً روانہ ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی راجا ایک طرف سے نمودار ہوا اور اس نے آتے ہی فکر مندی

سے کہا۔

''یہ بدبخت یہاں کیوں آیا تھا؟''

''کیونکہ اسے علم ہو گیا ہے کہ اس کا بکرا تو لے گیا ہے۔''

راجا نے برہم ہو کر کہا۔ ''تو نے اقرار کر لیا۔''

''ہاں، ایک تو مجھ سے ایک حد سے زیادہ جھوٹ نہیں بولا جاتا ہے دوسرے وہ ہمارا کیا بگاڑ لے گا۔ پولیس کے پاس جانے سے تو رہا۔''

''ہو سکتا ہے، وہ گیا ہو۔''

''اس صورت میں اس کی جگہ نادر شاہ آتا اور ہمیں یوں لے جاتا جیسے ہم بکرا لے آئے تھے۔ تیرے معاملے میں قسائی کا کردار بھی وہ خود ادا کرتا۔ مگر شہزادہ بدبخت پولیس کے پاس نہیں گیا ہے اور اب تیری عافیت اسی میں ہے کہ بکرا واپس کر دے۔''

''اور گدھا؟''

''تو اسے نارمل چلتا دیکھ چکا ہے، اس کا مطلب ہے کہ گدھا اس نے نہیں چرایا۔ چور کوئی اور ہے۔''

راجا پریشان ہو گیا۔ ''یعنی ہم نے جو محنت کی وہ رائگاں گئی۔''

''ایسا ہی لگ رہا ہے۔'' میں نے سر ہلایا۔

''ہو سکتا ہے وہ بلف کر رہا ہو گدھا اسی نے چرایا ہو ورنہ تو خود سوچ کہ وہ اتنی جلدی ہم تک کیسے پہنچ سکتا ہے، کیا اسے الہام ہوا ہے کہ بکرا ہم نے اٹھایا ہے۔ ایسا صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب اس نے ابا کا گدھا چرایا ہو اور اسے معلوم ہے کہ جوابی کارروائی ہم ہی کر سکتے ہیں۔''

راجا نے واقعی اہم نقطہ اٹھایا تھا، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ''پر وہ تیری ہینڈ رائٹنگ کا حوالہ دے رہا تھا۔ تم دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھتے ہو۔''

''بکواس کرتا ہے اپنی ہینڈ رائٹنگ تو میں خود دو دن بعد نہیں پہچان پاتا، یہ کہاں سے پہچاننے لگا۔ جہاں تک اسکول کی بات ہے تو ہمارے سیکشن الگ تھے۔ صرف کھیل کے میدان میں ہم ملتے تھے۔''

''مگر یار وہ سچ مچ پریشان لگ رہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ بکرا اس کا نہیں ہے کسی نے امانتاً رکھوایا ہے۔''

''امانتاً۔'' راجا نے قہقہہ مارا۔ ''اس شہر میں کوئی آدمی ایسا ہوگا جو شہزادہ بدبخت کو جانتا ہو اور اس پر اعتماد کرے۔ اس نے بھی بکرا کہیں سے اٹھایا ہے۔ کڑی ہی والے کب سے ایسے تگڑے بکرے بنے گئے، وہ تو چھوٹے اور سستے بکرے لیتے ہیں جن میں گوشت سے زیادہ ہڈیاں ہوتی ہیں۔ جلیل تو بھی کس کی باتوں میں آ رہا ہے۔''

راجا نے یہ بات بھی درست کی تھی کہ شہزادہ بدبخت نہایت چرب زبان اور عیار آدمی تھا۔ وہ باتوں سے آدمی کو گھیرنے کا فن جانتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''تب ایک ہی طریقہ ہے ہم ڈٹ جاتے ہیں کہ بکرا تب ملے گا جب تیرے باپ کا گدھا واپس مل جائے گا۔ اگر اس نے گدھا نہیں لیا ہے تب بھی اس کی تلاش میں ہمارا ساتھ دے اور اپنا بکرا واپس لے لے۔''

''یہ کی نا... عقل کی بات۔'' راجا جوش سے بولا۔ ''وہ اسی کاروبار سے منسلک ہے اور اسے معلوم ہے کہ گدھے کے گوشت کے سپلائر کون کون ہیں۔ وہ ہمیں بتائے گا مگر اب اسے تلاش کرنا پڑے گا۔''

''انتظار کر جب تو اپنے گھر پر نہیں ملے گا تو وہ سیدھا یہیں آئے گا۔''

ہمیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پندرہ منٹ بعد ہی شہزادہ بدبخت آ کر دھڑام سے کرسی پر گرا اور اس نے کھا جانے والی نظروں سے راجا کو دیکھا۔ ''یہ منحوس یہاں ہے اور میں اس کے باپ سے گالیاں سن کر آ رہا ہوں۔''

''شکر کر ابا نے صرف گالیاں دیں ان کی جگہ میں ہوتا تو تجھ پر گولہ داغ دیتا شہزادہ بدبخت۔'' راجا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''لوگوں کو گدھے کا گوشت کھلانے والے۔''

''خدا کے لیے۔'' اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ ''کیوں میری چٹنی بنوانا چاہتا ہے۔ آج کل انصاف کا معاملہ پبلک نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔''

میں نے تائید کی۔ ''بیس روپے کا مٹی کا تیل اور ایک ماچس کی تیلی خرچ ہوتی ہے۔ مجرم کو موقع پر ہی انصاف مل جاتا ہے۔ اب بھلا اس سے سستا انصاف کیا ہوگا۔ لوگ پھر بھی مہنگائی کا رونا روتے ہیں۔''

''میرا بکرا واپس کر دو۔'' شہزادہ بدبخت نے مطالبہ کیا۔

''تو تو کہہ رہا تھا کہ کسی اور کا بکرا ہے۔''

''ہاں جانی چھریا نے رکھوایا ہے۔'' اس بار وہ رو دینے والے انداز میں بولا۔ ''اگر بکرا نہ ملا تو وہ میرے ساتھ وہی سلوک کرے گا جو قسائی بکرے کے ساتھ کرتا ہے۔''

''مجھے تجھ سے ہمدردی ہے یار مگر مسئلہ ہے گدھے کا۔''
''وہ جائے بھاڑ میں۔''
''تب تو اور تیرا بکرا دونوں جائیں بھاڑ میں۔'' راجا نے اچھل کر کہا۔ ''خبردار جو لال کے بارے میں ایک لفظ کہا۔''
میں نے تائید کی ''بالکل، بے شک وہ راجا کا ماجایا نہیں ہے مگر دونوں پلے تو ساتھ ساتھ ہیں۔ تو صرف اسے گدھا نہ سمجھ۔''
''تو کیا راجا سمجھوں۔''
''پنا باپ سمجھ۔'' راجا غرایا۔ ''اگر اپنا بکرا چاہتا ہے تو گدھے کی تلاش میں ہماری مدد کر، جیسے ہی گدھا ملے گا، تیرا بکرا بھی مل جائے گا۔''
اس پر راجا اور شہزادہ بدبخت کے درمیان ایک چھوٹا سا مگر بھرپور فساد ہوا اور پہلی بار ایسا ہوا کہ فتو کے ڈیک کی آواز انسانوں سے دب گئی۔ چیخ چیخ کر دونوں کے گلے کی رگیں پھول گئی تھیں۔ شہزادہ بدبخت کا سفید چہرہ سرخ اور راجا کا گہرا سانولا رنگ عنابی ہو گیا تھا۔ ہاتھا پائی کی دونوں میں نہ ہمت تھی اور نہ قوت اس لیے سارا فساد زبانی رہا اور بالآخر ان کے گلے بھی اس گلے بازی میں جواب دے گئے۔ میں اب تک سکون سے بیٹھا ہوا تھا۔ جب وہ خاموش ہو گئے تو میں نے کہا۔ ''اس مسئلے کا ایک حل ہے۔''
''وہ کیا؟'' شہزادہ بدبخت نے نہایت غلط نظروں سے راجا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا وہی حال تھا گو زبان کو جنبش نہیں مگر آنکھوں میں تو دم ہے۔ جو بات وہ زبان سے نہیں کہہ پا رہا تھا وہی آنکھوں سے کہہ رہا تھا مگر یہاں بھی راجا بازی لے گیا تھا زبان درازی کے بعد اس کی آنکھیں زیادہ رفتار سے شہزادہ بدبخت کو گالیاں دے رہی تھیں۔
''تو اسی شعبے سے تعلق رکھتا ہے اور تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ گدھے کا گوشت کون سپلائی کرتا ہے اس لیے تو ہماری مدد کرے گا اور ہمیں ان تک پہنچائے گا۔ تیری اس مدد کے بدلے ہم تیرا بکرا واپس کر دیں گے۔''
''میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔'' شہزادہ بدبخت نے راجا کی طرف اشارہ کیا، اس پر راجا نے نہایت واہیات اور ناقابلِ بیان الفاظ میں بتایا کہ شہزادہ بدبخت اور کن معاملات میں اپنی بھی مدد نہیں کر سکتا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر سیز فائر کا یونیورسل اشارہ کیا مگر جب دونوں کی دوبارہ چل پڑنے والی زبان نہیں رکی تو میں نے وہی کیا جو اس قسم کے تنازعات میں اقوام متحدہ کرتی ہے یعنی درمیان سے اٹھ جاتی ہے۔ میں اٹھا تھا کہ ان کی زبانیں رک گئیں۔ راجا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔
''تو کہاں جا رہا ہے؟''
''اگر تم نے گلے بازی سے یہ مسئلہ حل کرنا ہے تو ٹھیک ہے لیکن دوسری صورت وہی ہے جو میں نے بیان کی ہے۔''
شہزادہ بدبخت نے خون کے گھونٹ پی کر سر ہلایا۔
''چل میں تیری اس معاملے میں مدد کر بھی دوں لیکن اس کے باوجود گدھا نہیں ملا تو میرے بکرے کا کیا ہوگا؟''
''اصل چیز تیری نیت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تو نے خلوصِ نیت سے مدد کی تو مجھے پتا چل جائے گا اور اگر تیری نیت میں کھوٹ ہوا تو وہ بھی مجھ سے چھپا نہیں رہے گا۔ فیصلہ میرا ہوگا اور بالکل غیر جانبداری سے ہوگا۔''
''میں گدھے کے بغیر بکرا واپس نہیں کروں گا۔'' راجا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا لیکن جیسے ہی میں اٹھنے لگا، اس نے فیصلہ بدل دیا۔
''اب تو سیاست داں بننے کے قابل ہو گیا ہے، وہ بھی فیصلہ بدلنے میں اتنی ہی دیر لگاتے ہیں۔'' میں نے راجا سے کہا اور شہزادہ بدبخت کی طرف متوجہ ہوا۔ ''اس علاقے میں گدھے کے گوشت کا سپلائر کون کون ہے؟''
''میں تین آدمیوں کو جانتا ہوں لیکن تینوں ہی بہت خطرناک ہیں، انہیں بھنک بھی پڑ گئی کہ میں نے ان کی نشان دہی کی ہے تو اگلے دن میرا گوشت سپلائی ہو رہا ہوگا۔ وہ کوئی بھی چیز ضائع نہیں کرتے۔''
''لوگوں کو فرق بھی محسوس نہیں ہوگا بالکل ایسا لگے گا کہ گدھے کا گوشت کھا رہے ہیں۔'' راجا نے معصومیت سے کہا۔
''لیکن اگر تیرا گوشت مارکیٹ میں آیا تو کھانے والا اسے سور کا سمجھے گا۔'' شہزادہ بدبخت نے جوابی کارروائی کی۔
اس سے پہلے جھگڑا پھر شروع ہوتا، میں نے پوچھا۔
''تینوں کے نام بتا اور ٹھکانے بتا جہاں وہ گدھا کاٹتے ہیں؟''
شہزادہ بدبخت نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ''ایک تو جانو ہے جانو جرمن کے نام سے مشہور ہے۔ دوسرا رمضو قسائی ہے۔ خاندانی قسائی ہے مگر لالچ میں پڑ کر اس دھندے میں آ گیا ہے۔ تیسرا شاہو جی لنگڑا ہے۔''
میں اور راجا بیک وقت چونکے۔ ''لنگڑا ہے؟''
''ہاں ایک پاؤں گولی لگنے سے بیکار ہو گیا ہے شاید اسے گھسیٹ کر چلتا ہے اس لیے لنگڑا کہلاتا ہے۔''
میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے اسی کی طرف چلتے ہیں۔''
''میں نہیں جاؤں گا صرف جگہ بتا سکتا ہوں۔''

شہزادہ بدبخت نے صاف انکار کر دیا۔

''ٹھیک ہے جگہ بتاؤ مگر یاد رکھنا کوئی چکر بازی کی تو تیرا نقصان صرف بھرے تک محدود نہیں رہے گا۔'' میں نے اسے دھمکی دی۔

☆☆☆

میں اور راجا گدھوں کے درمیان چھپے ہوئے تھے کیونکہ شاہ جی کے اس ٹھکانے کے احاطے میں کودتے ہی ایک گدھے نے بے وقت کا راگ الاپا اور پھر الاپتا ہی چلا گیا۔ میں نے راجا سے کہا۔ ''اس نے تجھے دیکھ کر آواز نکالی ہے۔''

اسی دوران میں گدھوں کا نگران وہاں آگیا اور ہمیں عجلت میں چھپنا پڑا تھا۔ نگران نے آتے ہی موسیقی کے دلدادہ گدھے کو رسی سے بنا ہوا کوڑا رسید کیا اور چند کوڑے کھا کر گدھے کی طبیعت کو ذرا سکون آیا تو احاطے میں سکون ہوا۔ اس کی آواز سخت سمع خراش تھی۔ نگران ایک چھوٹی سی کوٹھری سے نکلا تھا اور واپس اسی میں چلا گیا۔ وہاں گدھوں کی لید اور ان کی ذاتی بو کے علاوہ بھی ایک بو تھی۔ راجا نے ناک پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جلیل ایسی بدبو نہیں آ رہی جیسے کمیلے میں آتی ہے۔''

یہاں نیم تاریکی تھی اس لیے آس پاس کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ''شاید یہیں گدھوں کو کاٹا جاتا ہے۔''

کچھ دیر بعد اس کی تصدیق بھی ہوگئی جب ایک طرف ٹب میں گدھے کی کھال پائی گئی جسے نمک لگا ہوا تھا اور اس کے پاس والے ٹب میں مرحوم کی سری باقی بچی تھی۔ ظاہر ہے سری فروخت نہیں کی جاسکتی تھی اس کا شاید کچھ اور مصرف نکالا جاتا۔ جب سے وطن عزیز میں دونمبری کا رواج ہوا ہے کوئی چیز ضائع نہیں جاتی ہے۔ احاطے میں نصف درجن گدھے تھے اور ان میں راجا کے باپ کا لال نہیں تھا۔ اگرچہ وہ بھی خر سیاہ ہی تھا مگر نام اس کا لال تھا۔ راجا نے تصدیق کی کہ وہ ان گدھوں میں نہیں ہے۔''

''کہیں وہی تو اب صرف کھال اور سری کی صورت میں باقی نہیں رہ گیا ہے؟''

''نہیں یار یہ سفید کھال والا گدھا ہے اور اس کی سری بھی لال سے بہت بڑی ہے۔ وہ یہاں نہیں ہے۔''

گدھے کو کٹے ہوئے شاید چھ سات گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ میں اور راجا مایوس تھے۔ اگر لال کاٹا جا چکا تھا تو ہمارا یہاں آنا بیکار ثابت ہوا تھا۔ ہم یہی امید کر سکتے تھے کہ گدھا شاید رمضو قسائی یا جانو جرمن کے پاس تھا۔ ہم دیوار پھلانگ کر احاطے سے نکلے اور رمضو قسائی کے

ٹھکانے کی طرف روانہ ہوئے۔ میں نے راستے میں راجا پر واضح کیا کہ اگر ان دو جگہوں پر بھی اس کا گدھا نہ ملا تو اسے بکرا واپس کرنا ہوگا۔ راجا کا موڈ نہیں تھا۔ ''اتنی جلدی بھی واپس نہیں کروں گا۔''

''راجا اگر تیری نیت خراب ہوئی تو میں اس معاملے سے نکل جاؤں گا اور جانی چڑیا شامل ہو جائے گا۔ وہ ویسے ہی تیرا دشمن ہے۔ اگر تو پھنسا تو وہ رگڑ دے گا۔ اس لیے اپنی بات پر قائم رہ۔''

جانی چڑیا کا نام آیا تو راجا فوراً سیدھا ہو گیا۔ ''اچھا یار واپس کر دوں گا، میں کون سا اس کا بکرا کھا جاؤں گا۔''

''اسی میں تیری اور میری عافیت ہے۔''

رمضو قسائی کا بزنس شاید عروج پر تھا کیونکہ اس کے سلاٹر ہاؤس میں کوئی گدھا نہیں تھا البتہ مرحومین کی کھالیں ایکسپورٹ کے لیے سکھائی جا رہی تھیں اور راجا نے انہیں بھی دیکھ کر تصدیق کی کہ ان میں اس کے ماں، باپ کا لال شامل نہیں تھا۔ ہم وہاں سے نکلے تو بس اب ایک جگہ رہ گئی تھی۔ میں نے راجا سے کہا۔ ''اگر تیرے باپ کے نصیب میں اپنا لال ہوا تو ٹھیک ہے ورنہ اسے ذاتی لال یعنی تجھ پر گزارا کرنا پڑے گا۔''

''ہرگز نہیں۔'' راجا نے لرز کر کہا۔ ''اس سے بہتر ہے میں گھر سے فرار ہو جاؤں۔''

''فرار ہو کر کہاں جائے گا؟''

''سنا ہے فلم انڈسٹری پھر سے اٹھ گئی۔ جیسے بعض اوقات قبر سے مردہ زندہ نکل آتا ہے۔''

''تو چاہتا ہے کہ وہ پھر لیٹ جائے قبر میں۔'' میں نے ملامت سے کہا۔ ''راجا فلم انڈسٹری پر رحم کر اور کوئی دوسرا کام سوچ جو تو کر بھی سکے۔''

''وہ تو میں کرتا ہوں۔'' راجا نے دانت نکالے۔ ''قسمت آزمانے میں کیا حرج ہے۔ ہیرو نہ سہی ولن کا کردار مل جائے۔''

راجا ولن کے کردار کے لیے موزوں تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ فلمی ولن عام طور سے جتنے کمینے اور گھٹیا ہوتے ہیں راجا اس سے کچھ زیادہ ہی ان صفات کا حامل تھا۔ مگر میں نے یہ کہنے سے گریز کیا۔ ویسے بھی مجھے فلم اور اس کی انڈسٹری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اگر یہ راجا کی وجہ سے دوبارہ بیٹ جاتی تو میری بلا سے۔ جانو جرمن زیادہ بڑا بزنس مین ثابت ہوا کیونکہ اس کے سلاٹر ہاؤس میں صرف گدھے ہی نہیں بلکہ کتے اور وہ گھوڑے بھی موجود تھے جو اب کسی قابل نہیں رہے تھے۔ مگر شومیٔ قسمت لال یہاں بھی نہیں تھا۔ ایک گدھا لال سے خاصا ملتا تھا مگر راجا نے ایک نشانی کی مدد سے اسے مسترد کر دیا۔ بچپن میں ایک بار اس نے لال کے کان پر اپنے دانت آزمائے تھے۔ راجا کا یہ ڈینٹل ریکارڈ آج بھی لال کے کان پر موجود تھا اور خرِ مذکورہ کے دونوں کان صاف ستھرے پائے گئے تھے۔ راجا سخت مایوس تھا۔ ہم وہاں سے نکلے تو میں نے اسے تسلی دی۔

''دیکھ یار ہم جتنی بھاگ دوڑ کر سکتے تھے، وہ کر لی اب تیرے باپ کی قسمت میں اپنا گم شدہ گدھا نہیں ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

''ہاں سوائے بکرا واپس کرنے کے۔''

اس چکر میں نصف رات ہو چکی تھی اور مجھے اماں کی فکر تھی۔ آج کل وہ میری آمد و رفت پر بہت نظر رکھنے لگی تھیں حالانکہ یہی کام کچھ عرصے بعد شفو کرنے والی تھی۔ تب اماں میرے جلد گھر آنے پر مجھے جورو کا غلام قرار دیتیں۔ ابھی تو دیر سے آنے پر باز پرس کے ساتھ ساتھ بے عزتی بھی ہوتی تھی۔ اس لیے میری کوشش ہوتی تھی کہ نصف رات سے پہلے واپس گھر میں پایا جاؤں۔ مگر مجبوری تھی، یہ کام آج پایۂ تکمیل تک پہنچا کر جاتا تھا اگر میں راجا پر چھوڑ دیتا تو امید یہی تھی کہ وہ بکرے سمیت غائب ہو جائے گا اور شہزادہ بدبخت پھر میرے گلے پڑے گا۔ اس کی تو اتنی فکر نہیں تھی مگر اس کے پیچھے جانی چڑیا تھا اور آدمی کو اس کی فکر کرنی ہی پڑتی تھی۔ ہم ماما بکرا کے ڈیرے پہنچے اور دروازہ بجایا تو اس نے اندر سے ڈری ڈری سی آواز نکالی۔

''کون ہے۔''

''ماما میں ہوں راجا۔''

اس نے دروازہ کھولا اور بولا۔ ''راجا مجھے افسوس ہے۔''

''کس بات کا؟'' راجا نے کہا اور پھر اس کا دھیان بکرے کی طرف گیا۔ اس نے ماما بکرا کا گریبان پکڑ کر اسے باہر کھینچ لیا۔ ''بکرا کہاں ہے؟''

''وہ لے گئے؟'' اس نے مردہ لہجے میں کہا۔

''کون لے گئے اور کیسے لے گئے؟'' راجا آپے سے باہر ہو گیا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ ماما کو قتل کر دے گا کیونکہ اس نے گریبان چھوڑ کر اس کی گردن دبوچ لی تھی۔ ماما بوڑھا اور کمزور آدمی تھا۔ اس لیے راجا اپنی کمزور صحت کے باوجود اس کی گردن اس حد تک دبانے میں کامیاب رہا کہ اس کی آنکھیں باہر آ گئیں۔ اگر میں بروقت مداخلت کر کے اسے راجا کی گرفت سے آزاد نہ کراتا تو اس کی آنکھیں

باہر ہی رہ جاتیں۔ پھر بھی اس کے حواس خاصی دیر میں بحال ہوئے اور اس نے کوئی درجنوں بار پوچھنے پر بتایا۔

''بکرا.... وہ جانی چڑیا کے آدمی لے گئے۔ ہر سال مجھ سے ایک بکرا لے جاتے ہیں... میں نے کہا بھی کہ یہ بکرا میرا نہیں ہے مگر وہ لے گئے۔ میں کیا کرتا؟'' اس نے فریاد کی۔ ''ان لوگوں سے کون پورا پڑسکتا ہے؟''

میں اور راجا دم بہ خود رہ گئے تھے۔ پہنچی وہیں خاک جہاں کا خمیر تھا۔ جانی چڑیا نے بکرا شہزادہ بدبخت کے پاس رکھوایا اور وہاں سے ہم نے اٹھا کر ماما بکرا کے پاس رکھوایا جہاں سے جانی چڑیا کے آدمی اسے لے گئے۔ میں نے ماما بکرا سے کہا۔ ''اب اس بات کو بھول جاؤ اور ہاں ہمارا ذکر مت کرنا ورنہ تمہیں بکرے کا تاوان بھرنا پڑے گا۔ اگر جانی چڑیا پوچھے تو کہنا کہ بکرا شہزادہ کڑاہی ہاؤس والے نے رکھوایا تھا اور اگر اپنے باقی بکروں کی خیریت چاہتے ہو تو آج ہی منڈی لے جاؤ اور بیچ دو۔ باقی تمہاری مرضی ہے۔''

ہم باہر آئے تو راجا نے مایوسی سے کہا۔ ''یہ تو کچھ نہیں ہوا۔''

''بہت اچھا ہوا۔'' میں نے کہا۔ ''اب صرف شہزادہ بدبخت کو اطلاع دینی ہے۔''

نصف رات کے بعد بھی لوگوں کی خوش خوراکی میں فرق نہیں آیا تھا اور کڑاہی ہاؤس کے سامنے خاصی رونق تھی۔ شہزادہ بدبخت کیش کاؤنٹر پر موجود تھا وہ ہمیں دیکھ کر چونکا۔ ''بکرا کہاں ہے؟''

''وہاں جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اسے بکرا ماما کے پاس رکھوایا تھا اور وہاں سے اسے جانی چڑیا کے آدمی لے گئے، اب جانی چڑیا تم سے پوچھے تو تم کو یہی کہنا ہے کہ تم نے اسے بکرا ماما کے پاس رکھوایا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی کہانی سنائی یا حقیقت بتائی تو ہم غائب ہو جائیں گے اور تم یہیں ہو گے۔''

شہزادہ بدبخت نے جس طرح سکون کا سانس لیا تھا اس سے مجھے لگا کہ اس نے جانی چڑیا کے حوالے سے سچ ہی کہا تھا۔ ''چلو میرے سر سے تو بوجھ اترا۔''

میں نے کچن کے ساتھ کاؤنٹر پر رکھا ہوا تازہ گوشت دیکھا۔ ''یہ کس کا ہے بکرے کا یا گدھے کا؟''

''کسی کا بھی ہو اب تم یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔'' شہزادہ بدبخت نے حسب توقع کام نکلتے ہی یاری کو لات مار کر آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔ میں تو خاموش رہا مگر راجا نے جیسے کو تیسا والا جواب دیا اور چیخ کر بولا۔

''ہمیں بھی گدھے اور کتے کی کڑاہی کھانے کا شوق نہیں ہے۔''

جب ہم وہاں سے روانہ ہو رہے تھے تو ایک منٹ پہلے شوق سے کڑاہی کھانے والے اب شہزادہ بدبخت کا گھیراؤ کر رہے تھے۔ میرا اب سیدھا گھر جانے کا ارادہ تھا مگر راجا نے اصرار کیا کہ اسے گھر پر ڈراپ کروں کیونکہ راستے میں موجود چند کینہ پرور کتے بلاوجہ اس کی ٹانگ لینے کی کوشش کرتے تھے۔ راجا نے بائیک سے اترنے سے انکار کر دیا اس لیے مجبوراً مجھے اس کے گھر کا رخ کرنا پڑا۔ راستے میں کینہ پرور کتوں والی بات درست ثابت ہوئی اور کئی گلیوں سے ہم یوں گزرے کہ ہم دونوں کی دونوں ٹانگیں ہوا میں معلق تھیں۔ ایک کتے نے جسے ٹانگ سمجھ کر منہ مارا وہ گرم سائلنسر ثابت ہوا اور اس کی دردناک صدائیں خاصی دور تک سنائی دیتی رہی تھیں۔ مگر جب راجا کی گلی میں داخل ہوئے تو اتنے حیران ہوئے کہ پاؤں نیچے کرنا بھول گئے اور ایک کھلے مین ہول سے، ذرا پہلے میں بروقت پاؤں نیچے کر کے بریک لگانے میں کامیاب ہوا۔ راجا کے گھر کے سامنے اس کے ماں باپ موجود تھے اور اپنے گدھے سے لپٹے جا رہے تھے۔ زندگی میں پہلی بار راجا کے باپ نے اسے دیکھ کر اظہار مسرت کیا اور بولا۔

''راجا دیکھ اپنا لال واپس آگیا ہے۔''

راجا اب تک دم بہ خود تھا۔ ''واپس آگیا ہے مگر کیسے؟''

''اس کی رسی کھل گئی تھی، گلی سے نکلا تو ناصر کو مل گیا۔ وہ سمجھا کہ دھوبی گھاٹ سے آرہا ہے۔ وہ اسے وہاں لے گیا اور وہیں باندھ دیا۔''

''مگر اسے لے جانے والا تو لنگڑا تھا۔'' راجا بولا تو اس کے باپ نے کہا۔

''ہاں ناصر کے پاؤں میں موچ آئی ہے لنگڑا کر چل رہا ہے اسی وجہ سے بتانے گھر نہیں آسکا۔ پھر کام میں بھول گیا، ابھی اسے یاد آیا تو بتایا اور میں جا کر اسے گھاٹ سے لے آیا۔''

لال دن بھر بھوکا رہا تھا اس لیے چارے پر ٹوٹا پڑ رہا تھا اور اس نے محاورہ درست ثابت کر دیا تھا یعنی جتھے دا کھوتا اوتھے آن کھلوتا۔ ہمیں سارا دن بلاوجہ خوار کروایا۔ راجا نے مشتعل ہو کر لال کو لات رسید کی اور اس نے فوراً فریاد کی۔ جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو راجا باپ کی لات کھا کر دروازے سے باہر آرہا تھا۔ آج رات بھی اس کے مقدر میں عارفہ کا بیڈروم تھا۔

انگارے

چوتھی قسط

طاہر جاوید مغل

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثر و رسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سطر سطر رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان...
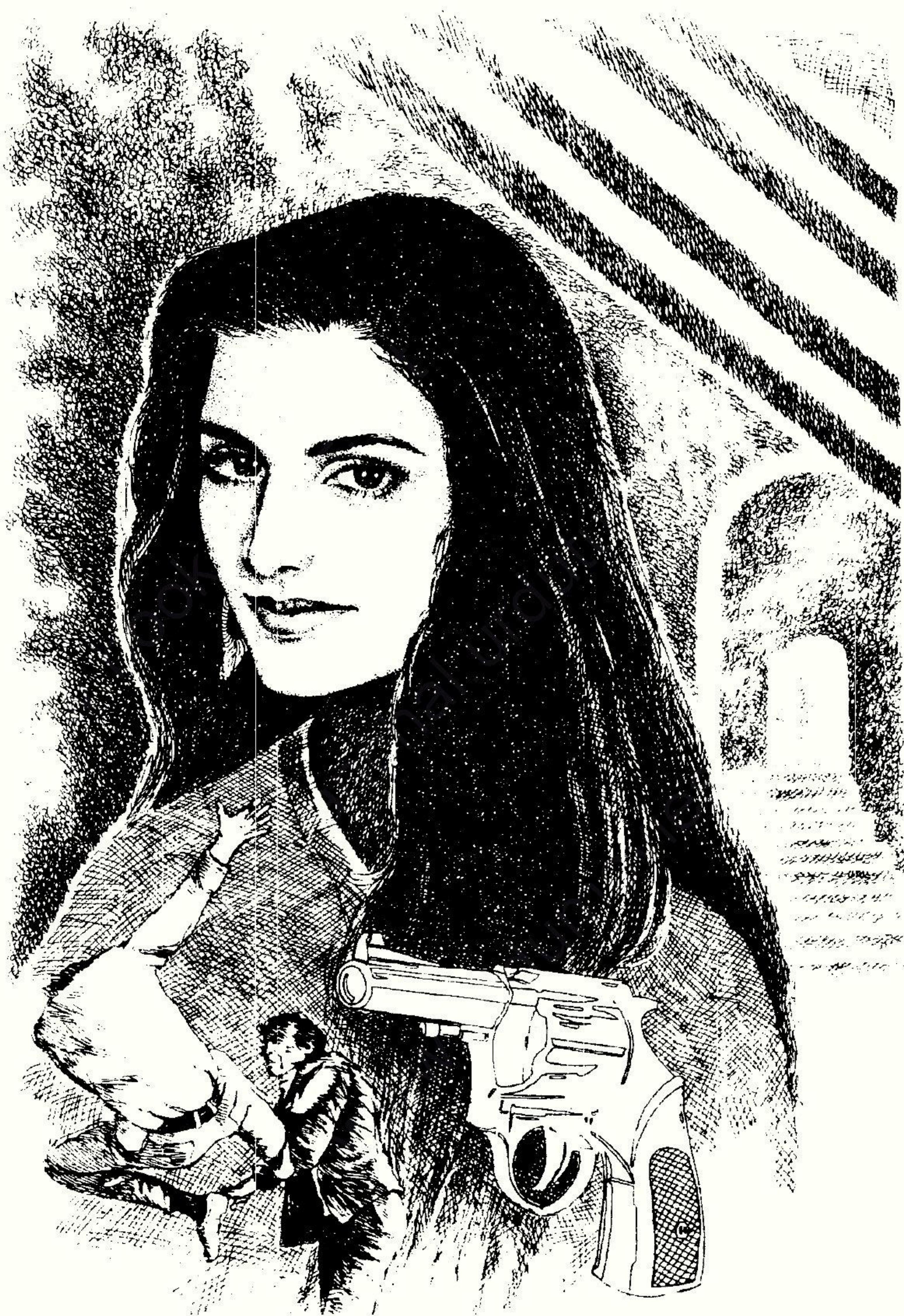
وہ مجھے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی عجوبہ دیکھا ہو۔ شاید اس کے لیے یہ بات قابلِ یقین نہیں تھی کہ شکیل داراب جیسے شخص کے کارندے کو کوئی اس طرح لتاڑ سکتا ہے اور زخمی کرسکتا ہے۔

زخمی ہونے کے بعد سرغنہ نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ یقیناً اس کے ماتھے پر ویسا ہی نیلگوں گومڑ نمودار ہوچکا تھا جیسا عارف کے چھوٹے بھائی سلیم کے ماتھے پر دکھائی دے رہا تھا۔ سرغنہ نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو پیچھے آنے کا کہا۔ دُم دبا کر نکل جانے والا محاورہ ان پر بالکل صادق آرہا تھا۔ جس شخص کے جبڑے پر میری کہنی کی ضرب لگی تھی، وہ بھی اپنا منہ دبائے ہوئے تھا۔ چہرے پر اذیت کے آثار تھے۔ میں نے سلیم کے ماتھے کو اپنے رومال سے صاف کیا اور اسے کہا کہ وہ چوٹ کو صاف پانی سے دھولے۔

عاشرہ نے اشک بار آواز میں مجھے مخاطب کیا اور بولی۔ ''تم... میرا مطلب ہے آپ یہاں کیسے پہنچے؟''

''میں عارف کا دوست ہوں اور مصیبت کی گھڑی میں دوست مدد کو پہنچ ہی جایا کرتے ہیں۔ اس کے ایکسیڈنٹ کے وقت بھی تو میں پہنچ ہی گیا تھانا۔''

''مجھے ایسا لگتا ہے آپ کی وجہ سے ہم سب بُری طرح پھنسنے والے ہیں۔'' عاشرہ نے کانپتی آواز میں کہا۔

''اور میرا خیال ہے کہ میری وجہ سے انشاء اللہ آپ کے ساتھ بہت کچھ اچھا ہونے والا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے عارف کو اشارہ کیا کہ وہ عاشرہ کے ساتھ بات چیت کرے۔ خود میں کمرے سے باہر آگیا اور سلیم سے گفتگو شروع کردی۔

عارف اور عاشرہ کی بات چیت قریباً ایک گھنٹا جاری رہی۔ اس کے بعد عاشرہ تیزی سے نکلی اور اپنی کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔ یہ قریباً دس بجے کا وقت تھا۔

بارش تھم چکی تھی۔ عاشرہ کے جانے کے بعد میں پھر عارف کے پاس آبیٹھا۔ اب عارف کے چہرے پر زندگی کی ہلکی سی چمک نظر آتی تھی۔ بہرحال مجموعی طور پر وہ غم زدہ ہی تھا۔ اس نے سلیم کو چائے اور بسکٹ وغیرہ لانے کا کہا پھر بولا۔ ''شاہ زیب بھائی! یہ سب کچھ اتنا حیران کرنے والا ہے کہ ابھی تک مجھے پوری طرح یقین نہیں آیا، عاشرہ کو کیسے آئے گا۔ بہرحال یہ بات تو وہ سمجھ گئی ہے کہ اب اسے شکیل کی طرف سے کوئی فوری خطرہ نہیں اور شاید یہ امید بھی اسے پیدا ہوگئی ہے کہ وہ اپنے والد نذیر صاحب کو علاج کے لیے پاکستان سے باہر لے جاسکے گی۔''

''چلو یہی بڑی بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن یہ سب کیسے ہوا ہے، یہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ میرا مطلب ہے کہ شکیل جیسے بندے کا ایک دم پیچھے ہٹ جانا۔''

میں نے کہا۔ ''میرے خیال میں پیڑ گننا اتنا ضروری نہیں ہوتا اصل چیز تو پھل ہوتی ہے۔''

''وہ اب بھی بڑی مایوسی والی باتیں کررہی ہے۔ اپنی زندگی کو...... ایک بہت بڑا بوجھ سمجھ رہی ہے اور اس کی وجہ وہی ہے جو تم جانتے ہو۔ اس کتے نے عاشرہ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ کاش میرے بس میں ہوتو اس کی منحوس کھوپڑی میں پوری چھ گولیاں اتار دوں۔''

''اور پھر خود بھی شکیل کے بندوں کے ہاتھوں مارا جاؤں۔'' میں نے اس کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد داراب فیملی تمہارے وارثوں کو تھانے کچہریوں میں گھسیٹتی پھرے اور انہیں زندہ درگور کردے۔ خدا کے لیے عارف، خدا کے لیے... سمجھ بوجھ سے کام لو۔ اللہ نے تمہیں نئی زندگی دی ہے۔ اب وہی تمہارے لیے خوشیوں کے راستے بھی کھول رہا ہے۔ تم نے خود کہا ہے کہ جو کچھ عاشرہ کے ساتھ ہوچکا ہے تم اسے ایک حادثہ سمجھ کر بھول جانا چاہتے ہو۔ وہ تمہارے لیے اب بھی پہلے والی عاشرہ ہے۔ پاک دامن اور صاف شفاف۔ تم یہی بات اس کو کیوں نہیں بتاتے؟ کیوں اسے نئی زندگی کے لیے قائل نہیں کررہے؟''

''میں نے قائل کرنے کی پوری کوشش کی ہے شاہ زیب اور مزید بھی کروں گا مگر اس کی سوچ کسی اور طرف جارہی ہے۔''

''کس طرف؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اب تمہیں کیا بتاؤں شاہ زیب، وہ اس سارے معاملے کو بالکل اور طرح لے رہی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ اس خبیث نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ اس کو اندر سے بُری طرح زخمی کرگیا ہے۔ کسی وقت نفسیاتی مریضوں جیسی باتیں کرنے لگتی ہے۔''

''مثلاً کیا کہہ رہی تھی؟''

عارف بولا۔ ''میں نے اس سے کہا عاشرہ، یہ زندگی بڑی کڑوی ہے اور کبھی کبھی بہت بدصورت بھی ہوجاتی ہے۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ شکیل نے تمہیں مجبور کرکے، تمہارے ساتھ جسمانی تعلق بنایا اور اس طرح کے معاملے ہوجاتے ہیں کیونکہ عورت کمزور ہے، طاقت کے نشے میں

مرد اسے زیر کر لیتے ہیں اور مجبور کر دیتے ہیں لیکن ایسے میں عورت کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ بے شک اس کے جسم سے بدسلوکی ہو جاتی ہے لیکن اس کا اندر اس کا اپنا آپ تو اسی طرح پاک صاف رہتا ہے۔ اس میں کوئی شک کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ میری بات کے جواب میں وہ عجیب انداز سے بولی۔

''تم اور بات کر رہے ہو عارف تم جو کچھ کہہ رہے ہو اسے مجرمانہ حملہ کہا جاتا ہے ریپ کہا جاتا ہے لیکن میں تو... اس کی کوٹھی سے باہر نکل آئی تھی پھر اپنے قدموں سے چل کر واپس گئی۔''

عارف چپ ہو گیا تو میں نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''عاشرہ کی اس دلیل میں کوئی وزن نہیں ہے۔ بات تو عورت کی مجبوری اور بے بسی کی ہوتی ہے چاہے عملی طور پر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے جائیں، چاہے ایسے حالات پیدا کر دیے جائیں کہ وہ بے بس ہو جائے اور اس کمینے چھوٹے داراب نے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے۔''

''میں اسے یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اللہ کرے وہ سمجھ جائے لیکن ایک بات کا پتا مجھے بڑی اچھی طرح چل رہا ہے شاہ زیب بھائی۔''

''وہ کیا؟''

''اب میں اس شہر میں نہیں رہ سکتا اگر رہوں گا تو شکیل کسی نہ کسی طریقے سے مجھے قبر میں اُتار دے گا۔''

''تو تمہیں کون کہتا ہے یہاں رہنے کے لیے۔ حاجی نذیر علاج کے لیے باہر جائیں گے اور جہاں تک میرا اندازہ ہے عاشرہ اور اس کی والدہ بھی جائیں اسی طرح تم بھی باہر نکل سکتے ہو۔ میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ وہیں پر عاشرہ سے تمہارا نکاح بھی ہو سکتا ہے۔''

میں اور عارف تادیر باتیں کرتے رہے۔ وہ عجیب کشمکش میں تھا۔ جیسے کسی برفیلے پانی میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہا ہو۔ بہرحال میں جانتا تھا میں نے اس کی راکھ میں وہ چنگاریاں جگا دی ہیں جو کل شعلے بن جائیں گی اور شاید ایسی ہی ایک دو چنگاریاں عاشرہ کی بجھی ہوئی راکھ میں بھی پیدا ہو چکی تھیں۔ آج یہاں جو کچھ اس کی نگاہوں کے سامنے شکیل کے خاص غنڈوں کے ساتھ ہوا تھا وہ اس کے لیے بے حد حیرت انگیز اور حوصلہ افزا تھا۔

عارف نے ایک بار پھر مجھے کریدنے کی کوشش کی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ میرے ہاتھ وہ کون سا جن آیا ہے جس کی مدد سے میں شکیل جیسے دبنگ شخص کو کنٹرول کرنے میں کامیاب ہو رہا ہوں۔ میں نے کہا۔

''عارف! معاف کرنا یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں اس پر ڈسکس کرنا پسند نہیں کروں گا۔''

☆☆☆

اگلے ایک مہینے میں بڑی تیزی سے کئی طرح کی پیش رفت ہوئی۔ عاشرہ اور اس کی والدہ حاجی نذیر کو لے کر لندن چلی گئیں۔ وہاں ان کی بائی پاس سرجری ہونا تھی۔ میں نے عارف کو باہر بھیجنے کا انتظام بھی کر دیا۔ عارف کے والدین تو حیات تھے لیکن وہ اس کے دو بڑے بھائیوں کے پاس تھے اور یہ دونوں بھائی والدین کو عارف سے کم ہی ملنے دیتے تھے۔ عارف کے کاغذات بنوانے کے ساتھ ساتھ میں اپنے سفری کاغذات بھی تیار کروا رہا تھا۔ میرے پہلے کاغذات میرے پاسپورٹ سمیت حویلی کی آتشزدگی میں ضائع ہو گئے تھے۔

چچا حفیظ اسپتال میں تھے اور ان کی حالت اب قدرے بہتر تھی۔ وہ چاہتے تو میں انہیں بھی باہر بھیجنے کا انتظام کر سکتا تھا۔ شکیل داراب اس سلسلے میں بھی ضرور میری مدد کرتا۔ وہ تو چاہتا ہی یہی تھا کہ ہم یہاں سے نکل جائیں لیکن چچا کسی صورت بھی اپنی مٹی اور اپنے بڑوں کی قبریں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کا جینا مرنا یہیں ہے۔ ویسے بھی ان کا اکلوتا بیٹا ولید جیل میں تھا۔ وہ اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ میں نے ولید کے کیس کی پیروی کے لیے ایک بڑا وکیل کر لیا تھا۔ دوسری طرف شکیل داراب نے بھی پس پردہ مجھے یقین دلایا تھا کہ ولید کو انصاف کے حصول میں مدد کی جائے گی (دوسرے لفظوں میں انصاف کے حصول میں رکاوٹیں نہیں ڈالی جائیں گی) ان سارے کاموں کے ساتھ ساتھ میں ایک اور کام بھی کر رہا تھا اور وہ کام تھا اس چہرے کی تلاش کا جو میری نگاہوں میں بسا ہوا تھا اور میرے سینے میں ایک داغ کی طرح جلتا تھا۔ یہ اس کا چہرہ تھا جس کا نام بھی میں نہیں جانتا تھا۔ جس کی ذات مجھے معلوم نہیں تھی، جس کا پتا ٹھکانا میرے علم میں نہیں تھا۔ جس طرح خلا کی بیکراں وسعتوں میں دو ستارے ہزاروں نوری سال تک سفر کرنے کے بعد اچانک ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اور پھر بچھڑ جاتے ہیں، وہ بھی میرے قریب آیا تھا۔ اس نے کچھ وقت میرے ساتھ گزارا تھا اور پھر اپنے مدار پر چلتا ہوا کہیں کھو گیا تھا۔ اس نے الوداع نہیں کہا تھا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ مڑ کر بھی نہیں

دیکھا تھا پھر بھی ایک نادیدہ ڈور تھی جو اس کے ساتھ ساتھ کھنچتی چلی گئی تھی۔ شاید اس ڈور کا ایک سرا مجھ سے بندھا ہوا تھا۔ اب یہ ڈور مجھے کھینچتی تھی۔ یہ حرکت کرتی تھی اور ڈوریں تب ہی حرکت کرتی ہیں جب ان کے دوسری طرف کوئی موجود ہوتا ہے۔

کئی ہفتوں تک میں نے اس ڈور کا دوسرا سرا ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی۔ میں نے بھاؤ کی مدد لی۔ انیق کی مدد لی، عارف سے بھی بات کر کے دیکھی لیکن مسئلہ یہی تھا کہ میرے پاس اس کا کوئی سراغ نہیں تھا۔ بس ایک فون نمبر تھا جو غلط ثابت ہو چکا تھا۔

ایک دن جب میں اسنوکر کلب کے پیچھے والے بھاؤ کے ذیر زمین ٹھکانے پر موجود تھا۔ بھاؤ نے ایک سابق پولیس والے کو وہاں بلا لیا۔ الیاس نامی یہ شخص اسپیشل پولیس میں کام کرتا رہا تھا اور اس شعبے میں تھا جہاں مجرموں کے خاکے وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ بھاؤ نے مجھ سے کہا۔ ''یار یہ بڑا باکمال فن کار ہے۔ تم اس لڑکی کا حلیہ بتاتے جاؤ یہ اس کی تصویر بنا کے دے دے گا۔ تصویر بن جائے تو بندے یا بندی کو ڈھونڈنا آسان ہو جائے گا۔''

میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ میں اس چہرے کا خاکہ بنواؤں جس سے میں پرستش کی حد تک محبت کرنے لگا تھا مگر پھر اس امید پر کہ شاید اس سے کچھ مدد مل جائے میں تیار ہو گیا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کیں اور اس کے تصور کو ذہن میں اجاگر کیا۔ وہ ایک دم ابھر کر میرے سامنے آ گئی۔ بالکل جیسے میرے سامنے کھڑی ہو۔ چہرے کا ہر نقش واضح ہو گیا۔ پیشانی دکھنے لگی۔ اس نے اپنے طریقۂ کار کے مطابق سب سے پہلے کمپیوٹر پر آنکھیں اور ناک دکھانا شروع کیں۔ میں نے کہا۔ ''نہیں... مجھے سب سے پہلے پیشانیاں دکھاؤ۔'' پتا نہیں کیوں میں جب بھی اس کا تصور ذہن میں لاتا تھا سب سے پہلے پیشانی ہی ابھر کر سامنے آتی تھی اور اس کے ساتھ ہی شہد رنگ بالوں کی وہ لٹیں جو گھوم کر اس کے رخسار یا ناک کو چھوتی رہتی تھیں۔ پتا نہیں کہ وہ انہیں جان کر نہیں ہٹاتی تھی یا پھر ہٹانا بھول جاتی تھی۔

میں اس کا تقریباً دو تہائی چہرہ بنوا چکا تھا جب میرا ذہن ایک دم صاف ہو گیا۔ اس کا چہرہ میرے تصور کے پردے سے یوں غائب ہوا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن دوبارہ اس کے تصور کو مجسم نہ کر سکا۔ الیاس پریشانی کے عالم میں میری طرف دیکھتا رہا۔ کافی دیر کوشش کرنے کے بعد میں نے کہا۔ ''نہیں بھئی! ابھی نہیں... ابھی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

وہ اپنے طور پر کوشش کرنے لگا۔ اس نے کمپیوٹر سافٹ ویئر کے ذریعے ہیئر اسٹائل، ناک، ہونٹ اور ٹھوڑیاں لگا کر ادھورے چہرے پر آزمائیں لیکن کوئی بات نہیں بن سکی۔

تھک ہار کر وہ چلا گیا۔ میں حیران تھا کہ وہ چہرہ ایک دم اوجھل کیوں ہو گیا ہے۔ الیاس کے جانے کے بعد مجھے انیق کی زبانی یہ بھی پتا چلا کہ الیاس کمپیوٹر خاکے بنانے میں ماہر ضرور ہے لیکن یہ کوئی والیفائڈ بندہ نہیں۔ اس نے بس یونہی ادھر ادھر سے کام سیکھ کر پولیس میں نوکری کر لی تھی۔ بعد میں اس کی جعلی ڈگری کا بھید کھلا تو اسے فارغ کر دیا گیا۔

میں نے پاکستان آنے کے بعد محسوس کیا تھا کہ الیاس جیسے ناتجربہ کار اور جعلی ماسٹر تقریباً ہر شعبے میں موجود ہیں۔ لوگ بتاتے کچھ تھے اور اصل میں ہوتے کچھ اور تھے۔ چند ہفتے پہلے میں نے رانا رفیق نامی جس بندے کی ملازمت ختم کروائی تھی وہ بھی فراڈیا ہی نکلا تھا۔ اس کے پاس ایف اے کی جعلی سند تھی اور وہ ٹیکس دار جیسے نامی گرامی شخص کے پرسنل سیکریٹری کا اسسٹنٹ بن کر لوگوں پر رعب گانٹھ رہا تھا۔

درحقیقت پچھلے ڈیڑھ دو مہینے میں مجھے اپنے اردگرد کے ماحول اور حالات نے سخت مایوس کیا تھا۔ وطن لوٹ کر اپنی مٹی میں بسنے اور اپنی ہواؤں میں سانس لینے کی ساری آرزوئیں بُری طرح مجروح ہوئی تھیں۔ وہ سارے سپنے بکھر گئے تھے جو میں نے مدتوں سے آنکھوں میں سجا رکھے تھے۔ یہ میرا محبوب شہر لاہور تھا لیکن اب یہاں میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ یہاں کے گلی کوچوں میں انسان نہیں روبوٹ چل رہے ہیں۔ یہاں کی فضاؤں میں منافقت اور جھوٹ کی گرد اڑتی محسوس ہوتی تھی۔ یہاں کے سبزہ زاروں اور تفریح گاہوں میں بے چینی اور خوف کے سائے رینگتے تھے۔ محسوس ہوتا تھا کہ اچھے اور سچے لوگ کونے کھدروں میں دُبک چکے ہیں اور کرپشن کے دیو برہنہ ہو کر ہر جگہ رقص کر رہے ہیں اور شاید یہ صرف ایک لاہور ہی کی بات نہیں تھی اس وطنِ عزیز کے سارے گلی کوچے اسی صورتِ حال کا شکار دکھائی دیتے تھے۔

یہ وہ وطن تو نہیں تھا جو میرے سپنوں میں آتا تھا جو میری روح میں جگمگاتا تھا۔ یہ تو ایک ایسی اندھیر نگری تھی جس میں قدم رکھتے ہی مجھ پر ایک دلخراش سانحہ گزر گیا تھا۔ میں نے اپنی چچی اور اپنی سگی بہن جیسی چچا زاد کی اذیت

ناک موت دیکھی تھی۔ میں اس چچا زاد بہن کی شادی کی خوشیاں دیکھنے کے لیے بڑے ارمانوں سے یہاں پہنچا تھا مگر سارے ارمان آگ اور خون میں تھڑ گئے تھے۔ ذہن قبرستان کی مکین ہوئی تھی۔

بے شک میں نے چچی اور فائزہ کی موت کا بدلہ لیا تھا۔ میں نے کسی ہرکارے یا کارندے کو نہیں مارا تھا بلکہ اصل کرتا دھرتا اور اس کے رائٹ ہینڈ کو ٹارگٹ کیا تھا۔ اللہ نظام منوں مٹی کے نیچے پہنچ چکا تھا اور اس کا دست راست قیصر چوہدری ہڈیاں تڑوا کر اسپتال میں پڑا تھا۔ میں اس بدلے کو مزید آگے بھی چلا سکتا تھا مگر مجھے ان لوگوں کے بارے میں بھی سوچنا تھا جو اس انتقامی سلسلے سے متاثر ہو سکتے تھے۔

چند دن پہلے تو میرا دل چاہا تھا کہ جونہی عارف پاکستان سے روانہ ہو میں بھی یہاں سے نکل جاؤں لیکن بات پھر وہیں دل کے معاملے پر آجاتی تھی۔ میں پاکستان آیا تھا کسی کو ڈھونڈنے کے لیے۔ کسی کے ساتھ زندگی کا نیا سفر شروع کرنے کا انوکھا سپنا لے کر۔ تو کیا اسے ڈھونڈے بغیر ہی واپس چلا جاؤں؟

اس سوال کا جواب میرے اندر سے یہی ابھرا تھا کہ نہیں... ابھی مجھے تھوڑی کوشش اور کرنی چاہیے۔ لاہور کے گلی کوچوں کی کچھ اور خاک چھاننی چاہیے، کچھ اور دروازوں پر دستک، کچھ اور دوپہروں کی آوارہ گردی، کچھ اور شاموں میں آبلہ پائی۔

اکثر ایسا میرے ساتھ ہوتا تھا۔ میرے پاس ہیلمٹ کا نقاب موجود تھا۔ ہم دونوں موٹر سائیکل بھی بدلتے رہتے تھے اور ہیلمٹ بھی۔ میں اکثر ان جگہوں پر گھومتا تھا جہاں اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میری نگاہیں ہر اس مقام پر بھٹکتی تھیں جہاں اس نے میرے قدموں سے قدم ملائے تھے لیکن وہ کہیں نہیں تھی۔ کہیں بھی نہیں۔ کسی وقت مجھے لگتا تھا کہ شاید وہ صرف ایک خیال ہی تھی یا پیاسی آنکھوں کا خواب لیکن یہ تو ایک شاعرانہ سی بات تھی۔ حقیقت یہی تھی کہ ہم ملے تھے، ہم نے باتیں کی تھیں، ہم نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا تھا اور چند ساعتوں کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوئے تھے مگر اصل بات تو تلاش کی تھی اور کسی نام پتے اور ٹھکانے کے بغیر اسے تلاش کرنا ایسے ہی تھا جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سے سوئی ڈھونڈنا۔

ایک چاندنی رات میں، میں اکیلا ہی موٹر بائیک پر نکلا اور نہر کے کنارے ان درختوں کے درمیان جا بیٹھا جہاں ہم نے گھاس پر کپڑا بچھا کر اور درختوں سے ٹیک لگا کر کچھ دیر گپ شپ کی تھی۔ نہر کنارے سردی اور بھی زیادہ ہوتی ہے مگر میں وہاں بیٹھا رہا۔ پانی میں چاند کا جھلملاتا عکس دیکھتا رہا اور اسے یاد کرتا رہا۔ دل میں خیال آیا، کتنا اچھا ہو وہ بھی مجھے ڈھونڈتی ہوئی اس طرف آنکلے۔ ہم ایک دوسرے کی طرف حیران نظروں سے دیکھیں پھر وہ شرمائے اور اس کی آنکھوں میں ہزار ہا ستارے جگمگا اٹھیں لیکن ایسے کرشمے حقیقت میں کم کم ہی ہوتے ہیں اور سیانے یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ آسیں شاذ و نادر ہی پوری ہوتی ہیں۔

مجھے اس سے اپنی وہ دونوں ملاقاتیں یاد آئیں جو ایک دن کے وقفے سے ہوئی تھیں۔ یہی دو ملاقاتیں میری یادوں کا سرمایہ تھیں۔ آنکھوں کے سامنے ایک فلم سی چلنے لگی۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے، یہ تقریباً ساڑھے تین برس پہلے کی بات تھی، میں ڈنمارک سے پاکستان آیا تھا۔ میری والدہ بھی ساتھ تھیں۔ یہاں ہمیں صرف تین دن ٹھہرنا تھا اور ایک شادی میں شرکت کرنا تھی۔ میں سیلانی روح تھا۔ دوپہر کے وقت اکیلا ہی اپنے کزن کی گاڑی لے کر نکل کھڑا ہوا۔ یونہی شہر میں گھومنے کو دل چاہ رہا تھا۔ وہ دسمبر کے یخ بستہ دن تھے۔ میں قلعہ لاہور کی طرف نکل گیا۔ ان دنوں میرے بال بہت لمبے تھے اور گھنی داڑھی بھی تھی۔ کئی لوگ مڑ مڑ کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ قلعہ لاہور میں داخل ہو کر میں ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ میری نظر ایک لڑکی پر پڑی۔ وہ چادر میں سمٹی سمٹائی سیدھی میری ہی طرف آرہی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ کافی ڈری ہوئی ہے۔ اس کے ڈر کی وجہ بھی فوراً ہی میری سمجھ میں آگئی۔ تین چار اوباش لڑکے اس کے پیچھے تھے۔

وہ ایک ورکنگ ڈے تھا۔ قلعے میں بہت کم لوگ دکھائی دیتے تھے۔ حسب اندیشہ لڑکی سیدھی میرے پاس آئی اور کانپتی آواز میں بولی۔ ”میری مدد کریں... یہ لڑکے...“

وہ میرے پہلو میں کھڑی ہوگئی اور لڑکوں کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے لڑکوں کو گھورا۔ میرا تن و توش اور اعتماد دیکھ کر وہ وہیں ٹھٹک گئے۔ انہوں نے آگے بڑھنے کی حماقت نہیں کی۔ نہ ہی کسی نے کوئی شرارت وغیرہ کی اور یہ ان کے حق میں اچھا ہی ہوا کیونکہ اگر وہ مزید پیش رفت کرتے تو بات بڑھ کر ہاتھا پائی تک پہنچ جاتی تو ان کے

لیے بہت بُرا ہوتا (میں اس وقت تک مارشل آرٹ کی نیند میں داخل ہو چکا تھا اور ڈنمارک کے دو چار چوٹی کے کھلاڑیوں میں تھا)

لڑکی دائیں بائیں ہو گئے۔ لڑکی منمنائی۔ ''آپ شریف آدمی لگتے ہیں۔ پلیز میری مدد کریں۔ میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔''

مجھے اندازہ ہوا کہ لڑکوں کے کچھ ساتھی اور بھی ہیں اور وہ آس پاس موجود ہیں۔ میں کسی طرح کی پھڈے بازی افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے لڑکی کو ساتھ لیا اور باہر آ گیا۔ ''کیا آپ میرے ساتھ گاڑی میں جانا پسند کریں گی؟''

اس نے ایک بار پھر دھیان سے میری طرف دیکھا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ ایک دلکش لڑکی تھی۔ شدید نروس ہونے کے باوجود اگر وہ دلکش نظر آ رہی تھی تو پھر یقیناً اس میں کوئی بات تھی۔ اس کے شہد رنگ بال بالکل سیدھے تھے اور بالوں کی لٹیں اس کے چہرے پر جھول رہی تھیں۔

وہ گاڑی میں میرے ساتھ اگلی نشست کے بجائے پچھلی نشست پر بیٹھی۔ میں جز بز تو ہوا لیکن پھر میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ''آپ کو کہاں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم... مجھے نہیں پتا۔ فی الحال آپ یہاں سے نکلیں۔'' اس نے کہا۔

اس کا لہجہ بالکل سادہ تھا۔ زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں لگتی تھی مگر صورت کی طرح اس کی آواز اور بات کرنے کا انداز بھی دلنشین تھا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ یہ نوبونا تھی۔ رائٹ ہینڈ ڈرائیو تھی جبکہ میں ڈنمارک میں لیفٹ ہینڈ چلاتا رہا تھا۔ یہاں کی ٹریفک بھی سمجھ سے بالاتر تھی۔ تیسری بات یہ کہ مجھے راستوں کا بھی کچھ زیادہ علم نہیں تھا۔ اپنے کزن سے پوچھ پاچھ کر میں نے صرف بادشاہی مسجد، شاہی قلعہ اور مینارِ پاکستان وغیرہ کی لوکیشن معلوم کی تھی اور یہ تینوں جگہیں پاس پاس ہی تھیں۔ اب یہ لڑکی پتا نہیں مجھے کہاں لے جانا چاہتی تھی۔ ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں یہ کوئی ڈراما ہی نہ ہو جو مجھے کسی مشکل میں ڈال دے۔

میں نے کہا۔ ''مس، میں اس شہر کا نہیں ہوں۔ مجھے بتائیں آپ کو کہاں اترنا ہے۔''

''ابھی آپ سیدھے ہی چلتے جائیں۔'' وہ کانپتی آواز میں بولی۔

پتا نہیں کیوں اس کا لب و لہجہ مجھے یہ یقین دلا رہا تھا کہ وہ انتہائی سادہ اور سچی لڑکی ہے۔ مجھ سے کوئی ناٹک نہیں کر رہی۔

وہ جیسے خود بھی اس شہر کے بارے میں زیادہ اچھی طرح نہیں جانتی تھی۔ مسلسل دائیں بائیں دیکھ رہی تھی جیسے راستہ تلاش کر رہی ہو۔ اچانک اس نے کہا۔ ''یہاں سے دائیں مڑ جائیں۔''

میں اس کشادہ سڑک پر مڑ گیا۔ ایک جگہ لگے بورڈ سے مجھے پتا چلا کہ یہ تو شہر کی مشہور سڑک شاہراہِ قائداعظم ہے۔ ہم سیدھا چلتے گئے اور نہر پر پہنچ گئے۔ ایک جگہ گھنے درخت نظر آنے۔ یہاں لکڑی کی بینچ پڑی تھیں۔ وہ بولی۔ ''یہ جگہ بیٹھنے کے لیے ٹھیک ہے۔ ہم یہاں تھوڑی دیر بیٹھ سکتے ہیں۔''

مجھے اس کا رویہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہ ابھی تک لڑکوں سے ڈری ہوئی تھی۔ راستے میں، میں نے عقب نما آئینے پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ مجھے ہلکا سا شبہ بھی نہیں ہوا تھا کہ کسی نے ہمارا تعاقب کیا ہے پھر وہ کس سے خوف زدہ تھی؟ یہ بھی ایک اہم سوال تھا کہ وہ اس شہر میں اجنبی ہونے کے باوجود اکیلی یہاں کیوں گھر رہی ہوئی تھی۔

میں گاڑی درختوں کے درمیان لے گیا۔ ہم اتر کر اونچے بڑے بڑے پودوں کے عقب میں بیٹھ گئے۔ اِکا دُکا اور افراد بھی یہاں لکڑی کی بینچوں پر موجود تھے۔ میں نے کہا۔ ''آپ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ کیا آپ یہاں کسی کے ہاں مہمان آئی ہوئی ہیں؟''

اس نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ بالوں کی لٹیں شفاف چہرے پر جھول گئیں۔

''آپ کو اکیلے نہیں نکلنا چاہیے تھا بہرحال وہ لڑکے تو بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو کہیں بھی چھوڑ سکتا ہوں لیکن یہاں کے راستے مجھے نہیں آتے۔''

''کیا آپ باہر کے ملک سے آئے ہیں؟'' بڑی سادگی سے پوچھا گیا۔

''ہاں... اور مجھے لگتا ہے کہ آپ بھی اس شہر کی نہیں ہیں؟''

اس نے پھر اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ لٹیں چہرے پر تھیں۔ وہ جیسے انہیں ہٹانا بھول ہی گئی تھی۔

مجھے الجھن ہونے لگی۔ میں جو بات کرتا تھا وہ اس کا بہت مختصر جواب دے کر خاموش ہو جاتی تھی۔ آخر میں نے کہا۔ ''اگر آپ کو کہیں جانا نہیں تو پھر مجھے اجازت

دیں۔‘‘

وہ اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔ صراحی دار گردن کے نیچے اس کا سارا جسم بے حد متناسب تھا۔ اس نے صاف ستھرے لیکن بڑے سادہ کپڑے پہن رکھے تھے۔ کلائیوں میں کانچ کی خوشنما چوڑیاں تھیں۔ آخر وہ ایک دم جیسے کسی فیصلے پر پہنچ کر بولی۔ ’’کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ کچھ دیر میرے ساتھ رہیں۔ ہم... میرا مطلب ہے... دو تین گھنٹے... میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں... لیکن میری مجبوری ہے۔‘‘

’’کیا مجبوری؟‘‘

’’میں شام پانچ چھ بجے سے پہلے گھر جانا نہیں چاہتی۔‘‘

’’لیکن... کیوں؟‘‘

’’دیکھیں آپ کوئی سوال نہ کریں۔ اگر میری اتنی سی مدد کرسکتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میں آپ کو مجبور نہیں کروں گی۔‘‘

میں نے ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا۔ وہ مجسم معصومیت اور سادگی تھی۔ اس کا چہرہ اتنا شفاف تھا کہ خون کے ذرا سے دباؤ سے سرخ ہوجاتا تھا، کسی بیر بہوٹی کی طرح۔

میں نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ’’ٹھیک ہے، میں شام تک تمہارے ساتھ رہتا ہوں لیکن کیا ہمیں بیٹھے رہنا ہے؟‘‘

’’کچھ دیر یہاں بیٹھتے ہیں پھر... لارنس گارڈن کی طرف چلے جائیں گے۔‘‘

میں نے اس کے کوائف پوچھنا چاہے مگر اس کے ہونٹوں پر ایک بار پھر چپ کی مہر لگ گئی۔ وہ کچھ بھی بتانا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے اسے اپنے بارے میں بتانا شروع کردیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ڈنمارک سے آیا ہوں۔ وہیں پلا بڑھا ہوں۔ اردو اس لیے روانی سے بول سکتا ہوں کہ ہمارے گھر میں یہی زبان بولی جاتی ہے۔

میں نے اسے اپنے پروفیشن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اگر بتاتا تو شاید وہ سمجھ نہ پاتی اور اگر سمجھ جاتی تو شاید ڈر جاتی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ’’وہاں قلعے کے اس حصے میں دوپہر اور لوگ بھی تو موجود تھے لیکن تم میری ہی طرف کیوں آئیں... مجھ پر ہی بھروسا کیوں کیا؟‘‘

’’آ... آپ مجھے ٹھیک لگے۔‘‘

میں ہنس دیا۔ ’’ٹھیک کیا لگا... میرے بے بال ہیں کندھوں تک پہنچتے ہوئے... مونچھیں ہیں، میں ہپیوں جیسا نظر آتا ہوں۔‘‘

’’بس... آپ ٹھیک لگے۔‘‘

’’پر کیوں؟‘‘

’’پتا نہیں۔‘‘ اس نے ایک بار پھر دل موہ لینے والی سادگی کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔

کچھ دیر خاموش رہی پھر میں نے پوچھا۔ ’’اگر تمہیں بھوک لگی ہو تو کھانے کے لیے کچھ لے لیں؟‘‘

’’اگر آپ کو لگی ہے تو لے لیں۔‘‘

’’یعنی تمہیں نہیں لگی؟‘‘

’’تھوڑی تھوڑی۔‘‘

’’تو پھر تم بیٹھو، میں کچھ لے کر آتا ہوں۔‘‘

وہ ذرا سوچ کر بولی۔ ’’نہیں... دونوں ہی چلتے ہیں۔‘‘

ہم دونوں پھر کار میں آبیٹھے۔ اس مرتبہ وہ جھجکتی ہوئی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے ایک راہگیر سے پوچھا۔ ’’یہاں آس پاس کوئی ریسٹورنٹ ہے؟‘‘

اس نے ایک قریبی جگہ کا پتا بتایا۔ ہم نے وہاں سے دو لنچ باکس لیے۔ دو انرجی ڈرنک بھی تھے۔ ہم لارنس گارڈن کے بجائے گاڑی پر نیو کیمپس کی طرف نکل گئے۔ یہاں ایک خوب صورت چلڈرن پارک میں بیٹھ کر ہم نے لنچ کیا۔ اب ساڑھے تین کا وقت ہوچکا تھا۔ سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ دسمبر کی خوشگوار دھوپ میں پھول دمکتے تھے اور تتلیاں منڈلاتی تھیں۔ ذرا سی دھوپ نے اس کا رنگ انگارے کی طرح سرخ کردیا تھا۔ یہ سرخی مجھے اتنی بھلی لگی کہ میں ڈنمارک، ناروے اور ہالینڈ کی ان گنت حسیناؤں کے چہرے بھول گیا جو مجھ سے ملی تھیں۔ یہ کیا سادگی تھی؟ یہ کیا حسن تھا؟ وہ ایک معما تھی لیکن اتنا دلکش کہ جان نکلتی محسوس ہوتی تھی اور وہ اس چمکیلی دوپہر میں نہ جانے کہاں سے کٹی پتنگ کی طرح ڈولتی ہوئی مجھ سے آ ٹکرائی تھی۔

میں نے ایک بار پھر اس سے پوچھنا چاہا کہ وہ شام تک اپنے گھر سے باہر کیوں رہنا چاہتی ہے لیکن وہ نہ بتاسکی اور اس کا انداز مجھے سمجھا رہا تھا کہ اگر میں زیادہ اصرار کروں گا تو وہ اٹھ کر چلی جائے گی اور میں اس کا یہ مختصر ساتھ کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے مجھ سے باہر کی دنیا کے بارے میں پوچھا۔ وہاں کے حالات کے بارے میں معصوم سے سوالات کیے۔ میں جوابات دیتا رہا۔ کبھی کبھی ہماری گفتگو

کے دوران میں خاموشی کا طویل وقفہ آجاتا۔ ایسے میں ہم ان پرندوں کی چہکاریں سنتے جو شام کو اپنے گھونسلوں میں واپس آرہے تھے اور دور کہیں کسی گاڑی کے ڈیک پر بجتی ہوئی موسیقی ہمارے کانوں تک پہنچتی۔ یہ موسم یہ مست نظارے پیار کرو تو ان سے کرو۔

شام کے ساتھ ہی گہری دھند بھی فضا کو ڈھانپنا شروع ہوگئی تھی۔ آخر اس سے جانے کا وقت ہوگیا۔ میں نے کہا۔ ''کیا اپنا کوئی نام و نشان چھوڑ کر نہیں جاؤ گی؟''

''جی؟''

''کوئی فون نمبر تاکہ کبھی تمہاری خیر خیریت کے بارے میں پوچھ سکوں۔''

''نہیں، میں ایسا نہیں کرسکتی۔'' اس نے سر جھکا کر کہا۔

''چلو میرا نمبر ہی لے لو۔''

وہ رضامندی کے انداز میں خاموش رہی۔ میں نے اسے اپنا سیل نمبر دے دیا۔ یہ میرے اس کزن کا فون تھا جس کے پاس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ فون آج کل میرے پاس تھا اور پھر وہ چلی گئی۔ مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ پھر کبھی اس سے رابطہ ہو سکے گا۔

میں اس وقت ششدر رہ گیا جب تیسرے روز ہی صبح دس بجے کے قریب اس کا فون آگیا۔ یہ فون اس نے پی سی او سے کیا تھا۔ میں نے اس کی گھبرائی ہوئی آواز صاف پہچانی تھی۔ ''جی آپ شاہ زیب بول رہے ہیں؟''

''ہاں، خیریت تو ہے، تم نے کیسے یاد کرلیا؟''

''کیا... میں آج آپ کو پھر تین چار گھنٹوں کی تکلیف دے سکتی ہوں؟'' اس نے رک رک کر کہا۔

''یعنی پرسوں کی طرح تم کچھ دیر گھر سے باہر رہنا چاہتی ہو؟''

''ایسا ہی سمجھ لیں۔''

میں نے ذرا توقف کر کے کہا۔ ''آج رات کی فلائٹ سے مجھے بھی واپس... جانا ہے بہرحال شام چار پانچ بجے تک تو میں فارغ ہی ہوں۔''

''تو پھر آپ کی مہربانی، آپ آجائیں۔''

''کہاں؟''

''وہیں آجائیں جہاں پرسوں ہم نہر کے پاس بیٹھے تھے۔''

''کتنی دیر تک آؤں؟''

''ابھی نکل پڑیں، میں بھی نکل رہی ہوں۔''

فون پر بات ختم کرنے کے بعد میں نے سوچا کہیں کوئی جھگڑے والی بات نہ ہو۔ کیا میرے پاس کوئی ہتھیار ہونا چاہیے یا پھر اپنے کزن کو ساتھ لے لوں کہ وہ آس پاس رہ کر صورتِ حال پر نظر رکھے لیکن پھر میں نے یہ سارے اندیشے ذہن سے نکال باہر کیے اور اکیلا ہی روانہ ہوگیا۔

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد میں کار پر سوار بے ہنگم ٹریفک سے بچتا بچاتا اور جگہ جگہ نظر آنے والی بدنظمی کو حیرت سے دیکھتا پرسوں والی جگہ پر پہنچ گیا۔ وہ میرے آنے سے پہلے ہی وہاں پر موجود تھی۔ پرسوں کی طرح سر سے پاؤں تک ایک کریم کلر کی چادر میں لپٹی ہوئی۔ اس نے چادر کو سر پر اس طرح ڈھکا رکھا تھا کہ گھونگھٹ کی سی شکل بن گئی تھی۔ ایک عام سا شولڈر بیگ اس کی گود میں رکھا تھا۔

اس کی قربت مجھے مسحور کردیتی تھی۔ مجھ میں یہ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں رہتی تھی کہ وہ ایسا کیوں کررہی ہے۔ کس کے خوف سے گھر سے باہر رہنا چاہ رہی ہے۔ یہاں تک کہ میں اس کا نام دریافت کرنے کی ہمت بھی اپنے اندر نہیں رکھتا تھا۔ میرے سوالوں سے بچنے کے لیے وہ خود مجھ سے سوالات شروع کردیتی تھی اور پھر ان سوالوں کے طویل جواب چاہتی تھی۔ بہت کوشش کر کے میں بس اتنا ہی معلوم کرسکا کہ وہ لاہور میں اپنے کسی قریبی عزیز کے گھر مہمان آئی ہوئی ہے اور پھر واپس چلی جائے گی۔ یہ بھی اس نے نہیں بتایا کہ کہاں؟

اگر کوئی کسی شخص سے پوچھے کہ فلاں عورت یا لڑکی اسے کتنی پیاری لگی تو وہ کہے گا بہت پیاری لگی یا بہت زیادہ پیاری لگی، لیکن اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہوں گا کہ وہ مجھے بے انتہا پیاری لگی۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنے بدن سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

نہ جانے کیوں اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ یہ سرکتا ہوا سورج ایک جگہ رک جائے۔ یہ سہ پہر کبھی شام کی صورت اختیار نہ کرے۔ وہ اسی طرح میرے پہلو میں بیٹھی رہے اور میں اس کے جسم کی منفرد مہک اور سانسوں کی خوشبو اپنے قرب و جوار میں محسوس کرتا رہوں۔ عورت میرے لیے کوئی انوکھی چیز نہیں تھی۔ میں نے اس لڑکی سے شاید دس بیس گنا زیادہ خوب صورت اور دلکش لڑکیاں بھی دیکھی ہوں گی۔ اس سے زیادہ خوش اندام و خوش اطوار مگر اس میں کوئی ایسی بات تھی جو میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

جب دسمبر کی ٹھٹھری ہوئی شام کے سائے طویل ہوئے اور ہلکی ہلکی دھند نے فضا میں ڈیرے ڈالنے شروع

کیے تو اس کی رخصت کا وقت ہوگیا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر بڑی عاجزی سے بولی۔ ''شاہ زیب صاحب آپ نے میرا بڑا ساتھ دیا۔ میرا یہ بہت مشکل وقت آپ کی وجہ سے خیریت سے کٹ گیا۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرنے کے سوا اور کیا کرسکتی ہوں؟''

میں نے مسکرا کر کہا تھا۔ ''کچھ نہ کچھ تو کر ہی سکتی ہو۔''

وہ اپنی بڑی بڑی پلکیں اٹھا کر سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''تم نے مجھ پر تھوڑا سا بھی بھروسا نہیں کیا۔ مجھے اس کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔''

وہ میری بات سمجھ گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ پتا نہیں یہ شرم کی سرخی تھی، ندامت کی یا پھر پریشانی کی لیکن جو بھی تھی لاجواب تھی۔ اتنا حسین رنگ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اس نے گہری سانس بھر کر مجھے ایک فون نمبر دے دیا تھا اور پھر وہ چلی گئی تھی۔ دھند آلود ٹھٹھری ہوئی شام میں بڑی خاموشی کے ساتھ، بغیر رکے بغیر مڑ کر دیکھے۔ وہ دھیرے دھیرے پاپولر کے دراز قد درختوں کے درمیان قدم اٹھاتی گئی اور پھر میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

اور آج قریباً ساڑھے تین سال بعد میں پھر اسی جگہ بیٹھا اسے یاد کررہا تھا اور سوچ رہا تھا کہیں وہ صرف ایک خیال ہی تو نہیں تھی؟ اگر نہیں تھی تو پھر پچھلے ساڑھے تین برسوں میں، میں اس کا کوئی کھوج کیوں نہیں پاسکا تھا۔ کیوں کبھی میرے سیل فون پر اس کے نام کی گھنٹی نہیں بجی تھی؟ کیوں کبھی اس کے دیے ہوئے نمبر پر کال تھرو نہیں ہوئی تھی اور کسی نے اپنی دلنشین آواز میں ہیلو نہیں کہا تھا۔ میں نے پچھلے تین ساڑھے تین برسوں میں شاید ہزاروں... بار اپنے سیل فون کی اسکرین کو اس امید کے ساتھ دیکھا تھا کہ شاید اس پر ''بے نام'' کے نام کی کوئی کال ہو، کوئی میسج، کوئی رابطہ مگر ہر بار نگاہِ منتظر کو مایوسی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ (میں نے سیل فون پر اس کا نمبر بے نام کے نام سے محفوظ کر رکھا تھا) بہت سے دیگر سوالوں کی طرح یہ سوال بھی سیکڑوں بار میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ تھا کہ وہ ایک خاص وقت تک گھر سے باہر رہنا چاہتی تھی اور کیا ایسا صرف دو دنوں کے لیے ہی ہوا تھا یا یہ سلسلہ بعد میں بھی چلتا رہا تھا۔

اچانک مجھے اپنے پیچھے قدموں کی مدھم آہٹ سنائی دی اور میں اپنی طویل سوچ سے چونک گیا۔ مڑ کر دیکھا کوئی بھاگ کر تیزی سے میری طرف آیا اور عقب سے مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ ایک توانا شخص تھا۔ اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس کے ساتھ دو تین مزید افراد مجھ پر جھپٹ پڑے۔ مجھے ایک پولیس اہلکار کی وردی کی جھلک بھی نظر آئی۔ میں ابھی تک بیٹھا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے گالیاں بکیں اور مجھے وہیں گھاس پر لمبا لٹانے کی کوشش کی۔ یہ ان کے بس کی بات تو نہیں تھی۔ میں نے مزاحمت کی ایک باوردی اہلکار کو گریبان سے جھٹکا دے کر میں نے اپنی طرف کھینچا اور اس کی بھاری توند پر اپنے گھٹنے کی ضرب لگائی۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا۔ دوسرے اہلکار کے ہولسٹر میں سے میں نے اس کا سرکاری پستول کھینچ لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''خبردار!'' میں گرجا۔ ''گولی چلا دوں گا۔''

یہ کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ وہ لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ یہ کل تین بندے تھے اور میرے اندازے کے مطابق تینوں پولیس والے تھے۔ ایک سفید کپڑوں میں تھا اور دو وردی میں۔ جس اہلکار کے گریبان کو میں نے جھٹکا دیا تھا اس کی سیاہ جرسی نیچے تک پھٹ گئی تھی۔ اس کے کندھے کے پھول بتا رہے تھے کہ وہ انسپکٹر ہے۔ اس کی رنگت اڑ گئی تھی مگر وہ اپنے چہرے پر افسرانہ شان اور دبدبہ پیدا کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ سنسناتے ہونٹوں سے لہجے میں بولا۔ ''تم ہوش میں تو ہو۔ یہ کیا کررہے ہو؟ پستول نیچے کرو۔'' میں نے نہ صرف پستول نیچے کرلیا بلکہ اس کے مالک کو واپس بھی کردیا۔

ان تینوں کی اڑی ہوئی رنگت قدرے بحال ہوگئی۔ شاید انہوں نے یہی سمجھا تھا کہ میں نے پولیس مقابلے کے نہایت سنگین الزام سے بچنے کے لیے پستول واپس کردیا ہے۔ پستول کے مالک سب انسپکٹر نے پستول کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ''چلو ادھر گاڑی میں بیٹھو... چلو۔''

''کس خوشی میں؟'' میں نے پوچھا۔

''اب بہت سی خوشیاں اکٹھی ہوگئی ہیں۔'' انسپکٹر نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''اور ایک خوشی تو یہی ہے جو تمہیں بھی نظر آرہی ہے۔ پولیس اہلکار کی وردی پھاڑی ہے تم نے۔'' اس نے اپنی پھٹی ہوئی جرسی اور قمیص کے ٹوٹے ہوئے بٹن مجھے دکھا کر کہا۔

میں نے کہا۔ ''ابھی تو صرف وردی پھٹی ہے کچھ اور بھی... ہوسکتا تھا۔'' میرا اعتماد اور اطمینان دیکھ کر تینوں اہلکار کچھ ٹھٹک گئے۔

اسی دوران میں درختوں کی عقب سے ایک لمبا تڑنگا شخص برآمد ہوا اور کڑک کر بولا۔ ''اوئے نامردو! کیا دیکھ

رہے ہو، توڑ دو اس کی ایک دو ہڈیاں اور ڈالو گاڑی میں..." فقرے کے آخر میں اس نے ایک غلیظ گالی بھی بکی۔

آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں نے پہچان لیا یہ لمبے دھڑ اور پلپلے جسم والا تنویر پاشا تھا جس کی چند ہفتے پہلے میں نے یادگار ٹھکائی کی تھی۔ یہی ناہید کا سابقہ شوہر تھا اور اپنی کوٹھی میں مجھ سے زبردست درگت بنوانے کے بعد اس نے تیزی سے اثر کرنے والا نشہ آور کیپسول نگل لیا تھا۔

وہ ذرا روشنی میں آیا تو میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ شلوار قمیص اور کوٹ میں وہ پچھلی بار سے بھی پھیلا ہوا دکھائی دیتا تھا مگر میں جانتا تھا اس بدبخت کے جسم میں بس ہوا ہی ہوا ہے۔

اگلے ایک دو منٹ میں ان ویران درختوں میں جو گفتگو ہوئی، اس سے مجھے صاف پتا چل گیا کہ پولیس اہلکاروں کو یہاں لانے والا یہی پلپلا شرابی تنویر پاشا ہے۔ اس نے یا اس کے کسی ساتھی نے مجھے دیکھا تھا اور اب یہ لوگ مجھے گھیرنے کے لیے یہاں پہنچ گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ انسپکٹر یا سب انسپکٹر وائرلیس کر کے مزید ساتھیوں کو یہاں بلا لیتا اور ہنگامہ بڑھ جاتا، میں نے پاشا سے کہا۔ "اچھے بچے کوئی بھی حرکت کرنے سے پہلے اپنے ابا جی سے ضرور پوچھ لیتے ہیں۔ تمہیں بھی محترم جناب شکیل صاحب سے اجازت مانگ لینی تھی۔"

وہ گالی دے کر خطرناک لہجے میں بولا۔ "اجازتیں بھی مانگ لیں گے فی الحال تم تھانے چلو۔"

میں نے کہا۔ "جو لوگ اپنی بیویوں کے سلسلے میں بے غیرت ہوتے ہیں، ان کی عقل ایسے ہی ماری جاتی ہے۔ اپنے ابا جی سے پوچھے بغیر مجھے تھانے لے جاؤ گے تو اس بار تمہیں دونوں کو چھتر اکٹھے ہی کھانے پڑ جائیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی جیکٹ کی جیب سے سیل فون نکالا اور شکیل داراب کا ڈائریکٹ نمبر ڈائل کیا۔ یہ نمبر اس نے بس خاص خاص لوگوں کو ہی دے رکھا تھا اور اس کے ایک اہم ترین راز سے واقف ہونے کے بعد میں بھی اس کے خاص لوگوں میں شامل ہو گیا تھا۔ کم از کم عارضی طور پر تو ہو ہی گیا تھا۔

دو تین بار بیل ہوئی پھر اسپیکر پر شکیل داراب کی جوان لیکن بارعب آواز ابھری۔ "ہیلو شکیل اسپیکنگ۔"

"میں شاہ زیب عرض کر رہا ہوں۔ معافی چاہتا ہوں آپ کے ایک بے وقوف دوست کی وجہ سے آج پھر آپ کو زحمت دینا پڑ رہی ہے۔ میرے سامنے پاشا کھڑا ہے۔ اپنی مدد کے لیے ساتھ میں تین پولیس والے بھی لایا ہے۔ مجھے آوارہ گردی کے جرم میں پکڑ کر تھانے لے جانا چاہ رہے ہیں۔"

"پاشا؟" شکیل کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جی ہاں... آپ کو یاد ہی ہوگا چند ہفتے پہلے اس کی کوٹھی میں اس کے ساتھ میری علیک سلیک ہوئی تھی۔ ذرا سنگین قسم کی علیک سلیک تھی۔ شاید یہ اس کا غصہ نکالنا چاہ رہا ہے مجھ پر۔"

"بڑا اُلو کا پٹھا ہے۔" شکیل نے دانت پیسے۔

"آپ نے میرے بارے میں تھوڑا بہت بتا دیا ہوتا اسے۔"

"بتایا تھا، بھول گیا ہوگا خبیث کی اولاد۔ ہر وقت تو ٹُن رہتا ہے۔" شکیل نے کہا۔ پھر کسی قدر غصیلے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اور... تم کب جا رہے ہو یہاں سے؟ تمہارے کاغذات تو میرے خیال میں تیار ہی ہیں؟"

"بس زیادہ دن آپ کو تکلیف نہیں دوں گا۔" میں نے کہا۔

"جب تک تم یہاں ہو ایسے مسئلے کھڑے ہوتے ہی رہیں گے۔ کچھ پولیس افسر تمہارے خلاف ہیں۔ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ جلد نکل جاؤ۔"

"میں ایسے لوگوں کو جوتے کی نوک پر رکھتا ہوں شکیل صاحب لیکن آپ کا کہا سر آنکھوں پر۔ میں اب زیادہ دن یہاں نہیں رکوں گا۔"

اس نے ذرا توقف سے کہا۔ "اچھا فون دو اس... کو۔" فقرے میں پاشا کے لیے انگریزی کی ایک تگڑی گالی موجود تھی۔

میں نے فون پاشا کی طرف بڑھایا۔ وہ بات کرتا ہوا کچھ آگے نکل گیا۔ یقینی بات تھی کہ شکیل داراب اسے بُری بھلی سنا رہا ہوگا۔ پاشا اس کے لیے ایک ایسے کتے جیسا تھا جسے ہر وقت گودے سے بھرپور ہڈیاں ملتی رہتی تھیں۔ اس کے باوجود اگر وہ اپنے مالک کے لیے پریشانی کا باعث بنتا تو مالک کو غصہ تو آنا ہی تھا۔ بہرحال میں جانتا تھا کہ یہ غصہ ایک حد سے نہیں بڑھے گا کیونکہ جس طرح میں شکیل کے ایک نہایت اہم راز سے واقف تھا، یہ پاشا بھی تھا بلکہ اس راز کا تو تعلق ہی پاشا سے تھا۔ اس راز کا افشا ہوتا (اور پھر الیکشن جیسے نازک موقع پر افشا ہوتا) شکیل کے لیے سیاسی موت کا باعث بن سکتا تھا۔

تین چار منٹ بعد پاشا سرخ چہرے کے ساتھ سیل فون میری طرف بڑھا دیا اور منہ میں پتا نہیں کیا کیا بڑبڑانے لگا۔ میں اسے مزید تاؤ دلانے کے موڈ میں تھا۔ میں اس کے قریب گیا اور اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے ایک طرف لے گیا۔ میں نے کہا۔ ”پاشا! مجھے پتا چلا ہے کہ تو صرف شادی شدہ عورتوں اور منگیتروں وغیرہ پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔ اس کی وجہ میں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔“

وہ سوالیہ انداز میں منہ کھولے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”اس کی وجہ یہ گتی ہے کہ تیری اپنی بیوی کسی اور کے پاس ہے۔ تو جن موج مستیوں میں پڑا ہوا ہے اس کی قیمت تو نے اپنی بیوی کی صورت میں دی ہے۔ بڑی اعلیٰ نسل کے خاندانی دلال ہی ایسے کام کرتے ہیں۔“

اس نے تڑپ کر میرا گریبان پکڑ لیا۔ پولیس والے بھی پھر الرٹ ہو گئے۔ پاشا خونخوار لہجے میں بولا۔ ”اب ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو میں جان لے لوں گا تیری۔“ فرط غضب سے وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”اتنے بڑے پیٹ کے ساتھ اس عمر میں اتنا غصہ ٹھیک نہیں۔ اٹیک شٹیک ہو جایا کرتا ہے۔“

اس کی گرفت سے اپنا گریبان چھڑا کر میں نے بڑے اطمینان کے ساتھ گھاس پر سے اپنا ہیلمٹ اٹھایا اور اپنی موٹر بائیک کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

میں داؤد بھاؤ کے زیرِ زمین ٹھکانے پر موجود تھا۔ اس وسیع ہال کے ایک گوشے میں ایک مستقل اسٹیج بنا ہوا تھا۔ یہاں اکثر مارکٹائی کے مقابلے ہوتے رہتے تھے۔ جس دن میں نے اس اسٹیج پر لودھی کو یادگار مار لگائی تھی یہاں میری دھاک بیٹھ گئی تھی۔ درحقیقت لودھی یہاں کا بہترین فائٹر سمجھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اسے دھول چٹانے کے بعد یہ اعزاز میرے حصے میں آگیا تھا۔ ویسے رسمی طور پر وہی اس کلب کا چیمپئن تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید لودھی ایک بار پھر مجھے چیلنج کرے گا اور یوں اپنا کھویا ہوا وقار واپس حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے گا لیکن اس نے یہ حماقت نہیں کی۔ ہاں اس نے ایک اور کام کیا۔ وہ ایک اور شخص کو میرے مقابل لے آیا۔

یہ بات عتیق نے ہی مجھے بتائی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا ٹی وی پر نیوز دیکھ رہا تھا۔ اسکرین پر شکیل درّاب نظر آرہا تھا۔ الیکشن میں بس چند ہی روز رہ گئے تھے۔ وہ میڈیا والوں کے تند و تیز سوالات کے جوابات بظاہر بڑی خندہ پیشانی سے دے رہا تھا۔ اس نے ابھی اساتذہ کے ایک بہت بڑے کنونشن سے خطاب کیا تھا اور اب میڈیا والوں کو بتا رہا تھا کہ تعلیم اور تعلیم دینے والوں کی اس کے نزدیک کیا اہمیت ہے۔ وہ علاقے میں بہت جلد ایک یونیورسٹی کی بنیاد رکھنے کی بات بھی کر رہا تھا۔

اگر کوئی یہاں آکر بتا دیتا کہ اساتذہ کی شان میں قصیدے پڑھنے والے اس حاکم زادے نے اپنی ہی ایک محترم استاد کی زندگی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے تو شاید لوگ ابھی اس پر جوتے پھینکنے لگتے۔ وہ سیاستدانوں کے دہرے چہرے کی زندہ مثال تھا۔

اتنے میں عتیق اندر داخل ہوا۔ اس نے کہا۔ ”شاہ زیب بھائی! آپ کا سائڈ ہیرو ایک بندے کو لے کر آیا ہے۔ میری انفارمیشن کے مطابق یہ بندہ حیدرآباد کا ایک پہنچا ہوا فائٹر ہے۔ فوج میں بھی بھرتی ہوا تھا لیکن پھر مکمل طور پر مارشل آرٹ کی طرف آگیا۔ ریس میں حصہ لینے والی کاریں بھی ڈرائیو کرتا رہا ہے لیکن اس کی اصل شہرت اس کی مارکٹائی کا زبردست فن ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ لودھی اسے آپ کے مقابل لانا چاہتا ہے۔“

”تو کوئی بات نہیں۔ ہو جائیں گے مقابل۔“ میں نے ایل سی ڈی کی اسکرین پر نگاہیں جمائے جمائے کہا۔

”پر یہ کوئی معمولی شخص نہیں ہے بھائی۔ سنا ہے کہ جاپان اور ہالینڈ کی یاترا بھی کر چکا ہے۔ وہاں بھی غیر ملکی فائٹروں سے مقابلے وغیرہ کرتا رہا ہے۔“

اسی دوران میں میرے سیل فون پر بیل ہوئی۔ دوسری طرف داؤد بھاؤ تھا، وہ مجھے اپنے چیمبر یعنی کمرے میں بلا رہا تھا۔ میں نے عتیق کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لو بلاوا آگیا ہے بھاؤ کا۔“

میں ایل سی ڈی آف کر کے بھاؤ کے کمرے میں پہنچا۔ وہاں بھاؤ کے ساتھ وہ حیدرآبادی بندہ بھی موجود تھا۔ وہ مضبوط جسم کا ایک توانا شخص تھا۔ عمر اٹھائیس سے اوپر رہی ہوگی۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ ایک تجربہ کار فائٹر ہے۔ اس نے مجھے دیکھا اور جیسے چونک سا گیا۔ کتنی ہی دیر بڑے تعجب سے میری طرف دیکھتا رہا۔ بھاؤ نے اس سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ”مستان، یہ ہے شاہ زیب... اور شاہ زیب، یہ ہے مستان۔ تمہاری ہی طرح لڑنے بھڑنے کے فن میں طاق ہے۔ جاپان اور یورپ کی سیر بھی کر چکا ہے اور وہاں کئی ٹائٹل اپنے نام کیے ہیں...“

بھاؤ تعارف کروانے میں مصروف تھا اور وہ شخص بس مجھے دیکھے چلا جا رہا تھا۔ بھاؤ نے تاڑ کر کہا۔ ''کیا بات ہے مستان! تم پہلے سے جانتے ہو شاہ زیب کو؟''

''شاہ زیب کو...'' اس نے الجھے الجھے لہجے میں کہا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ ایک دم میرے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ مجھے شک ہوا کہ یہ شخص مجھے مارشل آرٹ والے تم لینی ایسٹرن کی حیثیت سے نہ صرف جانتا ہے بلکہ مجھ سے مل بھی چکا ہے۔ اب مجھے اس کی صورت بھی کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔

اس نے کچھ بولنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔ غالباً وہ سمجھداری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ بدلے ہوئے حلیے کے باوجود میرے بارے میں زبردست شک میں مبتلا ہو چکا ہے۔ درحقیقت جو لوگ آپ کو قریب سے جانتے ہوں، آپ سے مل چکے ہوں، بات چیت کر چکے ہوں، ان کو اپنے گیٹ اَپ سے دھوکا دینا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہی ہوتا ہے۔ بے شک اب میرے سر کے بال کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔ میری مونچھیں اور داڑھی بھی غائب تھی، بالوں کا رنگ بھی ایسٹرن کنگ والا نہیں تھا لیکن چہرہ تو وہی تھا اور آواز بھی۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی کوئی سیاہ کار سرکاری افسر داؤد بھاؤ کو سلام کرنے کے لیے وہاں آ گیا اور داؤد بھاؤ کو کچھ دیر کے لیے اٹھ کر دوسرے کمرے میں جانا پڑا۔

اب وہاں میں اور مستان نامی وہ شخص اکیلے تھے۔

مستان نے تیز نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ جیسے یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہو کہ یہاں کوئی خفیہ کیمرا یا ڈکٹا فون تو موجود نہیں پھر بڑی دھیمی آواز میں بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ میری نگاہیں دھوکا نہیں کھا رہیں لیکن آپ کا حلیہ اس قدر بدلا ہوا ہے کہ کوئی آپ کو پہچان نہیں سکتا... آپ ایسٹرن ہی ہیں ناں؟''

میرا جسم سنسنا گیا بہرحال میں نے نارمل لہجے میں کہا۔ ''کون ایسٹرن؟''

مستان کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ رنگت کا یہ بدلاؤ بتا رہا تھا کہ وہ مجھے پہچان لینے کے باوجود ابھی تک تذبذب میں ہے۔ ''پلیز آپ مجھے کنفیوز کر رہے ہیں۔ میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ اگر... اگر آپ کی کوئی مجبوری ہے تو میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا لیکن آپ... مان تو لیں۔''

''تم نے کہاں دیکھا تھا مجھے؟''

''لندن میں... پھر ہم پانچ دوسرے فائٹرز کے ساتھ ایمسٹرڈیم گئے تھے۔ ننھے ہی بائی روڈ... ایمسٹرڈیم میں میرا مقابلہ بیچ فائٹر جونی ہنڈ کے ساتھ ہوا تھا... وہی لمبے بازوؤں والا...''

اب مجھے بھی کچھ کچھ یاد آنے لگا تھا۔ یہ شخص کوئی تین سال پہلے کی بات کر رہا تھا۔ ہم نے ہالینڈ کے سپیشل ایمسٹرڈیم میں ایک دوستانہ مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ ہماری ٹیم میں چھ سات کھلاڑی شامل تھے اور ہم لندن کے ہوٹل میں ایک رات اکٹھے بھی رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، مجھے یاد آ گیا ہے لیکن میں چاہوں گا کہ تم اس سلسلے میں اپنی زبان ابھی بالکل بند رکھو۔ ہم اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔ تم میرا سیل نمبر لکھ لو۔''

''جو آپ کا حکم سر۔'' مستان نامی اس شخص نے فوراً رضامندی ظاہر کی۔

اسی دوران میں داؤد بھاؤ واپس آ گیا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا اور اس سرکاری افسر کو کلاسیکل گالیاں دے رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ملک کے سب سے بڑے بلیک میلر اور کرپٹ سرکاری افسر اور بیوروکریٹس ہی ہیں۔ کرپٹ سیاست دان تو پھر بھی وفادار ہو جاتے ہیں لیکن ان کی کرسیاں پکی ہوتی ہیں۔ ان کی اکثریت ایسی ہے جن کی گھٹی میں عیاشی پڑی ہوئی ہے۔

کچھ دیر بعد ہماری گفتگو پھر لڑائی مار کٹائی اور فائٹنگ کے فن کی طرف آ گئی۔ داؤد بھاؤ نے اشاروں کنایوں میں مجھے بتایا کہ اگر ہم دونوں میں ایک بھرپور فائٹ ہو تو دیکھنے والوں کو مزہ آ جائے۔

''کیا آپ فکسڈ فائٹ کی بات کر رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں یار، دو نمبری میں دو نمبری نہیں چلتی۔ مقابلہ ہوگا تو پھر اصلی ہوگا۔ ہاں اس میں کوئی رول وغیرہ بنائے جا سکتے ہیں کہ کسی کو شدید چوٹ نہ لگے۔ ایسا پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔''

کچھ دیر تک اس بارے میں مزید گفتگو ہوئی۔ مستان تو زیادہ تر خاموش ہی رہا۔ میں نے کہا۔ ''داؤد بھاؤ میں سوچ کر آپ کو کل بتاؤں گا۔''

شام کے فوراً بعد جب میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا اور روبی میرے لیے چائے سرو کر رہی تھی۔ میری نگاہ بار بار اس کے شرمیلے بالوں کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ بھاؤ کی اس

نوخیز رتھیل میں میرے لیے بس ایک ہی چیز دلچسپی کی تھی۔ مجھے جب بھی اس کے بال دکھائی دیتے تھے مجھے کسی اور کے بالوں کی یاد دلا دیتے تھے۔ وہ جو ایک خیال کی طرح مجھے ملی اور اوجھل ہوگئی تھی۔ کہاں تھے وہ بال؟ کہاں تھیں ان کی وہ لٹیں جو شفاف شیشے جیسے چہرے پر جھکی رہتی تھیں۔ انیق میرے کہنے پر اب بھی ایک موہوم سے کلیو کے ساتھ اس کی تلاش میں نکلا ہوا تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ مایوس چہرہ لے کر ہی واپس آئے گا۔

اتنے میں میرے سیل پر کال کے سگنل آئے۔ میں نے دیکھا، یہ مستان کی کال تھی۔ میں نے روبی کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنے مختصر لباس میں اپنے توبہ شکن سراپا کی جھلک دکھاتی باہر نکل گئی۔

''ہیلو مستان کیسے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''شکر ہے آپ نے مجھے میرے نام سے تو بلایا۔'' وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ''یقین کریں میں اسے اپنی بہت بڑی خوش نصیبی سمجھ رہا ہوں کہ آپ جیسے چیمپئن کھلاڑی سے یہاں اپنے وطن میں اس طرح ملاقات ہوگئی ہے۔''

''تو پھر یہ خیال ہے؟ اس خوش نصیبی کو چاہو اور بڑھایا جائے، میرا مطلب ہے مقابلہ وغیرہ کرنے کا ارادہ ہے؟''

''یہ بات کر رہے ہیں جناب؟ میری یہ مجال... میری حیثیت تو آپ کے شاگردوں کے شاگرد کی بھی نہیں ہے۔''

''خیر اتنا بھی بانس پر نہ چڑھاؤ مجھے۔ داؤد بھاؤ کا خیال ہے کہ اگر یہ اپنا مقابلہ ہو جائے تو اسے کافی آمدنی ہوگی اور ہم دونوں کو بھی معاوضہ ملے گا۔''

''میں بھوکا مر سکتا ہوں لیکن اتنی بڑی حماقت نہیں کر سکتا جناب کہ پیسے کمانے کے لیے آپ سے لڑوں۔''

''یہ بھوکا مرنے کا ذکر کہاں سے آ گیا، تم خیریت سے تو ہو۔ میرا مطلب ہے کوئی تنگی ترشی والا معاملہ تو نہیں چل رہا؟'' وہ ایک دم خاموش ہوگیا جیسے اسے احساس ہوا ہو کہ اس نے غلط جملہ بول دیا ہے۔

میں نے کل بھی محسوس کیا تھا کہ مستان اپنے بائیں کندھے کو ہلاتے ہوئے کچھ دقت محسوس کرتا ہے۔ وہ جس فیلڈ سے تعلق رکھتا تھا اس میں عموماً انجریز ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی کوئی پٹھا چڑھ گیا کبھی کہیں چین نکل آئی۔ اگر اس طرح کی انجریز عام ہوں تو کوئی بات نہیں ہوتی لیکن اگر انجری کی نوعیت سنگین ہو تو کئی مرتبہ کھلاڑی کا کیریئر داؤ پر لگ جاتا ہے۔

میں نے مستان سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا اور جلد ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ پچھلے تقریباً ایک سال سے اَن فٹ ہے۔ کل کا نامور فائٹر کراچی کے فائٹنگ کلبس میں بس چھوٹے موٹے مقابلے کر کے روزی روٹی چلا رہا تھا۔ پچھلے دنوں پولیس کے ٹریننگ سینٹر میں لڑکوں کو مارشل آرٹ کی سمجھ بوجھ دینے کے لیے انسٹرکٹر کی ایک نوکری نکلی تھی۔ مستان ہر طرح اس نوکری کا اہل تھا لیکن اس پر ایک نااہل منظورِ نظر کو ترجیح دے دی گئی تھی۔ وہی کہانی جو درجنوں بار اس سے دہرائی جا چکی تھی۔ اب اس پر ایک اور مصیبت آ گئی تھی۔ اس کی اکلوتی بہن جس سے وہ بہت پیار کرتا تھا سخت مصیبت میں تھی۔ اس کا شوہر جو کسی امیر کبیر شخص کا خاص گن مین تھا کسی لڑائی میں زخمی ہوگیا تھا اور ساتھ ہی اس کی نوکری بھی چلی گئی تھی۔ بہن کا بچہ بیمار تھا اور اس کے ساتھ ان کو روٹی کے لالے بھی پڑے ہوئے تھے۔

مفلسی کی یہ تصویر واقعی دلدوز تھی۔ خاص طور سے اس لیے کہ اس کا تعلق ماضی کے ایک نامور کھلاڑی سے تھا۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ اس کے لیے کچھ کروں گا۔ میں پاکستان سے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ مجھے یہاں ان گنت مستان، وحید اور عارف نظر آئے تھے جو روپیا اور وسائل نہ ہونے کی وجہ سے حالات کی چکی میں پس رہے تھے۔ میں ان سب کے لیے کچھ کرنے کے قابل تو نہیں تھا مگر کم از کم اس ایک مستان کا دکھ تو ہلکا کر سکتا تھا۔

اگلے روز پھر مستان سے ٹیلی فون پر بات ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے بہنوئی کا کیا حال ہے؟ وہ بولا۔ ''اس کی ٹانگ کا ایک اور آپریشن ہونا تھا لیکن اس کے سابقہ مالک نے مزید مالی تعاون کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اب ہم مجبوراً اسے سرکاری اسپتال میں داخل کروا رہے ہیں۔''

میں نے اس سلسلے میں مستان سے مزید سوال جواب کیے۔ میں نے اس گفتگو کے دوران میں ہی فیصلہ کر لیا کہ میں مستان کے لیے کچھ نہ کچھ کروں گا اور اس سلسلے میں میرے ذہن میں ایک پلان بھی بن گیا۔

میں نے کہا۔ ''مستان! میں داؤد بھاؤ کی بات نہیں ٹال سکتا۔ وہ میرا میزبان ہے اور مہربان بھی۔ اس کی خواہش ہے کہ میں تم سے مقابلہ کروں۔ یہ مقابلہ ہونا چاہیے اور اس میں تمہیں جیتنا بھی چاہیے۔''

''مم... میں سمجھا نہیں جناب؟''

''کسنڈ مقابلہ۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن کسی قم

یا فائدے کے لالچ میں نہیں صرف اس لیے کہ میری ہی فیلڈ کے ایک شخص کو اس کا حق اور مقام نہیں دیا جا رہا۔''

وہ کچھ بولنا چاہ رہا تھا لیکن میں نے اسے خاموش کر دیا اور کہا کہ باقی باتیں ہم آمنے سامنے بیٹھ کر کریں گے۔

''جیسے آپ کا حکم... لیکن مجھے کہاں آنا ہوگا؟'' وہ کانپتی سی آواز میں بولا۔

''جہاں تم آسانی سے آسکو مگر رازداری کے ساتھ۔'' ہم نے ایک ریسٹورنٹ کا تعین کر لیا اور ملاقات کا وقت بھی طے ہو گیا۔

☆☆☆

میں پاکستان سے روانہ ہونے کی پوری تیاری کر چکا تھا۔ چچی آمنہ اور فائزہ کی قبروں پر فاتحہ خوانی کر آیا تھا۔ اسپتال میں جا کر ولید سے مل آیا تھا اور اسے پوری تسلی دے آیا تھا کہ وہ بہت جلد آزاد زندگی کی طرف لوٹ آئے گا۔ بہرطور میں جانتا تھا کہ وہ غصے کا بہت تیز ہے فی الحال تو اس کا جیل میں رہنا ہی زیادہ مناسب تھا۔ اپنی والدہ اور بہن کی موت اسے طیش سے دیوانہ کیے ہوئے تھے اور اس طیش سے ایک قیامت برپا ہو سکتی تھی۔ چچا حفیظ اپنی برباد شدہ حویلی کے بچے پیچھے حصے میں واپس پہنچ چکے تھے۔ میں نے انہیں بھی پوری تسلی دی تھی کہ وہ اب لالہ فیملی کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ ہیں۔ اب کوئی قیصر چودھری انہیں دھمکانے کے لیے یہاں نہیں آئے گا۔ نہ ہی یہ زمین فروخت کرنے کے لیے ان پر ناجائز دباؤ ڈالا جائے گا۔ میں نے ان کو یہ اطمینان بھی دلایا تھا کہ میں ڈنمارک میں ہوتے ہوئے بھی ہمہ وقت ان سے رابطے میں رہوں گا۔ وہ بار بار مجھ سے کہتے رہے۔ ''شاہ زیب پتر! اگر تم یہاں رہنے کا ارادہ لے کر آئے تھے تو اب واپس کیوں جا رہے ہو؟ اب تو تمہیں یہاں رہنے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ تمہاری چچی اور فائزہ کے بعد میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔ ولید بھی جیل میں ہے۔ کسی دن میری سانس رک جائے گی اور تم لوگ میرا منہ بھی نہیں دیکھ سکو گے۔''

میں چچا کو کیسے سمجھاتا کہ میں آیا تو واقعی یہاں رہنے کے ارادے سے تھا لیکن اب یہاں میرا دم گھٹنا شروع ہو گیا ہے۔ جس طرح انہیں اپنی سانس رکنے کا خدشہ ہے۔ مجھے بھی لگتا ہے کہ اس شہر کا بے پناہ حبس میرے پھیپھڑوں میں بھر کر میرے دل کو تھام لے گی۔

ماشرہ اپنے والد حاجی نذیر صاحب کو علاج کے لیے کوپن ہیگن لے جا چکی تھی۔ اس کی والدہ بھی ساتھ گئی تھیں۔ پاکستان سے میری روانگی مہینے کی 25 تاریخ کو تھی۔ عارف بھی میرے ساتھ ہی جا رہا تھا مگر مجھے یہ تاریخ مستان کی اسٹنٹ شوٹی کے لیے چار دن آگے کرنا پڑی۔ چار دن بعد میرے اور مستان کے بیچ داؤد بھاؤ کے زیرِ زمین ٹھکانے پر مقابلہ ہونا طے پایا تھا۔ میں نے تو اب شاید ہی بھاؤ سے دوبارہ ملنا تھا یا اس زیرِ زمین ٹھکانے پر واپس آنا تھا تو پھر میں اپنی ساکھ کو ضائع کیوں ہونے دیتا۔ کیوں نہ اسے کسی ضرورت مند کے حوالے کر دیتا تا کہ یہ اس کے کام آسکے اور میں نے یہ ساکھ مستان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مستان کو میں نے اس کے لیے کیسے اور کیونکر رضامند کیا، یہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔ میرے لیے اس زیرِ زمین کلب میں ہار جیت کی کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن میری ہار مستان جیسے مصیبت زدہ کے دن پھیر سکتی تھی۔ یہاں سے فائٹنگ کلبس اور مارشل آرٹ کے حلقوں میں اس کا وقار بحال کر سکتی تھی۔ اپنے کندھے کی انجری کو میرے ساتھ ہونے والے تاریخی مقابلے کا نتیجہ بھی قرار دے سکتا تھا اور یوں اسے انجری سے ابھرنے کے لیے بہ آسانی ایک آدھ سال کی مہلت بھی مل جاتی۔

میرے اور مستان کے مقابلے کی خبر بہت جلد اسٹریٹ فائٹرز اور مارشل آرٹ کے مقامی حلقوں میں پھیل گئی۔ اسے باکسنگ کا مقابلہ کہا جا رہا تھا لیکن یہ دراصل کک باکسنگ کے طرز کی لڑائی تھی۔ داؤد بھاؤ کے زیرِ زمین ٹھکانے پر ایک بار پھر جوش و خروش کے وہی مناظر دیکھنے میں آئے جو میرے اور لودھی کے مقابلے کے موقع پر دیکھنے میں آئے تھے۔ کلب میں میرے بہت سے پرستار پیدا ہو چکے تھے اور وہ میری جیت کے سلسلے میں بہت پُرامید تھے۔ تاہم ان میں سے اکثر یہ بھی جانتے تھے کہ پہلے لودھی تھا اور اب حیدرآباد کا مستان ہے۔

مستان، لودھی سے کہیں بڑا فائٹر ہے۔ مستان کی حمایت کرنے والوں میں لودھی فاروق، واحد اور ان کا گروپ شامل تھا۔ یہ لوگ مجھے مستان سے شکست کھاتا دیکھنے کے زبردست خواہش مند تھے اور میں ان کی یہ خواہش پوری کرنے جا رہا تھا کیونکہ میرا اس میں کچھ جاتا نہیں تھا۔ کئی بڑے بڑے پھنّے خان بھی مقابلہ دیکھنے کے لیے تشریف لا رہے تھے۔ ان میں کچھ نیم سیاسی، نیم بدمعاش ہستیاں بھی شامل تھیں اور انڈر ورلڈ کے دو چار چہرے بھی جھلک دکھانے والے تھے۔ بھاری شرطیں لگائی

گئی تھیں۔

27 تاریخ کو مقابلہ ہوا اور خوب ہوا۔ بڑے مقابلے سے پہلے کئی چھوٹے مقابلے ہوئے۔ یہاں کا کانگڑی پہلوان جبار انتظامِ اعلیٰ کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی موجودگی میں کسی بدنظمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نہ ہی فکسنگ وغیرہ کا کوئی چکر تھا یہاں۔ واحد فکسڈ مقابلہ میرا اور مستان کا تھا اور اس کا علم بھی صرف اور صرف ہم دونوں کو تھا۔

حسبِ سابق پانچ راؤنڈ کا مقابلہ تھا۔ تاہم پچھلی مرتبہ صرف باکسنگ ہوئی تھی اس مرتبہ کک باکسنگ ہوتا تھی۔ تماشائیوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ زبردست نعرے بازی بھی ہو رہی تھی۔ پورے ہال میں نیم تاریکی تھی صرف رنگ روشنیوں میں جگمگا رہا تھا۔

یہ مقابلہ پورے چار راؤنڈ چلا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے پر شدید حملے کیے۔ ان فٹ ہونے کے باوجود مستان نے میری توقع سے بڑھ کر کارکردگی دکھائی۔ وہ یقیناً ایک جان مارنے والا فائٹر تھا۔ اس کا کندھا ٹھیک ہوتا اور یہ طے شدہ مقابلہ نہ ہوتا تو وہ یقیناً مجھے ٹف ٹائم دے سکتا تھا۔ اس کے فٹ ورک اور چکما دینے کے ہنر نے مجھے متاثر کیا۔ بہرحال ایک سنسنی خیز اور دعوت پیش بڑھا دینے والے مقابلے کی ساری خصوصیات اس فائٹ میں موجود تھیں۔ ایک دوسرے کو زوردار ضربات لگائی گئیں۔ ناک منہ سے خون بھی چھوٹا۔ تماشائیوں نے اپنے شور سے آسمان بھی سر پر اٹھا لیا۔ ریفری نے بار بار ہم دونوں کو وارننگ دی۔ ”ورنہ فاؤل نہیں کریں گے۔ اگر فاؤل کریں گا تو ہم پوائنٹ کاٹیں گے۔“

ایک موقع پر کرچن ریفری مجھے دھکیلتا ہوا رسوں تک لے گیا اور مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس ادھیڑ عمر کے جسم میں اتنی طاقت کہاں تھی کہ مجھے روک سکتا۔ بہرحال میں نے اس کا بھرم رکھا اور خود کو چھڑایا نہیں۔ بہرحال اس مقابلے کا آخری نتیجہ وہی نکلا جو ہم نے چار روز پہلے طے کیا تھا۔ مجھے ٹیکنیکل ناک آؤٹ قرار دیا گیا اور مستان کو اس کے پُرجوش حمایتیوں نے کندھوں پر اٹھا لیا۔

اسی دوران میں ایک ناخوشگوار واقعہ بھی ہو گیا۔ مجھے شکست خوردہ دیکھ کر میرے سابقہ حریف لودھی کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ اس کی کدورت عود کر آئی۔ اس نے مجھ پر آوازیں کسیں اور نازیبا جملے بولے۔ درحقیقت وہ ایک منہ پھٹ شخص تھا۔ اس کی بدزبانی کی وجہ سے انیق بھڑک اٹھا اور لودھی پر جا پڑا۔ دونوں نے ایک دوسرے پر اندھادھند مکے برسائے۔ اس موقع پر میری نگاہ مستان پر پڑی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے اجازت طلب کر رہا تھا کہ اگر میں کہوں تو وہ لودھی کی بولتی بند کر دے۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں ہی اسے منع کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ مختار جبار اس طرح کی سچوئیشنز کو بڑے اچھے طریقے سے سنبھالتا ہے۔ وہ بالکل سنگل پسلی تھا لیکن یہاں اس چھت کے نیچے اس کا کافی رعب داب تھا اور میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ مختار جبار اور اس کے دو تین قریبی ساتھیوں نے جلد ہی اس ہنگامے پر قابو پا لیا۔ بہرحال ان ڈیڑھ دو منٹوں میں انیق کو کافی چوٹیں آ گئیں۔ وہ اپنی پھٹی ہوئی شرٹ سے بار بار اپنا خون آلود منہ پونچھ رہا تھا۔ اس طرح کے ہنگامے یہاں روزمرہ کا معمول تھے۔

میں نے یہاں اپنے اور مستان کے مقابلے کی تفصیل بیان نہیں کی۔ نہ ہی میں مقابلے کے بعد کی صورتِ حال کا نقشہ کھینچنا چاہتا ہوں۔ (بے شک کچھ لوگ بہت خوش اور کچھ بہت مایوس ہوئے تھے) میں دراصل قارئین کو اس انہونی کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں جو اس مقابلے کی وجہ سے ہوئی یا یوں کہہ لیں کہ اس انعام کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں جو میری اس قربانی کے سبب مجھے ملا۔ اس کو آپ صرف ایک اتفاق کہہ سکتے ہیں اور ٹائمنگ کی کرشمہ کاری بھی مگر اس حقیقت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ بعض اوقات ہمارے چند اچھے کام ہمارے لیے آسانیوں کے راستے کھولتے ہیں۔ مجھے 25 تاریخ کو لاہور سے امارات کی ائیرلائن پر واپس پاکستان روانہ ہونا تھا۔ اس مقابلے کی وجہ سے میں نے اپنی روانگی چار دن لیٹ کی یعنی اپنا اور عارف کا ٹکٹ 29 تاریخ کا کرا لیا۔

اور 28 تاریخ کو پاکستان میں میرے عارضی سیل نمبر پر ایک ایسی کال آئی جس نے میرے لیے بہت کچھ بدل دیا۔ یہ کال اس فرح نامی جواں سال لڑکی کی طرف سے تھی جس سے میری ملاقات چند ہفتے پہلے تنویر پاشا کے عشرت کدے پر ہوئی تھی۔ یوں تو پلپلا تنویر پاشا اس عشرت کدے میں راجا اِندر بن کر بیٹھا رہتا تھا تاہم جس رات میں نے اس کے ٹھکانے پر شب خون مارا تھا وہاں صرف دو ہی لڑکیاں موجود تھیں۔ ایک ٹی وی آرٹسٹ جاناں اور دوسری یہ فرح۔ فرح نے اس رات میرے ساتھ کافی تعاون کیا تھا اور اس کے رویے سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ ایک رکھیل کی حیثیت سے پاشا کے خلاف بہت بھری ہوئی ہے۔ فون پر فرح کی آواز سن کر میں بُری طرح چونکا۔ میں نے سب

سے پہلا سوال اس سے یہی کیا۔ ”تمہارے پاس یہ نمبر کیسے آیا؟“

اس نے پہلے معافی مانگی پھر بولی۔ ”جب آپ تنویر پاشا کو دیکھنے دوسرے کمرے میں گئے تھے تو آپ کا فون صوفے پر پڑا ہوا تھا، میں نے اس میں سے نمبر دیکھ لیا۔“

میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں تو صرف دس پندرہ سیکنڈ کے لیے اُٹھا تھا۔“

”میرے لیے یہ دس پندرہ سیکنڈ ہی کافی ثابت ہوئے تھے... اس کے لیے ایک بار پھر آپ سے معذرت چاہتی ہوں۔“

”کیا میں فون کرنے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“

”وجہ صرف یہ ہے کہ آپ مجھے بہت اچھے لگے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”اس کو کوئی غلط معنی نہ پہنایئے گا۔ دراصل میں نے چہرہ شناسی کو بہت اسٹڈی کیا ہے۔ اس حوالے سے باقاعدہ ایک غیر ملکی ڈپلوما ہے میرے پاس۔ بڑا دعویٰ تو نہیں کرتی مگر اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ برے بھلے بندے کی خاص طور سے مردکی پہچان مجھے ہو جاتی ہے۔“

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”اس کے باوجود تم پاشا جیسے کمینے کے چکر میں پھنس گئیں۔ اس کو اپنے اوپر اتنا حاوی کر لیا کہ اس نے نہ صرف تمہاری منگنی تڑوائی بلکہ شادی کے جھوٹے وعدے پر تمہارے ساتھ گناہ کی زندگی بھی گزار رہا ہے۔“

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ”شاہ زیب صاحب! اپنے ساتھ ہونے والے اس حادثے کے بعد تو میرے اندر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں لوگوں کو جانوں، ان کو سمجھوں اور ان کے اندر جھانک کر دیکھوں۔ خاص طور سے مرد ذات کو۔“

میں نے کہا۔ ”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، کیا تم اپنی بات مختصر کر سکتی ہو؟“

وہ بولی۔ ”میرا دل کہتا ہے کہ آپ کو کمزور اور بے بس لوگوں کی مدد کرنا اچھا لگتا ہے اور یہ ہر کسی کے بس کی بات ہوتی بھی نہیں۔ اللہ نے آپ کو ہمت اور جرأت دی ہے اور اس ہمت اور جرأت کے بھروسے پر میں ہاتھ باندھ کر آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں۔“

”تمہیں جو بھی کہنا ہے جلدی کہہ دو۔“

”میں آپ سے صرف اور صرف دس منٹ مانگتی ہوں اور وہ بھی اپنے لیے نہیں کسی اور کے لیے اور میں آپ کو یہ بھی یقین دلاتی ہوں کہ آپ کے یہ دس منٹ ضائع نہیں ہوں گے۔ اگر آپ کو لگے کہ آپ کا وہ وقت ضائع ہوا ہے تو آپ جو جرمانہ کریں جو سزا دیں مجھے قبول ہوگی۔“

فرح کے لہجے میں عجیب سی التجا تھی۔ کوئی ایسی بات تھی جس نے مجھے متاثر کیا۔ نہ جانے کیوں مجھے شک ہوا کہ وہ اپنے ہی جیسی کسی مظلوم عورت کے سلسلے میں مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔

”پلیز... شاہ زیب... پلیز... میری یہ درخواست ٹھکرایئے گا مت۔ میں صرف دس منٹ مانگ رہی ہوں آپ سے۔ اس کے بعد سب کچھ آپ پر چھوڑ دوں گی۔ ایک لفظ بھی نہیں کہوں گی۔“

”تم اس وقت کہاں ہو؟“ میں نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

”لاہور میں ہی ہوں۔ آپ جہاں بھی کہیں، میں زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں پہنچ جاؤں گی۔“

میں بر خصلت پاشا کو اب کافی اچھی طرح جان چکا تھا اور فرح اس کے جور و ستم کا تختۂ مشق بننے والیوں میں سے ایک تھی۔ نہ جانے اب وہ کیا بپتا سنانا چاہتی تھی۔ پاشا کا منحوس چہرہ میری نگاہوں میں گھوما۔ میں نے فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے، میں دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں دے سکوں گا۔ تم شان ریسٹورنٹ، میکلوڈ روڈ پر پہنچ جاؤ لیکن ایک بات پھر ذہن نشین کر لو۔ میں ڈاج دینے والوں کے ساتھ بہت زیادہ اچھا سلوک نہیں کرتا۔ تم اندرونِ شہر میں پاشا کی حجامت ہوتے ہوئے دیکھ ہی چکی ہو کی ٹی وی پر۔“

وہ عجیب جذباتی لہجے میں بولی۔ ”اگر آپ کو مجھ پر ذرا سا بھی شک ہو تو میری کنپٹی پر گولی مار دیجیے گا۔ میں اپنے پرس میں یہ تحریر لکھ کر رکھ لیتی ہوں کہ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے رہی ہوں یا پھر جیسے بھی آپ کہیں، میں آپ کو یقین دلانے کو تیار ہوں۔“

میرے ذہن میں بار بار یہ بات آ رہی تھی کہ شاید فرح سے بات کر کے میں پاشا اور اس کے پشت پناہ شکیل داراب کے بارے میں کچھ اور جان سکوں۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں شان ریسٹورنٹ میں موجود تھا اور چائے کی چسکیاں لیتا ہوا فرح کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے تین چار منٹ سے زیادہ اس کی راہ نہیں دیکھنا پڑی۔ یہ شام پانچ بجے کا وقت تھا۔ ڈائننگ ہال کا مین دروازہ کھلا اور دو لڑکیاں اندر داخل

ہوئیں۔ ان میں سے ایک کو تو میں نے دور ہی سے پہچان لیا، وہ فرح تھی۔ وہ ماڈرن لباس میں تھی اور کوٹ کے نیچے اس نے جینز پہن رکھی تھی۔ دوسری لڑکی مشرقی لباس شلوار قمیص میں تھی۔ اس نے اپنا نصف چہرہ سیاہ رنگ کی شال میں چھپا رکھا تھا۔ وہ کچھ ڈری سہمی بھی دکھائی دیتی تھی۔

ہال میں آکر فرح نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر سیدھی میری طرف آئی۔ دوسری لڑکی نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ میں نے اٹھ کر انہیں ویلکم کہا۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد وہ میرے روبرو بیٹھ گئیں۔ فرح سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ وہ پڑھی لکھی ہوشیار لڑکی تھی مگر ہوس پرست پاشا کے جال میں اس طرح پھنسی ہوئی تھی کہ اس کی ساری صلاحیتیں زیرو ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس نے اپنے حالات سے جیسے سمجھوتا کرلیا تھا بہرحال جو عورتیں ایسے سمجھوتے کرلیتی ہیں، ان کے اندر بھی بغاوت کی چنگاریاں کبھی نہ کبھی تو چمکتی ہی ہیں۔ شاید فرح کے اندر بھی آج کوئی ایسی ہی چنگاری چمکی ہوئی تھی اور وہ اپنے جیسی کسی مظلوم لڑکی کے ساتھ میرے سامنے آن موجود ہوئی تھی۔

"آپ کیسے ہیں؟" فرح نے مجھ سے پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"مجھے آپ کے بارے میں بہت سی باتوں کا پتا چل گیا ہے اور مجھے لگ رہا ہے کہ اس رات میں نے آپ کو پاشا کے بارے میں جو کلیو دیا تھا اس سے کچھ نہ کچھ آپ کو حاصل ہوا ہے۔"

"یہ بات تم کیونکر کہہ رہی ہو؟"

"آج کل پاشا کا خمار کچھ اترا ہوا ہے۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اپنے نوجوان باس شکیل اراب کی طرف سے اس پر کچھ لعنت ملامت بھی ہوئی ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ اس لعنت ملامت کے پیچھے بھی آپ کا ہاتھ ہے۔ شاید اس رات آپ نے پاشا کی جو درگت بنائی تھی اس کی وجہ سے اس کے ستارے گردش میں ہیں۔"

جب فرح بات کررہی تھی اور میں اپنی باری کا انتظار کررہا تھا، میری اچٹتی سی نظر اپنے سامنے بیٹھی لڑکی پر پڑی۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے چادر کے نقاب نے اس کا نصف سے زائد چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ بس آدھی ناک، آدھے سے کم رخسار، آنکھیں اور پیشانی نظر آرہے تھے اور سب سے پہلے مجھے اس کی پیشانی ہی دکھائی دی تھی۔ یوں لگا جیسے بے دھیانی میں، میں نے اپنا ہاتھ ہزاروں وولٹ کے ننگے تار پر رکھ دیا ہو یا پھر کسی نے عقب سے آکر میرے سر پر ایک طاقتور بم پھوڑ دیا ہو۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں لیکن میں یقیناً بے ساختہ اپنی کرسی سے اچھل پڑا تھا۔ میرے سامنے وہی بیٹھی تھی جسے میں نے اس شہر کے گلی کوچوں میں دیوانہ وار ڈھونڈا تھا اور اب تقریباً مایوس ہو کر اس شہر اور ملک کو چھوڑ رہا تھا۔ پچھلے تقریباً ساڑھے تین برس میں، میں نے سیکڑوں بار اس کے بارے میں سوچا تھا اور اس کی تلاش میں اپنے سیل فون کی اسکرین پر نگاہیں دوڑائی تھیں لیکن ان لمحوں میں... کم از کم ان لمحوں میں، میں اس کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا... اور نہ میری نگاہیں اس کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں اور وہ میرے سامنے، مجھ سے صرف دو فٹ کی دوری پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"کک... کیا ہوا؟" فرح نے گھبرا کر پوچھا۔

یہی وقت تھا جب اس نے اپنی گھنیری پلکیں اٹھائیں اور مجھ پر نظر ڈال کر قدرے حیران دکھائی دینے لگی مگر یہ حیرانی مجھے پہچانے جانے کی نہیں تھی۔ یہ ویسی ہی حیرانی تھی جیسی فرح کو ہوئی تھی۔ فرح کی حیرانی یہ تھی کہ میں کس بری طرح کیوں چونکا ہوں۔

"کیا بات ہے شاہ زیب؟ کیا آپ... میرا مطلب ہے آپ اس کو پہلے سے جانتے ہیں؟" فرح نے پوچھا۔

"نہیں... ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ہاں... ان کی شکل... کسی سے بہت زیادہ ملتی ہے اور میں اسے جانتا تھا۔ کہیں لاہور میں ملاقات ہوئی تھی۔" میں نے بات بنائی۔

"یہ بے چاری تو کبھی لاہور آئی ہی نہیں۔ بڑے دور دراز گاؤں کی رہنے والی ہے۔ گوجرانوالہ سے آگے جائیں تو ڈسکہ کی طرف ان کا گاؤں آتا ہے، چاند گڑھی۔ صرف خاص مجھ سے ملنے کے لیے بے چاری اتنا لمبا سفر کرکے آئی ہے۔ یہاں لاہور میں اس کی ایک بہن بیاہی ہوئی ہے اس کے پاس ٹھہری ہے..."

فرح باتیں کررہی تھی اور مجھے اس کی آواز جیسے کہیں بہت فاصلے سے آتی محسوس ہوتی تھی۔ اردگرد کے مناظر میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ یہ سو فیصد وہی تھی۔ کیا وہ بھی مجھے پہچان پائی تھی؟ ساڑھے تین سال پہلے جب میں اس سے ملا تھا تو میرا حلیہ بالکل اور تھا۔ لمبے بال، مونچھیں، داڑھی۔ اب میں ایک صاف ستھرا کلین شیو نوجوان تھا۔ میری ڈریسنگ بھی بہت مختلف تھی۔

میری زبان پر بے ساختہ وہ سوال آگیا جو برسوں سے مجھے پریشان کررہا تھا۔ میں نے کہا۔ "ان کا نام؟"

"تاجور... تاجاں بھی کہتے ہیں۔" فرح نے جواب

دیا۔ ''دوردراز گاؤں میں رہنے کے باوجود اس نے میٹرک کیا ہوا ہے۔ آگے پڑھنے کا ارادہ بھی رکھتی تھی مگر اس کے حالات... بہت بری طرح پھنسی ہوئی ہے یہ۔ اسے مدد کی ضرورت ہے۔ کسی درد مند شخص کی مدد کی ضرورت ہے۔''

میں فرح کی باتیں ضرور سن رہا تھا لیکن میرے کانوں میں فقط تاجور کا لفظ ہی گونج رہا تھا۔ کتنا جانا پہچانا لگتا تھا یہ نام... جیسے میرے کانوں تک پہنچنے سے پہلے ہی یہ میری روح میں بسا ہوا تھا۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں محبوب کی ذات سے وابستہ ہر چیز پیاری ہو جاتی ہے۔ چاہے وہ کیسی بھی ہو۔ میں اس نام کا مطلب نہیں جانتا تھا۔ شاید ابھی درست طور پر اس کا تلفظ بھی ادا نہیں کر سکتا تھا لیکن یہ مجھے پیارا ہو گیا تھا۔

میں نے اپنی بے تاب سانس اندر کی طرف کھینچی۔ یہ وہی تھی، سوندھی سوندھی سی۔ اس کے تن کی بھینی بھینی مہک سانس کے راستے میرے اندر اتری اور اس مہک نے سارے تن بدن جیسے اپنی غیر مرئی انگلیوں سے میرے دل کے تاروں کو چھیڑا۔

فرح کہہ رہی تھی۔ ''مجھے چہرہ شناسی کا کوئی بہت بڑا دعویٰ تو نہیں لیکن جتنا تھوڑا بہت میرے پاس ہے... میرا دل کہتا ہے کہ مظلوم عورت ذات کے لیے آپ کے دل میں بہت ہمدردی ہے ورنہ آپ ان لوگوں میں سے نہیں جو صرف ہمدردی رکھتے ہیں۔ آپ اپنی ہمدردی کو عملی شکل بھی دے سکتے ہیں۔ صرف چند منٹ میں آپ اس لڑکی کی مختصر کہانی سن لیجیے۔ اس کے بعد اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس کے لیے کچھ کریں۔ میں آپ سے مزید اصرار نہیں کروں گی۔''

''مجھے لگتا ہے فرح بی بی تم نے مجھ سے بہت زیادہ ہی توقعات لگا لی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم یہ سب کچھ کیوں کہہ رہی ہو؟ میری کچھ مصروفیات ہیں اور میں ان میں سے بمشکل وقت نکال کر یہاں آیا ہوں۔'' میں نے جان بوجھ کر بے پروائی ظاہر کی۔ میں فرح کا اور فرح سے زیادہ اس لڑکی کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ ورنہ میرے دل کے اندر جو اتھل پتھل ہو رہی تھی اس کا حال مجھے ہی معلوم تھا۔

فرح نے عاجزی سے کہا۔ ''آپ کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں شاہ زیب۔ اگر آپ کے پاس وقت نہیں تو آپ اپنے کسی دوست یا ساتھی کی ڈیوٹی لگا دیں۔ وہ کم از کم ایک بار اس کے ساتھ اس کے گاؤں جائے اور دیکھے کہ وہاں کتنے عجیب حالات ہیں۔ میں تو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی ہوں۔ اس اکیسویں صدی میں بھی ایسے ہو...

لوگوں کے سامنے اس طرح کے تماشے لگائے جاتے ہیں...''

پھر وہ تاجور سے مخاطب ہوکر بولی۔ ''تاجاں! اب کیوں منہ کو تالا لگا کر بیٹھی ہوئی ہو۔ بولو نا... بتاؤ نا شاہ زیب صاحب کو، کیا ہو رہا ہے تمہارے ساتھ۔''

وہ بس اپنی انگلیاں مروڑ کر رہ گئی۔ اس کی گلابی چادر نے اس کا نصف سے زیادہ چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ ایک آنکھ، ایک رخسار اور ایک کان دکھائی دے رہا تھا۔ وہی شیشے جیسی شفاف جلد جس کے نیچے دوڑتا ہوا خون بھی جھلک دکھا جاتا تھا۔ ہاں بالوں کی وہ دو لٹیں نظر نہیں آرہی تھیں جو اس چہرے کو ایک شاہکار تصویر کا روپ دیتی تھیں۔

فرح اسے اپنی کہانی سنانے کو کہہ رہی تھی اور یہی کہانی تھی جسے سننے کے لیے میں عرصے سے بے قرار تھا۔ یہ جاننے کے لیے میری سماعت ترس گئی تھی کہ وہ کون تھی؟ کس کی بیٹی تھی یا اس کے دیگر کوائف کیا تھے؟ وہ کن حالات سے گزر رہی تھی؟

مجھے اس کی ایک آنکھ ہی دکھائی دے رہی تھی اور ایک کی پلک اور یہ پلک لرز رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ یہ پلک اٹھے، وہ میری طرف دیکھے اور میں جان سکوں کہ جس طرح میں نے اسے پہچانا ہے وہ بھی پہچان سکی ہے یا نہیں۔ آثار یہی بتا رہے تھے کہ اس نے نہیں پہچانا۔

جب فرح نے دیکھا کہ وہ کوشش کے باوجود کچھ بول نہیں پارہی تو اس نے ایک لمبی سانس لی اور یہ ذمے داری خود پر لے لی۔ وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔ ''شاہ زیب صاحب آپ نے ظالم شوہروں کے بارے میں تو سنا ہوگا لیکن ظالم منگیتروں کے بارے میں شاید کم ہی سنا ہو۔ منگنی کا دور تو ایک ایسا دور ہوتا ہے جب دونوں فریق ایک دوسرے کو اپنے مزاج کا بہترین رخ دکھاتے ہیں مگر یہاں تاجاں کا واسطہ ایک ایسے کرخت بے رحم منگیتر سے پڑا ہوا ہے جس نے شادی سے پہلے ہی اس بے چاری کی زندگی حرام کرکے رکھ دی ہے۔ سچ پوچھیں شاہ زیب تو یہ بچی گھٹ گھٹ کے مر رہی ہے۔ بس اس کی ہمت ہے جو ایسے برے حالات میں بھی سانس لیتی جارہی ہے۔'' فرح کی آواز بھرا گئی۔

''اس کے گاؤں کا ہی بندہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''گاؤں کا ہی ہے بلکہ سگے ماموں کا بیٹا ہے۔ پورے خاندان پر دہشت بٹھائی ہوئی ہے اس نے۔ کوئی اس کے سامنے بولتا ہی نہیں۔ کافی سال پہلے اس کے باپ نے پسند کی لڑکی سے شادی نہ ہونے پر اسے گولیاں مار کر شدید زخمی کردیا تھا اور لڑکی چند ماہ بعد زخم خراب ہوجانے سے مر گئی تھی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ خون خرابے کے جراثیم اس بندے کو وراثت میں ملے ہوئے ہیں اور شاید اسی وجہ سے خاندان والے اس سے ڈرتے بھی ہیں۔''

''تاجاں کے ماں باپ کیا کہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ان بے چاروں نے کیا کہنا ہے۔ باپ دمے کا پرانا مریض ہے۔ تاجاں کے دو بھائی ہیں۔ دونوں اس سے چھوٹے ہیں۔ بڑے کی عمر مشکل سے اب چودہ پندرہ سال ہوئی ہوگی۔ تاجاں سے بڑی دو بہنیں ہیں۔ دونوں بیاہی ہوئی ہیں۔ ایک وہیں ڈسکے کے پاس دوسری یہاں لاہور میں۔''

''تاجاں تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟'' میں نے اسے گفتگو میں شامل کرنے کی کوشش کی۔

اس نے پھر ہاتھوں کی انگلیاں مروڑیں اور بس اتنا ہی کہہ سکی۔ ''زمین ہے۔''

بھولی بسری آواز کانوں سے ٹکرائی اور دل کے تار پھر بج اٹھے۔

اس نے نامکمل جواب دیا تھا۔ فرح نے اسے گھور کر دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہوکر بولی۔ ''شاہ زیب! ان کی تین مربعے کی زمین ہے مگر والد دین محمد چونکہ خود بیمار رہتے ہیں اس لیے صحیح طرح کاشت وغیرہ نہیں ہوتی۔ زیادہ تر ملازم ہی کھا پی جاتے ہیں۔ بھائی بے چارے ابھی چھوٹے ہیں، پڑھ رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''فرح! تمہاری باتوں سے پتا چلتا ہے کہ تاجاں وہاں شادی کرنا نہیں چاہتی۔ اگر یہ شادی کرنا نہیں چاہتی تو پھر تو یہ سیدھا سادہ معاملہ ہے۔ رشتے دار اس کی مدد کرسکتے ہیں اور اگر وہ نہیں تو گاؤں کی پنچایت ہوتی ہے، پھر کتنا بھی دور دراز گاؤں ہے وہاں پولیس وغیرہ کا وجود بھی ہوگا... اس کے ساتھ زبردستی کیسے کی جاسکتی ہے؟''

''سب کچھ ہے شاہ زیب لیکن انصاف نہیں ہے۔ آپ نے خود دیکھا ہے اگر شہروں میں یہ حال ہے تو دیہات اور قصبوں وغیرہ میں کیا ہوگا۔ میں پھر آپ سے درخواست کرتی ہوں، اللہ نے آپ کو ہمت دی ہے اور کمزوروں کی مدد کا جذبہ بھی دیا ہے۔ آپ صرف ایک بار تاجاں کے گاؤں میں جاکر وہاں کے حالات دیکھیں اور اگر خود نہیں

جاسکتے تو اپنے کسی اعتبار کے آدمی کو بھیج دیں اور وہ دیکھیں کہ وہاں کچھ لوگ کس طرح اس بے چاری کے گرد گھیرا تنگ کررہے ہیں۔“

”گھیرا تنگ کررہے ہیں... میں سمجھا نہیں؟“

”آپ کو پتا ہی ہوگا ہمارے دیہاتوں میں جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈا کس قدر عام ہے۔ اب تو اس کے بارے میں سن سن کر کان پک گئے ہیں۔ تاجاں کے گاؤں میں بھی اسی طرح کے حالات ہیں۔ پیر ولایت نامی ایک بندہ وہاں روحانیت کا ٹھیکیدار بن کر بیٹھا ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ تاجاں کے منگیتر اسحاق نے اس پیر ولایت سے یاری گانٹھی ہوئی ہے۔ پیر ولایت اس کے کہنے پر تاجاں کے خاندان والوں کو ڈراتا دھمکاتا ہے اور مجبور کرتا ہے کہ وہ تاجاں اور اسحاق کے رشتے میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔ خاندان میں دو چار گھر ایسے تھے جو اس جھگڑے میں تاجاں اور اس کے والدین کی حمایت کررہے تھے اور چاہتے تھے کہ تاجاں جیسی کڑی اسحاق عرف ساتے جیسے اوفر کے پے نہ بندھے مگر ان سب لوگوں کو چپ ہوتا پڑا کیونکہ ان کے ساتھ کچھ ایسے واقعات ہوئے جنھوں نے انہیں ڈرادیا۔ ایک گھر میں تو شاید اتفاقاً ہی ایک بارہ تیرہ سالہ نابینا لڑکی کی موت ہوگئی۔ ایک گھر میں دو افراد بری طرح بیمار ہوئے، انہیں خون کی الٹیاں آئیں اور انہیں گوجرانوالہ کے اسپتال میں پہنچانا پڑا۔ ایک گھر میں آگ لگ گئی اور آگ لگنے سے کچھ دن پہلے دیواروں پر خون کے چھینٹے نظر آتے رہے۔“

”ہاں اس طرح کے شعبدوں کے بارے میں تو میں نے بھی سنا ہے۔“ میں نے کہا۔

فرح بولی۔ ”پورے گاؤں میں جو دو تین بندے اب بھی اس بات کے حامی تھے کہ تاجاں کی مرضی کے بغیر یہ شادی نہیں ہونی چاہیے، ان میں سے ایک مسجد کے امام صاحب تھے وہ بہت کھل کر یہ بات کرتے تھے کہ ایسی شادی ناجائز ہوتی ہے۔ دو تین مہینے پہلے ہونے والی پنچائیت میں بھی انہوں نے کھل کر یہ بات کہی تھی۔ پچھلے دنوں امام صاحب نے دوسری شادی کی ہے۔ سنا ہے کہ اس شادی کا سارا خرچہ اسحاق کے ایک زمیندار دوست عالمگیر نے کیا تھا۔ اب دو مہینے پہلے اس نے امام صاحب کو مدرسہ بنانے کے لیے اپنی کچھ زمین بھی مفت دی ہے۔ کوئی دس بارہ مرلے جگہ ہے۔ اس کے بعد سے امام صاحب کا رویہ بھی بالکل بدل گیا ہے اور وہ بھی یہ بات کہنے لگے ہیں کہ فساد سے بچنے کے لیے تاجاں کے والدین کو یہ آٹھ دس سال پرانا رشتہ توڑنا نہیں چاہیے۔“

میں نے ایک بار پھر تاجاں کو گفتگو میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے کہا۔ ”تاجاں! تمہارا کیا خیال ہے۔ مولوی صاحب کی رائے بدلنے کی وجہ وہی ہے جو فرح نے بتائی ہے یعنی روپیا اور زمین وغیرہ؟“

وہ ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی اور اس مرتبہ سر ہلانے سے وہ دو تین لٹیں بھی ڈھلک کر پیشانی پر آگئیں جن کی جھلک دیکھنے کا میں شدت سے منتظر تھا۔

فرح نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اس میں کوئی شک ہی نہیں ہے۔ اب دیکھیں یہ مولوی صاحب بھی وہی بات کہہ رہے ہیں جو اس سے پہلے پیر ولایت کہتا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ تاجاں کے گھر پر نحوست کے سائے ہیں۔ پچھلے جمعے انہوں نے تاجاں کے والد کو بلایا اور اسے کچھ عجیب سی باتیں بتائیں۔ انہوں نے کہا... دو عورتیں ہیں جو ہر وقت تمہاری بیٹی تاجاں کا پیچھا کرتی ہیں۔ بالکل سیاہ رنگ والی بدصورت عورتیں ہیں۔ عام آنکھ سے نظر نہیں آتیں لیکن وہ ہیں۔ وہ کسی بھی وقت تاجاں کے ساتھ کچھ کرسکتی ہیں۔ اس کی شادی جلدی ہونی چاہیے۔ اس دن کے بعد سے تاجاں کے والد دین محمد شدید بخار میں ہیں۔ غشی کی حالت میں پتا نہیں کیا کیا بولتے رہتے ہیں۔ یہ دو عورتوں والی بات کچھ عرصہ پہلے اس فراڈ پیر ولایت نے بھی کی تھی... اب بتائیں اس میں کیا شک ہے کہ مولوی صاحب بھی اپنا پرانا موقف چھوڑ کر اس کوشش میں لگ گئے ہیں کہ تاجاں اور اس کے گھر والے ساتے کی مرضی کے سامنے سر جھکادیں۔“

وہ بول رہی تھی اور میں سن رہا تھا۔ یہ سارا معاملہ کسی اور لڑکی کا ہوتا اور فرح مدد کے لیے میرے پاس آتی تو شاید میں کبھی مثبت جواب نہ دیتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کرتا کہ ان دونوں کا رابطہ اپنے خالہ زاد ایڈووکیٹ عبداللہ سے کروادیتا کہ وہ ان کی دادرسی کی کوشش کرے مگر یہاں تو صورتِ حال ہی کچھ اور تھی۔ ابھی تو میں لاہور سے روانہ نہیں ہوا تھا۔ میں کوپن ہیگن کی فلائٹ پر سوار ہوتے وقت بھی تاجاں کو دیکھ لیتا تو ٹکٹ پھاڑ کر پھینک دیتا اور واپسی کینسل کروادیتا۔

بہرحال میں نے اپنے جذبات اور احساسات چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیے اور بڑے تحمل سے مختلف سوالات کرتا رہا۔ میرے ذہن میں جیسے ایک آندھی سی چل رہی تھی۔

ایک موقع پر میں نے کہا۔ ”فرح! بالفرض میں

تاجاں کے ساتھ اس کے گاؤں جانے کی ہامی بھر بھی لیتا ہوں تو کیا ہوگا؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں دو چار گھنٹے یا ایک دو دن میں سارے حالات کو سمجھ لوں اور پھر اس کے لیے کچھ کر بھی سکوں۔ مجھے وہاں رہنا پڑے گا۔ کہیں رہنا پڑے گا اور اس کے لیے کوئی جواز تو ہونا چاہیے ہوگا۔''

تاجو یعنی تاجاں نے ایک دم اپنی جھکی ہوئی گردن اٹھائی۔ شال سر سے ڈھلک گئی۔ وہ بالکل کسی الھڑ دیہاتی مٹیار کی طرح بولی۔ ''میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے جی... بالکل ٹھیک رہے گی۔''

میں اور فرح حیران ہوکر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اسے فوراً ہی احساس ہوا کہ وہ بلند آواز میں اور چہک کر بولی ہے۔ وہ ایک دم خاموش سی ہوگئی، اس نے شال اپنے سر پر درست کی اور گردن پھر اداس بکری کی طرح جھکالی۔ میں زیرِلب مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

فرح نے اسے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بولو، کیا بتانا چاہ رہی تھی؟''

اس نے منمنا کر اور رک رک کر جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس کے والد دین محمد کو ایک ٹریکٹر چلانے والے کی سخت ضرورت ہے، ایسا بندہ جو ٹریکٹر چلا سکے بلکہ بوقتِ ضرورت اس کی مرمت وغیرہ بھی کر سکے۔ تاجاں نے اشارہ دیا کہ اگر میں ٹریکٹر چلا سکتا ہوں اور انجن کی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ بھی رکھتا ہوں تو بات بن سکتی ہے۔ اگر ایسا بندہ پانچ چھ ہزار روپے تنخواہ پر مل جائے تو ابا جی اسے فوراً رکھ لیں گے۔''

''کوئی گارنٹی وغیرہ نہیں مانگیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''گارنٹی میں دے دوں گی۔'' فرح نے فوراً کہا۔ ''اور وہ قبول بھی کریں گے۔''

میں نے سگریٹ سلگانے کی ضرورت محسوس کی لیکن میرے پاس سگریٹ نہیں تھی اور ہوتی بھی تو میں اس حسین چہرے کے سامنے اس طرح کا کثیف عمل نہ کرتا۔ میں نے کہا۔ ''لباس بدل کر اور اپنی چال ڈھال تبدیل کر کے ٹریکٹر ڈرائیور کا روپ تو دھارا جا سکتا ہے تاجاں لیکن میں پنجابی روانی سے نہیں بول سکتا بلکہ جب اردو بولتا ہوں تو اس میں بھی کہیں کہیں انگریزی کے لفظ بول جاتا ہوں۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' فرح نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنے محبوب کے چہرے پر مایوسی کا سایہ سا لہراتے دیکھا، دل پر جیسے ایک ضرب لگی۔ میں نے کہا۔ ''ایک طریقہ ہوسکتا ہے، میں کچھ بولوں ہی نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' فرح نے پوچھا۔

''اوں آں... اوں آں۔'' میں نے کسی گونگے کی طرح ایکسپریشن دیے اور مسکرانے لگا۔

''ہاں یہ بھی ہوسکتا ہے۔'' فرح نے فوراً تائید کی۔ وہ جیسے اپنے طور پر یہ طے کر چکی تھی کہ اگر میں نے اس کی سہیلی کی مدد کی ہامی بھر لی تو پھر اس کے مسائل اگر پہاڑوں جیسے بھی ہیں تو ریزہ ریزہ ہوکر ہوا میں تحلیل ہوجائیں گے۔ پتا نہیں اگر یہ اس کی چہرہ شناسی تھی یا پھر اس رات تنویر یا شا اینڈ کمپنی کی یادگار درگت دیکھنے کے بعد وہ میرے دم خم کی پرستار اور معتقد ہوگئی تھی۔

اس نے تاجاں کے گاؤں کا نام چاند گڑھی بتایا تھا۔ فرح کے بیان کے مطابق چاند گڑھی لاہور سے ڈیڑھ سو کلومیٹر دور تھا۔ اگر یہ گاؤں ڈیڑھ ہزار کلومیٹر دور بھی ہوتا تو میں سر کے بل وہاں جانے کو تیار تھا، یہ اور بات ہے کہ میں ظاہر کچھ نہیں کر رہا تھا۔ فرح نہیں جانتی تھی کہ میں ایک دن بعد یہاں سے جا رہا ہوں۔ اگر وہ جانتی ہوتی تو شاید تاجاں کی مدد کے لیے اتنی شدت سے اصرار ہی نہ کرتی۔ بہرحال میرے لیے یہ...... سفر اسی وقت بے معنی ہوگیا تھا جب میں نے اپنے محبوب چہرے کی پہلی جھلک دیکھی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تاجاں کو دیکھنے کے فوراً بعد میرے لیے ڈنمارک والا چیپٹر کلوز ہوگیا تھا۔ اب 28 گھنٹے بعد عارف کو لاہور سے اکیلے ہی فلائی کرنا تھا۔ میں کہیں نہیں جا رہا تھا۔ میں کہیں جا ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے ڈور کا دوسرا سرا مل گیا تھا اور یہ ڈور مجھے جس طرف کھینچ رہی تھی، مجھے اسی طرف محوِ پرواز ہونا تھا۔

☆☆☆

میں اور رائق دونوں دیہاتی لباس میں تھے۔ شلوار قمیص اور لنڈے کے کوٹ۔ پاؤں میں گرگابیاں اور میرے گلے میں ایک رنگ دار مفلر بھی تھا۔ ہم ایک دیہاتی کھٹارا بس میں سے اترے۔ یہ ایک تنگ سڑک کا چھوٹا سا بازار تھا۔ چند خوانچہ فروش، چند دکاندار جنہوں نے کپڑوں کے سائبان تان رکھے تھے۔ مٹھائیوں پر منڈلاتی ہوئی گرد، کچے پکے برتنوں کی دکان، موٹر سائیکل مکینک کی خستہ حال دکان، ڈیزل کا ڈپو اور اس کے سامنے بہت سے رنگ برنگے ڈرم۔ ہمارے اردگرد بس اسی طرح کے مناظر تھے۔ نہر کے ساتھ ساتھ ایک کچا ناہموار راستہ دور کہیں کیکر

اور شیشم کے درختوں میں گم ہوجاتا تھا۔ اس راستے پر دودھ کے برتنوں سے لدا ہوا ایک ریڑھا ہچکولے کھاتا ہوا گزر رہا تھا۔ چند تانگے بس اسٹاپ پر موجود تھے۔ ان کے پہیے کیچڑ میں تھڑے ہوئے تھے۔ تانگا بان آوازیں دے رہے تھے۔ ڈارا پور... چاند گڑھی... چاند گڑھی۔''

میں اور انیق ایک تانگے کی پچھلی نشست پر جا بیٹھے۔ چاند گڑھی کا کرایہ بیس روپے فی سواری تھا۔ تانگا بان کے تیور بتا رہے تھے کہ اس میں رعایت کی کوئی گنجائش نہیں۔ تانگا بان نے ہم پر کوئی خاص توجہ نہیں دی، بلکہ اردگرد موجود کسی نے بھی ہمیں قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ ہمارے حلیے تقریباً مقامی لوگوں جیسے ہی تھے بلکہ مقامی کھیت مزدوروں جیسے۔ تانگے میں موجود ایک شخص نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کہاں سے آئے ہو جوانا؟''

میں نے انگلی سے اپنے بند ہونٹوں کو چھوا اور انکار میں سر ہلایا۔ انیق نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ گونگا ہے چاچا جی۔''

''کہاں جا رہے ہو؟''

''بس جی روزی روٹی کی تلاش ہے۔'' انیق نے کہا۔

''کہاں پر تلاش ہے؟'' اس نے ذرا زور دے کر پوچھا۔

''دین محمد صاحب کے ڈیرے پر جانا ہے جی، انہوں نے کام کے لیے بلایا ہے۔'' دین محمد کا نام سن کر ادھیڑ عمر شخص کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمودار ہوئے اور وہ منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔

تانگا بان نے بھی مڑ کر ہماری طرف دیکھا اور مجھے اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب نظر آئی۔ باقی کا سفر تقریباً خاموشی سے ہی طے ہوا۔ تانگے میں موجود لوگ آپس میں بات کرتے رہے لیکن ہم دونوں کو کسی نے گفتگو کے قابل نہیں سمجھا۔ ان لوگوں کی زیادہ تر گفتگو فصل، کھاد، بارش اور مقامی لڑائی جھگڑوں کے بارے میں تھی۔ اس گفتگو میں مولوی فدا محمد کی شادی کا ذکر بھی آیا۔ پتا چلا کہ مولوی صاحب کی عمر چالیس کے قریب ہے، انہوں نے ایک چوبیس پچیس سال کی لڑکی سے شادی کی ہے۔ ایک شخص نے اس شادی پر ناک بھوں چڑھائی۔ دوسرے نے کہا۔

''بھائی شادی ہی کی ہے نا، کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ شرعی کام میں کیڑے نکالنے والے ہم کون ہوتے ہیں۔''

معلوم ہوا کہ اس سلسلے میں گاؤں کے اندر دو رائے تھیں۔

چاند گڑھی گاؤں میں قریباً پچاس فیصد مکان کچے تھے۔ ٹیوب ویلز کے ساتھ ساتھ ہمیں دو تین کنوئیں بھی دکھائی دیے۔ ایک کنواں دو گھوڑوں کے ذریعے چلایا جا رہا تھا۔ بجلی کے تار تو نظر آ رہے تھے لیکن پتا نہیں بجلی یہاں پہنچتی بھی تھی یا نہیں۔ بہر حال موبائل فون یہاں بھی کسی نہ کسی کے ہاتھ میں دکھائی دے جاتا تھا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔

تانگے سے اتر کر ہم کچھ فاصلے تک پیدل چلے اور پھر دین محمد کے چھوٹے سے ڈیرے پر پہنچے۔ یہاں ٹیوب ویل اور ایک خستہ حال ٹریکٹر دور ہی سے نظر آ رہے تھے۔ ڈیرے کے اردگرد زمین کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ دو تین کھیت تو ویسے ہی خالی پڑے تھے اور ان میں جڑی بوٹیاں سر ابھار رہی تھیں۔ دین محمد صاحب ڈیرے پر ہی تھے، ان کی عمر پچپن سے اوپر رہی ہوگی۔ کمزور جسم پر سفید قمیص اور تہبند باندھ رکھا تھا، سر پر سفید پگڑی تھی۔ انہوں نے مجھے سر تا پا دیکھا پھر میرے سوٹ کیس اور بستر کو دیکھا۔ تب انیق سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''یہ گونگا ہے؟''

''جی ہاں لیکن بندہ کاریگر ہے، گاڑی کے پرانے انجن میں بھی نئی جان ڈال دیتا ہے۔''

''پر یہاں گاڑی تو نہیں ٹریکٹر ہے۔''

''ٹریکٹر ہو یا بلڈوزر یا کوئی اس سے بھی بڑی شے جی۔ ایک دم ماسٹر ہے ان کاموں میں۔ بس قسمت کا مارا ہے، آج کل کوئی کام شام نہیں ہے اس کے پاس۔''

دین محمد نے حقہ گڑگڑایا اور کہا۔ ''میں نے ٹیلی فون پر فرح بی بی کو بتا دیا تھا، میں چار ہزار سے زیادہ نہیں دے سکوں گا اور وہ بھی اس کا کام دیکھنے کے بعد۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔''

''اور خیر سے تم کس مرض کی دوا ہو؟'' دین محمد نے انیق سے پوچھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھے اور عاجزی سے بولا۔ ''نوکر کیا اور نخرا کیا، جناب، آپ جو حکم دیں گے کر لوں گا، چارا کاٹنے سے بھینسیں نہلانے تک ہر کام پر حاضر جناب ہوں جی۔''

''کوئی تجربہ بھی ہے؟''

''معافی چاہتا ہوں جی، بھینسیں نہلانے میں کیا تجربہ ہوتا ہے۔ بس اس کی گیلی پوشل سے ہی بچنا ہوتا ہے نا۔''

''گیلی پوشل سے بھی اور اس کے سینگوں سے بھی۔'' دین محمد نے کہا اور اس کے پاس بیٹھے ہوئے دو افراد مسکرانے لگے۔ دین محمد نے بھی مسکرا کر انیق کو دیکھا پھر

ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”اور گردوسی کی بات پر دھیان نہیں دینا بس اپنے کام سے کام رکھنا ہے۔ تم دونوں یہاں صرف مزدوری کے لیے آئے ہو، اپنے اس ساتھی کو بھی سمجھا دو۔“ دین محمد نے میری طرف اشارہ کیا۔

ہم دونوں کو دین محمد کے ملازم نے ایک کمرا دکھا دیا۔ یہ کچی چھت والی ایک ڈھارا نما جگہ تھی۔ تین خالی چارپائیاں پڑی تھیں۔ ہم نے اپنے بستر اور دیگر سامان یہاں رکھ دیا۔ ملازم کا نام سولنگی تھا، اس نے انیق کو بتایا کہ دو وقت کا کھانا ملے گا۔ اگر دوپہر کو کھانے کی عادت ہے تو پھر اپنے پیسے سے کھانا پڑے گا۔ سولنگی کے بازو پر کوئی چوٹ لگی ہوئی تھی اور اس نے پٹی باندھ رکھی تھی۔

بجلی یہاں تحفے کے طور پر بس ایک دو گھنٹے کے لیے آتی تھی۔ رات کو جب ہم لالٹین کی روشنی میں لحاف اوڑھے بیٹھے اور گاؤں کی ایک خاموش شب کو دھیرے دھیرے سرکتے دیکھ رہے تھے، سولنگی ہمارے لیے کھانا لے آیا۔ یہ دال کریلے اور خمیری روٹی پر مشتمل تھا۔ ساتھ میں سوجی کا حلوہ تھا۔ اس کھانے نے جو لطف دیا اس نے کوپن ہیگن، روم اور لندن کے عالیشان ہوٹل میں کھائے ہوئے ڈنرز کو پیچھے چھوڑ دیا اور کھانے سے بھی بڑھ کر کھانے کا ماحول تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی، کھڑکیوں سے باہر ہلکی دھند، مٹی کی انگیٹھی میں اپلوں کی آگ، دور کھیتوں میں چلتے ہوئے کسی ٹریکٹر کی مدھم آواز۔ یہ سب کچھ میرے لیے نیا تھا اور نہایت حیران کن بھی۔ میں پاکستان کا یہ رخ شاید پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ شہر کی حبس زدہ مشینی زندگی اور یہاں کے خاموش پُرسکون رہن سہن میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ سولنگی نے انیق سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ ”چاچا دین محمد کی بیٹی کو ہم سب نکی بھین (چھوٹی بہن) کہتے ہیں۔ اللہ اس کی عمر لمبی کرے بہت ہمدرد ہے۔ ہم ملازموں، مزدوروں کا بڑا خیال رکھتی ہے۔ مہینے میں دو چار بار اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر یہاں ڈیرے پر بھجواتی ہے، آج بھی شاید اس نے ہی پکایا ہے۔“

ایک دم مجھے لگا کہ کھانے کا لطف کئی گنا بڑھ گیا ہو۔ میں نے روٹی کا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے سوچا۔ ”کیا واقعی اسے تاجور کے ہاتھ لگے ہوں گے؟“

تاجور یعنی تاجور کو یقیناً پتا چل گیا تھا کہ ہم یہاں آچکے ہیں لیکن ابھی تک اس کی جھلک نظر نہیں آئی تھی حالانکہ دین محمد کا گھر ڈیرے سے بہت زیادہ دور نہیں تھا۔ درمیان میں صرف تین چار کھیت ہی پڑے تھے۔ میرا ذہن ابھی تک یہ معما حل کرنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ جس طرح میں نے تاجور کو پہچانا ہے کیا وہ بھی مجھے پہچان چکی ہے یا نہیں یا پھر پہچان کر انجان بنی ہوئی ہے۔

کھانے کے کچھ دیر بعد دودھ پتی آگئی۔ خالص دیہاتی دودھ کی یہ دودھ پتی، ان چاکلیٹس ڈرنکس اور ہاٹ سیرپس سے بہت جدا چیز تھی جو اب تک میرے ہونٹوں تک پہنچتے رہے تھے۔ کیا یہ بھی اس نے بنائی ہوگی، اس کے ہاتھوں نے ان پیالیوں کو چھوا ہوگا یا شاید یہ کسی اور نے بنائی ہو لیکن یہ اس کے گھر سے تو آئی تھی۔

اس دوران میں ایک بڑے دلچسپ کردار سے ہماری ملاقات ہوئی۔ رات کے قریباً دس بجے تھے جب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ سولنگی نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک تنومند جسیم پہلوان نما شخص کھڑا تھا۔ گھنی مونچھیں، چھوٹا سر اور بڑا چہرہ۔ اس نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی لیکن وہ پنجابی نہیں لگتا تھا۔ بعدازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ ذات کا میو تھا اور اس کا پورا نام حشمت میو راہی تھا۔ وہ روانی سے اردو بولتا تھا اور پہلوانی کے علاوہ ہڈیوں کا علاج بھی کرلیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ہمارے کمرے کے ساتھی سولنگی کا ٹوٹا ہوا بازو دیکھنے آیا تھا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس کا انداز اتنا رازداری کا کیوں ہے جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ سولنگی دور سے حشمت راہی کا تعلق دار بھی تھا۔ وہ سولنگی کے ٹوٹے ہوئے بازو کی مرہم پٹی کرنا چاہتا تھا مگر سولنگی چونکہ دین محمد کا ملازم تھا اور دین محمد کا حقہ پانی گاؤں کے لوگوں نے تقریباً بند کر رکھا تھا لہٰذا حشمت رات کے وقت چوری چھپے اسے دیکھنے آیا تھا۔

حشمت نے ہم دونوں کو قدرے حیرت سے دیکھا۔ سولنگی نے ہمارا تعارف کرواتے ہوئے بتایا، اس کا نام شاہ زیب ہے، یہ ٹریکٹر چلاتا ہے اور مرمت بھی کرتا ہے اور یہ اس کا ساتھی انیق ہے، یہ کھیتوں میں کام کرے گا۔“

حشمت نے دھیان سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”اسے کام شام بھی جانتا ہے یا پھر ہینڈل گھمانا ہی آوت ہے؟“

سولنگی نے کہا۔ ”یہ بول نہیں سکتا پہلوان ویسے کام کا پکا ہے۔“

”چلو ہاتھ کنگن کو آرسی کیا جب کام شروع کرے گا تو پتا چل جاوے گا۔“

حشمت نے سولنگی کے بازو کی پٹی کھولی، تھوڑی سی مالش کی اور نئی پٹی باندھ دی۔ معلوم ہوا کہ سولنگی بانس کی سیڑھی سے گر پڑا تھا۔ پہلوان تقریباً آدھا گھنٹا وہاں رکا۔

اندازہ ہوا کہ وہ دلچسپ شخصیت کا مالک ہے، غصے کا ذرا تیز تھا لیکن فطری طور پر ہمدرد لگتا تھا۔ اپنی گفتگو میں اونگیاں بونگیاں بھی مارتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ پاکستان میں جتنے ڈاکٹر اور سرجن ہیں ان کو کسی بحری جہاز میں بٹھا کر سمندر میں ڈبو دینا چاہیے۔ خاص طور سے سرکاری اسپتالوں کے ڈاکٹروں کو کیونکہ وہ اپنے گندے اوزاروں سے لوگوں کی زندگیاں تباہ کر رہے ہیں اور انہیں معذور کر رہے ہیں۔ اس کے خیال میں دیسی طریقے سے بہتر کوئی علاج نہیں تھا اور اس کا خاندان کئی نسلوں سے یہی کام کر رہا تھا۔ اس نے یہ انکشاف بھی کیا کہ ہیر رانجھا کا اہم کردار کیدو ایک حقیقی کردار تھا۔ اس کی ٹانگ ایک بیل گاڑی کے نیچے آ کر چکنا چور ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں کوئی بڑے سے بڑا مائی کا لال ڈاکٹر بھی ہوتا تو ٹانگ کو کٹنے سے بچا نہیں سکتا تھا لیکن اس کی ٹانگ بچی رہی اور یہ اس کے بزرگوں کا ہی کارنامہ تھا۔ ایک حیرت انگیز انکشاف یہ بھی ہوا کہ پہلوان ہڈیاں جوڑنے کے علاوہ شعر بھی جوڑتا ہے اور راہی کے تخلص سے بڑی گاڑھی اردو میں شاعری فرماتا ہے۔ پہلوانی اور شاعری تو بالکل متضاد میدان تھے۔ جاتے جاتے اس نے انیق کو اپنا ایک شعر بھی سنایا۔

یہ نہ سمجھنا کہ تم بھلا دو گے ہمیں کل پرسوں
ہم نہ ہوں گے تو روئے گا یہ زمانہ برسوں

اس کے جانے کے بعد انیق دیر تک سر دھنتا رہا اور سونگی کو بتاتا رہا کہ اس پائے کا شعر شاید ہی مرزا غالب کے بعد کسی نے کہا ہو۔ سونگی، پہلوان کو اپنا ماموں کہتا تھا۔ انیق نے کہا۔ ”سونگی! تمہارے حشمت ماموں کو فوراً لاہور چلے جانا چاہیے وہاں کی فلم انڈسٹری کا اگر بیڑا غرق ہو رہا ہے تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حشمت ماموں جیسے شاعر اور ادیب یہاں چاند گڑھی جیسے دیہات میں بیٹھے ہیں۔“

سونگی بھی فلموں کا شوقین تھا۔ دونوں میں فلمی گفتگو شروع ہوئی اور بہت دور تک گئی۔ میں بھی سنتے سنتے سو گیا۔

اگلی صبح بڑی خوب صورت تھی۔ مجھے مرغ کی مسلسل اذان نے ہی جگایا تھا۔ میں انگڑائی لے کر اٹھا اور دروازہ کھول کر دیکھا۔ کھیتوں پر دور تک کہرے کی ہلکی سی چادر تھی۔ درختوں کے شبنم آلود پتے دھلے دھلائے تھے اور کہیں کہیں قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا تھا۔ ہوا اتنی صاف اور تازہ تھی کہ پھیپھڑوں کے بجائے روح میں اترتی محسوس ہوئی۔ بھینسوں کی ایک قطار اپنے گلے کی گھنٹیاں بجاتی ایک

کچے پکے راستے پر آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی اور اس قطار کے اوپر پرندوں کی ایک ٹولی مسلسل چکر کاٹ رہی تھی۔ ایک بکری ممیاتی اور دوڑتی ہوئی میرے پاس سے گزری اور چند اور بکریوں کے ساتھ شامل ہوگئی۔ سورج ابھی افق سے ابھرا نہیں تھا لیکن دور ہرے کھیتوں کے عقب میں اس کی لالی محسوس کی جا سکتی تھی۔ یہ یا منظر تھا، میں مبہوت ہو کر رہ گیا۔ مجھے لگا کہ اصل پاکستان میں نے آج دیکھا ہے۔ اتنا خوب صورت، اتنا سادہ۔۔۔

ایک ادھیڑ عمر ملازم حق نواز کی بیوی بھی ڈیرے پر ہی رہتی تھی۔ اس کا نام نذیراں تھا۔ نذیراں نے تازہ مکھن سے پراٹھے بنائے جو ہم نے لسی اور سوڑے کے اچار کے ساتھ کھائے۔ اس کے بعد سردیوں کی سنہری دھوپ میں بیٹھ کر چائے پینے اور ڈیزل انجن کی کوکو نے جدا ہی مزہ دیا۔ میں خود کو کسی اور ہی دنیا میں محسوس کر رہا تھا۔ شاید اس انجوائے منٹ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں اب عاشرہ اور عارف کی طرف سے بھی بالکل مطمئن تھا۔ حسب پروگرام عاف 29 تاریخ کو لاہور سے روانہ ہو کر وین ہیگن عاشرہ کے پاس پہنچ چکا تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ ان دونوں کے دن بہت جلد پھر جائیں گے۔

میرا کام صبح آٹھ بجے کے قریب شروع ہوا۔ ٹریکٹر چلانے کی ٹریننگ میں یہاں آنے سے پہلے ہی لے چکا تھا۔ مجھے اس میں بالکل کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ہاں اگر ٹریکٹر کو ٹرالی کے آگے جوڑ دیا جاتا تو پھر ڈرائیونگ ذرا مشکل اور مختلف ہو جاتی تھی۔ یہ سارا کچھ میں نے صرف دو دن میں بڑی اچھی طرح سیکھ لیا تھا اور اس دوران میں ٹریکٹر انجن کے اہم نقائص کو پہچاننا اور انہیں دور کرنا بھی شامل تھا۔

دین محمد نے حقہ گڑگڑاتے اور کھانستے ہوئے میرا کام دیکھا اور مطمئن ہوا۔ میں نے دوپہر تک جتنا کام کیا اس نے دین محمد کے علاوہ ڈیرے کے دیگر لوگوں کو بھی حیران کیا بلکہ میں خود بھی حیران ہوا کہ کیا میں واقعی اتنی تندہی اور تیزی سے زمین میں ہل چلا سکتا ہوں۔ شاید میری اس توانائی اور جوش و خروش کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ تھا اور جس کا ہاتھ تھا اس کی جھلک بھی میں نے دیکھی اور سرشار ہوا۔ یہ دوپہر کوئی دو بجے کا وقت تھا جب انیق نے میرے پاس سے گزرتے ہوئے بہت آہستہ سے کہا۔ ''جناب۔۔۔ میرا خیال ہے کہ وہ چھت پر ہے۔''

میں نے ''کیا مطلب'' کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن پھر فوراً یاد آیا کہ اللہ نے مجھے قوتِ گویائی سے ''محروم'' کر رکھا ہے۔

میں نے ٹریکٹر پر بیٹھے بیٹھے ذرا مڑ کر دیکھا۔ تین چار کھیت چھوڑ کر دین محمد کا گھر تھا۔ یہ گاؤں کے ان چند گھروں میں سے تھا جو نیم پختہ تھے۔ گھر کی چھت پر سنہری دھوپ تھی اور کوئی الگنی پر کپڑے پھیلا رہا تھا۔ یہ تاجور ہی تھی۔ ہلکے زرد لباس میں اس کی رنگت کچھ اور بھی کھلی ہوئی تھی۔ ہلکی ہوا میں نہ صرف اس کے بال اڑ رہے تھے بلکہ ایک پہلو سے اس کا لباس بھی جسم کا حصہ بن گیا تھا۔ اس نے دو تین سیکنڈ کے لیے سر گھما کر کھیتوں کے رخ پر دیکھا۔ کیا وہ مجھے دیکھ رہی ہے؟ یہ سوال ایک نہایت مٹھاس بھرے تیر کی طرح میرے سینے میں لگا۔ وہ جانتی تھی میں اس کے لیے یہاں آیا ہوں اور اس کے لیے یہاں موجود ہوں۔ وہ چھت پر رکی نہیں، بہت جلدی نیچے چلی گئی۔

اس روز گاؤں کی جو دوسری اہم ترین صورت مجھے نظر آئی وہ پیر ولایت کی تھی۔ یہ منظر بھی انوکھا تھا۔ میں نے ٹریکٹر کے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالتے ہوئے دیکھا ایک مشکی گھوڑے پر ایک دراز قد شخص سوار تھا۔ اس نے زرد رنگ کا کافی بڑا پگڑ باندھ رکھا تھا۔ بالائی جسم پر ایک لمبا چغا سا تھا، گلے میں کچھ مالائیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک مرید نما شخص نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ رکھی تھی اور بڑے احترام سے سر جھکائے پیدل جا رہا تھا۔ راستے میں ملنے والے لوگ پیر صاحب کو دیکھتے ہی تیزی سے آگے بڑھتے اور اس کے پاؤں کو چھوتے یا ان پر اپنا ماتھا رکھتے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو گھوڑے کی باگ کو بوسہ دیتے۔ ایک شخص بڑا سا چھاتا لیے پیر صاحب کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ غالباً جہاں پیر صاحب کو گھوڑے سے اترنا تھا وہاں یہ چھاتا ان کے سر پر تانا جانا تھا۔

کھیتوں میں کام کرتے ہوئے اکثر مزدور پیر صاحب کی سواری باد بہاری دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو گئے اور رخ ان کی طرف پھیر لیا۔

انیق میرے قریب ہی کھیت سے جڑی بوٹیاں کھینچ رہا تھا۔ میلی سی شلوار قمیص میں وہ ننگے سر اور ننگے پاؤں سو فیصد کھیت مزدور ہی دکھائی دے رہا تھا۔ انیق کی شکل و صورت کی خاص بات یہ تھی کہ وہ خاص نہیں تھی، اگر کہا جائے کہ وہ عام سے خدوخال کا مالک تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ ایک عام شخص لیکن بہت خاص۔ وہ دھیرے سے بولا۔ ''سراسر فراڈ ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ کریکٹر اس نے کسی ہندی فلم سے چرایا ہے۔''

پلاننگ کے مطابق انیق مجھ سے اشاروں کنائیوں میں ہی بات کرتا تھا لیکن کسی وقت موقع تاڑ کر ایک آدھ فقرہ بول بھی دیتا تھا۔ میں نے اس بات کی خاص طور سے پریکٹس کی تھی کہ کسی کے آواز دینے پر چونک کر اس کی طرف نہیں دیکھنا۔ میں گونگا شخص تھا اور یقیناً بہرا بھی تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے اندر اداکاری کی صلاحیتیں ہمیشہ موجود رہی ہیں۔ گونگے بہرے کا یہ روپ میرے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہو رہا تھا۔

رات کو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ گیارہ بجے کا عمل ہوگا۔ دیہات میں یہ رات گئے کا وقت شمار ہوتا ہے۔ انیق نے میرا کندھا جھنجھوڑ کر مجھے جگایا۔ ''کوئی گڑبڑ ہے جی، دین محمد کے گھر کی طرف سے شور سنائی دے رہا ہے۔''

میں نے دیکھا سولنگی اپنے بستر پر موجود نہیں تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے ہم سے پہلے ہی شور سن لیا تھا اور جائزہ لینے کے لیے باہر چلا گیا تھا۔

ہم نے لالٹین کی لو اونچی کر کے اپنی چپلیں تلاش کیں اور دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ سرد ہوا نے استقبال کیا۔ دین محمد کے گھر کے باہر کئی لالٹینیں گردش کر رہی تھیں، واقعی کچھ گڑبڑ تھی۔ ہم پگڈنڈی پر تیز تیز چلتے گھر کے پاس پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر میرا جسم سنسنا اٹھا کہ ایک چودھری نما شخص، بوڑھے کمزور دین محمد کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہا تھا اور چلّا رہا تھا۔

''ماردو... سب کو ماردو، جو تم کو عقل کی بات بتاتے ہیں خون کر دو ان سب کا۔''

دین محمد نے کہا۔ ''یہ الزام ہے، میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔''

''تو پھر تیری دھی رانی نے خود کیا ہوگا یا پھر تیری گھر والی نے کیا ہوگا اور کون تھا یہاں تیسرا۔ اگر نادرہ کو کچھ ہو گیا تو میں سیدھا تیرے اور تیری دھی کے خلاف پرچہ کراؤں گا۔''

اتنے میں ایک اور شخص پکار کر بولا۔ ''یہ اور کسی کا کام ہے ہی نہیں۔ یہ دین محمد کی دھی کا کام ہے۔ یہ کل رات بہت لڑی تھی نادرہ سے، ہمارے گھر تک آواز آ رہی تھی اس کی بکواس کی۔''

''ہاں... یہ اسی نے کیا ہے۔'' ایک اور عورت دوہائی دینے والے انداز میں بولی۔

میں نے دیکھا ایک طرف سے کیم شحیم پہلوان حشمت تیز تیز قدم اٹھاتا نمودار ہوا، اس کا ایک شاگرد بھی ہمراہ تھا۔ شاگرد کے ہاتھ میں چمڑے کا بڑا سا تھیلا تھا، اس تھیلے میں پہلوان علاج معالجے کا سامان رکھتا تھا۔ پہلوان عجلت کے ساتھ دین محمد کے گھر میں داخل ہو گیا۔

انیق نے سولنگی کو دیکھا تو اس سے پوچھا۔ ''کیا ہوا سولنگی بھائی؟''

سولنگی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انیق کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، پھر وہ ہم دونوں کو ساتھ لے کر لوگوں سے کچھ فاصلے پر چلا گیا اور دھیمی آواز میں بولا۔ ''ساتھ والے پنڈ کے نمبردار فیاض کی بیوی نادرہ، مالک (دین محمد) کے گھر میں مہمان آئی ہوئی تھی۔ کسی نے سوتے میں اس کو زخمی کر دیا ہے۔ بڑی سخت چوٹیں آئی ہیں اس کے منہ سر پر۔ کہتے ہیں کہ جبڑا ٹوٹ گیا ہے اور سامنے کے دو چار دانت بھی نکل گئے ہیں۔''

''یہ کس نے کیا ہے؟''

''اللہ جانے، ابھی تو الزام مالک اور اس کے گھر والوں پر ہی آ رہا ہے۔ یہ عورت دراصل تاجور بی بی اور اسحاق کے رشتے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ تاجور اور اس کے گھر والوں کو سمجھانے بجھانے کے لیے۔ بڑے لوگوں کا سمجھانا بجھانا بھی اصل میں دھمکی ہی ہوتا ہے کہ سمجھ جاؤ نہیں تو پچھتاؤ گے۔ سنا ہے کل رات نمبردار کی بیوی اور تاجور میں کافی بحثا بحثی بھی ہوئی تھی، آج یہ معاملہ ہو گیا ہے... اللہ خیر کرے۔''

میری نگاہوں میں تاجور کی شبیہ ابھری۔ یہ میرے محبوب کی شبیہ تھی اور محبوب میں کوئی خامی ہو تو خوبی ہی لگتی ہے۔ میں اپنی محبت کو ایک طرف رکھ دیتا تو بھی میرا دل بڑے یقین سے گواہی دے رہا تھا کہ تاجور ایسی نہیں ہو سکتی۔ کسی سے تلخ کلامی یا تو تکرار تو اور بات ہے مگر اس طرح کسی پر ہاتھ اٹھانا اور زخمی کر دینا کم از کم تاجور جیسی لڑکی تو نہیں کر سکتی۔

اتنے میں گھر کا دروازہ کھلا اور کچھ لوگ افراتفری میں ایک چارپائی اٹھا کر باہر لے آئے۔ میں نے دیکھا اس پر ایک ادھیڑ عمر عورت نیم بے ہوشی کی حالت میں لیٹی تھی، وہ درمیانے جسم کی تھی۔ اس کا چہرہ اور سر کے بال خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ پہلوان حشمت بھی اس کے پیچھے تھا۔ اس نے چودھری نما شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یہ میرے بس کی نہیں ہے بھیا۔ اسے اسپتال لے جانا ہوگا اور ذرا جلدی کریں، نہیں زیادہ خون بہہ جانے سے کام اور خراب نہ ہو جائے۔''

پھر سات آدمیوں نے عورت والی چارپائی اٹھائی اور تیزی سے ایک ٹریکٹر ٹرالی میں ڈال دی۔ ٹریکٹر ٹرالی پر چند اور افراد بھی سوار ہوئے اور یہ ٹرالی زخمی عورت کو لے کر تیزی سے گاؤں کے کچے راستے پر ہچکولے کھانے لگی۔

ماحول میں ایک سراسیمگی سی تھی۔ بہت سے افراد بلند آواز میں باتیں کررہے تھے۔ ان میں کبھی کبھی کسی عورت کے واویلا کرنے کی آواز بھی شامل ہوجاتی تھی پھر پتا چلا کہ پولیس والے آئے ہیں۔ میں نے علاقے کے تھانیدار کو پہلی بار دیکھا اور یہ دیہاتی تھانے دار بالکل ویسا ہی تھا جیسا میرے تصور میں موجود تھا۔ موٹا تازہ، کھردرے لہجے والا اور چہرے سے بے پناہ سختی ٹپکتی ہوئی۔ یہ سب انسپکٹر تھا۔

سونگی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''پتا نہیں اب کس کس کی شامت آتی ہے۔'' اس نے سرگوشی کی۔

دوسرا ملازم حق نواز بولا۔ ''اب ہمیں تو یہاں سے کھسکنا چاہیے۔''

سونگی نے انیق کو اشارہ کیا اور مجھے بھی ٹہوکا دیتے ہوئے بولا۔ ''چل بھئی گونگے ڈیرے پر چلیں۔''

ہم چاروں ڈیرے پر واپس جانے کے لیے پگڈنڈی کی طرف بڑھے۔ ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ پیچھے سے ایک بھاری آواز آئی۔ ''اوئے ٹھہرو، ادھر آؤ۔''

سونگی بڑبڑایا۔ ''لو بھئی، ہوگیا کام۔''

تحکمانہ آواز دوبارہ اُبھری۔ ہم پلٹ آئے۔ سامنے ایک بغیر وردی کے پولیس والا کھڑا تھا جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی درشت لہجے میں بولا۔ ''چلو بھئی تمہیں تھانیدار صاحب بُلا رہے ہیں۔''

ہم گھر کی بیٹھک میں پہنچے۔ یہاں ہم سے پہلے آٹھ دس دیہاتی اور موجود تھے۔ یہ سب کے سب کچے فرش پر مسکینوں کی طرح پاؤں کے بل بیٹھے تھے۔ سامنے تین کرسیاں رکھی تھیں۔ ان میں سے دو پر پولیس والے تھے جبکہ ایک پر چودھری نما شخص براجمان تھا۔

دیہاتی تھانے دار کی آنکھوں سے قہر ٹپک رہا تھا۔ چودھری نما شخص بھی خاصا تپا ہوا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اشارہ کیا۔ ہم بھی قیدیوں کی طرح پاؤں کے بل فرش پر بیٹھ گئے۔

تھانے دار نے پوچھ گچھ شروع کی۔ سب سے پہلے تو پڑوسیوں کے دو لڑکوں کی شامت آئی۔ یہ شاید واحد گھر تھا جس نے اب بھی دین محمد اور اس کے کنبے سے تعلقات باقی رکھے ہوئے تھے۔ تھانے دار نے دونوں لڑکوں سے ایک ساتھ پوچھا۔ ''ہاں بھئی یہ کس کا کارنامہ ہے؟''

''ہم تو سورہے تھے جی۔'' بڑے لڑکے نے جواب دیا جس کی عمر چوبیس پچیس سال تھی۔

''پچھلے مہینے تیرا ویاہ ہوا ہے اور تو سورہا تھا کنجر ے۔'' تھانیدار نے بیٹھے بیٹھے ٹانگ چلائی جو لڑکے کے سینے پر لگی اور وہ لڑھک کر کچی دیوار سے جاٹکرایا۔

''اور تو کیا کررہا تھا چھوٹے؟'' تھانے دار نے دوسرے بھائی سے پوچھا۔

''مم... میں جاگ رہا تھا۔'' وہ جلدی سے گھبرا کر بولا۔

''اچھا جس کی نئی نئی شادی ہے وہ سورہا تھا اور جو ابھی چھڑا ہے وہ جاگ رہا تھا، تو کس چکر میں جاگ رہا تھا بھئی؟''

تھانے دار نے اسے بھی ٹانگ رسید کی اور وہ بھی بھائی کی طرح الٹ کر دیوار سے جاٹکرایا۔ اس کی دھوتی تتر بتر ہوگئی اور وہ عریاں ہوتے ہوتے بچا۔

تھانیدار نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''ان دونوں بہن خوروں کے بیان کچے ہیں۔ دونوں کو تھانے لے جانا ہے۔''

وہ ہاتھ پاؤں جوڑنے لگے باقی بھی سہم کر سکڑ سمٹ گئے۔ تھانے دار نے ایک درمیانی عمر کے شخص کو آگے بلایا۔ ذرا اونچی ناک والا یہ شخص لرزتا کانپتا تھانیدار کے قدموں میں جا بیٹھا۔ تھانے دار بولا۔ ''تیرا دین محمد کی زنانی سے بڑا یارانہ ہے تو کہاں تھا اس واردات کے وقت؟''

وہ بولا۔ ''وہ میری ماں جیسی ہے جی لیکن جب سے پنڈ والوں نے دینے سے ملنا جلنا بند کیا ہے، میں بھی کم ہی آتا ہوں ان کے گھر میں۔''

''یہ تو بڑا احسان کیا ہے تو نے پنڈ والوں پر... اوئے کنجر کے پُتر، میں جو پوچھ رہا ہوں وہ بتا۔ واردات کے ویلے کہاں تھا؟''

''اپنے گھر میں تھا جی۔'' اس شخص نے تھانے دار کی طرف دیکھ کر کہا۔ گالی کھا کر اس کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا تھا۔

کیونکہ اس نے تھانے دار کی طرف دیکھ کر بات کی تھی، تھانے دار مشتعل ہوگیا۔ پھنکار کر بولا۔ ''اوئے ماں کے... ڈیدے نکالتا ہے تیری تو...'' اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے دیہاتی پر تھپڑوں کی بارش کردی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے بھی اپنے افسر کا ہاتھ بٹایا۔ دیہاتی کے گلے سے بے ساختہ گھٹی گھٹی آوازیں نکلیں۔

''معاف کردیں جی... معاف کردیں جی۔'' وہ بس یہی کہتا جارہا تھا۔

دو اہل کار اسے گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے گئے۔ تھانے دار چلایا۔ ''بڑی اونچی ناک ہے اس کی۔ ذرا زمین پر رگڑے دلواؤ اس کو۔''

اہلکاروں نے دیہاتی کو مجبور کیا کہ وہ لوگوں کے سامنے زمین پر ناک سے لکیریں کھینچے۔ تفتیش کا یہ عالم دیکھ کر قطار میں بیٹھا ایک لڑکا ہچکیوں سے رونے لگا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اس کی پیٹھ پر دو ہنٹر رسید کیے۔

تھانے دار کا رعب بے پناہ تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ اگر چاہتا تو کمرے میں موجود کسی بھی شخص سے بہ آسانی اعترافِ جرم کروا سکتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ایک بہت بڑا زہریلا ناگ کمرے میں پھن پھیلائے بیٹھا ہے اور اس کی دہشت سے کمرے میں موجود آٹھ دس چوہے سکتہ زدہ ہو گئے ہیں۔ نہ ہل سکتے ہیں نہ اپنی آنکھ جھپک سکتے ہیں۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی ہٹ لسٹ میں اس تھانے دار کا نام بھی شامل کر لیا۔ یہاں گاؤں میں آنے کے بعد اس تصوراتی ہٹ لسٹ میں دو نام اور بھی شامل ہو چکے تھے لیکن ان ناموں کو ابھی فائنل ہونا باقی تھا۔ تھانیدار نے اپنی گرج دار آواز کو کچھ اور گرج دار بناتے ہوئے کہا۔ ''تم سب کو پتا ہے کہ میں مارتا کم ہوں اور گھسیٹتا زیادہ ہوں اور جس کو گھسیٹتا ہوں وہ دو تین مہینے تک اپنی بے بے کی گود میں سیدھا نہیں لیٹ سکتا۔ اس لیے چنگا یہی ہے کہ اگر کسی نے کچھ بتانا ہے تو ٹھکائی شروع ہونے سے پہلے ہی بتا دے اور باقیوں کے حال پر رحم کرے۔''

قریباً سب ہی تھوک نگل کر رہ گئے۔ تھانیدار کو طیش آیا۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی پتلون کی بیلٹ کھولی۔ کافی موٹی اور وزنی بیلٹ تھی۔ وہ کمرے میں ہی مار پیٹ کا ارادہ رکھتا تھا جیسے تھانے میں ہونے والی اصل ٹھکائی کا تھوڑا سا نمونہ دکھانا چاہتا ہو۔ اس نے سب کو دو دو کرارے ہاتھ لگائے اور گالیاں دیں۔ میرے کندھے پر بھی دو جگہ بیلٹ کی سخت ضرب لگی اور چنگاریاں سی چھوٹیں مگر دوسروں کی طرح مجھے بھی خاموش ہی رہنا تھا۔ کسی نے کہا۔ ہائے میں مر گیا۔ کسی نے معافی کی دوہائی دی، کوئی چلا کر رہ گیا۔ یہ سب کچھ اس پولیس والے کو مزہ دے رہا تھا۔

شاید وہ مزید مار پیٹ کرتا لیکن لوگوں کو عاجزی اور بے بسی کی تصویر بنے دیکھ کر اسے اپنے اختیار اور تسلط کے حوالے سے تھوڑی سی تسلی ہوئی۔ ویسے بھی توند بڑی تھی اور بیلٹ نہ ہونے کے سبب پتلون کے نیچے کھسکنے کا اندیشہ موجود تھا اس لیے اس نے ہاتھ روک لیا۔

گاؤں کا سارا روز عجیب بے چینی میں گزرا۔ پورے گاؤں پر جیسے ہراس کی فضا طاری تھی۔ تھانے دار سجاد نے دین محمد کے تین ملازموں سمیت چھ سات افراد کو پکڑ کر تھانے میں بند کر دیا تھا۔ سنا تھا کہ ان کی خوب اچھی طرح ٹھکائی ہو رہی ہے۔ ان مصیبت زدگان میں ہمارا کمرے کا ساتھی سونگی بھی شامل تھا۔

دن بھر میں سوچتا رہا کہ یہ حملہ کس نے کیا ہوگا۔ اس سلسلے میں انیق نے دوسرے ملازم حق نواز سے بھی سُن گن لینے کی کوشش کی۔ دوسرے لوگوں کی طرح حق نواز بے چارہ بھی بہت سہما ہوا تھا۔ اسے جیسے ہر گھڑی دھڑکا لگا تھا کہ تھانے سے اس کے پیچھے بلاوا آ سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے انیق سے کھل کر کوئی بات نہیں کی صرف اتنا کہا۔ ''بی بی تاجور تو ایسا کر ہی نہیں سکتی۔ نہ ہی یہ اس کے گھر والوں میں سے کسی کا کام ہے۔ یہ تو لگتا ہے کہ کسی نے جان بوجھ کر مالک اور اس کے گھر والوں کو پھنسانے کی کوشش کی ہے۔''

حق نواز کی یہ بات درست بھی ہو سکتی تھی۔ اس واقعے کے بعد دین محمد اور تاجاں یعنی تاجور وغیرہ پر بے حد دباؤ آ گیا تھا۔ ان پر پرچہ کٹوانے کی بات ہو رہی تھی۔ سہ پہر کے وقت پتا چلا کہ زخمی نمبردارنی نادرہ تحصیل اسپتال سے واپس آ گئی ہے، تاہم اس کا سارا منہ سر پٹیوں میں لپٹا ہوا ہے اور اس کے سر پر بہت سے ٹانکے بھی لگے ہیں۔

سونگی تو تھانے میں اپنے ناکردہ جرم کی سزا بھگت رہا تھا۔ رات کو میں اور انیق کمرے میں اکیلے تھے۔ یہ ایک دھند آلود یخ بستہ رات تھی۔ بجلی حسبِ معمول غائب تھی، کمرے میں انگیٹھی کی مدھم سی سرخ روشنی تھی۔ میں تاجور کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ ساڑھے تین سال کے بعد ایک حسین اتفاق کے تحت یہ لڑکی مجھے دوبارہ مل گئی تھی لیکن ابھی تک ایک معما ہی تھی۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے وہ سارے واقعات بھی یاد آ رہے تھے جو ساڑھے تین سال پہلے پیش آئے تھے۔ وہ اس وقت بھی کسی کے خوف میں مبتلا تھی۔ شام سے پہلے گھر جانا نہیں چاہتی تھی وہ کون تھا کیا اس کا منگیتر ہی تھا یا پھر کوئی اور؟ اچانک کمرے کے دروازے کو کسی نے ہولے سے ہلایا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے چادر میں لپٹی لپٹائی ایک عورت کھڑی تھی۔ اسے دیکھنے سے پہلے ہی مجھے پتا چل گیا کہ وہ کون ہے۔ اس کے جسم کی جدا مہک میں ہزاروں

خوشبوؤں میں سے پہچان سکتی تھا۔

وہ جلدی سے اندر آ گئی اور دروازے کو خود ہی اندر سے کنڈی بھی چڑھا دی۔ اس دوران میں انیق نے لالٹین کی لو اونچی کر دی تھی۔ تاجور نے اپنے چہرے سے چادر سرکائی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کا جسم سرتاپا کانپ رہا تھا اور بولنے کی کوشش میں ہونٹ بے ساختہ لرز رہے تھے۔

''تاجور بیٹھ جاؤ پلیز۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

وہ جھجکتی ہوئی چارپائی کے ایک سرے پر بیٹھ گئی پھر دل فگار آواز میں بولی۔ ''میں اپنی جان دے دوں گی لیکن ان لوگوں کے سامنے سر نہیں جھکاؤں گی۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے بہت بڑی بات کی ہے اور مجھے تم جیسی لڑکی سے ایسی ہی امید تھی۔''

وہ بولی۔ ''یہ جو کچھ ہوا ہے، مجھے پھنسانے کے لیے ہے۔ ابھی دو گھنٹے پہلے ساقا ہمارے گھر آیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ کل کسی وقت مجھ پر اور ابا جی پر پرچہ کٹ جائے گا پھر تھانے کچہری کے چکر پڑ جائیں گے۔ اس نے اشاروں اشاروں میں بتایا ہے کہ اگر وہ چاہے تو تھانیدار سجاد کو پرچہ کاٹنے سے باز رکھ سکتا ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ...'' اس کی آواز بیٹھ گئی اور وہ فقرہ مکمل کیے بغیر سسکنے لگی۔

میں نے اس کے ساتھ تسلی تشفی کے بول بولے۔ وہ قدرے نارمل ہو گئی۔ بہرحال اس کے جسم میں ہلکی سی لرزش اب بھی موجود تھی۔ وہ رات کے وقت اکیلی گھر سے نکلی تھی اور اس وقت ہم دونوں کے ساتھ ایک بند کمرے میں بیٹھی تھی یقیناً یہ ہمت اور دلیری کی بات تھی۔ اس کے علاوہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا تھا کہ وہ ہم دونوں کی ذات پر بھروسا رکھتی ہے۔ میں نے کہا۔ ''تاجور! ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ کر بتاؤ یہ کس کا کام ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نمبردارنی تمہارے گھر میں تھی۔ اگر باہر سے کوئی اندر نہیں آیا تو پھر کون ہو سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے تمہارے اور تمہارے امی، ابا کے علاوہ اور تو گھر میں کوئی نہیں تھا۔''

''نہیں، کوئی نہیں تھا۔''

''کوئی آہٹ کوئی آواز وغیرہ بھی نہیں آئی تمہیں؟''

''بس تھوڑی سی آواز آئی تھی جیسے دو تین بار کسی بھینس کو لاٹھی ماری گئی ہو۔ میں سمجھی کہ یہ آواز پڑوسیوں کے احاطے سے آئی ہے۔ ان کے تین چار ڈنگر ہماری دیوار کے بالکل پاس بندھے ہوتے ہیں۔''

''تم اس وقت جاگ رہی تھیں؟''

''ہاں میں برانڈے کے ساتھ والے کمرے میں سوتی ہوں لیکن کل بیٹھک میں سوئی تھی۔ جگہ بدل گئی تھی اس لیے مجھے جلدی نیند نہیں آ رہی تھی۔ اتنے میں دو تین بار ٹھک ٹھک کی اونچی آواز آئی۔ اس کے ایک منٹ بعد ہی نمبردارنی نے برانڈے میں آ کر واویلا کیا اور پھر گر گئی۔ پہلے میں ہی برانڈے میں پہنچی تھی پھر ابا اور امی بھی آ گئے اس وقت تک وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔''

''آس پاس کوئی چیز پڑی تھی... میرا مطلب ہے جس سے چوٹ لگائی گئی ہو؟'' انیق نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ تاجور جواب میں کچھ کہتی، میں نے اسے روک دیا۔ ''ٹھہرو تاجور، پہلے ایک بات بتاؤ۔''

وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ دو لٹیں رخسار پر ڈھلک آئیں۔ میں نے کہا۔ ''ابھی تم نے بتایا ہے کہ تم برانڈے کے ساتھ والے کمرے میں سوتی ہو لیکن اس دن بیٹھک میں سو رہی تھیں۔ کیا تم ہمیشہ برانڈے کے ساتھ والے کمرے میں سوتی ہو؟''

''ہاں جی، وہی میرا کمرا ہے۔ چھوٹے سے بڑا بھائی کاکا بھی میرے ساتھ ہی سوتا ہے لیکن وہ آج کل چاچو کے گھر گیا ہوا ہے اس لیے میں اکیلی ہی تھی۔''

''تمہارے بیٹھک میں سونے کی وجہ کیا تھی؟'' میں نے پوچھا۔

تاجور کا جواب میری توقع کے مطابق تھا۔ وجہ نمبردارنی نادرہ ہی تھی۔ تاجور نے اپنے سیدھے سادے لہجے میں بتایا۔ ''نمبردارنی کو سردی کچھ زیادہ لگتی ہے اس لیے ابا جی نے کہا کہ تم تاجور والے کمرے میں سو جاؤ، تاجور بیٹھک میں سو جائے گی۔''

''یعنی تمہارے کمرے کو گھر میں تاجور والا کمرا کہا جاتا ہے۔''

''ہاں جی، دادی کے بعد سے اسے تاجور والا کمرا کہا جانے لگا تھا۔ اب تو دادی کو اللہ بخشے مرے ہوئے بھی آٹھ دس سال ہو گئے ہیں۔''

میرے ذہن میں ایک پھلجھڑی سی چھوٹ گئی تھی۔ برانڈے کے ساتھ والے کمرے کو تاجور کا کمرا کہا جاتا تھا اور وہ وہیں سوتی تھی لیکن تاجور رات وہاں نہیں بلکہ بیٹھک میں سو رہی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وار کرنے والے نے نمبردارنی نادرہ کو نہیں بلکہ تاجور کو نشانہ بنایا ہو۔

یہ ایک خطرناک پہلو تھا۔ بہرحال میں نے اپنے

تاثرات سے تاجور پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میں نے نیتی کے سوال کی طرف واپس آتے ہوئے کہا۔ ''ابھی انیق نے پوچھا ہے کہ کیا تمہیں زخمی نادرہ کے پاس سے کوئی ایسی چیز ملی جسے چوٹ لگانے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہو؟''

تاجور کی شیشے جیسی شفاف پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔ وہ بولی۔ ''سب یہی کہہ رہے ہیں کہ نمبردارنی کو لکڑی کے اس ڈنڈے سے مارا گیا ہے جو مرچ مسالا پیسنے کے لیے کونڈی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ ڈنڈا کمرے کی دہلیز پر پڑا ہوا ملا تھا۔ تھانے دار اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ کہتا تھا کہ اس پر انگلیوں کے نشان ہوں گے لیکن اس ڈنڈے کو تو بعد میں کئی ایک نے ہاتھ لگایا تھا۔ پتا نہیں کس کس کی انگلیاں اس پر لگی ہوں گی۔''

''کوئی ایسی چیز جو تم لوگوں نے موقع پر دیکھی ہو؟''

میرے اس سوال پر تاجور کے شفاف چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ بےچاری اپنے اندر کی کوئی بات چھپا ہی نہیں سکتی۔ بالوں کی لٹیں بدستور جھک کر رخسار کو چوم رہی تھیں اور وہ حسبِ عادت انہیں ہٹانا بھول گئی تھی۔

ذرا توقف سے بولی۔ ''آپ یہاں میری مدد کرنے کے لیے آئے ہیں اور میرا دل کہتا ہے کہ آپ مدد کرسکتے ہیں اور مجھے اپنے رب سے بھی پوری امید ہے کہ وہ میرے لیے کوئی وسیلہ ضرور پیدا کرے گا... ایک چیز میرے پاس ہے اور اس کے بارے میں، میں نے ابھی تک کسی کو نہیں بتایا... اباجی کو بھی نہیں۔''

اس نے لرزتے ہاتھوں سے اپنی چادر کے پلو کو پکڑا اور ایک چھوٹی سی گرہ کھول کر کوئی چیز میری طرف بڑھائی۔ یہ بالکل چھوٹے سائز کی ایک تسبیح تھی۔ ایسی تسبیح میں عموماً 33 دانے ہوتے ہیں۔''

''یہ کہاں سے ملی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس چارپائی کے نیچے سے جہاں نمبردارنی سو رہی تھی۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا یہ نمبردارنی کی تسبیح ہو، یہ ہمارے گھر میں سے بھی کسی کی نہیں۔ اباجی کے پاس تسبیح ہوتی ہے لیکن وہ لکڑی کے دانوں والی بڑی تسبیح ہے۔''

میں نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا، اس کے پلاسٹک کے نارنجی دانے بالکل چھوٹے تھے۔ انگلی کے گرد تسبیح کے دو چکر دیے جاتے تو اس کی لمبائی ختم ہوجاتی۔

میں نے کہا۔ ''تاجور اسے دیکھ کر تمہارا دھیان کس کی طرف جاتا ہے؟''

اس نے اپنے نچلے ہونٹ کو ہلکے سے اندر کی طرف دبایا۔ بڑی پیاری ادا تھی، ساڑھے تین سال پہلے کے کئی مناظر یاد آ گئے۔ مجھے سب کچھ یاد آرہا تھا لیکن کیا اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے لٹوں کو پیچھے ہٹایا اور بولی۔ ''میں کوئی غلط بات کہہ دوں گی تو اللہ کی طرف سے مجھ پر اس کا عذاب آئے گا۔ لیکن پتا نہیں کیوں میرا دھیان مولوی فدا محمد کی طرف بھی جاتا ہے۔ مولوی فدا کو میں جتنا اچھا سمجھتی تھی ان کی جتنی عزت کرتی تھی وہ سب کچھ میرے دل سے ختم ہوگیا ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ اس پنڈ میں اگر کوئی میرا ہمدرد اور سہارا ہے تو وہ مولوی فدا ہیں۔ وہ ہر جگہ یہ بات علی الاعلان کہتے تھے کہ شادی کے لیے لڑکی اور اس کے والی کا رضامند ہونا ضروری ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک دن وہ اس طرح اپنا فتویٰ اور اپنی نظریں بدلیں گے اور یہ سب کچھ انہوں نے اپنی دوسری شادی کی وجہ سے اور مدرسے کی زمین ملنے کی وجہ سے کیا ہے۔ کوئی اور اس طرح کا لالچ کرے تو اتنا دکھ نہیں ہوتا لیکن جب نیکی کا درس دینے والا اس طرح سچ کو جھوٹ کہنا شروع کردے تو ہر ایک پر سے یقین اٹھنے لگتا ہے۔''

یہاں آ کر گاؤں میں، میں نے دو طرح کی رائے نوٹ کی تھیں۔ کچھ لوگوں کا تو خیال تھا کہ مولوی فدا کو اس عمر میں بال بچے دار ہوتے ہوئے ایک جوان لڑکی سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی اور کچھ کا خیال تھا کہ اس میں کون سی برائی ہے۔ اس طرح مدرسے والی زمین کے بارے میں بھی دو رائے تھیں۔ ابھی تک مجھے مولوی صاحب کا دیدار نہیں ہوا تھا۔ ہاں ایک دو بار لاؤڈاسپیکر پر ان کی گرج دار آواز ضرور سنی تھی۔

یہ چھوٹی سی تسبیح دیکھ کر اور تاجور کی باتیں سن کر نہ جانے کیوں میرا دل چاہا کہ ایک بار مولوی فدا صاحب سے ملاقات کرلی جائے۔

میں نے اپنی گفتگو میں تاجور پر یہ تو ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں (میری سوچ اس طرف جارہی تھی کہ کل رات والا حملہ نمبردارنی پر نہیں خود تاجور پر ہوا تھا) بہرحال میں نے اسے سختی سے ہدایت کی کہ وہ بہت محتاط رہے۔ بہتر ہے کہ اباامی والے کمرے میں ان کے ساتھ سوئے۔ گھر کے دروازے بھی اچھی طرح بند کیے جائیں۔ تھانے دار کے حوالے سے بھی میں نے اسے تسلی تشفی دی اور کہا کہ ہمارے یہاں ہوتے ہوئے اللہ نے چاہا تو اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔

وہ واپس گئی تو میں اور انیق اس وقت تک اسے دیکھتے رہے جب تک وہ کھیت پار کر کے اپنے گھر میں داخل نہیں ہوگئی۔

اس کے جانے کے بعد ہم ایک بار پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اگر یہ بات درست تھی کہ حملہ نمبردارنی پر نہیں بلکہ تاجور پر کیا گیا تھا تو پھر کس نے کیا تھا؟ یہ تاجور کے منگیتر اسحاق عرف ساتے کی کارروائی تو ہرگز نہیں ہوسکتی، نہ ہی کسی ایسے شخص کی جو تاجور اور ساتے کی شادی کا حامی تھا۔ تاجور کو زخمی کر کے یا مار کر وہ کیا فائدہ حاصل کرسکتا تھا۔

انیق کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ وہ سولنگی کا خالی بستر دیکھ کر اداس ہوگیا تھا، کہنے لگا۔ ''پتا نہیں تھانے میں اس پر کیا بیت رہی ہوگی۔ مجھے تو وہ پرانی فلم ڈاکورانی یاد آگئی ہے جس میں تھانے دار نے رانی کو کس قدر خوف زدہ کیا تھا۔''

''لیکن پھر بھی یہ سولنگی عورت تو نہیں ہے۔ ہاں بے چارے کا بازو ضرور ٹوٹا ہوا ہے۔ ہاں یاد آیا، اس نے جھوٹ بولا ہے کہ اس کا بازو سیڑھی سے گر کر ٹوٹا ہے بلکہ یہ مار پیٹ سے ٹوٹا ہے۔''

''مار پیٹ... کس نے کی؟'' انیق نے حیران ہو کر پوچھا۔

''گاؤں والوں نے اور کس نے۔ دین محمد اور اس کے سارے قریبی لوگوں کا حقہ پانی گاؤں والوں نے بند کر رکھا ہے۔ چند دن پہلے سولنگی بے چارہ گاؤں کے کمپاؤنڈر سے پیٹ درد کی دوا لینے چلا گیا۔ درد زیادہ تھا کمپاؤنڈر نے ترس کھا کر دوا دے دی۔ نتیجے میں کمپاؤنڈر کو گالیاں سننا پڑیں مگر سولنگی کی باقاعدہ ٹھکائی ہوگئی۔ ایک لاٹھی لگنے سے اس کا بازو ٹوٹ گیا، اب حشمت پہلوان چوری چھپے آکر اس کی مرہم پٹی کررہا ہے۔''

''لیکن آپ کو کیسے پتا چلا؟'' انیق نے حیران ہو کر پوچھا۔

''گونگے بہروں کو بہت سی ایسی باتوں کا پتا چل جاتا ہے جو تم جیسے نارمل لوگوں کو نہیں چلتا۔'' میں نے زیر لب مسکرا کر کہا پھر وضاحت کرتے ہوئے انیق کو بتایا کہ کل کس طرح حق نواز ایک دوسرے ملازم کے ساتھ میرے سامنے ہی بے دھڑک اس واقعے پر بات کررہا تھا۔

ابھی ہم باتیں ہی کررہے تھے کہ انیق کی نظر کھڑکی سے باہر گئی اور وہ ذرا چونک گیا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ مجھے وہی کل والا شخص نظر آیا جس کو تھانے دار نے دین محمد کی بیوی پر وار بنا دیا تھا اور اس نے بڑی عاجزی سے کہا تھا کہ وہ تو بیری ماؤں جیسی ہے۔ بعد میں تھانے دار نے ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر اس وارث نامی شخص کی خوب درگت بنائی تھی اور اسے ناک سے زمین پر لکیریں کھینچنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ شخص اب ایک موٹی تازی بکری اور ایک گٹھری لیے کہیں جا رہا تھا۔

انیق نے آواز دے کر اسے روکا۔ وہ بے چارہ ٹھٹک کر رک گیا اور ہماری طرف دیکھنے لگا۔ ہم اس کے پاس پہنچے۔ اس کی اونچی ناک پر گہری سیاہ خراشیں نظر آرہی تھیں۔ یقیناً یہ کل والی سزا کا نتیجہ تھیں۔ وہ بہت سہما ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

''کہاں جا رہے ہو وارث؟'' انیق نے اس سے پوچھا۔

''مولوی جی کو نذرانہ دینا ہے۔''

''نذرانہ؟''

''آہو جی۔ یہ ایک بکری ہے، کچھ دیسی گھی اور بادام کی گریاں ہیں۔'' اس نے باداموں کی گریوں والا لفافہ دکھایا۔ یہ ڈھائی تین کلو سے کم نہیں تھا۔ دیسی گھی بھی پانچ چھ کلو تو رہا ہوگا۔

''نذرانہ کس بات کا؟'' انیق نے پوچھا۔

وارث کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ ''بس جی... کچھ مصیبت آگئی ہے۔'' وہ اٹک اٹک کر بولا۔

''تھانے دار والی بات کررہے ہو؟'' انیق نے پوچھا۔

''آہو جی وہ بھی ہے مگر کل رات... کچھ اور بھی مسئلہ ہوا ہے ناں۔''

''اور مسئلہ؟''

وارث نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور ڈرے ڈرے سے انداز میں جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ کل رات اس کے گھر پر بھی کچھ پُراسرار گڑبڑ ہوئی ہے۔ آدھی رات کے وقت عورتوں کے بین کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ باہر نکل کر دیکھا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر کچھ دیر بعد گھر پر پتھر پڑنے شروع ہوگئے، صحن میں اور باہر کی دیواروں پر خون کے چھینٹے بھی نظر آئے۔ وہ سب اتنے ڈر گئے کہ پڑوسیوں کے گھر چلے گئے اور باقی ساری رات جاگتے اور پڑھتے ہوئے گزاری۔

''تو پھر آج صبح تم مولوی جی کے پاس گئے ہوگے؟'' انیق نے پوچھا۔

''آہو جی۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہم سا تے اور تا جور کی شادی کے حق میں نہیں ہیں اس لیے ہم پر یہ مشکل آئی ہے۔ ابھی تو یہ صرف نمونہ ہے، بات اس سے آگے بھی جاسکتی ہے۔ انہوں نے مصیبت ٹالنے کے لیے یہ نذرانہ بھی منگوایا ہے۔''

میں اندر ہی اندر ابل کر رہ گیا۔ یقیناً انیق کی بھی یہی کیفیت رہی ہوگی۔ کچھ چالباز افراد ان سادہ لوح لوگوں کو بڑے بھونڈے طریقے سے بے وقوف بنا رہے تھے اور یہ بن رہے تھے۔

کچھ دیر بعد وارث تو موٹی تازی بکری اور گٹھری لے کر مولوی صاحب کی طرف چلا گیا اور ہم پھر کمرے میں آبیٹھے۔ میرے اندر ہلچل تھی آج کی رات دو بندوں کے لیے بڑی سخت ثابت ہونے والی تھی۔ ان میں سے ایک گاؤں کا مولوی فدا تھا۔

☆☆☆

میں جو سامان لاہور سے اپنے ساتھ لایا تھا اس میں ایک ٹرنک بھی تھا۔ اس ٹرنک میں ایک گرے پتلون کے علاوہ ایک سیاہ قمیص اور سیاہ جرسی بھی موجود تھی۔ تسموں والے بوٹ اور ایک مدد کولٹ پستول بھی اس سامان کا حصہ تھے۔ وہ ایک سرد ترین رات تھی۔ فضا میں ہلکا سا کہرا موجود تھا۔ پروگرام کے مطابق میں نے دیہاتی لباس اتار کر پتلون اور جرسی وغیرہ پہنی، پتلون کی بیلٹ میں کولٹ پستول لگایا۔ اس کے بعد چہرے پر سیاہ رنگ کا ایک کپڑا اس طرح باندھ لیا کہ بس آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ اس سارے گیٹ اپ کو چھپانے کے لیے میں نے ایک کمبل نما بڑی سی چادر اوڑھ لی۔ یہ چادر میرے سر کو ڈھانپ کر میرے گھٹنوں سے نیچے تک پہنچ رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد میں چادر میں لپٹا لپٹایا مولوی فدا کے گھر کی طرف جارہا تھا۔ ابھی میں اس کے گھر سے تیس چالیس قدم دور ہی تھا کہ مجھے ٹھٹک کر درختوں کے پیچھے جانا پڑا۔ میں نے مولوی فدا کے گھر سے کسی کو نکلتے دیکھا۔ یہ رات کے قریباً ساڑھے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ پورا علاقہ گہری یخ بستہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس وقت مولوی فدا کے گھر سے کون نکل رہا تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ ایک نہیں دو افراد تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ٹارچ تھی اور یہ ذرا فربہ اندام تھا۔ میں پہچان گیا یہی مولوی فدا تھا۔ اس کے عقب میں ایک نوجوان لڑکا تھا۔ یہ چھریرے جسم کا تھا اور اس نے شلوار قمیص پر سویٹر پہن رکھا تھا۔ اس لڑکے کے ہاتھ میں وہی گٹھری تھی جو ہم نے مصیبت زدہ وارث کے ہاتھ میں دیکھی تھی، بکری بھی ساتھ ہی تھی لیکن اس کی رسی مولوی فدا کے ہاتھ میں تھی۔

یہ دونوں کچھ آگے بڑھ کر کھیتوں میں داخل ہوئے تو میں بھی ان کے پیچھے چل دیا۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں جارہے تھے لہٰذا ان کی رفتار تیز تھی۔ مجھے احتیاط سے قدم اٹھانا پڑ رہے تھے۔ قریباً بیس منٹ پیدل چلنے کے بعد وہ دونوں درختوں کے ایک جھنڈ میں داخل ہوئے۔ یہاں ایک خستہ حال مکان تھا۔ تین چار کچے کمرے تھے۔ ایک کمرے کی چوبی بالکونی دکھائی دیتی تھی۔ نوجوان باہر کھڑا رہا اور مولوی فدا بکری اور گٹھری کے ساتھ اندر چلا گیا۔

میرا تجسس پوری طرح بیدار ہوچکا تھا۔ رات کے اس پہر مولوی فدا چوری چھپے یہاں کیوں آیا تھا۔ میں نے زیادہ توقف کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر مکان کی عقبی سمت آگیا۔ پانچ چھ فٹ اونچی چاردیواری پھاند کر اندر داخل ہونے میں مجھے بالکل دشواری پیش نہیں آئی۔ میں ایک برآمدے میں سے گزر کر ایک ایسے کمرے کے سامنے پہنچا جہاں لالٹین کی روشنی ہورہی تھی۔ اندر سے کسی شخص کے کھانسنے کی مسلسل آواز سنائی دے رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ بہت زیادہ بیمار اور کمزور ہے۔

میں کچھ دیر انتظار کرتا رہا پھر کمرے کے سامنے سے گزر کر گھر کے بغلی حصے کی طرف آگیا۔ اس طرف بھی برآمدہ تھا۔ بکری برآمدے کے ایک ستون سے بندھی ہوئی تھی اور گھاس پر منہ مار رہی تھی۔ یہاں بھی ایک کمرے کے کواڑوں سے لالٹین کی روشنی چھن چھن کر آرہی تھی۔ اندر سے بولنے کی مدھم آواز بھی آرہی تھی۔ میں نے بے دھڑک دروازے کی جھری سے آنکھ لگائی۔ مجھے ایک جواں سال عورت نظر آئی۔ اس نے زرق برق کپڑے پہن رکھے تھے، کسی حد تک سنگھار بھی کیا ہوا تھا۔ مولوی فدا جو گٹھری لایا تھا وہ قریب ہی لکڑی کی میز پر پڑی تھی۔ مولوی فدا نظر نہیں آرہا تھا مگر کمرے میں موجود تھا۔ عورت اس سے بات کررہی تھی۔ میں نے ان کی گفتگو وضاحت سے سننے کے لیے اپنی آنکھ ہٹا کر اپنا کان دروازے کی جھری سے لگا دیا۔

عورت نے کہا۔ ''اب کیا کروں مولوی جی۔ خاوند ہے جو کہتا ہے کرنا پڑتا ہے لیکن اس کی حالت اچھی نہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ ڈاکٹر بھی کہہ رہا تھا اب دس پندرہ دن سے زیادہ نہیں نکالے گا۔''

''ڈاکٹروں کے کہنے سے کیا ہوتا ہے پیارے۔''

مولوی فدا کی مدھم آواز ابھری۔ ''ہوسکتا ہے کہ دس پندرہ دن بھی نہ نکلیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دس پندرہ ہفتے نکل جائیں۔''

اس کے بعد کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر عورت نے سرگوشی میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ جواب میں مولوی فدا تسلی دینے والے انداز میں بولا۔ ''سب ٹھیک ہوجائے گا پیاری، تھوڑا سا حوصلہ رکھو۔''

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا اور کچھ آ بھی رہا تھا۔ ایک عورت جس کا خاوند سخت بیمار تھا اور ساتھ والے کمرے میں پڑا ہوا تھا یہاں مولوی فدا کے ساتھ موجود تھی۔ اس نے نئے نویلے کپڑے پہن رکھے تھے اور سنگھار کر رکھا تھا۔ مولوی فدا اس کے لیے تحفے تحائف لے کر آیا تھا۔ وہ تحفے جو اس نے نذرانے کے طور پر ایک سادہ لوح دیہاتی سے وصول کیے تھے۔

اچانک مجھے اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا لیکن تھوڑی دیر ہوگئی تھی، کسی نے ایک لاٹھی گھما کر میرے سر پر ماری۔ یہ ضرب کسی اور کو لگی ہوتی تو لمبا لیٹ گیا ہوتا لیکن میرا تو کام ہی چوٹیں مارنا اور چوٹیں سہنا تھا۔ ایک بار آنکھوں میں تارے سے ضرور چمکے لیکن پھر میں سنبھل گیا۔

حملہ آور نے دوسرا وار کرنا چاہا مگر اب یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے جھک کر وار بچایا اور ٹانگ اس کی پھپاتی پر رسید کی۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا۔

دھما چوکڑی کی آوازوں نے اندر والوں کو الرٹ کردیا تھا۔ پہلے عورت کے چلانے کی آواز سنائی دی پھر کسی نے دھماکے سے کمرے کا دروازہ کھولا۔ یقیناً یہ مولوی فدا ہی تھا۔

''ماردوں گا... چیر ڈالوں گا۔'' میرا لاٹھی بردار مدِ مقابل چلّایا اور ایک بار پھر مجھ پر جھپٹا۔

میں نے بروقت دیکھ لیا تھا کہ اس کے ہاتھ میں چاقو ہے ورنہ چاقو کا پھل دستے تک میری ٹانگ میں گھس گیا ہوتا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس مرتبہ حملہ آور کی کنپٹی پر ٹانگ کی جچی تلی ضرب لگائی۔ یہ ضرب کوئی پیشہ ور فائٹر تو برداشت کرسکتا تھا عام شخص نہیں۔ مدمقابل دیوار سے ٹکرایا اور اوندھے منہ گر کر اتنا غفیل ہوگیا۔ کمرے کے اندر سے نکلنے والی روشنی میں اس کے چہرے کی جھلک نظر آئی۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ یہ مولوی فدا کا وہی ساتھی تھا جو گھر سے باہر ٹھہرا رہ گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ مولوی فدا کچھ کرتا یا پھر چمکیلے گلابی کپڑوں والی عورت باہر بھاگنے کی کوشش کرتی، میں نے کمر کی طرف سے جری اٹھا کر اپنا کولٹ پسٹل نکال لیا۔

''خبردار... اگر کوئی چالاکی دکھائی تو گولی چلا دوں گا۔'' میں نے پستول مولوی فدا اور عورت کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

وہ دم بخود سے کھڑے رہے گئے۔ عورت دہشت زدہ نظروں سے اوندھے پڑے نوجوان کو دیکھ رہی تھی۔ اسے شاید ڈر تھا کہ وہ مرگیا ہے۔ نوجوان کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ وہ مولوی فدا کے شاگردوں میں سے لگتا تھا۔ چھدری داڑھی کے اوپر ہلکی مونچھیں تھیں۔ لاٹھی گر گئی تھی لیکن چاقو ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ میں نے نیچے جھک کر چاقو اس کی گرفت سے نکال لیا اور بند کرکے پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔

''کون ہو تم... کیا چاہتے ہو؟'' مولوی فدا نے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو، انسان کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔''

میں مولوی فدا کو پہلی بار قریب سے دیکھ رہا تھا۔ عمر چالیس سے کچھ اوپر ہی رہی ہوگی، جسم قدرے موٹا تھا۔ داڑھی سیاہ اور سر پر گول ٹوپی تھی۔ ٹوپی میں سے جو بال نکلے ہوئے تھے ان پر تیل کی چمک دکھائی دیتی تھی۔

عورت روہانسی آواز میں بولی۔ ''اگر تم ڈاکو ہو تو یہاں سے جو جی چاہے لے جاؤ مگر ہمیں کچھ نہ ہو، تمہیں تمہارے بال بچوں کا واسطہ۔'' عورت کی آنکھوں سے کاجل نکلنا شروع ہوگیا تھا اور اس کی ڈری ڈری نگاہیں مسلسل بے ہوش پڑے نوجوان پر تھیں۔

میں نے کہا۔ ''گھبراؤ نہیں بی بی، یہ مرا نہیں صرف بے ہوش ہوا ہے مگر تم دونوں کے لیے بات بے ہوشی سے آگے بھی بڑھ سکتی ہے۔ پوری چھ گولیاں ہیں اس میں۔''

''کیا چاہتے ہو تم؟'' مولوی فدا نے تھوک نگلا۔

''فی الحال تو تم دونوں اندر چلو۔'' میں نے پستول کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔

قریبی کمرے میں مریض شخص مسلسل کھانس رہا تھا اور شاید بیوی کو پکارنے کی ناکام کوشش بھی کررہا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اسے یہاں ہونے والی گڑبڑ کا احساس ہوگیا تھا

اگر وہ چارپائی سے اٹھنے کے قابل ہوتا تو ضرور یہاں پہنچ گیا ہوتا۔

میں مولوی فدا اور عورت کو واپس کمرے میں لے آیا لیکن اس سے پہلے میں نے بے ہوش نوجوان کو بازو سے گھسیٹ کر ایک چھوٹے کمرے میں بند کر دیا تھا۔

یہ گھر اندر سے بھی خستہ حال ہی تھا۔ ایک جگہ مجھے طاق میں ایک مورتی بھی دکھائی دی۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے مولوی فدا اور عورت کو دیسی کرسیوں یعنی موڑھوں پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ بے چون و چرا بیٹھ گئے۔ دونوں کے رنگ لالٹین کی روشنی میں زیادہ ہی زرد نظر آنے لگے تھے۔ میں نے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ وہاں بھی لالٹین روشن تھی۔ مجھے بستر پر ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ پڑا نظر آیا۔ چہرہ مدقوق، آنکھیں اندر دھنسی ہوئی۔ اس کے قریب میز پر بہت سی انگریزی اور دیسی دوائیں رکھی تھیں۔ دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ ایک تپ دق زدہ شخص ہے۔ میں نے دروازہ دوبارہ بھیڑ دیا اور دوسرے کمرے میں مولوی فدا اور عورت کے سامنے آن بیٹھا۔

عورت کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں تھیں۔ مولوی فدا بھی سکتہ زدہ سا بیٹھا تھا۔ میں نے مولوی فدا کا بہت گھناؤنا روپ دیکھا تھا۔ اس نے ایک کم عمر لڑکی سے شادی رچائی تھی اور اب بھی شاید اس کی مہم جوئی کو بریک نہیں لگے تھے۔ یہاں اس چار دیواری میں بھی کوئی شدید قسم کی گڑبڑ کر رہا تھا۔

میں نے مولوی فدا کی آنکھوں میں دیکھا اور مجھے چونکنا پڑا۔ اس کی آنکھیں مجھے اس کے چہرے اور کردار سے مختلف نظر آئیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے ان آنکھوں میں وہ مولوی فدا دکھائی نہیں دیا جو پچھلے دو تین دنوں میں میرے سامنے آیا تھا۔ میں عجیب سے تذبذب کا شکار ہو گیا اور شاید یہ میری زندگی میں پہلی بار تھا کہ میں کسی شخص کو دیکھ کر اس طرح کنفیوژ ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ مولوی فدا وہ نہیں ہے جو نظر آ رہا ہے اور جو نہیں ہے شاید وہ بھی نہیں ہے۔

میں نے مولوی فدا سے باز پرس شروع کی اور اس دن زندگی میں مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ کبھی کبھی چہرے میں اور اس تصویر میں کتنا فرق ہوتا ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔ ضروری نہیں ہوتا کہ حقیقت وہی ہو جو ہماری نگاہ ہمیں دکھاتی ہے یا ہماری سماعت ہمیں سناتی ہے یا ہمارے حواس ہمیں محسوس کرواتے ہیں۔ اگلے ایک گھنٹے کے اندر میں نے مولوی فدا کی خیالی تصویر اور اس کے اصل چہرے میں اتنا فرق دیکھا کہ دنگ رہ گیا۔

مولوی فدا مجھ سے بار بار پوچھ رہا تھا کہ میں کون ہوں اور اس سے کیا چاہتا ہوں۔ اس کی نگاہیں میرے سیاہ ڈھاٹے کے پیچھے دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

میں نے اس کے حواس بحال کرنے کے لیے پہلے اسے تھوڑا سا پانی پلایا پھر کہا۔ ”میں ان دو بدصورت عورتوں کو دیکھنا چاہتا ہوں جن کا تم ذکر کرتے رہتے ہو اور بتاتے ہو کہ وہ گاؤں کی کسی تاجور نامی لڑکی کا پیچھا کرتی ہیں؟“

مولوی فدا کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ اپنی داڑھی کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ”ایسی باتوں کو مذاق کے طریقے سے نہیں کرتے، کبھی کبھی بہت نقصان ہو جاتا ہے۔“

”لیکن ایسی باتیں کرنے سے تمہارا تو فائدہ ہی فائدہ ہوتا ہے۔ تمہارے گھر نذرانے آتے ہیں۔ حلوے کے تھال پہنچتے ہیں۔ روپیا پیسا بھی آتا ہے جس سے تم دھوم دھام سے شادی کرتے ہو اور مزید شادیاں کرنے کے پروگرام بھی بناتے ہو۔“ میں نے ڈری سہمی خوش شکل عورت کی طرف دیکھ کر کہا۔

مولوی فدا بولا۔ ”مجھے لگتا ہے آپ بھی ان لوگوں میں سے ہو جن کو میری شادی سے بہت دکھ پہنچا ہے۔ کیا میں نے نکاح کر کے کوئی غلط کام کیا ہے؟“

”نکاح کرنا تو کوئی غلط کام نہیں لیکن نکاح کے بعد تم جس طرح پیر ولایت کے اسپیکر بن گئے ہو اور ہر جگہ اسی کے ترانے پڑھتے ہو، یہ یقیناً بہت غلط کام ہے اور تمہارے منصب کے مطابق بھی نہیں۔“

”میں تمہارے اس سوال کا جواب بعد میں دے سکتا ہوں۔ تمہارا پہلا سوال شادی کے بارے میں تھا۔“

اچانک وہ ہوا جس کی توقع نہیں تھی۔ عورت نے مجھے غافل سمجھا اور ایک دم اٹھ کر باہر کو بھاگی۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ وہ گھوم کر دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرائی۔ اس کی پھولدار قمیص کندھے پر سے پھٹ گئی اور عریاں جسم نظر آنے لگا۔ اس کے ہونٹوں سے بھی خون رسنے لگا تھا، وہ چلا رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے بازو کی لپیٹ میں لے لیا۔ مولوی فدا نے اس کی مدد کرنا چاہی مگر میرا دھکا کھا کر چارپائی پر گرا اور چارپائی کا بازو ٹوٹ گیا۔ لفافہ چھٹنے سے باداموں کی گریاں بھی ہر طرف بکھری نظر آئیں۔

میں نے پستول مولوی فدا کی طرف سیدھا کیا۔ ”چپ چاپ بیٹھے رہو ورنہ مارے جاؤ گے۔“

میں نے عورت کو بالوں سے پکڑ کر گڑیا کی طرح دھمکایا

اور پھر اسے اسی کمرے میں لے گیا جہاں نوجوان نیم بے ہوش پڑا تھا۔ اس نے اب ہولے ہولے کراہنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے پستول خوفزدہ عورت کی پیشانی سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''اب کوئی حرکت ہوئی تو معاف نہیں کروں گا اور یہ بات اس لڑکے کو بھی سمجھا دینا۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے دھکا دے کر عورت کو اس تنگ کمرے میں پھینک دیا۔ وہ اتنی دہشت زدہ ہوگئی تھی کہ چلا بھی نہیں سکی۔ میں نے دروازے کو باہر سے پھر بولٹ کر دیا۔

چارپائی پر گرتے ہوئے مولوی فدا کا سر کسی سخت چیز سے ٹکرایا تھا اور تیل زدہ بالوں میں سے خون رسنے لگا تھا۔ یقیناً آدھ گھنٹا پہلے تک اس نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ اس پر ایسی آفت ٹوٹنے والی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے پھر وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔ ''یا اللہ موت دے دے، ایسی زندگی سے تو موت دے دے۔ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟'' روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

میں خاموشی سے اس کی جانب دیکھتا رہا۔ آخر وہ گمبھیر آواز میں بولا۔ ''مجھے بتاؤ، میں نے کیا جرم کیا ہے شادی کر کے؟ سارا پنڈ جانتا ہے کہ میں اپنی بیوی سے کتنی محبت کرتا تھا، وہ دوسرے بچے کی پیدائش کے بعد بیمار ہوئی اور پورے چھ سال تک بستر پر پڑی رہی۔ پورے چھ سال تک میں نے دن رات اس کو سنبھالا، نہ صرف سنبھالا بلکہ بچوں کو بھی ماں بن کر پالا۔۔۔ اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی۔ وہ اپنی زندگی میں ہی مجھے شادی کی اجازت دیتی تھی لیکن میں نے نہیں کی۔ اس کے بعد بھی میں نے ایک سال اسی طرح اکیلے پن میں گزارا۔ کیا چھ سات سال بالکل اکیلے پن کی زندگی گزارنے کے بعد میرا حق نہیں بنتا تھا کہ میں اپنی زندگی کے لیے کوئی سہارا ڈھونڈ لوں۔ کیا میرا حق نہیں بنتا تھا؟''

میں خاموشی سے اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کرتا رہا۔

وہ پھر بولا۔ ''پھر میں نے اپنی ہم عمر عورت ڈھونڈنے کی کوشش کی جو مجھے نہیں ملی۔ اب جس لڑکی سے میں نے شادی کی ہے وہ غریب گھرانے کی ہے۔ اس کا نکاح ہو چکا ہے لیکن رخصتی سے پہلے ہی طلاق ہوگئی۔ اب اس کی شادی کی عمر گزرتی جا رہی تھی، سب سے بڑھ کر یہ بات کہ یہ لڑکی مجھے اپنے دونوں بچوں کے حق میں بہت بہتر لگی۔ میں نے باقاعدہ شرع سنت کے مطابق بغیر کسی جہیز کے اس کے ساتھ نکاح کیا۔ بتاؤ میں نے کچھ غلط کیا۔ کیا مجھے اپنے اور اپنے بچوں کے لیے ایک نئی زندگی شروع کرنے کا کوئی حق نہیں تھا؟''

''میں نے سنا ہے کہ اس شادی کا زیادہ خرچہ ایک ایسے بندے نے دیا ہے جو اسحاق عرف ساقے کا دوست ہے؟''

''تم زمیندار عالمگیر کی بات کر رہے ہو، یہ بالکل غلط ہے۔ اس نے صرف ولیمے کی دعوت کے لیے دو بچھڑے دیے تھے، وہ بھی میں نے اس شرط پر قبول کیے تھے کہ میں فصل کی کٹائی پر ان کی قیمت ادا کر دوں گا۔ اس کے علاوہ اگر کچھ ثابت ہو جائے تو جو چور کی سزا وہ میری۔''

''اور مدرسے کی زمین۔۔۔ یہ بھی تو ساقے کے دوست عالمگیر نے ہی تمہیں دی ہے؟''

وہ جیسے تڑپ کر بولا۔ ''یہ بالکل غلط ہے۔ یہ زمین عالمگیر نے نہیں کسی اور نے دی ہے مگر وہ اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے میں بھی چپ ہوں۔''

میں نے ذرا زور دے کر پوچھا تو پریشانی کے عالم میں اس کے منہ سے بے ساختہ خورشید بی بی کا نام نکل گیا۔

''کون ہے یہ خورشید؟'' میں نے فوراً اس کی بات پکڑ لی۔ وہ چند لمحوں کے لیے سٹپٹایا ہوا نظر آیا۔ پھر اس نے بتا دیا کہ وہ عالمگیر کی والدہ ہے۔ جو زمین مدرسے کو ملی ہے وہ اس کی والدہ کے حصے میں سے ملی ہے اور اس کا باقاعدہ کاغذ اس کے پاس موجود ہے۔ خورشید بی بی اور طرح کی عورت ہے، وہ نہیں چاہتی کہ اس کی نیکی کا ڈھنڈورا پیٹا جائے۔''

اپنی بات کے آخر میں مولوی فدا نے مجھ سے درخواست کی کہ اگر ہو سکے تو میں یہ بات اپنے تک ہی رکھوں۔

وہ میرے سوالوں کے ٹھوس جواب دے رہا تھا اور بار بار یہ بھی کہہ رہا تھا کہ میں چاہوں تو اس کی باتوں کی تصدیق بھی کر سکتا ہوں لیکن اس کی صفائی مجھے پوری طرح متاثر نہیں کر رہی تھی۔ میں نے پچھلے دو تین دن میں بہت کچھ ایسا نوٹ کیا تھا جو کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں تھا۔ جیسے ابھی پچھلے آدھ پون گھنٹے میں جو کچھ میرے سامنے آیا تھا۔ مولوی فدا اور اس کے شاگرد کا تنہا اس مکان میں داخل ہونا اور پھر مولوی فدا کا اس عورت سے باتیں کرنا۔

اچانک وہ دروازہ زور زور سے پیٹا جانے لگا جس

میں، میں نے مولوی فدا کے نیم بے ہوش شاگرد اور اس عورت کو بند کیا تھا۔ اندر سے دروازہ پیٹنے والی وہ عورت ہی تھی، وہ گھبراہٹ کے عالم میں واویلا کررہی تھی اور باہر نکلنا چاہتی تھی۔ اس کی آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔
''میں مرجاؤں گی...میری سانس رک جائے گی۔ مجھے یہاں سے نکالو، تمہیں بھگوان کا واسطہ...'' وہ بلند آواز سے رونے لگی۔

اس نے بھگوان کا واسطہ دیا تھا، میں چونک گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ساتھ والے کمرے میں طاق کے اندر رکھی ہوئی مورتی بھی یاد آئی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے مولوی فدا کی طرف دیکھا۔ اس نے شاید میرے چونکنے کی وجہ نوٹ نہیں کی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا یہ میاں بیوی ہندو ہیں؟''

مولوی فدا نے اثبات میں سر ہلایا۔
میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''یہ عورت کس قسم کی بیوی ہے اس کا شوہر سخت بیماری کی حالت میں بستر پر پڑا ہے اور یہ یہاں بن ٹھن کر تمہارے ساتھ باتیں کررہی تھی؟''

مولوی فدا محمد چند لمحے خاموش رہا جیسے سوچ رہا ہو کہ میرے اس سوال کا کیا جواب دے پھر دھیمی آواز میں بولا۔
''شاید تمہیں میری بات کا یقین نہیں آئے گا اس لیے بہتر ہے اسی عورت سے پوچھ لو۔''
میں نے کہا۔ ''تم بتاؤ، میں یقین کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''اس کے خاوند وکرم کو ٹی بی ہے کافی آگے کی اسٹیج پر ہے لیکن ایسا نہیں کہ علاج ہی نہ ہوسکے۔ پنڈ کے اندر ہی رہتا تھا۔ پھر آس پڑوس والوں نے کہا کہ اس کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں اسے یہاں کھلی جگہ پر چودھری...... کے اس مکان میں بھیج دیا گیا۔ میاں بیوی میں بہت محبت ہے۔ وکرم اب سمجھنے لگا ہے کہ وہ زیادہ دن جی نہیں سکے گا۔ وہ اپنے ان آخری دنوں میں بیوی کو بدحال دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس نے اسے سختی سے ہدایت کررکھی ہے کہ وہ خستہ حالت میں اس کے سامنے نہ آئے۔ وکرم کے مجبور کرنے پر وہ بے چاری خود کو بنا سنوار کر رکھتی ہے ورنہ سب جانتے ہیں جو اس پر بیت رہی ہے۔ ان کی اولاد نہیں ہے اور اولاد نہ ہونے سے اکثر میاں بیوی کی محبت کم ہونے کے بجائے اور بڑھ جاتی ہے۔''
''تمہارا اس عورت سے کیا تعلق ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''کیا مطلب؟''
''کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرو تو اچھا ہے، میں نے ابھی کچھ دیر پہلے تم دونوں کی باتیں سنی ہیں۔''
مولوی فدا نے کسی خاص ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا اور ٹھہرے لہجے میں بولا۔ ''میں ان تنگ نظر مولویوں میں سے نہیں ہوں جو چھوٹی چھوٹی بات پر مسلمان کو کافر قرار دیتے ہیں بلکہ اگر ذرا ٹھنڈے دل سے سوچا جائے تو کافر بھی تو آدم حوا کی اولاد ہیں۔ انسان ہونے کے ناتے سے ہمارے کچھ لگتے ہیں۔ اگر ہم پہلے ہی طے کرلیں گے کہ بس ان سے نفرت ہی کرنی ہے تو پھر ان کو اپنی طرف مائل کیسے کرسکیں گے؟ میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہا اپنے دل کی بات بتا رہا ہوں۔ میرے دل میں ان دونوں کے لیے بھی محبت ہے اور جہاں تک رام پیاری کی بات کررہے ہو وہ میرے لیے بہن، بیٹی جیسی ہی ہے۔''
''کون رام پیاری؟''
''وکرم کی یہ پتنی۔ اس کا نام رام پیاری ہے، اس کو گھر والے پیارو یا پیاری بھی کہتے ہیں۔'' مولوی فدا نے وضاحت کی۔
میں نے ابھی کچھ دیر پہلے مولوی فدا اور اس عورت کی جو گفتگو سنی تھی اس میں اسے مولوی فدا نے پیاری کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس وقت مولوی فدا کا یہ انداز تخاطب مجھے کافی مشکوک لگا تھا۔
مولوی فدا بھرائی ہوئی آواز میں اپنی جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ تمہارے جیسے لوگوں کے لیے کسی کا مولوی ہونا ہی جرم ہے، اس کے ہر کام کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس میں کیڑے نکالے جاتے ہیں۔ اچھے برے لوگ کہاں نہیں ہوتے۔ بے شک مولویوں کے روپ میں بھی کچھ...''
''اچھا مجھے ایک بات بتاؤ؟'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''کل صبح وہ سیدھا سادہ بندہ وارث تمہارے پاس آیا۔ اس نے تمہیں اپنی بپتا سنائی۔ وہ ڈرا ہوا تھا۔ گاؤں کے کئی دوسرے لوگوں کی طرح ہوائی چیزوں کی کارستانیوں سے پریشان تھا۔ کیا تم نے اس کی پریشانی سے فائدہ نہیں اٹھایا؟''
''کیا مطلب؟'' مولوی فدا کے چہرے پر اس دفعہ رنگ سا آکر گزر گیا۔
''تم نے اسے کوئی سیدھا راستہ دکھانے کے بجائے

نذرانہ لانے کے لیے کہا۔ ''دودھ دینے والی ایک صحت مند بکری، بادام اور گھی وغیرہ۔''

مولوی فدا پر کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ سر جھکا ہوا تھا پھر اس نے سر اٹھایا اور بولا۔ ''میرے پاس اس کی بھی وضاحت ہے پر پتا نہیں تم یہ مانو گے بھی یا نہیں۔''

''تم بتاؤ، میں پہلے کی طرح اب بھی کوشش کروں گا۔''

ساتھ والے کمرے میں رام پیاری نامی عورت کا واویلا اب بند ہو گیا تھا، شاید وہ تھک کر چپ ہو گئی تھی۔ دوسرے کمرے میں اس کا شوہر اب بھی کھانس رہا تھا۔

مولوی فدا نے کہا۔ ''میں مانتا ہوں کہ میں نے وارث سے نذرانہ لیا لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر میں نے نہ لیتا تو وہ کسی اور کے پاس چلا جاتا۔ نذرانہ یا خیر خیرات دیے بغیر اس کی تسلی ہونی ہی نہیں تھی تو پھر بجائے اس کے وارث کی خیر خیرات کسی ڈھونگی مولوی یا عامل کے پیٹ میں چلی جاتی، کیوں نہ اس سے کسی کا فائدہ ہوتا۔ میں نے وارث سے نذرانہ لیا اور یہ ایسا نذرانہ تھا جس کی کسی کو بہت سخت ضرورت تھی۔ شاید تم میری بات سمجھ گئے ہو گے۔ شہر کے ڈاکٹروں نے وکرم سے کہہ رکھا ہے کہ وہ اب بھی علاج کے قابل ہے لیکن جتنی ضرورت اسے دواؤں کی ہے، اتنی ہی اچھی خوراک کی بھی ہے۔ وارث نے جو بکری اور دوسرا سامان دیا ہے وہ میرے لیے ایک امانت کی طرح تھا اور وہ میں سارا یہاں وکرم کے پاس لے آیا ہوں، اس میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی میرے لیے حرام ہے۔'' مولوی فدا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

مولوی فدا محمد کے بارے میں میرے شبہات ڈانواں ڈول ہونے لگے تھے، وہ جو کچھ بتا رہا تھا اس میں وزن تھا۔ اس کے علاوہ مجھے مولوی فدا کی آنکھوں میں ایک عجیب سی غم آمیز کیفیت بھی نظر آ رہی تھی۔ غم آمیز اور کسی حد تک سکون آمیز۔ ایسی کیفیت یا تو سچے آدمی کی آنکھوں میں ہوتی ہے یا پھر بہت گہرے آدمی کی آنکھوں میں۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا لیکن ایک بات ایسی تھی جو مجھے مولوی فدا کے حوالے سے کسی طور بھی ہضم نہیں ہو رہی تھی اور وہ یہ کہ مولوی فدا نے پیر ولایت کی کچھ ایسی شعبدہ بازیوں کی تصدیق کی تھی جو کسی طور بھی قابلِ قبول نہیں تھی۔ دو بدصورت عورتوں کا گاؤں میں موجود ہونا اور ہر وقت تاجور کا پیچھا کرنا۔ گھروں میں اچانک آگ بھڑک اٹھنا اور خون کے چھینٹوں کا نظر آنا یا مرغیوں کے کٹے ہوئے سر ملنا۔ مولوی فدا کو گاؤں میں ایک سمجھدار اور عالم شخص جانا جاتا تھا۔ اکثر لوگ سمجھتے تھے کہ مولوی فدا کی باتیں من گھڑت اور بے بنیاد نہیں ہوتیں پھر اس شعبدہ بازی کی حمایت کیا معنی رکھتی تھی۔ کیا مولوی فدا کے پاس اس کا بھی کوئی معقول جواز تھا۔ میرے خیال میں اس کا کوئی معقول جواز ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

چوٹ لگنے سے مولوی فدا کے سر سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ میں نے ایک لوٹے میں پانی دیا تاکہ مولوی فدا اس خون کو صاف کر کے زخم پر روئی یا راکھ وغیرہ رکھ سکے۔ پستول بدستور میرے ہاتھ میں تھا اور میرا منہ سر سیاہ ڈھاٹے میں چھپا ہوا تھا۔ میری صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ مولوی فدا کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا کہ میں وہی ٹریکٹر ڈرائیور ہوں جسے دین محمد نے تین چار دن پہلے ملازم رکھا ہے۔ وہ مجھے یقیناً گاؤں کے باہر کا کوئی بندہ سمجھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ بار بار میری سیاہ جرسی کی طرف بھی اٹھتی تھی۔ شاید اس کے ذہن میں یہ بھی آیا ہو کہ میں کوئی حاضر سروس یا سابق پولیس والا ہوں۔

جس وقت مولوی فدا اپنے زخم صاف کر رہا تھا میں کھڑکی سے باہر چٹکی ہوئی چاندنی کو دیکھ رہا تھا۔ سردیوں کی یہ ٹھٹھری ہوئی چاندنی دور تک کھیتوں کھلیانوں اور باغیچوں کو روشن کر رہی تھی۔ پاس ہی کہیں کسی سوئے (چھوٹی نہر) کا چمکتا ہوا پانی بھی نظر آتا تھا۔ گاہے بگاہے کسی بے تاب چکور کی صدا ابھرتی تھی اور سناٹے میں دور تک پھیل جاتی تھی۔ ایسے مناظر میں نے کوپن ہیگن اور لندن میں کہاں دیکھے تھے، نہ ہی پاکستان کی یہ سادہ و حسین تصویر مجھے لاہور میں نظر آئی تھی۔

کہتے ہیں کسی خوب صورت چیز کو فدا ہو جانے والی نظروں سے دیر تک دیکھا جائے تو اسے نظر لگ جاتی ہے۔ اس منظر کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ اچانک گھر کا بیرونی دروازہ دھڑ دھڑ بجایا گیا، ساتھ ہی آواز آئی۔

''پیاری... رام پیاری دروازہ کھولو، جلدی کرو۔''

میں نے پہچان لیا، یہ اسی پہلوان حشمت راہی کی آواز تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے مولوی فدا کی طرف دیکھا، وہ بھی حیران اور کسی حد تک پریشان تھا۔ میں نے تیز سرگوشی میں کہا۔ ''دروازہ کھولو، لیکن کچھ بتانا نہیں۔ میں یہاں اس دروازے کے پیچھے موجود ہوں اور یاد رکھنا، میں گولی چلانے میں زیادہ دیر نہیں کروں گا۔''

کچھ تذبذب کے بعد مولوی فدا محمد نے آگے بڑھ کر

بیرونی دروازہ کھولا۔ میں ایک قریبی کمرے میں چلا گیا تھا اور دروازے کے تختوں کے درمیان سے دیکھ رہا تھا۔ اندر آنے والا پہلوان حشمت ہی تھا۔ وہ ہانپا ہوا تھا اور گھبرایا ہوا بھی۔ اس نے اندر کے ماحول کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ یہاں تک کہ مولوی فدا کے سر کی چوٹ پر بھی دھیان نہیں دیا، وہ بولا۔ ''مولوی صاحب آپ یہاں؟''

''ہاں کام سے آیا تھا۔'' مولوی فدا نے متانت سے کہا۔

''بہت گڑبڑ ہوگئی ہے جی، میں دیکھ کر آیا ہوں۔ وہ لوگ ادھر ہی آرہے ہیں، اب کی بار بہت غصے میں ہیں۔ ان کا بچہ مرگیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ وکرم اور پیاری کو نقصان پہنچادیں گے۔ کم از کم مار پیٹ کر یہاں سے نکال تو ضرور دیں گے۔''

''یہ کیا بات ہوئی، یہ تو سراسر بے وقوفی ہے جہالت ہے۔ اگر ان کا بچہ قضائے الٰہی سے چلا گیا ہے تو اس میں ان میاں بیوی کا کیا قصور ہے۔''

ابھی مولوی فدا کی بات جاری تھی کہ میری نگاہ ادھ کھلی کھڑکی سے باہر چلی گئی۔ میں نے ایک ٹریکٹر ٹرالی کو دیکھا، وہ تیزی سے اچھلتی کودتی اس گھر کی طرف آرہی تھی۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ اس میں پچیس افراد سوار تھے۔ عقب میں چار پانچ گھڑ سوار بھی تھے۔ کچھ کے ہاتھوں میں لالٹینیں اور لاٹھیاں وغیرہ صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

ذرا سی دیر میں یہ لوگ اس مکان کے سامنے پہنچ گئے۔ انہوں نے پلک جھپکتے میں بیرونی دروازہ توڑ دیا اور صحن میں گھس آئے۔ یہ سب مقامی دیہاتی تھے، ان میں سے کم و بیش پانچ بندوں کے پاس آتشیں اسلحہ موجود تھا۔ باقی لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ اپنے سامنے مولوی فدا کو دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکے پھر ان میں سے ایک بڑے پگڑ والے کیم شحیم نے آگے آکر کہا۔ ''مولوی جی، کہاں ہے وہ حرام کی جنی رام پیاری اور اس کا منحوس پتی؟''

''پر پتا تو چلے ہوا کیا ہے؟'' مولوی فدا نے لوگوں کے سامنے آتے ہوئے پوچھا۔

''جو ہونا تھا جی وہ بس ہوگیا ہے، اب ہماری باری ہے۔ مار مار کر ان کی ہڈیاں توڑیں گے اور پھینک کر آئیں گے اپنے پنڈ کی زمینوں سے باہر۔'' پگڑ والے شخص نے پکار کر کہا۔ اس کے ہاتھوں میں سیون ایم ایم رائفل تھی۔

مولوی فدا نے اس کا راستہ روکا۔ ''دیکھو... تمہیں ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ زندگی اور موت اوپر والے کے ہاتھ میں ہے اور پھر... یہ غیر مسلم جو بھی ہیں لیکن انسان ہیں۔ یہ ہماری پناہ میں ہوتے ہیں اللہ نے ہمیں ان کے حق حقوق بتائے ہیں... اور یہ بھی تو دیکھو کہ...''

''مولوی جی ہم آپ کی عزت کرتے ہیں۔ پر چنگا یہی ہے کہ آپ اس معاملے میں نہ بولیں۔ آپ پیچھے ہٹ جائیں۔'' اس نے مولوی فدا کو ذرا پیچھے ہٹانا چاہا۔ مولوی فدا نے قدم پیچھے نہیں ہٹائے۔ یہ مولوی فدا کا ایک نیا اور روشن روپ میرے سامنے آیا تھا۔

پہلوان حشمت غصے سے بولا۔ ''مولوی جی سے زبانی بات کرو، ہاتھ نہیں لگاؤ۔''

پگڑ والے کا ایک ساتھی دو قدم آگے آکر پھنکارا۔ ''یہ تمہارے نہیں سب کے مولوی جی ہیں، پر یہ اس معاملے سے دور رہیں تو ٹھیک ہے۔''

ایک دم میرے دل نے گواہی دی کہ یہاں معاملہ زیادہ خراب ہونے والا ہے۔ میں نے کھڑکی میں سے دو تین دیہاتی تانگوں کو دیکھا، ان پر بھی مشتعل افراد سوار تھے اور یہ اس مکان کی طرف آرہے تھے۔ میں نے تیزی سے فیصلہ کیا اور کمرے سے نکل آیا۔ بالکل ساتھ ہی اس کمرے کا دروازہ تھا جہاں میں نے رام پیاری اور مولوی فدا کے بے ہوش شاگرد کو بند کیا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو ڈری سہمی رام پیاری ایک گوشے میں سمٹ گئی۔ یقیناً وہ باہر سے بلند ہونے والا شور و غل اور ہنگامے سن چکی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنے ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔ ہم اندر کی طرف گئے اور اس کمرے میں پہنچے جہاں ہڈیوں کا ڈھانچا وکرم بستر پر چت لیٹا تھا۔ کچھ لوگ ایسے مریض کے قریب جانا بھی پسند نہیں کرتے لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا، میں نے اس ہلکے پھلکے شخص کو اٹھا کر اپنے کندھے پر لادا اور رام پیاری کے ساتھ گھر کے عقبی دروازے کی طرف بڑھا۔ تب تک مشتعل افراد گھر میں توڑ پھوڑ شروع کر چکے تھے اور کہیں آگ بھی لگا دی گئی تھی۔ رام پیاری مجھ سے چمٹ کر رہ گئی تھی۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

الوداعی تحفہ

جمال دستی

چہکتی مہکتی بیوی کا ساتھ اس کے لیے کسی انعام سے کم نہ تھا... مگر اس کی شوخی نے اسے بے رخی برتنے پر مجبور کردیا تھا... وہ روتھا روتھا اور اکھڑا اکھڑا سا تھا... بالآخر بیوی نے اسے اور اس نے بیوی کو منانے کا ایک چونکا دینے والا منفرد طریقہ سوچ لیا تھا... جاسوسی مزاج رکھنے والوں کے لیے توشہ خاص۔

[illegible]

فریڈرک روش پر آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اپنے گھر کے داخلی دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے تالا کھولا اور ہال وے میں داخل ہوگیا۔ ہال وے کا ماحول باہر کے سرد موسم کے مقابلے میں خاصا گرم تھا۔

وہ ایک لمحے کے لیے وہیں کھڑا رہا۔ ہال نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے اپنے سر کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے گہرے سانس لینا شروع کردیے۔ گھر کی پرانی مانوس خوشبو اسے بھلی محسوس ہورہی تھی پھر اس کا دھیان اس کام پر

چلا گیا جو وہ کرنے جا رہا تھا۔
اتنے میں اوپری منزل کے کمرے سے اس کی بیوی نے پکارا۔ ''فریڈرک، کیا یہ تم ہو؟''
فریڈرک اپنی بیوی کی آواز سن کر کپکپا گیا اور اس کے ہاتھ کی گرفت اس کے اوورکوٹ کی جیب میں رکھی ہوئی گول سی شے پر اور مضبوط ہوگئی۔ اس نے اپنی آواز حتی الامکان قابو میں رکھتے ہوئے جواباً بلند آواز سے کہا۔ ''ہاں، یہ میں ہی ہوں، ہنی!'' لیکن اندر اس کے جسم میں ایک خوف کی لہر سی دوڑ گئی۔
اس نے اپنے بریسٹ پاکٹ میں سے ایک سگریٹ نکالی اور اپنے خشک ہونٹوں کے درمیان دبالی۔ وہ بغیر جلی سگریٹ کے تمباکو کے ذائقے کو زبان پر محسوس کر رہا تھا پھر اس نے اپنا کوٹ اور ہیٹ اتار دیا اور انہیں ان پیک شدہ بیگز کے اوپر اچھال دیا جو دروازے کے قریب ہیٹ ریک کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے اوورکوٹ کی جیب میں موجود گول شے کے پیکٹ کو پہلے ہی نکال کر ہاتھ میں لے چکا تھا۔
وہ اس پیکٹ کو ہاتھ میں دبائے دبے پیروں سے کچن میں چلا گیا۔ نیچے تہ خانے کا دروازہ کچن میں سے تھا۔ اس نے اپنا ورکشاپ تہ خانے میں بنایا ہوا تھا۔ نیچے اترنے کی سیڑھیاں لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔ وہ دروازہ کھول کر ایک منٹ وہیں کھڑا رہا۔ وہ اپنے چہرے کی رگوں میں تیزی سے دوڑتے ہوئے خون اور اپنے سر میں چکر آنے کی کیفیت کو صاف محسوس کر رہا تھا۔
پھر وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے تہ خانے میں آگیا اور تہ خانے کی لائٹ آن کر دی۔ بغیر جلی سگریٹ بدستور اس کے ہونٹوں کے درمیان دبی ہوئی تھی۔ وہ اپنی ورک بینچ پر بیٹھ گیا۔ پھر احتیاط کے ساتھ ہاتھ میں دبے ہوئے پیکٹ کا ریپر اتارنے لگا۔
پیکٹ کے اندر سے پیتل کا بنا ہوا ایک قیمتی ٹیبل لائٹر برآمد ہوا۔ یہ ٹیبل لائٹر گلوب کی شکل کا تھا جس پر دنیا کا نقشہ نہایت صفائی اور مہارت سے کندہ تھا۔ اس گلوب میں اگنیشن کا بٹن قطب شمالی کے مقام پر تھا۔
فریڈرک نے اپنے ہونٹوں میں دبی ہوئی سگریٹ نکال کر ایک طرف رکھ دی اور ریک پر سے ایک اسکرو ڈرائیور اٹھا لیا۔ اس نے لائٹر کے اوپر ڈھکن کا اسکرو کھول دیا اور اس میں رکھی ہوئی کاٹن وول نکال کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دی۔ ریک میں اس کے مختلف اوزار رکھے ہوئے تھے۔ ان ہی کے درمیان پستول پاؤڈر کا ایک کنستر بھی موجود تھا۔ پھر اس نے لائٹر کا فتیلہ ہٹا دیا اور اس کی جگہ ایک چھوٹا سا تیزی سے جلنے والا فیوز فٹ کر دیا۔ پھر لائٹر کی تہ میں پستول پاؤڈر انڈیلنے لگا۔
فریڈرک کو پاؤڈر اور گیس کے دباؤ کے بارے میں مکمل معلومات حاصل تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ جب کوئی لائٹر کو اٹھائے گا اور اسے سگریٹ کے سرے پر پکڑنے کے بعد شعلہ دکھانے کے لیے لائٹر کا بٹن دبائے گا تو پھر کیا ہوگا۔
یقیناً روشنی تو ضرور ہوگی...... لیکن وہ روشنی ایسی ہوگی جو انہیں آخرت کی حیات جاودانی کا راستہ دکھا دے گی۔ ہوا کی گنجائش کا نہ ہونا، پستول پاؤڈر کے سیکڑوں باریک ذرات جو کہ لائٹر کی تہ میں کمپریسڈ ہوں گے، ایک دستی بم کے مانند مہلک ثابت ہوں گے۔
فریڈرک ایک بار پہلے بھی یہ تجربہ کر چکا تھا۔ پاؤڈر کے صرف چند ذرات جو صحیح طور پر لوڈ نہ کی جانے والی گولی سے کارٹرج کی تہ میں جام ہو چکے تھے، گیس کے پھیلتے ہوئے دباؤ کے لیے ہوا کی جگہ نہ ہونے کی بنا پر اس کے ایک ہیوی فریم کے عمدہ ریوالور کا ستیاناس کر چکے تھے اور یہ تباہ شدہ ریوالور اب بھی اس کی فائلنگ کیبنٹ کی ایک دراز میں رکھا ہوا تھا۔
اس نے ٹیبل لائٹر کے اوپری ڈھکن کو بند کر کے اس کا اسکرو دوبارہ کس دیا۔ پھر لائٹر کو اس احتیاط کے ساتھ اٹھا کر سیڑھیوں کی جانب بڑھنے لگا جیسے اس کے ہاتھ میں نائٹرو گلیسرین کی بوتل ہو۔
وہ خود کو بے حد کمزور محسوس کر رہا تھا۔ جیسے اس نے یہ سہ پہر اپنے بلاک کے اطراف میں دوڑتے ہوئے گزاری ہو۔ اوپر کچن میں پہنچ کر اس نے تہ خانے کا دروازہ بند کر دیا اور اس سے پشت لگا کر اس وقت تک کھڑا رہا جب تک اس کے شانے کی ہڈیوں میں درد شروع نہیں ہوا۔
پھر وہ پانی پینے کے لیے نلکے کی طرف چلا گیا۔ اس نے پانی پیا اور آہستہ آہستہ قدموں سے واپس لیونگ روم میں آگیا۔ اس نے نہایت احتیاط کے ساتھ وہ ٹیبل لائٹر کاک ٹیل ٹیبل پر ایک ایسی جگہ رکھ دیا جہاں وہ کسی کی بھی نظروں سے اوجھل نہ رہے۔
وہ جانتا تھا کہ یہ دیدہ زیب لائٹر ہاروے کو ضرور متاثر کرے گا جو بلانوش سگریٹ پینے کا عادی ہے۔ وہ اس سگریٹ لائٹر کو دیکھتے ہی سب سے پہلے اسے اٹھا لے گا۔
فریڈرک نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ہاروے کے ہینڈسم چہرے کا تصور کرنے لگا۔
پھر وہ کمرے سے باہر ہال وے میں آگیا اور اپنا

ہیٹ اور کوٹ پہننے لگا۔

اتنے میں اس کی بیوی ایوا اوپری منزل سے اتر کر نیچے آگئی۔ فریڈرک وہیں دروازے پر رک گیا اور اسے دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہیں ایوا کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں...... اس کے شانوں پر لہراتی ہوئی بھوری لمبی زلفیں، حسین دلکش چہرہ، پُرکشش جسم...... فریڈرک کے جذبات اُمڈنے لگے اور ایوا کی قربت کی خواہش ایک بار پھر عود کر آئی۔

وہ لیونگ روم کی جانب گھوم گیا اور ہچکچاتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھایا۔

''کیا ناراض ہو، فریڈی؟'' ایوا نے پوچھا۔

ایوا کی سُریلی آواز نے اس کی مضبوط قوتِ ارادی کو جیسے دولخت کر دیا۔

فریڈرک نے قہقہہ لگایا تو اسے اپنے ذہن میں اس کی بازگشت کھوکھلی اور جھوٹی محسوس ہونے لگی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔ میرا خیال ہے میں تھکا ہوا ہوں۔ بہت سخت دن گزرا ہے۔'' اس کے لہجے سے کمزوری عیاں تھی۔

ایوا اس کے نزدیک آگئی اور اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھ دیا۔

ایوا کے لمس نے جیسے فریڈرک کے ذہن کا ٹریگر دبا دیا اور اس کے اندر کی نفرت امڈ آئی اور نفرت کا یہ جذبہ اتنی شدت اختیار کر گیا کہ اگر ایوا نے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر سے نہ ہٹایا تو وہ ایوا کو ابھی اور اسی وقت قتل کر دے گا...... کسی اوزار، آلے، ترکیب یا طویل المدت منصوبے کے بغیر۔

پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''کیا ہاروے نے اپنے کیس کے لیے ابھی تک کوئی رابطہ نہیں کیا، ایوا؟'' ساتھ ہی اس کی تیز مشتبہ نگاہیں ایوا کی نظروں کو ٹٹولنے لگیں کہ ان میں خوف یا اپنے اعترافِ جرم کی کوئی جھلک تو عیاں نہیں ہو رہی ہے۔

تب ایوا نے اس کے بازو پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور اس کے رخسار گلابی ہو گئے۔ ''خدا کے لیے فریڈی، کیا ہمیں یہ سب کچھ پھر سے دہرانا ہوگا؟ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ آخری مرتبہ جب وہ یہاں آیا تھا تو وہ اپنا سگریٹ کیس یہاں لیونگ روم میں بھول گیا تھا اور میں اسے اٹھا کر اوپر بیڈ روم میں لے گئی تھی تاکہ وہ تمہیں دینا نہ بھول جاؤں اور جب تمہاری اس سے دفتر میں ملاقات ہو تو وہ تم اسے دے دو۔ کیا یہ تمہارے لیے معقول جواب نہیں ہے؟ کیا تم مجھ سے یہ توقع کرتے ہو کہ اپنے ہی شوہر کو یقین دلانے کے لیے میں اس کے قدموں میں جھک کر بھیک مانگوں؟'' اس کی آواز میں اتنا تناؤ تھا جیسے وائلن کے تار میں ہوتا ہے...... جیسے ایوا نے اس کے ذہن میں مزاحمت کے تاروں کو جھنجوڑ دیا ہو۔

فریڈرک کا ذہن ایک بار پھر لیونگ روم کی میز پر رکھے ہوئے گلوب نما ٹیبل لائٹر کی طرف چلا گیا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اسے اپنے منہ میں کڑواہٹ سی محسوس ہونے لگی جیسے بخار کی کیفیت میں ذائقہ تلخ ہو جاتا ہے۔ پھر اس نے اچانک ایوا کو اپنی طرف کھینچ لیا اور اس کے ہونٹوں پر جھک گیا۔ ایوا کے بدن کی ملائمت، اس کے مخصوص پسندیدہ پرفیوم کی تیز خوشبو، اس کی لپ اسٹک کا ذائقہ...... اس کی مہینوں کی دبی ہوئی خواہش کو جھنجوڑنے لگا لیکن پھر اس کے نفرت کے جذبے نے اس کیفیت پر فوراً ہی قابو پا لیا۔

''او کے۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔ ''او کے، ہنی! ان باتوں کو فراموش کرتے ہیں۔'' اس نے دروازہ کھولتے ہوئے اپنے بیگ اٹھا لیے۔ ''میں واپس آجاؤں گا۔ ہو سکتا ہے وقت لگ جائے۔ شاید ایک ہفتہ یا اس سے زیادہ۔''

''سنہری زلفوں والی اسپینی دوشیزاؤں سے ہوشیار رہنا۔'' ایوا نے اس کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ میں گھر سے اتنی دوری پر تم پر اعتبار کروں یا نہ کروں؟''

'مجھ پر اعتبار' فریڈرک نے تلخی سے سوچا؟ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے یا نہیں؟ اس نے یہ سوچ کر ایک قہقہہ لگانے کی کوشش کی کہ شاید یہ فٹ بیٹھ جائے۔ لیکن جب قہقہے سے بات نہ بنی تو وہ پلٹ گیا اور گھر سے نکل کر تیزی سے اپنی کار کی جانب چل دیا۔

باہر کی فضا میں خزاں کی چبھنے والی ہلکی سی تلخی موجود تھی۔ اسے سانس لیتے ہوئے یہ تلخی اپنے پھیپھڑوں میں محسوس ہو رہی تھی۔

پھر اسے اپنے اور ایوا کی قربت کے وہ دن یاد آگئے جب تک ہاروے نے اس کی فرم میں شمولیت اختیار نہیں کی تھی۔ وہ اور ایوا زندگی سے خوب لطف اندوز ہو رہے تھے اور ان کے درمیان کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں تھا۔

تب ہاروے کی ان کے گھر ہفتہ وار آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا اور تان اس وقت ٹوٹی جب ہاروے ان کے

برابر کے گھر میں منتقل ہو گیا۔
فریڈرک نے غصے سے کار کو دوسرے گیئر میں ڈالا تو کار کی ٹرانسمیشن ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گئی۔ جب وہ ہاروے کے مکان کے سامنے سے گزر رہا تھا تو کھڑکی کے شیڈ کے پیچھے اسے، ہاروے کے جثے کا سایہ دکھائی دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے کارنر تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ بے تاب شخص چوری چھپے باڑھ کے درمیانی گیٹ سے گزر کر وہاں پہنچ جائے گا جہاں ایوا اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔
فریڈرک نے کار کا گیئر تبدیل کیا اور کار کی رفتار بڑھا دی۔ سڑک کے کارنر پر پہنچ کر اس نے کار مرکزی شاہراہ پر گھما دی اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

☆☆☆

ہاروے، فریڈرک کے لیونگ روم کے درمیان کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بچگانہ سی ہنسی تھی۔ دیکھنے میں یہ ایک عیدہ ہنسی لگتی تھی جو کچھ عورتوں کے لیے متاثر کن ثابت ہوتی تھی۔ اس کی نظریں فریڈرک کی بیوی ایوا پر مرکوز تھیں۔
ہاروے کے چہرے پر ہلکا سا پسینا تھا۔ وہ ایوا سے مخاطب ہوا۔ ''دیکھو، اب آگے بہت ہی عیش و آرام ہے، ایوا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ جلد ہی سب کام تمام ہو جائے گا۔''
یہ کہہ کر وہ میز کی جانب چلا گیا اور اس پر رکھے ہوئے سگریٹ کے پیکٹ کو اس طرح گھمایا کہ ایک سگریٹ نکل کر باہر آ گئی۔ اس نے سگریٹ کا ایک سرا میز پر تھپتھپایا اور سگریٹ منہ میں دبا لی۔ پھر اس نے میز پر رکھا ہوا گلوب نما ٹیبل لائٹر اٹھایا اور اپنے ہاتھ میں تھامتے ہوئے بولا۔ ''بڑا اچھا چھوٹا سا خوشنما پیس ہے۔ یہ تم نے کہاں سے لیا؟''
ایوا اسٹوڈیو کاؤچ پر بیٹھی اپنے ہاتھوں کو تک رہی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ تناؤ کی کیفیت میں ہے۔ ہاروے کی بلند آواز نے جیسے اسے چونکا دیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا سر اوپر اٹھایا اور لائٹر پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالنے کے بعد لاتعلقی سے اپنے شانے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے نہیں معلوم، ہاروے۔ میرا خیال ہے یہ وہی لایا ہو گا۔ وہ اس قسم کی چیزیں اکثر گھر میں لاتا رہتا ہے۔''
ہاروے نے ٹیبل لائٹر واپس میز پر رکھ دیا اور اپنے لیے گلاس میں مشروب انڈیلنے لگا۔
ایوا نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے انہیں تر کیا اور بولی۔ ''کب ہاروے، کب؟ ابھی اور کتنا انتظار کرنا ہوگا؟''
ہاروے نے مشروب کو ایک ہی گھونٹ میں اپنے حلق سے نیچے اتار لیا اور اپنی دستی گھڑی پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ ''جب وہ ٹرن پائیک پہاڑی پر پہنچے گا تو وہاں کے خطرناک موڑ پر اسے تیز بریک لگانا پڑیں گے۔ جب وہ بریک دبائے گا تو بریک کا کیبل ٹوٹ جائے گا۔ میں نے ایمرجنسی بریک کا دھیان بھی رکھا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ایک اور جام انڈیلنے لگا۔ ''وہاں پر جو حفاظتی جنگلا بنا ہوا ہے، وہاں سے نیچے کھائی سوفٹ سے زیادہ گہری ہے۔ اسے کچھ محسوس بھی نہیں ہوگا کہ اس پر کیا گزری ہے۔''
ایوا یہ سن کر کانپ گئی۔
ہاروے نے اس کی کیفیت دیکھتے ہوئے سگریٹ اپنے منہ سے نکال لی اور اس کی جانب بڑھ گیا۔ ایوا بھی رضامندی اور اطمینان کے ساتھ اس کے بازوؤں میں سما گئی۔ ہاروے کا چہرہ اس کے چہرے پر جھک گیا۔
ایوا چند لمحوں تک ہاروے کی بانہوں میں یونہی ساکت پڑی رہی۔ اس کی گرم سانسیں ہاروے کو اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھیں۔ ایوا کی آنکھیں بند تھیں۔ کمرے میں بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔
تب ہاروے نے سگریٹ اٹھا کر دوبارہ اپنے ہونٹوں میں دبالی اور ایوا کو آہستگی کے ساتھ اپنے سے دور کر دیا۔ ''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، اینجل۔ کسی کو کسی قسم کا شبہ بھی نہیں ہوگا۔''
ایوا نے اپنا چہرہ دوبارہ ہاروے کے چہرے پر جھکا دیا اور مسکراتے ہوئے اس کے ہونٹوں میں دبی سگریٹ سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ ساتھ ہی اس کا ہاتھ میز پر رکھے ہوئے گلوب نما لائٹر کو ٹٹولنے لگا۔ لائٹر سے انگلیاں ٹکراتے ہی اس نے لائٹر کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ پھر اپنا دوسرا بازو ہاروے کی گردن میں حمائل کرتے ہوئے اس کے سر کو اپنے سر کی جانب کھینچ لیا۔
سگریٹ بدستور ہاروے کے ہونٹوں میں دبی ہوئی تھی۔ ایوا کو بخوبی علم تھا کہ ہاروے بلانوش ہے اور سگریٹ کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اس نے لائٹر کے فتیلے والے حصے کو سگریٹ کے کنارے پر ٹچ کر دیا اور ہاروے کے کان پر اپنے ہونٹ رگڑتے ہوئے بولی۔ ''لائٹ، ڈارلنگ!''
ساتھ ہی لائٹر کا بٹن دبا دیا۔۔۔

لالچ

پرویز بلگرامی

کچھ لوگ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مزید کی چاہ میں مبتلا رہتے ہیں... ان کی نظریں ہمہ وقت کسی نہ کسی شکار کی تاک میں لگی رہتی ہیں۔ اسی عالمِ ہوش و بے خبری میں وہ ان کو شکار کر بیٹھتے ہیں... جن سے وہ کوئی نہ کوئی تعلق رکھتے ہیں... ان کی قربتوں کے سائے میں پروان چڑھنے کے باوجود نفرتوں کے الاؤ میں دہکتے رہتے ہیں... ان دغا باز لمحات کی کہانی جب انسانی رشتوں نے اپنا اعتبار کھو دیا...

روشن خیال لوگوں کے تاریک جذبات و

خیالات کی ترجمان پُرانتقام کہانی......

ڈاکٹر روبینہ جیسے ہی اسپتال کے کوریڈور میں پہنچی، اس کا سامنا ہیڈ نرس آصفہ سے ہو گیا۔ اس نے ڈاکٹر کو سلام کیا اور بتایا۔ ''کیس کمپلیکیٹڈ ہے اسی لیے ڈاکٹر رشید نے رائے دی ہے کہ آپ کو بلایا جائے۔ یہ ہے مریضہ کی فائل۔'' اس نے فائل ڈاکٹر روبینہ کی طرف بڑھا دی۔

ڈاکٹر روبینہ فائل کی ورق گردانی کرنے لگی۔

اسی وقت کوری ڈور میں بچھی بینچ پر بیٹھے ایک بھاری بدن کے شخص نے کھڑے ہو کر ڈاکٹر کو سلام کیا۔ سلام کی

آواز پر وہ ٹھٹک گئی اور اس کی طرف دیکھ کر بولی ''وعلیکم السلام... کچھ کہنا ہے؟''

''ڈاکٹر یہ ایف آئی اے کے انسپکٹر ہیں۔'' نرس جلدی سے بولی۔

''ایف آئی اے... کیوں... ان کا کوئی کیس ہے کیا؟''

''جی ہاں... وہ... جس ..... کے لیے آپ کو بلوایا ہے وہ ان کی مریضہ ہے۔''

''اوہ... اچھا'' ڈاکٹر روبینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر، میرا نام انور اقبال ہے۔ میں جس کیس پر کام کر رہا ہوں اس میں یہ پیشنٹ بہت اہم ہے... ہو سکتا ہے ہم اسے سی ایم ایچ منتقل کر دیں۔''

''او کے... پہلے مجھے دیکھ لینے دیں۔'' ڈاکٹر روبینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ضرور...'' انور کہتا ہوا سامنے سے ہٹ گیا۔

ڈاکٹر روبینہ وارڈ کی جانب بڑھتی چلی گئی۔

اندر پہنچتے ہی اس کی نظر ڈاکٹر رشید پر پڑی۔ آئی سی یو میں اس وقت وہی آن ڈیوٹی تھا۔ وہ اس کی جانب بڑھتی چلی گئی۔

نزدیک پہنچتے ہی ڈاکٹر رشید نے اس سے کہا ''ویری سیریس کنڈیشن... کسی اونچی جگہ سے گری ہے۔''

ڈاکٹر روبینہ مریضہ کو چیک کرنے لگی۔ معائنے کے بعد وہ بولی۔ ''خدا کا شکر ہے کہ بے بی سیف ہے۔''

''اگر اسے ہوش نہیں آیا تو پرابلم ہو سکتی ہے۔'' ڈاکٹر رشید نے خاتون مریض پر نظریں جما کر کہا۔

''آف کورس۔'' ڈاکٹر روبینہ بولی۔

تبھی نرس کی نظر مریضہ پر پڑی۔ اس کی انگلیوں میں حرکت ہوئی تھی۔ وہ بولی ''ڈاکٹر... ابھی میں نے اس کی انگلی میں حرکت دیکھی ہے۔''

ڈاکٹر رشید نے ہنس کر کہا۔ ''پہلے پپوٹے حرکت میں آتے ہیں۔''

''نہیں ایسا ہر کیس میں نہیں ہوتا... کبھی کبھی انگلیوں میں بھی پہلے حرکت آجاتی ہے۔ انور صاحب کو اندر بلالو۔''

نرس نے وارڈ سے سر باہر نکال کر اشارہ کیا۔ انسپکٹر انور فوراً اندر آ گیا۔

انور کے اندر آتے ہی ڈاکٹر روبینہ نے کہا۔ ''انور صاحب... ابھی ابھی مریضہ کی انگلیوں میں حرکت ہوئی تھی۔''

''گڈ... ونڈرفل سائین...''

''سر آپ اس مریضہ کے بارے میں کچھ بتائیں گے۔'' ڈاکٹر رشید نے پوچھا۔

''آف کورس... اس لڑکی کے پاس کچھ ایسی اطلاعات ہیں جو ہمارے کام آسکتی ہیں۔''

''کیسی معلومات؟'' ڈاکٹر روبینہ نے پوچھا۔

''آپ نے ڈرگ ڈیلر شاناخان کا نام سنا ہوگا، یہ اس کی ساتھی ہے مگر ہم نے اسے توڑ لیا تھا... پتا نہیں کیسے انہیں اس پر شک ہوگیا۔ یہ اسے قتل کر رہے تھے کہ میں نے بچالیا۔ بھاگتے وقت گاڑی ٹکرا گئی اور یہ اچھل کر باہر جا گری تھی۔ تب سے بے ہوش ہے۔'' انسپکٹر انور نے بتایا۔

''آپ بے فکر رہیں... ہم اپنی جان سے بڑھ کر اس کی حفاظت کریں گے۔''

''یاد رہے... شاناخان کے آدمی اس کی تاک میں ہوں گے۔'' انور نے فکرمند لہجے میں بتایا۔

انور کی بات پر ڈاکٹر روبینہ نے ڈاکٹر رشید کی طرف دیکھا اور ڈاکٹر رشید نے روبینہ کی طرف۔ دونوں کی آنکھوں میں عجیب سی خوشی کی جھلک آگئی تھی، جیسے وہ انور کی بات پر انجانی سی خوشی محسوس کر رہے ہوں۔

''اسے کچھ ہوا تو...'' انور دو قدم آگے بڑھا پھر رک کر دونوں کے چہرے پر نظر ڈال کر بولا ''اس کی حفاظت آپ کی ذمے داری ہے... اچھا میں چلتا ہوں... یہ میرا کارڈ رکھ لیں، اس پر فون نمبر ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ڈاکٹر غصیلے انداز میں بولا۔

''ڈاکٹر تم نے اس کی بات سنی... جیسے ہم اس کے غلام ہیں... ہنہ!''

روبینہ نے اس کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا۔ ''مٹی پاؤ... چلو گھر چلتے ہیں۔''

وہ دونوں اسپتال سے باہر نکل آئے۔ ڈاکٹر روبینہ نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''آجاؤ... میں راستے میں تمہیں ڈراپ کردوں گی۔''

☆☆☆

رات کے دس بج رہے تھے۔ ڈاکٹر روبینہ اپنے بستر پر نیم دراز تھی۔ اس کے ہاتھ میں میڈیکل جنرل تھا جس کے صفحات پر وہ نشان بھی کھینچتی جا رہی تھی کہ برابر والی ٹیبل پر رکھا فون بج اٹھا۔ ڈاکٹر روبینہ نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ ''ہیلو... کون؟''

دوسری جانب سے ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ ''میری بیٹی سے بات کرا۔''

''اس وقت ممکن نہیں ہے۔'' ڈاکٹر روبینہ نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

''کیوں... کیا تیری موت کے سوگ میں وہ بیٹھی رو رہی ہے۔'' دوسری جانب سے دہاڑتی ہوئی آواز آئی۔

''کہا نا... اس وقت میں اس سے بات نہیں کرا سکتی... یہ سونے کا وقت ہے۔''

''وہ میری بیٹی ہے... میں جب چاہوں اُس سے بات کرسکتا ہوں۔ اُسے فون دے۔''

''ایسی باتیں نہ کرو ورنہ...'' روبینہ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ باتوں میں اس طرح مشغول تھی کہ اس نے دیکھا بھی نہیں کہ درمیانی دروازے کی آڑ میں ایک بچی کھڑی اسے خونخوار نظروں سے گھور رہی ہے۔

''ورنہ کیا... تُو کیا کرلے گی؟''

''میں پولیس کو انفارم کرسکتی ہوں۔'' ڈاکٹر روبینہ نے کہا اور ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔

ریسیور رکھے ایک لمحہ بھی نہ گزرا تھا کہ فون کی گھنٹی پھر سے بج اٹھی۔ ڈاکٹر روبینہ نے ریسیور اٹھا کر چیختی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اب اگر فون کیا تو میں پولیس کو کال کردوں گی۔''

''خیریت... کیا ہوا... کوئی ستا رہا ہے؟ میں انور بول رہا ہوں۔'' دوسری جانب سے انسپکٹر انور کی آواز سنائی دی۔

''اوہ... آپ ہیں؟'' ڈاکٹر روبینہ نے نرم آواز میں جواباً کہا۔ ''پتا نہیں کون بدمعاش ہے جو بار بار تنگ کررہا ہے۔''

''میں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اب مریضہ کی طبیعت کیسی ہے؟'' انور کی آواز آئی۔

''ابھی تک اسے ہوش نہیں آیا ہے... میں چیک کرکے آئی ہوں۔''

''او کے گڈ نائٹ!''

روبینہ نے ریسیور کو کریڈل پر رکھا اور بستر سے نیچے اتر گئی۔ اس کے قدم برابر والے کمرے کی طرف اٹھ رہے تھے۔ اس کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر آٹھ سالہ بچی پر جم گئی۔ اس نے نرم لہجے میں کہا ''سوئی نہیں... صبح اسکول جانا ہے۔''

''سو جاؤں گی۔'' بچی نے غصیلے انداز میں کہا۔

''ارے... غصے میں ہو کیا؟'' وہ پیار بھرے انداز

مشاہدہ

دہلی میں ایم بی بی ایس کے طلبا کی اناٹومی کی کلاس ہورہی تھی۔ میز پر ایک مردہ کتا پڑا ہوا تھا۔ پروفیسر نے کتے کی ناک میں انگلی ڈالی اور اسے چکھا پھر اس نے طلبا سے بھی ایسا ہی کرنے کے لیے کہا۔ طلبا بے چین ہوگئے، جھجکے لیکن پروفیسر کی تقلید لازم تھی۔ سب نے مردہ کتے کی ناک میں انگلی ڈالی اور ناک منہ چڑھا کر، ناگواری سے اسے چکھا۔

جب طلبا اس مشق سے فارغ ہوگئے تو پروفیسر نے ان سے کہا۔ ''آج کا پہلا سبق ہے مشاہدہ۔ تم سب نے کتے کی ناک کی غلاظت اس لیے چکھی کہ تمہارا مشاہدہ ناقص ہے۔ جب میں یہ کام کررہا تھا تو تم سب کی توجہ کہیں اور تھی۔ میں نے کتے کی ناک میں اپنی درمیانی انگلی گھمائی تھی مگر منہ میں شہادت کی انگلی لے گیا تھا۔''

سب طلبا پروفیسر کی بات مکمل ہونے سے پہلے چلّائے۔ ''سالا کتا!''

فیضان طاہر کا ڈھاکا سے تعاون

میں بولی۔

''ہاں... آپ نے ڈیڈی کو ڈانٹا کیوں تھا؟''

''انہوں نے ایک غلط بات کہی تھی اس لیے۔'' روبینہ نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں... ڈیڈی کبھی غلط بات نہیں کہتے... وہ بہت اچھے ہیں۔'' بچی نے معصوم انداز میں کہا۔

''دیکھو صنم... بڑوں کی باتوں میں دخل نہیں دیتے... اب سو جاؤ... گڈ نائٹ!''

''گڈ نائٹ آنٹی۔'' یہ کہہ کر بچی نے چادر سے منہ ڈھک لیا۔ مگر جیسے ہی روبینہ کمرے سے باہر نکلی، بچی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر بیڈ کے سرہانے تپائی پر رکھی تصویر کو اٹھا کر آنکھوں سے لگا کر بولی۔ ''گڈ نائٹ ممی گڈ نائٹ ڈیڈی۔''

ڈاکٹر روبینہ کا کمرا بالکل سیدھ میں تھا۔ اس نے بچی کو ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا مگر وہ کچھ بولی نہیں۔ بس خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ خیالوں میں یا کسی قسم کی فکر میں اس طرح ڈوب گئی کہ ملکہ کے آنے کا اسے احساس ہی نہیں ہوا۔ وہ دودھ کا گلاس لیے کھڑی تھی۔

''لیجیے... دودھ پی لیجیے۔'' ملکہ نے کہا۔

''ملکہ۔۔۔ دودھ کا ایک گلاس صنم کو بھی دے دو۔ پھر تم جاسکتی ہو۔''

''جی ڈاکٹر صاحب۔'' ملکہ نے جاتے ہوئے کہا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسپیکر کا بٹن دبا دیا۔

''آپ روبینہ ہیں۔'' دوسری جانب سے ایک اجنبی آواز آئی۔

''جی ہاں آپ کون؟''

''آپ مجھے پہچان نہیں سکیں گی۔ اس لیے ٹو دی پوائنٹ بولتا ہوں۔'' دوسری جانب سے کہا گیا۔ لہجہ شائستہ مگر پٹھانوں والا تھا۔ ملکہ بھی اس آواز اور لہجے پر ٹھٹک گئی۔ وہ ڈاکٹر روبینہ کے چہرے پر نظر جمائے کھڑی رہی۔

''جی بولیں۔'' روبینہ نے شائستہ لہجے میں جواب دیا۔

''آپ کی ٹریٹ منٹ میں ایک مریض ہے۔''

''آپ کون؟ پہلے یہ بتائیں۔''

''مجھے معلوم ہے وہ جلد ہوش میں آجائے گی اور یہ ہمارے لیے غلط ہوگا۔۔۔'' اُدھر سے ایسا انداز اپنایا گیا جیسے وہ روبینہ کی بات سننے پر آمادہ نہیں ہے۔ صرف اپنی بات کہنا چاہتا ہو۔

''میں سمجھی نہیں۔''

''اسے مرنا ہوگا۔۔۔ آپ ڈاکٹر ہیں۔ یہ کام آپ کو کرنا ہی ہوگا۔''

''آپ ہوش میں تو ہیں۔۔۔''

''اور ہاں۔۔۔ مجھے امید ہے آپ بے وقوفی نہیں کریں گی۔ پولیس سے رابطہ آپ ہی کے لیے نقصان دہ ہوگا۔''

''میں ابھی انور صاحب سے بات کرتی ہوں۔''

''یہ مت بھولیں آپ ہماری نظروں میں ہیں۔۔۔ اس وقت نیلا سوٹ آپ پر کھل رہا ہے۔''

روبینہ نے چونک کر اپنے لباس کو دیکھا پھر ملکہ کو دیکھا۔ ملکہ گھبرا کر کھڑکی کا پردہ برابر کرنے لگی۔ جیسے چوتھی منزل کی کھڑکی سے کوئی جھانک کر ان کو دیکھ رہا ہو۔

''خدا حافظ۔'' مائیک سے لائن کٹ جانے کی ٹون ابھرنے لگی۔

''ملکہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟ کون ہے؟'' ڈاکٹر روبینہ نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں ملکہ سے پوچھا۔

''آپ۔۔۔ آپ فوراً ڈاکٹر رشید۔ سے بات کریں۔'' ملکہ نے مشورہ دیا۔

''میں انسپکٹر انور۔۔۔۔۔۔ سے بات کرتی ہوں۔۔۔ ضرور یہ فون شانا خان کے کسی آدمی نے کیا ہوگا۔'' اس نے نمبر ڈائل کرنا شروع کردیے۔ دوسری جانب گھنٹی بج رہی تھی مگر کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔

''پلیز فون اٹھاؤ پلیز۔'' روبینہ کی بڑبڑاہٹ کافی اونچی تھی۔ ''پلیز فون ریسیو کرو۔''

اسی وقت دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ ملکہ دروازے کی جانب بڑھی۔ بند دروازے پر پہنچ کر اس نے پوچھا۔

''کون۔۔۔ کون ہے؟''

جواب نہ پا کر اس نے دروازہ کھولا۔ باہر جھانکا مگر سیڑھیاں خالی نظر آئیں۔ سامنے والے فلیٹ کے دروازے پر تالا جھول رہا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر واپس آگئی۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر روبینہ نے پوچھا۔ ''کون تھا؟''

''حیرت کی بات ہے۔ باہر تو کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ لگتا ہے گھنٹی میں کوئی خرابی ہوگئی ہے۔''

ابھی وہ بتا ہی رہی تھی کہ گھنٹی پھر بج اٹھی۔ ملکہ دوبارہ دروازے پر پہنچ گئی۔ ''کون؟''

''میں ہوں۔۔۔ رشید۔''

ملکہ نے دروازہ کھول دیا۔ اسے دیکھتے ہی ڈاکٹر رشید نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے، اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟''

''اندر تو چلیں۔۔۔ ڈاکٹر صاحبہ خود بتا دیں گی۔'' ملکہ کی آواز میں خوف تھا۔

ڈاکٹر رشید کو دیکھتے ہی ڈاکٹر روبینہ نے ہذیانی انداز میں بولنا شروع کر دیا ''دیکھو دیکھو۔۔۔ کوئی مجھے دھمکا رہا ہے۔۔۔ مجھے دھمکی دے رہا ہے۔''

''ہوا کیا۔۔۔ آپ اتنی پریشان کیوں ہیں۔۔۔؟'' ڈاکٹر رشید نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی ایک فون آیا تھا۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ ہم پر نظر رکھے ہوئے ہے۔۔۔ اس نے میرے کپڑوں کا رنگ بھی بتایا ہے۔''

''آپ نے انور صاحب کو بتایا؟'' ڈاکٹر رشید نے پوچھا۔

''نہیں۔۔۔ فون کیا تھا مگر وہ اٹھا ہی نہیں رہے۔ بیل جا رہی تھی مگر فون ریسیو نہیں ہو رہا۔'' اب تک وہ اسی کیفیت میں تھی اور نہایت تیز لہجے میں بول رہی تھی۔

''آپ پریشان نہ ہوں، میں ان سے بات

کرتا ہوں۔'' اس نے اپنا موبائل نکال کر کہا۔
''نہیں، چلو کچھ وقت باہر گزار آتے ہیں۔ ذہن بہت بوجھل ہے۔'' ڈاکٹر روبینہ نے کہا پھر ملکہ کی طرف دیکھ کر بولی ''پلیز آج رات تم یہیں ٹھہر جاؤ۔ میاں کے موبائل پر کہہ دو کہ باجی نے روک لیا ہے۔''
''جی اچھا۔'' ملکہ سر ہلا کر بولی۔
ڈاکٹر روبینہ نے اندر والے دروازے کے بیچ میں پردہ تھامے کھڑی ہوئی صنم کو دیکھ کر کہا ''تم سو جانا، میں کچھ دیر میں آؤں گی۔''
''خدا حافظ آنٹی۔'' صنم نے جواب میں کہا۔
''اتنی بڑی ہوگئی مگر اب تک اس نے مجھے ماں کا درجہ نہیں دیا... آنٹی ہی بولتی آئی ہے۔'' باہر کے دروازے پر پہنچ کر... روبینہ نے ڈاکٹر رشید سے کہا۔
''لعنت بھیجو، نہیں بولتی ہے تو نہ بولے۔'' رشید نے ناگوار لہجے میں جواب دیا اور سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

''سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے ہوش کیوں نہیں آرہا ہے۔'' آئی سی یو میں... بیڈ کے قریب کھڑے انور نے مریضہ پر نظر ڈال کر کہا۔
''ایسا ہوتا ہے... چوٹ شدید لگی ہے... اور... اور یہ پریگننٹ بھی ہے۔'' ڈاکٹر روبینہ مریضہ کے سرہانے رکھے چارٹ کو اٹھا کر دیکھتے ہوئے بولی۔
''ہوں...'' انور کے چہرے پر فکر کی پرچھائیں رقصاں تھیں۔
''مریضہ بہت کمزور ہے۔ اسی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔''
''میں افسران سے بات کرتا ہوں... اگر کل تک اسے ہوش نہیں آیا تو اسے سی ایم ایچ منتقل کرا دوں گا۔''
''شاید اس کی ضرورت نہ پڑے۔ اسے آج ہوش آجائے گا۔ آثار ایسے ہی نظر آرہے ہیں۔''
''انشاء اللہ... اچھا میں چلتا ہوں... ڈیوٹی سے واپسی پر آپ کے گھر آؤں گا۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''
''او کے... اگر کہیں تو میں ڈاکٹر رشید کو بھی بلا لوں؟''
''جی نہیں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا ''آپ سے دو باتیں کرنی ہیں۔ ایک کپ چائے بھی پی لوں گا۔''

''او کے آجائیں، میں انتظار کروں گی۔''

☆☆☆

''ملکہ!'' ڈاکٹر روبینہ نے ملازمہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
''جی ڈاکٹر صاحبہ!'' ملکہ نے جواب دیا۔
''ہوسکتا ہے رات میں صنم کے ڈیڈی فون کریں۔''
''ہاں... وہ تو رات میں ہی فون کرتے ہیں۔ نشہ جب چڑھتا ہے تو انہیں بیٹی یاد آتی ہے۔''
''اگر فون آئے تو ان سے صنم کی بات مت کرانا۔''
''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''
''کیوں؟''
''اپنی بیٹی سے بات کرنے کا انہیں قانونی حق حاصل ہے۔ یاد ہے نا وکیل صاحب نے کیا کہا تھا... اگر باپ بیٹی کے درمیان کوئی آیا تو وہ قانون کے گھیرے میں آجائے گا۔''
''وکیل کو مارو گولی... میں جو کہہ رہی ہوں وہ کرنا ہے... سمجھیں۔'' روبینہ نے چیخ کر کہا۔
''جی اچھا... رات کو اگر وہ خود آگئے تو...؟''
''اندر گھسنے نہیں دینا۔''
''وہ نشے میں چور ہوتے ہیں... کچھ بھی کر سکتے ہیں... ان کی دوستی غنڈوں سے ہے اگر کچھ لوگوں کو بھی ساتھ لائے تو؟''
''پولیس کو بلا لینا... بعد میں میں نمٹ لوں گی۔ میری نائٹ ڈیوٹی نہ ہوتی تو میں خود نمٹ لیتی پھر بھی میں ڈھائی بجے تک آجاؤں گی۔''

☆☆☆

رات کے تین بج رہے تھے۔ پورا شہر خواب خرگوش میں ڈوبا ہوا تھا۔ سڑکوں پر اکا دکا گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر روبینہ اپنی کار کو تقریباً اڑاتی ہوئی گھر پہنچی تھی۔ حالات ہی کچھ ایسے تھے جس وجہ سے ملکہ بھی سو نہیں پائی تھی۔ اسی لیے پہلی گھنٹی پر ہی وہ اٹھ گئی اور اب دروازہ کھولے کھڑی تھی۔ ڈاکٹر روبینہ نے اندر آتے ہوئے پوچھا ''صنم کے ڈیڈی کا فون آیا تھا؟''
''جی نہیں۔'' ملکہ نے دروازہ بند کرتے ہوئے جواب دیا۔
''اچھا ٹھیک ہے۔ ایک کپ چائے لے آؤ۔'' کہتی ہوئی روبینہ اپنے بیڈروم میں داخل ہوئی، بیڈروم کا ٹی وی آن تھا۔ روبینہ سمجھ گئی کہ ملکہ وقت گزاری کے لیے ٹی وی

دیکھ رہی تھی۔ وہ پرس کو ٹیبل پر رکھ رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ روبینہ نے مائیک کا اسپیکر آن کر دیا پھر پوچھا۔

''کون؟''

''ڈاکٹر روبینہ... کیسی ہیں آپ؟'' دوسری جانب سے آواز آئی۔

''کون... کون ہیں آپ؟'' ڈاکٹر روبینہ نے پوچھا۔ اسپیکر کی آواز کچن تک پہنچ رہی تھی ملکہ آواز سنتے ہی دوڑی چلی آئی تھی۔

''آپ کا خادم۔'' دوسری جانب سے اکھڑ لہجے میں جواب دیا گیا۔

آواز سن کر ان دونوں کے چہرے پر گھبراہٹ چھا گئی۔ ملکہ کے ہاتھ میں چائے کا کپ لرزنے لگا۔

''کیوں... کیوں آپ مجھے اس طرح خوف زدہ کر رہے ہیں؟''

''کس نے کہا کہ میں آپ کو خوف زدہ کر رہا ہوں... اچھا... اتنی رات گئے... اس عمر میں ملکہ کا ٹی وی دیکھنے کا شوق کم نہیں ہوا ہے۔'' اس کا جملہ سنتے ہی ملکہ کے چہرے پر گھبراہٹ گہری ہوگئی۔

''خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دیں... ہمیں خوفزدہ نہ کریں... ہم نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔'' وہ چیخ چیخ کر بول رہی تھی۔

''ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ مریضہ کبھی ہوش میں نہ آئے۔''

''ایسا کبھی نہیں ہوسکتا ہے میں ڈاکٹر ہوں کسی کی جان نہیں لے سکتی۔ تم جو کر سکتے ہو کرلو...'' روبینہ کے کہتے ہی فون بند ہوگیا۔

'' ایسا کرو زینکس لا دو... میں سونا چاہتی ہوں۔''

''آپ زینکس نہ لیا کریں۔ ڈاکٹر ہو کر نیند کی دوا اتنی زیادہ لے رہی ہیں۔''

''اف، جو کہہ رہی ہوں کرو... جاؤ۔'' وہ تیز آواز میں بولی۔

گولی کھا کر وہ سونے کے لیے لیٹی تھی کہ موبائل بج اٹھا۔ اس نے نمبر دیکھ کر کال ریسیو کی۔

''مس روبینہ میں انسپکٹر انور بول رہا ہوں...'' دوسری جانب سے کہا گیا۔

''جی کہیں۔'' ایسا لگ رہا تھا کہ دوا کا اثر ہونے لگا تھا اور اس کی آواز میں بھاری پن آ گیا تھا۔ ''جلدی بولیں نیند کی دوا لے رکھی ہے۔''

''معافی چاہتا ہوں... میں سمجھا تھا کہ آپ اسپتال میں ہیں... خیر اتنا بتا دیں اب مریضہ کا حال کیا ہے؟''

''نسبتاً بہتر ہے۔''

''گڈ... اب آپ آرام کریں خدا حافظ۔''

روبینہ نے موبائل آف کیا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔

☆☆☆

کھڑکی سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔ دھوپ کی تمازت نے ڈاکٹر روبینہ کو جگا دیا تھا۔ وہ بستر سے اتری اور ملکہ کو آواز دیتی ہوئی آگے بڑھی۔ ''ملکہ... او ملکہ... بدن ٹوٹ رہا ہے۔ دوا کا اثر باقی ہے۔ پلیز چائے دے جاؤ۔''

جیسے ہی اس نے گلیارے میں قدم رکھا، وہ ٹھٹک گئی۔ سامنے زمین پر ملکہ گری پڑی تھی۔ وہ اس کے قریب پہنچی اور اسے جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ ''کیا ہوا... تمہیں کس نے زخمی کیا؟''

''اذان کے وقت بیل بجی تھی۔ میں نے جیسے ہی دروازہ کھولا کہ کسی نے سر پر وار کیا اور پھر مجھے کچھ یاد نہیں۔''

ابھی وہ اسے سنبھال ہی رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ روبینہ دوڑتی ہوئی اُدھر گئی۔ اس نے جلدی سے اسپیکر آن کر دیا۔ ادھر سے آواز آئی۔ ''ڈاکٹر روبینہ... آپ بہت فکر مند ہیں نا... بے چاری ملکہ کو زیادہ چوٹ آ گئی... ہے نا۔''

''خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو... کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔'' ڈاکٹر روبینہ نے رو دینے والے لہجے میں جواب دیا۔

''ہم آپ کو کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتے ہیں... بس تھوڑا آپ بھی تعاون کریں... مریضہ کو ہوش میں نہ آنے دیں ورنہ...۔''

''ورنہ کیا؟''

''ورنہ کیا... سن سکیں گی... سنیں... آپ کی بیٹی صنم میرے قبضے میں ہے... اسے بچانا چاہتی ہیں... تو مریضہ کو ہوش نہیں آنا چاہیے۔'' وہ جواب میں کچھ کہتی کہ لائن کٹنے کی آواز گونج اٹھی۔

ڈاکٹر روبینہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ملکہ جو اس کے قریب ہی تھی، اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ملکہ... اب کیا ہوگا... میں کیا کروں... اُف!''

''آپ... آپ... ڈاکٹر رشید کو فون کریں۔'' ملکہ کی آواز میں بھی گھبراہٹ در آئی تھی۔

’’میں خود اسپتال جا رہی ہوں... بیگ تیار کرو۔ رشید سے مشورہ کرنا ضروری ہے۔‘‘

’’میرا خیال ہے آپ ان کو فون کر کے بلا لیں۔‘‘

’’کرو فون۔‘‘ روبینہ نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

ملکہ فون کرنے لگی۔

اس وقت بھی ڈاکٹر روبینہ سر پکڑے بیٹھی تھی۔ پھر اس نے ٹوٹے ہوئے انداز میں کہا۔’’ملکہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے تو کسی کا کچھ بگاڑا نہیں پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے...؟‘‘

’’اللہ بہتر کرے گا... ڈاکٹر رشید آتے ہوں گے۔ آپ حوصلہ کریں۔‘‘

’’اُف میں کیا کروں۔ صنم کے اغوا نے ذہن ماؤف کر دیا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔‘‘

’’صبر سے کام لیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘

اسی وقت کال بیل بجی۔ ملکہ نے جا کر دروازہ کھولا۔ ڈاکٹر رشید اندر آ گیا۔ وہ سیدھا ڈاکٹر روبینہ کے بیڈ روم میں پہنچا۔

’’کیا ہوا... ایسی کیا بات ہو گئی۔ اتنے سویرے کیوں بلا لیا؟‘‘

’’صنم اغوا ہو گئی ہے۔‘‘

’’اوہ... کیسے... کب... یہ کیا ہو گیا؟‘‘

’’تمام باتیں چھوڑو... اب بتاؤ کیا کرنا چاہیے؟‘‘

’’میرے خیال سے صنم کے ابو کو بتانا ضروری ہے۔‘‘

’’تم تو جانتے ہو وہ کیسا ہے... آسمان سر پر اٹھا لے گا۔‘‘

’’ہاں باجی... آپ ان کو خبر کر دیں ورنہ وہ کچھ اور سمجھیں گے۔‘‘

’’ہاں یہ بہت ضروری ہے... آپ انہیں فون کریں۔‘‘

اس نے ریسیور اٹھا لیا اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔ بار بار نمبر ملاتی رہی پھر اس نے ریسیور کو کریڈل پر رکھ کر کہا۔ ’’بیل جا رہی ہے مگر کوئی فون اٹھا نہیں رہا ہے۔‘‘

’’آپ ایسا کریں کہ انور صاحب کو فون کریں۔‘‘

’’نہیں یہ اور غلط ہوگا کیونکہ اغوا کرنے والے نے منع کیا ہے کہ پولیس کو فون نہیں کرنا۔‘‘

’’نہیں ان کو فون کریں، یہ بہت ضروری ہے۔‘‘

☆☆☆

کمرے میں ڈاکٹر رشید، ڈاکٹر روبینہ اور انور بیٹھے ہوئے تھے اور ملکہ دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ ڈاکٹر روبینہ کے بیڈ کے قریب فون رکھا ہوا تھا۔ سب کی نظریں اُدھر لگی ہوئی تھی۔ کمرے میں بالکل خاموشی تھی صرف گھڑی کی ٹک ٹک گونج رہی تھی۔

’’نہیں اس کا فون اب نہیں آئے گا... اس نے یہی کہا تھا کہ پولیس کو خبر نہ دینا... کیوں تم نے انور صاحب کو خبر دے دی۔ رشید، یہ بہت برا ہوا ہے۔‘‘ روبینہ نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

’’حوصلہ کریں روبینہ صاحبہ... رشید نے کچھ غلط نہیں کیا... صنم کی گمشدگی مریضہ کے کیس سے جڑی ہوئی ہے... اس طرح یہ ہم سے جڑی ہوئی ہے۔‘‘ انسپکٹر انور بولا۔’’آپ نے پہلے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ کوئی آپ کو اس طرح دھمکی دے رہا ہے۔‘‘

’’انور صاحب... اب وہ لوگ میری بیٹی کو... اسے نقصان پہنچائیں گے۔‘‘ وہ رو دینے والی آواز میں بولی۔

’’آپ کھل کر بتائیں ہوا کیا تھا... آج رات کی تمام باتیں۔ ایک ایک بات جزئیات کے ساتھ...‘‘

ڈاکٹر روبینہ نے اسے ایک ایک بات بتانا شروع کی ہی تھی کہ انور کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے موبائل جیب سے نکالا اور نمبر پر نظر ڈالتے ہی وہ اٹھ کر گیلری میں چلا گیا پھر جب واپس آیا تو اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ گہری سنجیدگی۔ اس نے روبینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔’’سو... سوری روبینہ صاحبہ!‘‘

’’کس بات کا؟‘‘ ڈاکٹر روبینہ نے پوچھا۔

’’آپ کے ایکس ہسبنڈ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا... ان کے ساتھ صنم بھی تھی...‘‘

’’کیا... صنم... میری صنم تو ٹھیک ہے نا؟‘‘

’’کار چُور چُور ہو گئی... دونوں...‘‘ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس سے آگے روبینہ سن بھی نہ سکی وہ بے ہوش ہو کر گر گئی۔

’’آپ انہیں سنبھالیں... میں اپنے دفتر کا چکر لگا کر آتا ہوں۔‘‘ یہ کہتے ہوئے انور کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

رات کا سایہ گہرا آیا تھا۔ روبینہ آج اسپتال بھی نہیں جا سکی تھی۔ ڈاکٹر رشید نے بھی چھٹی کر لی تھی۔ وہ اس وقت بھی اسی کے فلیٹ میں بیٹھا تھا کہ کال بیل بج اٹھی۔ ملکہ اپنے گھر

جا چکی تھی۔ اس لیے وہی دروازے پر پہنچا۔ اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا، سامنے انسپکٹر انور کھڑا تھا۔

''آپ... اس وقت؟'' ڈاکٹر رشید نے سوال کیا۔

''میرا روبینہ صاحبہ سے ملنا ضروری ہے، کچھ اہم باتیں بتانا ہیں۔''

''لیکن وہ اس حالت میں نہیں ہیں کہ آپ کی کوئی بات سن سکیں... وہ بالکل ٹوٹ کر رہ گئی ہیں۔''

''میرے پاس وقت بہت کم ہے... بس دو باتیں کر دوں گا۔''

''اچھی بات ہے جائیں۔ وہ بیڈ روم میں ہیں۔'' ڈاکٹر رشید نے راستے سے ہٹ کر اندر کی جانب اشارہ کیا۔

انور اندر کی جانب بڑھ گیا۔

کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے آواز دی۔ ''ڈاکٹر روبینہ آپ جاگ رہی ہیں؟''

''جی آجائیں۔'' روبینہ نے جواب دیا۔

انور اندر داخل ہوا تو وہ تکیے کے سہارے بیٹھی تھی۔ بیڈ کے ساتھ رکھی کرسی پر وہ بیٹھ گیا۔

''آپ کے ہسبینڈ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ آگئی ہے۔۔ وہ ڈرگ کے عادی تھے۔'' انور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں... وہ ڈرگ کے عادی تھے۔''

''انہوں نے شاید ڈوز زیادہ لے لیا تھا اور وہ کار کو سنبھال نہ سکے... کار سامنے سے آتی سوزوکی سے ٹکرا گئی۔ دونوں گاڑیاں چُور چُور ہو گئیں۔''

''مجھے ہمیشہ اسی بات کا ڈر رہتا تھا۔ وہ ڈرگ لے کر ڈرائیو کرتے تھے۔''

''ان کی کار سے ایک سوٹ کیس بھی ملا ہے۔'' انور نے بتایا۔

''جی...'' روبینہ نے سسکی لے کر کہا۔

''اس سوٹ کیس میں ان کے دو چار کپڑے تھے لیکن صنم کے بہت سارے نئے کپڑے تھے... ایسا لگتا ہے جیسے وہ لوگ کہیں چھٹیاں گزارنے جا رہے تھے۔ کیا یہ بات آپ کے علم میں تھی... یا صنم نے کچھ بتایا تھا؟''

''ایک روز صنم نے کہا تو تھا کہ وہ اپنے ڈیڈی کے ساتھ کچھ دن گزارنا چاہتی ہے۔''

''تب آپ نے کیا کہا تھا؟''

''میں سن رہی تھی کہ ان دنوں ظہیر کچھ زیادہ ہی ڈرگ لینے لگا تھا... میں نہیں چاہتی تھی کہ صنم اپنے باپ کی یہ حالت دیکھے۔''

''اس لیے آپ نے منع کیا تھا؟''

''جی ہاں۔''

''اچھا آپ نے رضیہ کا نام سنا ہے؟''

''رضیہ جی ہاں... آج کل وہ رضیہ کے ساتھ رہ رہا تھا۔''

''آپ کو تکلیف نہیں ہوتی تھی؟''

''تکلیف... کیسی تکلیف... یہ کوئی نئی بات تو تھی نہیں... یہ تو اس کی عادت تھی... وہ بیوی سے زیادہ دوسری عورتوں کو ٹائم دیتا تھا۔ رضیہ شاید چوتھی پارٹنر ہے اس کی۔''

''یعنی؟''

''پہلی شادی اس نے عشنا سے کی تھی۔''

''عشنا؟''

''میری سہیلی تھی... ماموں زاد بہن کہہ لیں... صنم کی ماں... میری پرورش عشنا کے والدین نے کی تھی۔''

''اوہ... اچھا۔''

''عشنا بہت معصوم تھی... پتا نہیں کیسے وہ اس کے جال میں پھنس گئی۔ اس کے ابو راضی نہیں تھے... میں نے ہی زور دے کر ان کو راضی کیا تھا کیونکہ وہ پریگنینٹ تھی۔''

''اوہ...''

''شادی کے کچھ ہی دنوں بعد دونوں میں دوریاں بڑھنے لگیں کیونکہ ظہیر ایک عورت پر قناعت نہیں کرتا تھا پھر... پھر وہ بیمار رہنے لگی، آخری وقت میں عشنا نے صنم کی ذمّے داری مجھے سونپ دی تھی۔''

''اوہ... شاید آپ نے صنم کے لیے ہی ظہیر سے شادی کی تھی؟''

''نہیں... آپ کو سچ ہی بتا دینا چاہیے... ابتدا میں، میں صنم کی وجہ سے ہی اس کی طرف راغب ہوئی تھی مگر...''

''مگر کیا؟''

''عشنا کی موت کے بعد وہ بالکل بدل گیا تھا... اس نے ڈرگ لینا بھی بند کر دیا تھا... صنم کو بھی وقت دیتا... پھر... پھر ایک بار وہ مجھے اور صنم کو.... مری سیر کے لیے لے گیا۔''

''اچھا پھر...''

''وہیں ایک رات بہت کچھ ہو گیا اور تب ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ ایک ہو جائیں۔ میرا خیال تھا کہ صنم خوش ہو جائے گی مگر ہوا الٹا... وہ آج بھی مجھے ماں نہیں کہتی۔

سوتیلی ماں سمجھتی ہے۔''

''اس وقت آپ بہت زیادہ اپ سیٹ ہیں۔ میں پھر کسی وقت حاضر ہو جاؤں گا۔'' ڈاکٹر روبینہ کی کہی باتیں نوٹ کرنے کے بعد وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ اسی وقت ملکہ کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔

''وکیل صاحب آئے ہیں۔''

''چلو... میں آرہی ہوں۔'' کہہ کر وہ واش بیسن کی طرف بڑھ گئی۔

''مجھے کچھ کام ہے۔ میں دو گھنٹے بعد آجاؤں گی... جاؤں؟'' ملکہ نے پوچھا۔

''ہاں جاؤ۔''

ملکہ دروازے کی جانب چلی گئی۔

☆☆☆

''جی وکیل صاحب!'' روبینہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

''میں وصیت کے سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔'' وکیل نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''بیٹھیں۔'' روبینہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے وکیل کو بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر بولی ''وکیل صاحب آپ اس بارے میں مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ جو مناسب سمجھیں کریں۔ کاغذات تیار کریں... جہاں جہاں کہیں گے میں دستخط کر دوں گی۔''

''جی جی... اچھا تو میں چلتا ہوں۔'' وکیل نے بریف کیس بند کرتے ہوئے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

روبینہ اٹھ کر کھڑکی کی طرف چلی گئی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اس کی نظریں سامنے والی بلڈنگ کے اس فلیٹ پر جمی ہوئی تھیں جو اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ اس کی کھڑکی سے سامنے والے فلیٹ کا ڈرائنگ روم صاف نظر آرہا تھا۔ اسی وقت گھنٹی بجی۔

''ملکہ بھی نہیں ہے۔ مجھے ہی دروازہ کھولنا پڑے گا۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھی۔

دروازے پر ڈاکٹر رشید تھا۔ روبینہ نے اسے اندر آنے اشارہ کیا اور مڑ گئی۔

''میں اسپتال جا رہا ہوں... ان دونوں کی باڈی لے کر یہیں آؤں گا۔'' رشید نے بتایا۔

''بیٹھو... چلے جانا۔'' روبینہ نے کہا اور اس کے برابر والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''کیا ملکہ نہیں ہے؟'' رشید نے پوچھا۔

''ہاں... وہ کسی کام سے دو گھنٹے کی چھٹی لے کر گئی ہے۔''

''چلو کچھ دیر کے لیے تو ٹینشن سے آزادی ملی۔'' رشید نے ہنستے ہوئے کہا۔

''مبارک ہو... کوئی بھی سمجھ نہیں پایا۔'' روبینہ نے کھل کر ہنستے ہوئے کہا۔

''تمہیں بھی مبارک... واقعی کوئی سمجھ نہیں پایا... ہاہاہا... میں تمہارے صبر کی تعریف کروں گا۔'' وہ روبینہ کے گال تھپتھپا کر بولا۔

''ہاں... صبر کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ عشنا نے بھی صبر کیا تھا... ٹھیک وقت پر وہ پریگننٹ ہو گئی تھی... جانتی تھی کروڑوں کی جائداد حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ ہے شادی... بے چاری... جائداد کا مزہ بھی نہ لے سکی۔''

''یہ کہو تم نے لینے نہیں دیا... اسے منظر سے ہٹا کر ظہیر پر قبضہ کر لیا۔ ہاہاہا۔'' رشید نے قہقہہ لگایا اور اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

''کیوں لینے دیتی... اس کے گھر میں پرورش پا رہی تھی اس لیے وہ مجھے کنیز سمجھتی تھی... نوکرانی جیسا سلوک کرتی تھی... پھر جب شادی کر لی تو ہوا میں اڑنے لگی... ذرا ذرا سی بات پر مجھے سنا کر رکھ دیتی۔ میں دل ہی دل میں کڑھتی مگر کچھ بول نہ سکتی.... موقع کی منتظر تھی۔ بالآخر موقع مل گیا... یہ موقع تب ملا جب وہ دوسری دفعہ ماں بننے کے لیے گھر آئی۔'' روبینہ نے کھڑکی کے پار دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی نظریں دور افق پر مرکوز تھیں جیسے وہ بیتے ہوئے کل کو دیکھنا چاہتی ہو۔ اسے ایسا لگنے لگا جیسے واقعی اس کے سامنے گزرا ہوا وقت کسی فلم کی طرح چلنے لگا ہو۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کے سامنے ایک بستر ہے جس پر ایک عورت لیٹی ہے۔ اس عورت کے چہرے سے نقاہت چھلک رہی تھی۔ جیسے وہ بیمار ہو۔ روبینہ اس کے بیڈ کے سرہانے کی ٹیبل پر رکھی دواؤں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی جیسے کچھ ڈھونڈ رہی ہو۔ تبھی وہ عورت بولی۔ ''تم یہ انجکشن ڈھونڈ رہی ہو؟''

''ہاں... دو۔'' روبینہ نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

''مگر میری سمجھ میں نہیں آتا... ڈاکٹر نے نسخے میں کوئی انجکشن لکھا نہیں اور تم مجھے صبح شام انجکشن دے رہی ہو۔''

''میں بھی ڈاکٹر ہوں... تبھی تو آسانی سے دوا بدلتی رہی ہوں۔''

''مگر کیوں؟''

روبینہ نے مسکرانے پر اکتفا کیا اور انجکشن تیار کرنے لگی۔

''بولو... کیوں؟ بولو نا؟'' اس عورت نے پھر پوچھا۔

روبینہ اس پر جھکتے ہوئے بولی۔ ''اس لیے کہ تم جب تک زندہ ہو میری منزل مجھ سے دور ہے۔''

''میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

''تم نے مجھے انسان کب سمجھا ہے... نوکرانی سمجھتی تھیں نا۔''

''نہیں یہ غلط ہے۔''

''میں بچپن سے سب کچھ سہہ رہی ہوں... اب اور نہیں... جانتی ہو میرا پلان کیا ہے'' اس وقت اس کی آنکھوں میں غصے کی جھلک صاف نظر آرہی تھی'' پہلے تمہیں راستے سے ہٹاؤں گی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ مڑی پھر مسکراتے ہوئے بولی۔'' بالکل صحت یاب کر کے تمہارے شوہر کو سونپ دوں گی۔''

''اُف تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔'' وہ بھی ہنسنے لگی۔

''لیکن...'' رشید کی تیز آواز نے اسے ماضی سے حال میں کھینچ لیا۔ رشید اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔'' یہ بھی سوچو تم نے مجھ پر کتنا ظلم کیا۔ اپنی جانِ تمنا کو کسی دوسرے کے کمرے میں دیکھ کر کتنی تکلیف ہوتی تھی، اس کا احساس تمہیں ہے۔''

''خاموش... یہ عقلمندی تھی۔''

''ایسا نہ کہو... میں ہر روز مرتا ہر روز جیتا تھا۔'' رشید کے لہجے میں دکھ ہی دکھ تھا۔

''یہی صبر کا پھل ہے کہ آج ہم کروڑپتی بننے جارہے ہیں... تمہارے بھروسے رہتی تو بھوکی مرجاتی۔''

''مگر یہ بھی مت بھولو کہ یہ سب میرے تعاون سے ہی ہوا ہے۔''

''ہونہہ۔ تمہاری اوقات کیا ہے... تم کیا ہو... یاد ہے نا وہ رات؟''

روبینہ کے طعنے نے اس کی نظروں کے سامنے اس رات کو زندہ کر دیا۔ اسے لگا جیسے وہ اس رات کا ایک ایک منظر دیکھ رہا ہو۔

''یقین کرو... بس کچھ دنوں کی بات ہے... مجھے کہیں نہ کہیں نوکری مل جائے گی... ہوسکے جاب مکمل ہو ہی گیا ہے۔'' رشید سامنے بیٹھی روبینہ سے کہہ رہا تھا۔

''تم نے جھوٹ کیوں کہا تھا کہ تم ایک امیر باپ کی اکلوتی اولاد ہو... کیوں خواب دکھائے تھے۔ بولو... ہے کوئی اس کا جواب؟''

''یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے... جلد نوکری مل جائے گی۔''

روبینہ نے چیخ کر کہا۔ ''خاموش'' پھر وہ جھک کر سرگوشی میں بولی۔'' کتنے کی نوکری ملے گی؟... دس بارہ ہزار کی؟'' پھر چیخ کر کہا۔'' مجھے لاکھوں کی دولت چاہیے لاکھوں کی... روپیا چاہیے روپیا... ڈھیر ساری دولت... بڑی سی گاڑی... عالی شان بنگلا... نوکر چاکر... سب کچھ جو میرا خواب ہے۔''

''ایسے خواب نہ دیکھو۔''

''میں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں... تمام زندگی دوسروں کا جھوٹا کھا کر پرورش پائی ہے مگر اب نہیں... اب میں کروڑپتی بننا چاہتی ہوں... سمجھے!''

''دولت کیا آسمان سے برسے گی... زیادہ خواب مت دیکھو ورنہ ٹوٹ جاؤ گی۔''

''تم کیا سمجھتے ہو جھوٹے خواب دکھا کر میرے قریب آگئے تو کیا میرے خواب مر گئے... آں... نہیں... تم نے جھوٹ بول کر مجھ سے محبت کا ڈھونگ رچایا۔ جھانسا دے کر شادی کی۔ اب قربانی بھی تمہیں دینی ہوگی۔''

''کیسی قربانی؟''

''میرے دماغ میں ایک بات آرہی ہے۔''

''کیا؟''

''بس تمہیں تھوڑی سی مدد کرنی ہے۔''

''کیسی مدد؟''

''عشنا نے زندگی بھر مجھ سے نفرت کی... صرف اس لیے کہ اس کی سہیلیاں کہتی تھیں کہ میں اس سے زیادہ خوبصورت ہوں۔ ہاں میں اس سے زیادہ خوبصورت ہوں... اور عشنا یہ بات سہہ نہیں پاتی اور گھر آکر جھوٹ موٹ میرے نام پر اپنی امی کو بھڑکاتی اور وہ... وہ مجھے پیٹ کر رکھ دیتیں... بہت مار کھائی ہے اس کی وجہ سے... اب موقع ملا ہے بدلہ لینے کا۔''

''تم نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے تو لیا... اسے غلط دوا دے کر بیماری کی گود میں دھکیل تو دیا ہے۔''

''وہ بدلہ نہیں پہلا قدم ہے... دولت حاصل کرنے کا نایاب ذریعہ...''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''یہ کل بتاؤں گی... ابھی میں گھر جارہی ہوں...''

وہ دروازے کی جانب بڑھتی چلی گئی۔

اگلے دن وہ صبح سویرے ہی رشید کے گھر جا پہنچی تھی۔ اس وقت وہ بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔

''کل میں نے جو کچھ کہا تھا، یاد ہے؟'' اندر داخل ہوتے ہی روبینہ نے کہا۔

''پہیلی بوجھنے کی قوت میرے اندر نہیں ہے۔''

''سنو... مجھے دولت چاہیے... تم نے جھوٹ بول کر مجھ سے محبت کی پینگیں تو بڑھا لیں۔ شادی بھی کر لی۔ اب اس کا کفارہ بھی ادا کرو۔''

''کیسا کفارہ؟''

''مجھے دولت چاہیے... بہت ساری دولت... تمام عیش و آرام مجھے چاہئیں۔''

''تم خود بھی ہاؤس جاب مکمل کر چکی ہو... میں بھی مکمل کر چکا ہوں... ہم دونوں کی تنخواہ اور پریکٹس سے خاطر خواہ آمدنی ہوگی جس سے ہماری زندگی عیش سے بھر جائے گی۔''

''ہم دونوں مل کر کتنا کما لیں گے؟ بولو... بیس تیس ہزار... چالیس پچاس ہزار... نہیں... یہ میرا خواب نہیں... مجھے کروڑوں کی دولت ایک جھٹکے میں چاہیے۔''

''اتنا تیز نہ بھاگو... آہستہ آہستہ سب کچھ حاصل ہو جائے گا۔''

''میں انتظار نہیں کر سکتی... مجھے دولت چاہیے... وہ دولت جو عشنا کی قسمت میں لکھی ہے... وہ ظہیر سے شادی کر کے ہواؤں میں اُڑ رہی ہے... زندگی بھر اس نے مجھے جسمانی تکلیف دی ہے... اب... اب وہ روحانی کرب دے رہی ہے۔''

''تو کیا اب اس کے گھر میں ڈاکا ڈالو گی؟''

''تم اگر مدد کرو تو اس کی دولت میری ہو سکتی ہے۔''

''کیسے...؟''

''یہ بتاؤ ظہیر نے عشنا کو کیوں پسند کیا... اس میں ایسا کیا ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''میں ظہیر کو حاصل کروں گی اور اس کام میں تم میری مدد کرو گے... میں اس سے شادی کروں گی۔''

''تمہارا دماغ خراب ہے... شادی پر شادی کرو گی... یہ جرم ہے۔ مذہب بھی اجازت نہیں دیتا۔''

''ہماری شادی کا گواہ کون ہے؟ قاضی بھی مجھے صحیح طور پر پہچان نہیں سکے گا۔ تمہارے پاس نکاح نامہ تک

نہیں ہے۔ وہ میرے پاس ہے۔ میں اسے پھاڑ دوں گی۔ اگر کاپی نکلوائی تو میں اسے چیلنج کر دوں گی۔ کیونکہ میں نے اردو میں لرزتے ہاتھوں سے صرف نام لکھا ہے۔ دستخط نہیں کیے ہیں۔''

''مجھ سے ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

''تو پھر میرے انتقام کا نشانہ تم بھی بنو گے... عقلمندی کا تقاضا ہے کہ میرا ساتھ دو... کچھ دنوں کی بات ہے پھر ہم ہوں گے اور دولت کا انبار ہوگا۔''

''ظہیر اتنی آسانی سے اپنی دولت تمہارے نام کر دے گا؟''

''ضرور... میرا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا... بس تم دیکھتے جاؤ... عشنا دوسرے بچے کی ولادت کے لیے گھر آئی ہوئی ہے... سمجھو ایک کانٹا راستے سے ہٹا۔''

''اگر تمہاری ضد ہے تو میں ساتھ دوں گا۔''

کچھ مجبوری اور کچھ خوف اور کچھ روبینہ کی محبت، رشید اس کا ساتھ دینے لگا۔ صرف چھ ماہ میں روبینہ نے بہت کچھ حاصل کر لیا۔ وہ کام کر دکھایا جس کی رشید کو امید بھی نہیں تھی۔ اس دن روبینہ نے کتنے فخر سے کہا تھا۔ ''دیکھا کتنی آسانی سے میں نے سب کچھ حاصل کر لیا۔''

''واقعی تم نے کمال کر دیا' پہلے عشنا کو جب وہ شادی کے آٹھ سال بعد ماں باپ سے ملنے آئی تو اسے سلو پوائزن دینا شروع کر دیا... اس کی طبیعت خراب ہوتی چلی گئی پھر ظہیر کو حاصل کرنے کے لیے تم صنم سے پیار کا ڈراما کرنے لگیں۔''

''صنم کا سہارا لے کر میں نے ظہیر کے دل میں گھر کیا۔'' روبینہ فخر سے بولی۔

''پھر بھی صنم تمہاری نہ ہو سکی... وہ تمہیں سوتیلی ہی سمجھتی رہی۔ نفرت کرتی رہی۔''

''وہ سینولیا ہے۔ اس نے اپنی ماں کو انجکشن دیتے دیکھ لیا تھا مگر بولتی تو کس سے بولتی۔ اس کے باپ کو میں نے اپنا دیوانہ جو بنا لیا تھا۔''

''اور شادی کے بعد... ہاہاہا شادی کے بعد اسے میں نے ڈرگ کا عادی بنا دیا... صرف چھ ماہ میں کمال کر دکھایا۔''

''یہ بھی دیکھو کہ اسے ڈرگ کا عادی کہہ کر میں نے بدنام کیا۔ تم اسے نشہ لا کر دیتے پھر نشے کی حالت میں اسے اکسا کر فون کراتے۔ اور میں سب کے سامنے مظلوم بن کر فریاد کرنے لگتی۔''

''ہاہاہا... اور تم موبائل رہتے لینڈ لائن پر اسپیکر آن کر کے کال سنتیں تاکہ ملکہ گواہ رہے کہ تم مظلوم ہو... تمہیں تو ایکٹر ہونا چاہیے تھا۔''

''اور تم... تم بھی غضب کے ڈائریکٹر نکلے۔''

''میں اور ڈائریکٹر؟''

''اور کیا... جب وہ انور کی مریضہ آئی تو تم نے اسی وقت پلان بنا لیا کہ یہی وقت ہے... چھ ماہ سے چلنے والے ڈرامے کے ڈراپ سین کا۔''

''اور تم نے بھی اس ڈرامے میں خوب رنگ بھرا۔'' اس نے روبینہ کو کندھے سے پکڑ کر اپنے اوپر جھکاتے ہوئے کہا۔

''اصل رنگ تو تم نے بھرا... تم نے دہشت گرد بن کر فون کرنا شروع کیا اور کال سنانے کے لیے میں اسپیکر آن کر دیتی تاکہ ملکہ گواہ بنی رہے' انور تک بات پہنچے۔''

''مگر صنم کو اغوا کرانے کا پلان تو تمہارا تھا۔''

''اس پلان میں رنگ تو تم نے بھرا... یاد ہے ناں۔ میں نے نیند کی گولی ملکہ سے منگوائی تاکہ وہ سمجھے کہ میں نے کھائی ہے اور پھر... پھر ایک گھنٹے بعد تم نے آ کر بیل بجائی۔ ملکہ نے جیسے ہی دروازہ کھولا تم نے اس کے سر پر ڈنڈے سے وار کیا جس سے وہ بے ہوش ہو کر گر گئی۔ میں نے صنم کو دودھ میں نیند کی دوا دے دی تھی۔ وہ بے ہوش پڑی تھی۔ اسے چادر میں لپیٹ کر میں لے آئی جسے تم اپنی گود میں لے کر نیچے اترتے چلے گئے۔''

''پھر میں اسے لے کر ظہیر کے پاس پہنچا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ صنم کو لے کر کہیں دور چلا جائے۔''

''ہاہاہا... یہ کمال تمہارا ہی تھا کہ تم نے اس دن زبردستی ظہیر کو بڑی مقدار میں ڈرگ استعمال کرائی اور پھر اسے کار میں بٹھا دیا اور اس کے برابر میں کلوروفارم سنگھا کر صنم کو بٹھایا پھر کار لے کر شاہراہ فیصل پہنچ گئے۔ کار روک کر خود اتر گئے اور کار اسٹارٹ کر کے نشے میں چور ظہیر سے کہا کہ ایکسیلیٹر دباتے چلے جاؤ... انجام... ہاہاہا۔'' پھر وہ چٹکی بجا کر بولی۔ ''دونوں اوپر۔''

''چھوڑو اِن باتوں کو... یاد ہے ناں کل بینک جا کر رقم ٹرانسفر کرانا ہے اور ٹریول ایجنسی جا کر ٹکٹ بھی کنفرم کرنا ہے۔''

''ہاں ہاں سب یاد ہے... اب تم اسپتال جا کر لاش لے آؤ تاکہ کفن دفن کا انتظام کیا جا سکے۔''

رشید اسے پیار کر کے باہر نکل گیا۔

تدفین سے فارغ ہو کر روبینہ نے پہلا کام یہ کیا کہ ملکہ کو ایک ماہ کی تنخواہ دے کر کہا۔ ''اب میرا یہاں دل نہیں لگ رہا ہے، اس لیے میں ایک ماہ کے لیے لاہور جا رہی ہوں۔کل سے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

ملکہ بھاری دل کے ساتھ سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ رشید آ گیا۔ملکہ نے اس سے پوچھا ''کیا آپ بھی لاہور جا رہے ہیں؟''

''ارادہ میرا بھی ہے۔'' کہتا ہوا وہ سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو روبینہ پیکنگ میں مصروف تھی۔

''یہ کیا... شلوار سوٹ... عجب جاہلوں والا کام کر رہی ہو'' اس نے روبینہ کو جھڑکا۔

اسی وقت روبینہ کا موبائل فون بج اٹھا۔موبائل بیڈ کے سرہانے، تپائی پر رکھا ہوا تھا۔روبینہ نے اشارے سے کہا کہ وہ فون اٹھا لے۔ رشید نے فون آن کر کے کان میں لگاتے ہوئے روبینہ سے کہا۔ ''ہم لوگ پیرس جا رہے ہیں۔... چیچھوں کی ململیاں نہیں... جینز اور شرٹ رکھو... بس۔''

وہ کچھ دیر تک دوسری جانب سے آواز آنے کا انتظار کرتا رہا۔کئی بار ہیلو ہیلو بھی کہا مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تو اس نے موبائل بند کر دیا۔

''کون تھا؟'' روبینہ نے پوچھا۔

''unknown numbr ہے شاید کسی نے غلطی سے نمبر ملا دیا ہے۔''

جسے اس نے ان نون نمبر سمجھا تھا، وہ انسپکٹر انور کا پرسنل نمبر تھا۔انسپکٹر انور نے پیرس کا ذکر سن لیا تھا۔وہ پہلے ہی شک میں گرفتار تھا۔اب اسے پختہ یقین ہو چلا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے اور وہ وکیل کے پاس جا پہنچا۔

''وکیل صاحب آپ تو ظہیر صاحب کے گھرانے کے لیگل ایڈوائزر ہیں... یہ بتائیں کہ ان کی پہلی بیوی عشنا سے ان کے تعلقات کیسے تھے؟''

''بات یہ ہے کہ ظہیر صاحب کچھ عاشق مزاج تھے... اسی لیے ان کے ڈیڈی نے وراثت نامے میں صاف لکھا تھا کہ تمام کاروبار اور جائداد ظہیر کے بچوں کے نام رہے گی... وہ اسے سیل نہیں کر سکتے۔ دراصل عشنا صاحبہ سے شادی ظہیر صاحب نے باپ سے پوچھے بغیر کی تھی۔یہی بات انہیں بری لگی تھی۔''

''عشنا اور ظہیر کے تعلقات کیسے تھے؟''

نوکری

ایک لاولد برطانوی ارب پتی مختصر سی علالت کے بعد دنیا سے رخصت ہو گیا۔اس کی بیوہ دل ہی دل میں شوہر کے خوش شکل اور اسمارٹ اکاؤنٹنٹ کو پسند کرتی تھی۔ بیوہ ہو جانے کے بعد اس نے کچھ عرصے تک اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھی۔ مطمئن ہونے کے بعد اس سے ربط ضبط بڑھایا اور آخر کار دونوں نے شادی کر لی۔شادی کے دوسرے ہی دن اس شخص نے اپنی نئی نویلی بیوی سے تاریخی بات کہی۔

''جین! میں ساری زندگی سمجھتا رہا کہ میں تمہارے متوفی شوہر کی نوکری کر رہا ہوں لیکن تقدیر کا لکھا یہ تھا کہ دراصل وہ میری نوکری کر رہا تھا۔ اس نے یہ سارا کاروبار اور دھن دولت میرے لیے جمع کیا تھا جواب تمہارا یعنی ہم دونوں کا ہے۔''

☆☆☆

''صنم کی پیدائش کے بعد ایک بچہ اور ہوا جو بچ نہ پایا۔ وہ بیمار پڑ گئیں، ان کی صحت گرنے لگی تھی۔ ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے روبینہ صاحبہ ان کا علاج کر رہی تھیں مگر زندگی نے وفا نہیں کی۔''

''انہیں مرض کیا تھا؟''

''سنتے ہیں کہ وہ روبینہ اور ظہیر کے تعلقات جان گئی تھیں... اسی کا دکھ لیے وہ اس دنیا سے چلی گئیں۔''

''جائداد اب کس کے نام ہے؟''

''بچے رہے نہیں اس لیے جائداد ظہیر صاحب کے نام ہو گئی۔ان کے بعد ڈاکٹر روبینہ کے نام۔''

''ہوں... میں چلتا ہوں'' یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔

☆☆☆

رات کا وقت تھا۔شہر کی سڑکیں ویران ہو رہی تھیں۔ فلیٹس کی تقریباً تمام کھڑکیاں بند ہو چکی تھیں۔ایک دو گھر میں روشنی ہو رہی تھی۔ رشید اور روبینہ بھی بے خبر سو رہے تھے۔ کافی دن بعد ایک بیڈ پر وہ دونوں سوئے تھے۔ملکہ کا بھی ڈر نہ تھا اسی لیے ہر جانب سے بے پروا ہو کر سو رہے تھے کہ روبینہ کی آنکھ کھل گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کا نام لے کر پکارا ہو۔وہ اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ اسے ایک ہلکی سی پکار سنائی دی۔ جیسے کوئی کرب میں اسے

پکار رہا ہو۔ وہ کان لگا کر سننے لگی۔ تبھی وہ آواز پھر آئی۔
''آنٹی۔''
''کک۔۔۔کو۔۔۔کون۔۔۔کون ہے۔'' روبینہ نے گھبرا کر پوچھا۔
''آنٹی۔۔۔ میرا پیر درد کر رہا ہے۔۔۔ آنٹی۔'' آواز ہلکی تھی مگر صاف سمجھ آرہی تھی۔
''رشید۔۔۔ رشید اٹھو۔۔۔ اٹھو۔'' روبینہ نے برابر میں سوئے ہوئے ڈاکٹر رشید کو جھنجوڑا۔
''کیا۔۔ کیا ہوا؟'' رشید نے چونک کر پوچھا۔
''صنم۔۔۔ صنم کی آواز۔۔۔''
''کیا بکتی ہو۔''
''ابھی۔۔۔ ابھی اس نے۔۔۔ لو سنو۔ وہ پھر پکار رہی ہے۔'' روبینہ کی آواز میں خوف در آیا تھا۔
''اُف۔۔۔ تمہارے دماغ میں صنم گھس گئی ہے۔۔۔ گھڑی دیکھو۔۔۔ کیا بج رہا ہے۔۔۔ سو جاؤ۔''
''نہیں رشید۔۔۔ وہ آواز صنم کی تھی۔'' ابھی اس نے اتنا کہا ہی تھا کہ کال بیل بج اٹھی۔ دونوں ہی بری طرح چونک گئے۔
''اتنی رات کو کون آگیا۔'' یہ کہتا ہوا رشید دروازے کی طرف بڑھا۔ بیل کی آواز مسلسل آرہی تھی جیسے بیل بجانے والے نے بیل پر انگلی رکھنے کے بعد اٹھانے کا ارادہ ترک کر دیا ہو۔ رشید نے دروازہ کھول کر دیکھا پھر باہر نکل گیا۔ روبینہ بھی اس کے پیچھے باہر آگئی۔
''کون تھا؟'' روبینہ نے پوچھا۔
''کو۔۔ کوئی نہیں۔۔۔ کک کسی نے۔۔۔ سوئچ پر ٹیپ چپکا دیا تھا۔''
''اوہ۔۔ کون ہو سکتا ہے؟''
اسی وقت تیز ہوا سے دروازہ بند ہو گیا۔ رشید نے ہینڈل پکڑ کر گھمانا چاہا۔ مگر دروازہ نہ کھلا۔ لاک ہو گیا تھا۔ پھر وہ مڑ کر بولا ''لاک آن تھا تو کیا ضرورت تھی دروازہ کھلا چھوڑنے کی۔''
''تیز آواز میں مت بولو۔'' روبینہ نے اسے جھڑکا۔
''یہ تم کس لہجے میں بات کر رہی ہو۔'' رشید بھی غصے میں بولا۔
وہ دونوں جھگڑ رہے تھے کہ گراؤنڈ فلور سے پھر آواز آئی۔ ''آنٹی۔''
وہ دونوں نیچے جھانک کر دیکھنے لگے۔ اس بار آواز زیادہ واضح تھی۔

''آنٹی۔۔۔ نیچے آؤ نا۔'' وہی آواز پھر ابھری۔
''آنٹی دیکھو نا۔۔۔ ڈیڈی کے سر میں بہت چوٹ آئی ہے۔ کتنا خون بہہ رہا ہے۔''
دونوں اس بچی کو دیکھ رہے تھے جو ہلکی روشنی میں کھڑی اوپر دیکھ کر آواز لگا رہی تھی۔
''نیچے جاؤ۔۔۔ دیکھو صنم کیا کہہ رہی ہے۔''
''ہوش میں آؤ۔۔۔ یہ صنم نہیں ہے۔'' رشید نے جھڑکا۔
''پھر کون ہے۔۔۔ کون ہے یہ؟'' روبینہ نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر سیڑھیوں کی جانب دھکیلا۔
روبینہ کے دھکیلنے پر رشید آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ چیخ کر بولا ''میں نے۔۔۔ خود میں نے۔۔۔ اسے کلوروفارم سنگھا کر بے ہوش کیا تھا۔۔۔ باپ کے ساتھ بٹھا کر کار چلائی تھی۔ تاکہ ایکسیڈنٹ میں ماری جائے۔''
تبھی اوپر جاتی سیڑھیوں کے سرے سے ایک دوسری آواز ابھری۔ ایک بھاری مردانہ آواز ''تھینک یو ڈاکٹر رشید تھینک یو۔۔۔'' بولنے والا مزید دو تین سیڑھیاں نیچے آیا۔ روشنی میں آتے ہی رشید نے اسے پہچان لیا۔ وہ انسپکٹر انور تھا۔ وہ طنزیہ انداز میں بول رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے میں ایک چھوٹا سا پاکٹ ٹیپ ریکارڈر۔ ''مجھے جو پتا کرنا تھا، کر لیا۔۔۔ یہ ثبوت کافی ہے۔ تم نے خود اقرار کر لیا کہ صنم اور اس کے باپ کو قتل کیا ہے۔۔۔ یعنی ایکسیڈنٹ نما قتل'' پھر وہ گراؤنڈ فلور پر جھانک کر بولا۔
''آؤ۔۔۔ اوپر آجاؤ۔۔۔''
نیچے کھڑی ہوئی ایک بچی اور ایک عورت اوپر آنے لگی۔ عورت کو مخاطب کر کے وہ بولا ''ملکہ تمہارا بھی شکریہ۔۔۔ ڈاکٹر روبینہ۔۔۔ یہ صنم نہیں ہے مگر صنم جیسی ہے۔ صنم اور ظہیر ایکسیڈنٹ میں ہی ختم ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر رشید۔۔۔ تم نے کیا سمجھا تھا کہ قانون اندھا ہے؟ وہ تم تک پہنچ ہی نہیں پائے گا۔۔۔ تم نے بالکل سامنے والا فلیٹ کرائے پر لیا تھا اور وہاں سے فون کرتے تھے مگر ایک دن۔۔۔'' وہ مزید ایک سیڑھی نیچے آ آیا ''مگر ایک دن ملکہ نے تمہاری ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ اس لیے میں نے فلمی انداز کا یہ ڈراما اسٹیج کیا اور تم دونوں میرے جال میں آ گئے۔۔۔ اب باقی باتیں عدالت کو بتانا کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔۔۔ آخر کیوں ڈاکٹر روبینہ انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے گناہ کرتی رہی اور ایک پورے خاندان کو برباد کر بیٹھی۔''
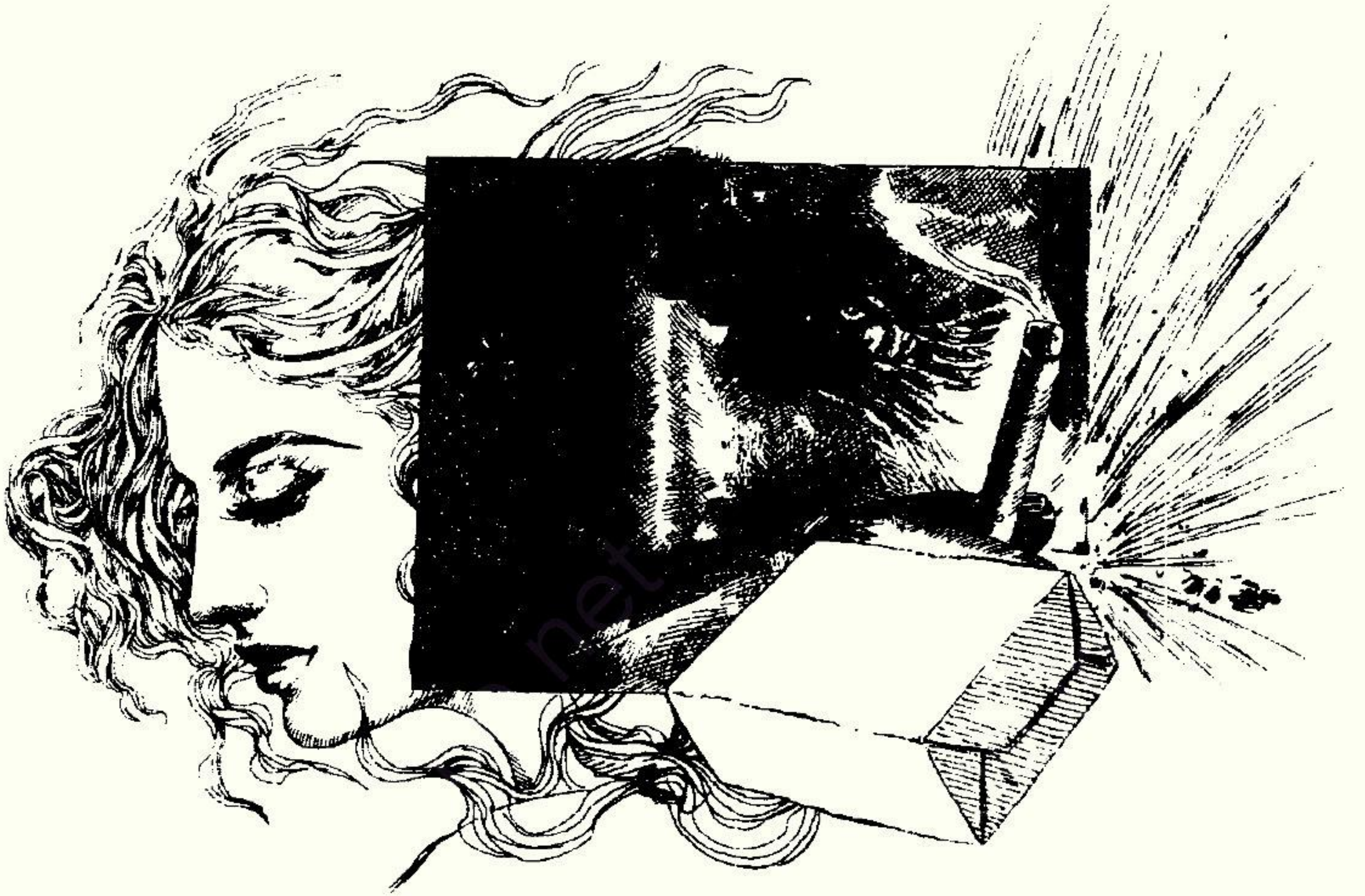
ڈبل کراس

سلیم انور

چوری اور سینہ زوری... محاورے چاہے کتنے ہی قدیم ہو جائیں اپنی افادیت نہیں کھوتے... ایک ایسی ہی کامیاب واردات کی روداد... ہر شخص اپنی اپنی جگہ کامیابی سے آگے کی جانب گامزن تھا... مگر اچانک ہی قسمت کے پھیر نے ہر شخص کے پھیرے لگادیے... ایک دلچسپ کہانی کے منفرد موڑ

شیطانی ذہن اور فتور نیت کے سامنے پسپا نہ ہونے والی عورت کی دلیری...

لینی ایڈمز اس وقت شام کا اخبار پڑھ رہا تھا جب داخلی دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اپنے جوتے اُتارے ہوئے تھے اور وہ صرف بنیان پہنے ہوئے تھا۔ اس کے منہ میں ایک سگار دبا ہوا تھا۔

اس نے اخبار چہرے پر سے ہٹایا، منہ میں دبا ہوا سگار نکالا اور چیخ کر بولا۔ ''دیکھو ہیزل، کوئی دروازے پر آیا ہے۔'' پھر اس نے اخبار دوبارہ اٹھالیا اور سگار بھی واپس منہ میں دبا لیا۔

اس کی بیوی ہیزل اس وقت کچن میں آئرننگ بورڈ پر کپڑے استری کر رہی تھی۔ کچن کے سنک میں دن بھر کے دھونے والے برتنوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنی پیشانی پر آئی ہوئی بالوں کی ایک لٹ کو پیچھے کیا اور ڈائننگ روم سے ہوتی ہوئی لیونگ روم میں آ گئی۔ وہ ایک دبلی پتلی اور ٹھنڈے مزاج کی عورت تھی۔ اس کے شانے ڈھلکے ہوئے تھے اور چہرے سے تھکن عیاں تھی۔ وہ اکتائے ہوئے انداز میں حرکت کر رہی تھی جیسے اس پر مردنی چھائی ہوئی ہو۔

ابھی وہ اس کرسی تک بھی نہیں پہنچی تھی جس پر اس کا شوہر لینی بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ دستک دوبارہ ہوئی۔

''خدا کے واسطے جا کر دیکھو کہ کون ہے؟'' لینی نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

ہیزل نے کوئی جواب دیے بغیر دروازہ کھول دیا۔

ہال کی مدھم روشنی میں وہ اس شخص کو پہچاننے میں ناکام رہی جو دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔

''مسز ایڈمز؟'' اس شخص نے کہا۔

ہیزل کو اپنے عقب سے لینی کی بے تاب آواز سنائی دی جو بدستور اپنی کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ ''کون ہے؟''

اس پستہ قد آدمی نے نروس زدہ لہجے میں کہا۔ ''یہ میں ہوں... یورک، مسٹر یورک۔ میں ہال میں سامنے کے اپارٹمنٹ میں رہتا ہوں۔''

وہ گہرے بالوں والا ایک پستہ قد آدمی تھا اور اس نے گہرے نیلے رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سوٹ کیس سائز کا ایک پیکٹ تھا جو براؤن کاغذ میں لپٹا ہوا تھا۔

تب ہیزل نے اسے پہچان لیا۔ ''یہ مسٹر یورک ہیں جو ہال میں سامنے کے فلیٹ میں رہتے ہیں۔'' ہیزل نے لینی کو بتایا۔

''یہ کیا چاہتے ہیں؟'' لینی نے پوچھا۔

ہیزل دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

''کیا آپ لوگ مجھ پر ایک عنایت کر سکتے ہیں؟'' مسٹر یورک نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔

''یقیناً، کیوں نہیں۔'' ہیزل نے جواب دیا۔ ''آخر کو ہم پڑوسی ہیں اور پڑوسی ہی ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔''

مسٹر یورک نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پیکٹ کو اس انداز سے اٹھایا جیسے اس کے وزن کے بارے میں جتلانا چاہتا ہو۔ ''یہ ایک پیکٹ ہے جو میں اپنے ایک دوست تک پہنچانا چاہتا ہوں۔''

''تو پھر؟'' ہیزل نے پوچھا۔

''میں نے اسے فون کر دیا ہے اور وہ اسے لینے کے لیے آ رہا ہے۔ لیکن مجھے اچانک باہر جانا پڑ رہا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کیا میں یہ پیکٹ اس کے لیے یہاں چھوڑ جاؤں تاکہ میری غیر موجودگی میں یہ اسے مل جائے؟'' مسٹر یورک نے کہا۔

''یقیناً، کیوں نہیں۔''

''یہ زیادہ بھاری بھی نہیں ہے۔'' مسٹر یورک نے بتایا۔ ''میرا دوست تقریباً ایک گھنٹے میں اسے لینے کے لیے آ جائے گا۔''

ہیزل نے وہ پیکٹ اس سے لے لیا۔ پیکٹ حیرت انگیز طور پر خاصا ہلکا تھا۔ ''ہمیں خوشی ہو گی مسٹر یورک۔ آخر کو ہم پڑوسی ہیں۔ ہیں نا؟''

ہیزل نے وہ پیکٹ مہمان خانے کی الماری کے خانے میں رکھ دیا۔

''اس شخص کا نام کمبرلے ہے۔'' مسٹر یورک نے کہا۔ ''اور یہ بات نہایت اہمیت رکھتی ہے کہ یہ پیکٹ صحیح شخص تک ہی پہنچے۔ وہ ایک دراز قامت آدمی ہے اور اس کے چہرے پر زخم کا نشان ہے۔''

''اس بارے میں آپ بالکل بے فکر رہیں مسٹر یورک۔'' ہیزل نے کہا۔ ''آپ کا یہ پیکٹ صحیح شخص تک ہی پہنچے گا۔''

''میں اس عنایت پر شکر گزار رہوں گا۔'' مسٹر یورک نے کہا۔ ''میں حقیقت میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔ میں یہ پیکٹ بذاتِ خود اسے دیتا لیکن مجھے ابھی پتا چلا کہ مجھے ایک کام کے سلسلے میں فوری طور پر باہر جانا پڑے گا۔ میں بے حد شکر گزار رہوں۔''

''بار بار شکریہ ادا کر کے شرمندہ نہ کریں۔'' ہیزل نے کہا۔

تب مسٹر یورک تاکیدی لہجے میں گویا ہوا۔ ''اسے کھولنا مت۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹا اور دروازے سے نکل کر تیز تیز قدموں کے ساتھ اپارٹمنٹ بلڈنگ کی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

''بڑا دیدہ دلیر ہے۔'' لینی نے اس کے جانے کے بعد تبصرہ کیا۔ ''اسے کھولنا مت۔''

ہیزل نے دروازہ بند کر دیا اور واپس کچن میں جانے کے لیے پلٹ گئی۔

''آخر کو ہم پڑوسی ہیں۔ ہیں نا؟'' لینی نے ہیزل کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ ''ہشت!''

ہیزل کا چہرہ تمتما گیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ہچکچائی، پھر آگے بڑھنے لگی۔

''جب میں کام پر چلا جاتا ہوں تو یہ شخص کتنی مرتبہ یہاں آتا ہے؟'' لینی نے پوچھا۔

ہیزل نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

تب لینی بولا۔ ''کیا تمہارے خیال میں تم مجھے دھوکا نہیں دے رہی ہو؟ میں کل کا بچہ نہیں ہوں۔''

ہیزل بدستور خاموش رہی۔ اس نے استری کی تپش چیک کی، پھر اسے داہنے ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے اس نے کچھ سوچتے ہوئے لینی کی طرف دیکھا اور استری دوبارہ نیچے رکھ دی۔

''ہشت!'' لینی نے کہا۔ ''میں کل کا بچہ نہیں ہوں۔''

پھر وہ دوبارہ اخبار کی جانب متوجہ ہو گیا اور قدرے بلند آواز میں ریس کے نتائج پڑھنے لگا۔ پھر سرخیوں پر آ گیا۔ ''بس کے حادثے میں چھ افراد زخمی... حکومت کی ٹیکس قانون سازی پر بحث... ڈاکو بکتر بند گاڑی سے پانچ کروڑ ڈالر لے اڑے۔''

ہیزل خاموشی اور سکون کے ساتھ استری کرنے میں مصروف رہی۔

تقریباً پانچ منٹ گزر گئے جب لینی اچانک بول پڑا۔ ''اس شخص کا نام کیا تھا؟''

''کس شخص کا؟'' ہیزل نے پوچھا۔

''وہی جس نے پیکٹ لینے کے لیے آنا ہے، بے وقوف۔''

''کمبرٹن یا ایسا ہی کچھ نام تھا۔''

''دراز قامت اور چہرے پر زخم کا نشان... یہی بتایا تھا نا، ہیزل؟'' لینی نے کہا۔

ہیزل نے استری شدہ سفید قمیص کچن کی کرسی کی پشت پر احتیاط سے لٹکا دی اور بولی۔ ''میرے خیال میں یہی بتایا تھا۔''

''یہی وہ شخص ہے۔'' لینی نے قدرے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''یقینی طور پر یہ وہی شخص ہے، دیکھو۔'' اس نے اخبار ہیزل کی جانب لہرایا اور پھر اسے درست کرتے ہوئے پڑھنے لگا۔ ''چشم دید گواہوں کے مطابق ایک ڈاکو دراز قامت تھا اور اس کے چہرے پر زخم کا نشان تھا۔ دوسرا ڈاکو پستہ قد تھا۔ اس کے بال گرے رنگ کے تھے اور اس نے سیاہ بزنس سوٹ پہنا ہوا تھا۔ یقیناً وہ دونوں یورک اور کمبرٹن ہی تھے۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔''

''انہوں نے کیا، کیا ہے؟'' ہیزل نے پوچھا۔

''انہوں نے ایک بکتر بند گاڑی کو تباہ کیا اور پانچ کروڑ ڈالر لے اڑے۔'' لینی نے کہا اور پھر اچانک رک گیا۔ اس نے اپنا بھاری بھرکم وجود کرسی پر سے اٹھایا اور الماری کی جانب بڑھ گیا۔

''دراز قامت اور پستہ قد آدمی تو بہت سے ہیں۔'' ہیزل نے کہا۔

''پانچ کروڑ ڈالر۔'' لینی نے نیاز مندانہ لہجے میں دہرایا۔ ''میں کہہ رہا ہوں کہ...''

''تم اس پیکٹ کو ہاتھ مت لگانا۔'' ہیزل اس پر چیخ پڑی۔ اس مرتبہ اس کی آواز اچانک چبھتی ہوئی اور تیز تھی۔

عین اسی لمحے دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی۔ لیکن اس مرتبہ یہ دستک بلند آواز اور اکھڑپن کے انداز کی تھی۔

ہیزل نے دروازہ کھولا تو سیاہ سوٹ میں ملبوس درشت چہرے والے دو بھاری بھرکم افراد دندناتے ہوئے اپارٹمنٹ میں در آئے۔ ان میں سے دراز قامت اپنی ایڑیوں کے بل دروازے پر کھڑا جھولنے کے انداز میں سرد نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

دوسرا شخص گویا ہوا۔ ''یہ سراغ رساں رورکی ہے اور میرا نام میکناز ہے۔ ہمارا تعلق ڈکیتی اسکواڈ سے ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اندر آ گیا اور اس کرسی پر بیٹھ گیا جس پر کچھ دیر پہلے لینی بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ سراغ رساں رورکی دروازے کے پاس ہی کھڑا رہا۔

ہیزل نے کپڑوں پر استری کرنا ایک بار پھر روک دی اور لیونگ روم میں آ گئی۔ ''کیا مسئلہ ہے، آفیسر؟'' اس نے پوچھا۔

میکناز اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، لیڈی۔ مسئلہ آپ لوگوں سے متعلق نہیں ہے۔ ہم آپ کے ایک پڑوسی کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔''

''مجھے معلوم تھا۔'' لینی نے کہا۔

''کیا معلوم تھا؟''

''یہ کہ جو شخص ہال میں سامنے رہتا ہے، مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک مجرم ہے۔'' لینی نے جواب دیا۔
''تم اس شخص کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟'' میکنا ز نے آہستگی سے پوچھا۔
''کچھ نہیں۔'' لینی نے کہا۔ ''بس یہی کہ میں نے اسے یہاں آتے جاتے ہوئے دیکھا ہے اور کچھ نہیں۔''
''تمہیں کس چیز نے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ وہ ایک مجرم ہے؟''
اس مرتبہ لینی نے جواب دیتے ہوئے الفاظ کے چناؤ میں احتیاط کی۔ ''مجھے دیکھنے میں وہ بے بھروسا اور دھوکے باز لگتا ہے۔ ایک نظر دیکھتے ہی یہ احساس ہونے لگتا ہے۔''
''بس یہی؟'' میکنا ز نے پوچھا۔ ''بس یہی یا اور کچھ بھی؟''
لینی کا چہرہ تمتما گیا۔
''ہم جس شخص میں دلچسپی رکھتے ہیں اس کا قد چھوٹا، بال گہرے رنگ کے ہیں۔ وہ ڈارک سوٹ پہنتا ہے۔ اپنا نام یورک بتاتا ہے۔ کیا یہ وہی ہے؟''
''بالکل وہی ہے۔'' لینی نے کہا۔
''آج رات۔'' ہیزل نے بولنا شروع کیا۔ ''وہ...''
لینی نے اس کی بات کاٹ دی اور تیزی سے خود گویا ہوا۔ ''آج رات ہم نے اسے باہر جاتے ہوئے سنا تھا۔ سات بجے کے قریب۔''
''لیڈی۔'' میکنا ز نے کہا۔ ''کیا آپ ہمیں کچھ بتانے کی کوشش کر رہی ہیں؟''
ہیزل کو لینی کی بڑی بے کیف آنکھیں اپنے وجود میں گڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں جیسے وہ اسے دھمکا رہا ہو۔
''نہیں، کچھ بھی نہیں۔'' ہیزل نے جواب دیا۔
''کیا کبھی کوئی اس سے ملنے کے لیے آتا تھا؟ کیا اس کے کوئی ملاقاتی بھی تھے؟''
''میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔''
''اور آج صبح؟ کیا وہ آج صبح دس بجے کے لگ بھگ اپنے اپارٹمنٹ میں موجود تھا؟''
''میں نے اس پر بھی دھیان نہیں دیا۔''
میکنا ز اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اوکے۔'' اس نے کہا۔ ''اوکے، میں اس بارے میں آپ کی باتوں کو تسلیم کیے لیتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ لوگ اپنے بیان پر قائم رہیں گے۔''
''ہم اپنی بات پر قائم ہیں۔'' لینی نے کہا۔ ''ہم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔''
میکنا ز دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ ''یہ آپ لوگوں کے مفاد میں ہوگا کہ آپ نے جو کچھ بتایا ہے وہی سچ ہے۔'' اس نے جاتے جاتے کہا۔
پھر وہ دونوں سراغ رساں وہاں سے چلے گئے۔ ان کے نکلنے کے بعد ہیزل بھی تھکے قدموں سے واپس کچن میں آگئی۔
اس نے استری کی تپش ایک بار پھر چیک کی۔ پھر لینی سے بولی۔ ''تم نے ان سے جھوٹ کیوں کہا؟''
لینی کھڑکی کے پاس جا چکا تھا اور پردے کی آڑ سے باہر جھانک رہا تھا۔ اس نے ہیزل کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔
''تم اس طریقے سے جھوٹ بول کر مشکل میں پڑ جاؤ گے۔'' ہیزل نے کہا۔
''شٹ اپ۔''
''تم باہر کیا دیکھ رہے ہو؟''
''ان پولیس والوں کو دیکھ رہا ہوں۔'' لینی نے بتایا۔ ''جیسے ہی یہ لوگ یہاں سے چلے جائیں گے، میں اس پیکٹ کو کھول لوں گا۔''
''یہ جسارت مت کرنا۔''
لینی نے ہیزل کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اس کے بجائے وہ کھڑکی کے پاس سے پلٹ آیا اور ریڈیو آن کر کے اس کے ڈائل گھمانے لگا۔ پھر وہ دوبارہ کھڑکی کی طرف چلا گیا۔
''یہ کم بخت آخر کب یہاں سے جائیں گے؟'' وہ جھنجلا گیا۔
اتنے میں ریڈیو اناؤنسر کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ ''اب ہم مقامی خبریں بیان کرتے ہیں، پولیس نے...''
''شش!'' لینی نے ہیزل کو اشارہ کیا۔ ''سنو، یہ کیا کہہ رہا ہے۔''
''...ان دونوں ڈاکوؤں کو شناخت کر لیا ہے جنہوں نے آج صبح چالاکی کے ساتھ بکتر بند گاڑی میں بم نصب کر کے اسے اڑا دیا تھا اور لگ بھگ پانچ کروڑ ڈالر لوٹ کر لے گئے تھے۔ پولیس کمشنر پیٹرز نے اعلان کیا ہے، انہیں یقین ہے کہ ان میں سے ایک ڈاکو ڈیوک یانکے وٹز عرف

یلٹن عرف یورک ہے جو تجوریاں توڑنے میں ماہر اور سزا یافتہ ہے۔ وہ آتش گیر مادوں میں مہارت کا حامل ہے۔ دوسرا ڈاکو رالف کنیٹن ہے جو کہ کمبرلے کے نام سے بھی مشہور ہے۔ ایک زمانہ تھا جب وہ یانکے ونز عرف یورک کا سب سے خطرناک دشمن سمجھا جاتا تھا۔ لیکن لگتا یوں ہے کہ اس ڈکیتی کی واردات کے لیے وہ دونوں یکجا ہو گئے تھے۔"

"یہ وہی دونوں ہیں۔" لینی نے کہا۔

ریڈیو اناؤنسر کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

"پولیس کمشنر پیٹرز کا کہنا ہے کہ ان دونوں آدمیوں نے ایک چھوٹا سا اسٹور کھولنے کے بعد اس بکتر بند گاڑی سے مال لانے لے جانے کا معاہدہ کرلیا تھا۔ اس دوران وہ بکتر بند گاڑی کی نقل و حرکت کا باریک بینی سے جائزہ لیتے رہے۔ آج صبح انہوں نے ایک تھیلا جس میں آتش گیر مادہ چھپایا ہوا تھا، بکتر بند گاڑی کے محافظوں کے سپرد کردیا تھا۔ یہ دھماکا خیز مادہ ایک مقررہ وقت پر پھٹنے کے لیے سیٹ کیا ہوا تھا۔ پھر یہ بم جیمز اور نارتھ اسٹریٹ کی کراسنگ پر پھٹ گیا۔ دھماکے سے بکتر بند گاڑی کے دروازے اڑ گئے اور دونوں گارڈ بے ہوش ہو گئے۔ دونوں ڈاکو جو پہلے سے اس جگہ چھپے ہوئے تھے، اپنی کمین گاہ سے نکل کر تباہ شدہ بکتر بند کی جانب لپکے اور انہیں بکتر بند میں رکھی ہوئی رقم لوٹنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ پھر دونوں ڈاکو دوڑتے ہوئے ایک گلی میں پہنچے اور وہاں سے علیحدہ علیحدہ راستہ اختیار کرلیا اور ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں فرار ہو گئے۔ اس طرح انہوں نے چشم دید گواہوں کو جو پہلے ہی حیرت زدہ تھے، مخمصے میں ڈال دیا۔ پولیس کو یقین ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی کار کہیں نزدیک ہی پارک کی ہوئی تھی۔ بکتر بند گاڑی کے دونوں محافظوں، چند چشم دید گواہوں اور اس ریئل اسٹیٹ فرم کے ملازمین نے جن کے ذریعے ان ڈاکوؤں نے وہ ڈمی اسٹور کرائے پر حاصل کیا تھا، تمام کے تمام نے کنیٹن عرف کمبرلے کی تصویر کی شناخت کردی ہے۔ یہ بات پولیس کمشنر پیٹرز نے بتائی۔ ایک نامعلوم فون کال سے کسی نے پولیس کو خبر دی کہ کمبرلے کا دوسرا ساتھی یورک ہے۔ یہ یورک تھا جس نے بکتر بند میں سے کیش سمیٹا تھا جبکہ کمبرلے زخمی محافظوں اور ششدر راہ گیروں کی نگرانی کررہا تھا...."

لینی نے ریڈیو کا سوئچ آف کردیا۔ پھر باہر جھانکنے

بیٹا مجھے پتا ہے کہ تمہاری ماں کا وزن منوں کے حساب سے کم ہوا ہے لیکن ڈائٹنگ سے 5 کلو کم ہوتا ہے تو تمہاری ماں کی خوش خوراکی سے چند روز میں 10 کلو بڑھ جاتا ہے۔ اس جمع تفریق کا نتیجہ سامنے ہے

کے ارادے سے دوبارہ کھڑکی کے پاس چلا گیا۔

"لینی!" اس کی بیوی ہیزل نے دھیمی اور پُرسکون آواز میں کہا۔ لینی کو اس کی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ "لینی، میں تمہیں یہ کچھ کرنے نہیں دوں گی۔"

لینی نے ایک خشمگیں نگاہ ہیزل کی جانب ڈالی، پھر پلٹ کر دوبارہ اس کار پر نظریں جما دیں جو نیچے سڑک پر کھڑی ہوئی تھی۔ "وہ کہہ رہی ہے کہ وہ مجھے یہ کچھ کرنے نہیں دے گی۔" وہ خود سے بڑبڑایا۔ "پانچ کروڑ ڈالرز... پانچ کروڑ ڈالرز! اور وہ سمجھ رہی ہے کہ وہ مجھے روک لے گی۔"

"لینی۔" ہیزل دوبارہ اس سے مخاطب ہوئی۔ "تم نے اگر وہ پیکٹ کھولا تو پھر مجھے دوبارہ کبھی دیکھ نہیں پاؤ گے۔"

یہ سن کر لینی نے ایک بے کیف قہقہہ بلند کیا۔

اس مرتبہ اس کی پوری توجہ ہیزل کی جانب تھی۔ اس کا چہرہ یوں تمتما رہا تھا جیسے اس پر بخار کی کیفیت طاری ہو۔ اس نے اپنی مٹھیاں سختی سے بھینچی ہوئی تھیں اور چہرے پر کرختگی کے تاثرات امڈ آئے تھے۔ وہ بولا۔ "میں تمہاری نازیبا حرکتوں کو ایک عرصے سے برداشت کرتا چلا آرہا ہوں، ہیزل! میں تمہاری ان حرکتوں سے عاجز آچکا ہوں اور میں تم سے بھی عاجز آچکا ہوں! میں وہ رقم لے کر رہوں گا

تب ہیزل میکانکی انداز میں اپنی مرضی کے بغیر اس کے پیچھے پیچھے ہال میں سے ہوتی ہوئی بیسمنٹ کی سیڑھیاں اترنے لگی۔

نیچے بیسمنٹ خالی، سیل زدہ اور اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب لینی نے لائٹ کا سوئچ آن کیا تو ہیزل خوف زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ وحشت اس کی نگاہوں سے عیاں تھی۔

پہلے تو اسے وہ دکھائی نہیں دیا۔ پھر کوئلے دان کے پاس اسے ایک بے ہنگم سایہ نما ڈھیر سا نظر آیا۔ اس نے غور سے دیکھا تو وہ اس شخص کی لاش تھی۔

تب لینی گویا ہوا۔ ''میں نے اس سے کہا کہ وہ پیکٹ کوئلے دان میں رکھا ہوا ہے اور جب وہ کوئلے دان پر جھکا تو میں نے پیچھے سے اس کے سر میں گولی ماردی۔''

ہیزل کانپ کر رہ گئی۔

لینی نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''میں ان کوئلوں کو انگیٹھی میں ڈال دوں گا اور ان پر لگے خون کا کوئی وجود باقی نہیں رہے گا۔''

ہیزل پر بدستور بیکلی کی کیفیت طاری تھی۔

لینی اس کے نزدیک آکر اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''تم اپنا منہ بند رکھنا۔ سُن رہی ہو؟''

ہیزل نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''تم یہیں انتظار کرو۔'' لینی نے اس سے کہا۔ ''میں کار گھما کر پیچھے لاتا ہوں۔''

وہ اس کے ساتھ دروازے تک گئی اور لینی کے اشارے پر وہیں رک گئی۔

اب وہ بیسمنٹ میں اس شخص کی لاش کے ساتھ تنہا رہ گئی تھی۔ وہ اس لاش سے جتنی دور ممکن ہوسکتا تھا، رہنا چاہتی تھی۔ وہ پلٹنے یا اس لاش کی جانب دیکھنے سے خوف محسوس کررہی تھی۔ ایک بار تو اسے یوں لگا جیسے لاش نے حرکت کی ہے۔ دہشت کے مارے اس کے قدم ڈگمگانے لگے اور اس کی پیشانی پر پسینا آگیا۔

آخر کار اسے کار کی آواز سنائی دی۔ پھر چند لمحوں بعد لینی آگیا۔ وہ اس کے پاس سے گزرتا ہوا سیدھا لاش کے پاس چلا گیا اور اس کے شانوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر اسے اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''تم اس کے پیر پکڑ لو۔'' لہجہ تحکمانہ تھا۔

ہیزل نے اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی۔ ''میں یہ نہیں کرسکتی، لینی۔ میں یہ نہیں کرسکتی۔'' ہیزل نے کہا۔

تب لینی نے لاش فرش پر چھوڑ دی اور ہیزل کی جانب بڑھا۔ اس نے نزدیک آکر ہیزل کے رخسار پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا اور گرجتے ہوئے بولا۔ ''اس کے پیر پکڑ کر اٹھاؤ۔''

ہیزل کو یہ سب کچھ ایک ڈراؤنے خواب کے مانند محسوس ہورہا تھا۔ اپنی اسی خوابناک کیفیت میں اس نے لاش کے پیروں کو پکڑا اور وہ دونوں لاش کو دروازے سے باہر لے گئے۔

انہوں نے لاش کار کی عقبی نشست پر ڈال دی۔ لینی نے وہ قیمتی پیکٹ لاش کے اوپر رکھ دیا اور ان دونوں کو ایک کمبل سے ڈھانپ دیا۔

''اندر بیٹھ جاؤ۔'' لینی نے ہیزل سے کہا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

ہیزل سحر زدہ انداز میں برابر کی نشست پر بیٹھ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ شخص جو اس کے برابر میں بیٹھا ہوا ہے زیادہ دیر نہیں ہوئی اس کا شوہر ہوتا تھا لیکن اب وہ اس سے اس درجہ خوف زدہ تھی کہ جیسے ساری زندگی اس سے نفرت کرتی چلی آئی ہو اور ان کے درمیان کبھی کوئی رشتہ نہ رہا ہو۔

لینی نے کار آگے بڑھا دی۔ دوران سفر وہ دونوں ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کررہے تھے۔ اس لیے کہ ان دونوں کے پاس ایک دوسرے سے کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ان کی کار کی پچھلی نشست پر موجود لاش خود ہی سب کچھ کہہ رہی تھی۔

نصف راستہ طے ہونے کے بعد لینی نے کار کا ریڈیو آن کردیا لیکن اس نے ڈائل گھمانے کی قطعی کوشش نہیں کی۔ کار کے اسپیکر سے ہلکی موسیقی سنائی دینے لگی جو ہیزل کو بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

پھر وہ ایک بہت بڑے خالی میدان پر پہنچ گئے جس کے درمیان... کوڑا کرکٹ پھونکنے کی ایک بہت بڑی بھٹی بنی ہوئی تھی۔ بھٹی کے اطراف میں ایک بڑا سا دیوہیکل اسٹرکچر تھا جو ابھی نامکمل تھا۔ اس کے اسٹیل کے گارڈرز پر رنگ بھی نہیں ہوا تھا اور اس کے وسط میں ایک لمبی اونچی چمنی دکھائی دے رہی تھی۔

اس عمارت میں ایک مہیب آگ روشن تھی۔ اس کی بھٹیوں میں دن رات الاؤ جلتا رہتا تھا جس میں شہر بھر کا کوڑا کرکٹ ٹھکانے لگایا جاتا تھا۔ یہ الاؤ کسی بھی انسانی جسم کو پلک جھپکتے میں شعلوں اور دھوئیں میں تبدیل کرسکتا تھا۔

''عقبی بوائلر روم۔'' لینی نے کہا۔ ''رات کو ادھر کوئی

نہیں ہوتا۔''

ابھی انہوں نے عقبی بوائلر روم کی جانب گھوم کر جانے والا راستہ نصف طے کیا تھا کہ ان کے کار کے ریڈیو پر موسیقی نشر ہونا بند ہوگئی اور اناؤنسر کی آواز ابھری۔

''ہمیں ابھی ابھی ایک بلیٹن موصول ہوا ہے جو پولیس کمشنر پیٹرز کی جانب سے ہے۔ اس نے اعلان کیا ہے کہ بکتر بند گاڑی کو لوٹنے والے دو ممکنہ ڈاکوؤں میں سے ایک ڈیوک یا نکے، وٹز عرف یبلاٹن عرف یورک کو اس وقت میونسپل ائرپورٹ سے گرفتار کر لیا گیا ہے جب وہ شہر سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب اس سے پولیس ہیڈ کوارٹر میں تفتیش کی جا رہی ہے۔''

یہ سن کر لینی بلند آواز میں بولا۔ ''اب وہ مجھے نہیں پکڑ سکتے۔ اب میں شبہے سے بالاتر ہوں۔ میری اس بیوی نے ایک لفظ بھی نہیں سنا۔''

لینی نے اپنی کار ریڈ پیکر چمنی کے بالکل ساتھ پارک کر دی پھر اس نے اپنی جیب میں سے ایک چابی نکالی اور بوائلر روم کے چھوٹے سے بیرونی دروازے کا تالا کھول دیا۔ پھر لاش کو کار کی عقبی نشست سے گھسیٹ کر نیچے زمین پر ڈال دیا۔ اس سے قبل وہ براؤن پیپر میں لپٹا ہوا وہ پیکٹ لاش کے اوپر سے اٹھا کر ایک طرف رکھ چکا تھا اور اسے کمبل سے ڈھک چکا تھا۔

پھر ہیزل کو اپنے سامنے دھکیل کر آگے بڑھنے کو کہا اور لاش کو گھسیٹ کر بوائلر روم میں لے گیا۔

وہاں الاؤ زیادہ تیز نہیں تھا۔ اس نے پہلے بھٹی کا بیرونی دروازہ اور پھر وہ دروازہ کھول دیا جس میں آگ جل رہی تھی۔ بھاری اسٹیل کا اونچا دروازہ ایک بڑے سے لیور سے کھلتا تھا۔ اس نے بھٹی کی آگ تیز کر دی تو شعلوں کا عکس اس کے درشت چہرے، اس کی کانپتی ہوئی بیوی اور لاش کے سرد بے جان چہرے پر رقص کرنے لگا۔

''ادھر۔'' اس نے بالآخر کہا۔ ''پھر لاش اوپر اٹھائی اور بھٹی کے دروازے سے جلتی ہوئی آگ میں پھینک دی۔

آگ کے شعلوں نے ایک پھنکاری سی اور کڑکڑانے کی آوازوں نے شعلوں کو مزید بلند کر دیا۔ شعلوں کی زرد رنگت اب نیلگوں ہوگئی تھی اور لاش نے چرمرانا شروع کر دیا تھا۔

تب ہیزل سے یہ منظر دیکھا نہ گیا اور اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

اب اس کے سامنے لینی کا چہرہ تھا جو مکاری اور نفرت کی شدت سے مسخ سا ہو رہا تھا۔ اس کی مخنی آنکھیں معنی خیز انداز میں ہیزل پر جمی ہوئی تھیں اور ہیجانی کیفیت ان سے عیاں تھی۔

اس سے پیشتر کہ وہ ہیزل پر جھپٹتا، ہیزل نے ایک زوردار چیخ ماری اور وہاں سے دوڑ پڑی۔ وہ شاید کبھی بچپن میں اتنا تیز دوڑی ہوگی جیسے اس وقت مایوسی کے عالم میں پاگلوں کے مانند دوڑ رہی تھی۔

لینی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ ہیزل کو سڑک پر لینی کے دوڑتے قدموں اور اس کے گہرے سانسوں کی آوازیں اپنے عقب میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ اپنے بھاری بھرکم وجود کی وجہ سے وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

پھر اس کے ہانپنے کی آوازیں آنا بند ہوگئیں اور دوڑتے قدم بھی رک گئے۔ شاید وہ بری طرح تھک چکا تھا۔

لیکن دوسرے لمحے ایک گونج سنائی دی۔

لینی نے اس پر فائر کیا تھا۔ لیکن اس کا نشانہ خطا گیا۔

ہیزل بدستور پاگلوں کی طرح دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ اس کا رخ ان روشنیوں کی جانب تھا جو دور لگ بھگ چوتھائی میل کے فاصلے پر دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ کوئی رہائشی علاقہ تھا۔ دوڑتے دوڑتے اس کے پھیپھڑوں میں سخت تکلیف ہونے لگی اور اسے اپنا دل اچھل کر حلق میں آتا محسوس ہونے لگا۔

اچانک اسے سڑک پر اپنا سایہ اپنے سامنے دکھائی دیا۔ ساتھ ہی عقب سے ایک انجن کا شور سنائی دینے لگا۔ لینی اب اپنی کار میں اس کے پیچھے آرہا تھا اور اسے کچل دینا چاہتا تھا۔

ہیزل نے دیوانہ وار سڑک کے کنارے بنی ہوئی نالی میں جست لگائی تو پشتے پر سے لڑھکتی ہوئی نیچے چلی گئی۔ وہ کار کے نیچے آنے سے بال بال بچی تھی۔ سڑک کے کنارے بکھرے ہوئے کنکر ٹائروں کی رگڑ سے اڑتے ہوئے اس کے جسم سے ٹکرائے تھے۔

کار کافی آگے نکل چکی تھی۔ پھر دور جانے کے بعد اس کی ہیڈ لائٹس کی روشنیاں بھی مدھم ہوگئیں۔ لیکن پھر وہ روشنیاں دور سے گھومتی دکھائی دیں۔ کار واپس مڑ رہی تھی اور اس کا رخ ایک بار پھر ہیزل کی جانب تھا۔

ہیزل چاروں ہاتھ پیروں کے بل پشتے پر رینگتی ہوئی تیزی سے مزید آگے نکل گئی اور ایک قدرے اندھیری گہری جگہ میں دبک گئی جہاں خشک گھاس اگی ہوئی تھی۔

کار کی آواز تیزی سے نزدیک آرہی تھی۔ پھر وہ اس جگہ سے آگے نکل گئی جہاں ہیزل چھپی ہوئی تھی۔ سڑک پر اس

مقام سے لگ بھگ بیس گز دور جانے کے بعد کار رک گئی۔ لینی کار سے نیچے اتر آیا اور سڑک کے کنارے پشتے کے پاس آکر نالی میں جھانکنے لگا۔

اندھیرے میں اسے کچھ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''ہیزل!'' اس نے آواز لگائی۔ ''ہیزل!''

ہیزل اس مقام سے پرے گھاس میں دبکی پڑی رہی۔

''ہیزل! ڈرو مت، میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میں تو بس مذاق کررہا تھا۔'' وہ بلند آواز سے کہہ رہا تھا۔

ہیزل یقیناً بے ہوش ہوگئی تھی۔ اسے لینی کے جانے یا کار کی واپسی کے بارے میں کچھ یاد نہیں تھا۔ وہ تو بس اتنا جانتی تھی کہ اس نے اپنی آنکھیں موند لی تھیں اور دعائیں مانگ رہی تھی۔

جب اس نے آنکھیں کھولیں تو لینی جاچکا تھا۔

وہ دیر تک اپنی جگہ ساکت پڑی رہی۔

جب اسے یقین آگیا کہ لینی جاچکا ہے تو بالآخر وہ بہ مشکل تمام اٹھ کھڑی ہوئی اور نالی سے نکل کر سڑک پر آگئی۔ اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا اور وہ ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ سڑک پر آگے بڑھ رہی تھی۔ اسے کچھ احساس نہیں تھا کہ وہ کدھر جارہی ہے۔

آخرکار وہ اس پختہ سڑک پر پہنچ گئی جہاں سے مکانات سے چھنتی ہوئی روشنیاں اب صاف دکھائی دینے لگی تھیں۔ اس کے قدم اب بھی ڈگمگا رہے تھے۔ پھر کسی نہ کسی طرح وہ سڑک کے پہلے کارنر تک جاپہنچی جہاں ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ بنا ہوا تھا۔ یہ ریسٹورنٹ گندا اور بدوضع سا تھا لیکن ہیزل کے لیے یہ اس وقت کسی جنت سے کم نہیں تھا۔

ہیزل نے ریسٹورنٹ کا دروازہ کھولا اور لڑکھڑاتے ہوئے اندر داخل ہوگئی۔

''پولیس کو فون کردو۔'' اس نے کاؤنٹر پر موجود شخص سے کہا۔

اس کے خیال میں اب وہ محفوظ تھی۔ محفوظ اور آزاد... لیکن کیا وہ واقعی محفوظ اور آزاد تھی؟ کیا جب تک لینی زندہ رہے گا وہ خوف اور خطرے سے آزاد رہے گی؟ کیا وہ اس کے پیچھے نہیں آئے گا؟ کیا اس کی آنکھوں سے قتل کی روشنی معدوم ہوجائے گی؟

یہ خیالات اس کے ذہن میں اچانک کلبلانا شروع ہوگئے تھے اور وہ حواس باختہ ہورہی تھی۔

''آپ ٹھیک تو ہیں نا، مس؟'' کاؤنٹرمین نے پوچھا۔

ہیزل نے ناتوانی سے اثبات میں سر ہلادیا۔

''یس، یہ پی لیں۔'' کاؤنٹرمین نے کافی کا کپ اس کے ہونٹوں سے لگادیا۔

ہیزل نے ایک بڑا سا گھونٹ بھرلیا۔ گرما گرم کافی نے اس کی زبان اور اس کا حلق جلادیا۔ لیکن اس کی گرمائش نے اس کے ذہن کو جیسے ایک جھٹکا سا دے دیا اور اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت لوٹ آئی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' ہیزل نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''وہ پولیس...''

''ہم انہیں فون کرچکے ہیں۔''

ریڈیو اس کے بوتھ کے برابر ہی میں رکھا ہوا تھا۔ اچانک ریڈیو میں ایک جھنجھناہٹ سی ہوئی اور ہیزل کا ذہن پوری طرح سے بیدار ہوگیا۔ اناؤنسر کہہ رہا تھا:

''ایک بے رحمانہ اور عیارانہ ڈکیتی جس کا اعتراف یانکے وٹز عرف یورک نے کرلیا ہے۔ پولیس کمشنر پیٹرز کے مطابق اس کا اختتام انڈرورلڈ کے پیچیدہ طریقے اور ایک دوسرے کو ڈبل کراس کرنے کی صورت میں ہوا۔ پولیس کمشنر نے بتایا ہے کہ کیپٹن عرف کمبرلے نے پولیس کو یورک کی پناہ گاہ کی مخبری کردی تھی۔ اس کے جواب میں یورک لوٹی ہوئی تمام رقم چمڑے کے ایک سفری بیگ میں چھپا کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا لیکن ائرپورٹ پر پکڑا گیا اور لوٹی ہوئی رقم اس کے پاس سے برآمد ہوگئی۔ فرار ہونے سے پہلے اس نے اس جرم میں شریک اپنے ساتھی کمبرلے کی موت کا مکمل انتظام کرلیا تھا۔ اس نے ایک بم بنایا تھا کہ جونہی پیکٹ کو کھولا جائے، وہ بم پھٹ پڑے۔ اس نے کمبرلے کو بتایا تھا کہ ڈکیتی میں لوٹی گئی رقم میں سے اس کا حصہ اس پیکٹ میں موجود ہے جو وہ کسی مخصوص جگہ چھوڑ آیا ہے اور کمبرلے وہاں سے اس پیکٹ کو حاصل کرسکتا ہے۔ پولیس اس پیکٹ کی تلاش میں ہے جس میں وہ بم...''

اتنے میں دور فاصلے پر ایک گونج سی سنائی دی اور دھماکے کی آواز سے ریسٹورنٹ کے دروازے اور کھڑکیاں کھڑکھڑا گئے۔

''یہ... یہ کیسا دھماکا تھا؟'' کاؤنٹرمین نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' ہیزل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہیں... اب سب کچھ ٹھیک ہوگیا ہے۔''

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر:18

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پُتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

شکیلہ نے مجھے اس چونکا دینے والی اطلاع کے متعلق بتایا کہ امریکا سے سرمد بابا کا فون آیا ہے، وہ آج شام کی فلائٹ سے پاکستان لوٹ رہے تھے۔

''کیا عابدہ اور عارفہ بھی ساتھ ہیں؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔ مجھے عابدہ کی طرف سے زیادہ فکر و تشویش لاحق تھی۔ حالانکہ سرمد بابا کی واپسی کی خبر سے مجھے خوش ہونا چاہیے تھا، لیکن شکیلہ کا گھٹا گھٹا چہرہ دیکھ کر نجانے کیوں میں اندر سے ایکا ایکی بے نام وسوسوں کا شکار ہونے لگا تھا۔

میری سوالیہ نظریں شکیلہ کے چہرے پر مرکوز تھیں اور وہاں مجھے ایک ہولناک خاموشی کے سوا کچھ نہیں ملا تو میں نے تقریباً چلا کر اور تیز لہجے میں اپنا سوال دہرایا۔

''میں کیا پوچھ رہا ہوں شکیلہ؟ کیا عابدہ بھی ان کے ساتھ لوٹ رہی ہے؟''

''نن... نہیں۔'' بالآخر شکیلہ کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی اور میں نے دوسرے ہی لمحے شکیلہ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ کھل کر اور صاف بولو۔'' شکیلہ کا چہرہ مجھے اترا اترا سا دکھائی دیا۔ جیسے وہ میرے سامنے ابھی کوئی بھیانک انکشاف کرنے والی ہو۔

وہ میرے جھنجھوڑنے کی پروا کیے بغیر بولی۔ ''سرمد بابا کے ساتھ صرف عارفہ لوٹ رہی ہیں۔''

''کک... کیا؟'' میں پورے جی جان سے چلا کر رہ گیا۔ میرا سر چکرا گیا تھا، مجھے ایسا لگا جیسے در و دیوار ہل رہے ہوں اور زمین پیروں تلے سے کھسک رہی ہو۔

''ی... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ عا... عابدہ ان کے ساتھ کیوں نہیں آرہی ہے؟'' میری حالت غیر ہو رہی تھی اور میں شکیلہ سے اس طرح بات کر رہا تھا جیسے سارا قصور اسی کا ہو۔ حالانکہ اس بے چاری کا کیا دوش تھا؟ وہ تو صرف وہی کچھ بتا رہی تھی جو اس نے فون پر سنا تھا۔

ایسے ہی وقت میں اول خیر میری طرف بڑھا اور میرا دایاں شانہ ہولے سے تھپتھپایا اور مجھے ایک صوفے پر بٹھا دیا۔

''کاکے! ذرا سنبھال خود کو۔''

''کیسے سنبھالوں یار میں خود کو؟'' میں جیسے اس پر چڑھ دوڑا اور مارے طیش و غضب کے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور حلق کے بل چلا کر بولا۔

''مجھے فون ملا کر دو شکیلہ! میں خود سرمد بابا سے بات کروں گا۔ میں انہیں ایسی حرکت کبھی نہیں کرنے دوں گا۔''

اول خیر میری بپھری ہوئی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا اور شکیلہ کا چہرہ متوحش نظر آنے لگا۔

''کاکے! تو بات تو سن۔''

''میں کسی کی کوئی بات نہیں سنوں گا اول خیر!''

میں نے پُرغیظ انداز میں قریب دھری تپائی کو لات رسید کر دی۔ ''اور اگر کسی نے میرے آڑے آنے کی کوشش کی تو میں اسے بھی نہیں چھوڑوں گا۔ یہ صریحاً دھوکا ہے، عابدہ کے ساتھ، میرے ساتھ۔ عابدہ اپنے کسی کام سے امریکا نہیں گئی تھی، وہ سرمد بابا کی بیمار بہو کے ساتھ گئی تھی۔ اور اب یہ دونوں اس بے چاری کو وہاں دیارِ غیر میں بالکل اکیلا چھوڑ کر خود واپس لوٹ رہے ہیں۔ ہرگز نہیں۔''

اول خیر پھر میری طرف بڑھا تو میں نے اسے بھی دھکا دے کر خود سے پرے کر دیا اور پُرطیش نظروں سے قریب کھڑی لرزتی کانپتی شکیلہ سے بولا۔ ''تم نے سنا نہیں۔ کیا کہا ہے میں نے۔ مجھے اسی وقت فون ملا کر دو۔''

میری دھاڑ سے پوری کوٹھی گونج رہی تھی۔ اماں جو دوسرے کمرے میں تھیں، فوراً وہاں آن پہنچیں اور مجھے غصے سے پھنکتا دیکھ کر پریشان ہو گئیں اور وہاں موجود سب کی طرف سوالیہ نظروں سے تکنے لگیں۔

شکیلہ نے فوراً فون ملایا۔ مگر کسی وجہ سے رابطہ نہ ہو سکا، تاہم وہ کوشش میں لگی رہی۔ میری حالت ابتر ہو رہی تھی۔ میں کمرے میں زخمی شیر کی طرح ٹہلنے لگا، اول خیر کو دوبارہ میرے قریب آنے کی جرأت نہیں ہو سکی تھی۔

میرے اندر ایک آگ سی بھڑک اٹھی تھی، جس کی حدت سے میرے جسم کا رُواں رُواں بری طرح تپ رہا تھا۔ ایک جوالہ مکھی تھا جو مجھے بہت تیزی سے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ دماغ اس تپش سے شل ہو رہا تھا۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سرمد بابا جیسا آدمی، جو یہ حقیقت اچھی طرح جانتا تھا کہ عابدہ میرے لیے کیا حیثیت رکھتی تھی۔ وہ میرے لیے کیا تھی اور میں اس کے لیے کیا تھا۔ وہ سب کچھ بھی سرمد بابا کے علم میں اچھی طرح تھا کہ عابدہ کو اس کی بیمار بہو کے ساتھ روانہ کر کے میں اور عابدہ کس بڑے اور کٹھن امتحان سے گزر رہے تھے، چہ جائیکہ اب وہ اسے وہیں سمندر پار چھوڑ کر اور وہ بھی ایسے حالات میں، صرف اپنی بہو کو لے کر واپس وطن لوٹ رہے تھے۔ جیسے عابدہ کسی دوسرے شہر میں ہو۔

رہ رہ کر میری آنکھوں کے سامنے عابدہ کا ڈرا سہما چہرہ، اس کی مخدوش باتیں، وہ سب یاد آنے لگیں جو اس

نے وہاں رہتے ہوئے محسوس کی تھیں اور وقتاً فوقتاً ان کے بارے میں مجھ سے فون پر ذکر بھی کرتی رہی تھی۔

''ششش... شہزی! لو... رابطہ ہوگیا۔''

معاً مجھے شکیلہ کی آواز نے چونکا دیا۔ میں نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے سیل لیا اور اپنے کان سے لگالیا۔ ابھی میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دوسری طرف سے سرمد بابا کی آواز ابھری۔

''میں زیادہ دیر بات نہیں کرسکتا۔ کچھ مجبوری ہے۔ جلدی کہو، کیا کہنا ہے؟ کون ہے؟''

سرمد بابا کی یہ بات سن کر میرا اندر انگار ہوگیا۔ میں بہ مشکل خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''سیٹھ منظور وڑائچ! یہ میں بات کررہا ہوں، شہزاد احمد خان۔ اور آپ کو میری پوری بات سننا ہوگی۔'' میں نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا اور دانستہ انہیں سرمد بابا کے بجائے ''سیٹھ منظور وڑائچ کے نام سے مخاطب کیا تھا، تو دوسری طرف چند لمحوں کے لیے چپ سی چھا گئی۔ پھر ان کی ٹھہری ہوئی آواز ابھری۔

''بیٹا! میں پاکستان ہی آرہا ہوں اور مزید تفصیل...''

''سیٹھ منظور وڑائچ! مجھے کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے، مجھے صرف یہ بتائیں کہ عابدہ بھی آپ لوگوں کے ساتھ آرہی ہے؟'' میں نے ان کی بات کاٹ کر سرد اور سخت لہجے میں کہا تو دوسری طرف سے سرمد بابا نہایت شفیق لہجے میں بولے۔

''شہزی بیٹا! میں تمہاری پریشانی کی وجہ سمجھ رہا ہوں اور میں خود بھی پریشان ہوں۔ یہاں کے حالات ایک دم بھیانک صورت اختیار کرگئے تھے اور ہم تینوں کے لیے یہاں سے نکلنا ممکن نہیں رہا تھا۔ یہ تو شکر ہوا کہ...''

اچانک رابطہ منقطع ہوگیا۔ میں جیسے پاگل ہوگیا اور ہیلو، ہیلو کرتا رہ گیا۔ مگر دوسری جانب سے اب سوں سوں کے سوا کچھ نہیں سنائی دیا۔ شکیلہ، جو میرے قریب ہی کھڑی تھی، مجھ سے فون لے کر دوبارہ ملانے لگی۔ مگر رابطہ نہ ہوسکا۔

''کیا ہوگیا شہزی پتر؟ خیریت تو ہے نا؟'' ماں نے چند قدم میری طرف بڑھاتے ہوئے فکرمندی سے کہا تو میں ایک گہری سانس خارج کرکے رہ گیا۔

میں ماں کو کیا بتاتا؟ بات لمبی تھی۔ اسی لیے میں نے اپنی اتھل پتھل ہوتی حالت پر قدرے قابو پاتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں ماں جی! بس تھوڑی سی پریشانی ہوگئی ہے۔ میں بعد میں آپ کو بتادوں گا، آپ بلاوجہ پریشان نہ ہوں۔'' یہ کہہ کر میں قریب دھرے صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا، ایسے میں اول خیر نے شکیلہ کو اشارہ کیا اور ماں جی سے کچھ کہا۔ شکیلہ ماں کو لے کر ایک کمرے کی طرف بڑھ گئی اور پھر اول خیر میرے قریب آکر بیٹھ گیا پھر بہت دھیرے سے اور بہت محبت کے ساتھ میرے کاندھے پر اپنا ایک بازو رکھتے ہوئے بولا۔

''اوئے کاکے! بھلا مجھ سے زیادہ کون تیرا درد سمجھتا ہوگا۔ تو بھی جھلا جاتا ہے۔ ایسے یار کو تو خود سے پرے دھکا دیتا ہے جس نے تیرے دکھوں کو اور تجھے بھی اپنا سمجھ رکھا ہے۔''

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ میرے دھکا دینے سے اس بے چارے کو یقیناً دلی تکلیف ہوئی تھی اور مجھے بھی بعد میں اس کا احساس ہوا تھا۔ لہٰذا میں نے اسی طرح اپنا سر جھکائے جھکائے کہا۔

''یار...! مجھے معاف کردینا۔''

''اوخیر کا کے! معافی بھلا کس بات کی؟'' اس کا مخصوص انداز لوٹ آیا۔ ''اوئے یارا! محبت کی ایک یہی خرابی تو ہوتی ہے کہ بندہ لاڈ میں آجاتا ہے، اپنے پیارے دوست کی ایک تھوڑی تکلیف بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ فوراً دل پہ لے لیتا ہے۔ چل چھوڑ، خود کو سنبھال ذرا۔ سرمد بابا کو آلینے دے پھر...''

''اول خیر! تو سمجھتا کیوں نہیں ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''سرمد بابا آخر عابدہ کو وہاں کیوں اور کس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر آرہا ہے؟ کیا وہ نہیں جانتا کہ میں اس کے بغیر...'' میں باعث رقت کے اپنا جملہ پورا نہ کرسکا۔

اسی بازو کے گھیرے میں، جو اس نے میرے شانے پر بڑی محبت سے پھیلا رکھا تھا، مجھے بے اختیار خود سے لگالیا۔

''اوخیر کا کے! میں سب جانتا ہوں اور تیرے اندر اس وقت کیا پک رہا ہے وہ بھی۔ تو ذرا سرمد بابا کو آلینے دے۔ اور ابھی ان کے ساتھ بدتمیزی نہ کر۔ کیا خبر حقیقت کیا ہو؟ وہ کتنے مجبور ہوں یا انہوں نے عابدہ کے لیے کیا بھلائی سوچ رکھی ہو۔ اور پھر وہ ایک بڑے آدمی ہیں۔ یہاں تک انہوں نے اپنا کام آسان کرلیا ہے تو آگے بھی وہ بہت کچھ کرلیں گے۔ انہیں بھی آخر ایک بات کا احساس ہوگا ہی۔''

میں نے اپنے حلق میں اترنے والی رقت کو نگلتے ہوئے کہا۔ ''یار اول خیر! سرمد بابا کو کم از کم اس سلسلے میں کوئی تفصیل تو بتانا چاہیے تھی کہ آخر صرف عابدہ کے ساتھ ہی ایسا کیا ہوا ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ نہیں لا سکے؟ جبکہ سنگین الزام تو ان کی بیوہ بہو عارفہ پر تھا، عابدہ بے چاری کو کس الزام کے تحت وہاں امریکا میں روک لیا گیا ہے؟ اب وہ

کہاں ہے؟ کس حال میں اور کس کے پاس ہے؟ میں تو یہ ساری باتیں سوچ سوچ کر ہی پاگل ہوا جارہا ہوں یار!''

''میں سمجھ رہا ہوں تیری دلی کیفیات کو شہزی کاکے!'' اول خیر بولا۔ ''ہم اب اللہ سے دعا ہی کر سکتے ہیں بہتری کی۔ اور سرمد بابا کا انتظار۔ وہ آج رات آرہے ہیں۔ تب ہی حقیقت سے پردہ اٹھ سکتا ہے۔ یار ماں جی کا ہی خیال کر لے، وہ تجھے اس قدر پریشان دیکھ کر خود بھی تشویش زدہ ہو رہی ہیں۔''

میں نے اس کی بات پر چپ سادھ لی۔ مگر اندر سے میں اس قدر بے کل ہو کر رہ گیا تھا کہ مجھ سے ایک لمحہ تک نہیں بتایا جارہا تھا۔ پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے دل خیر سے کہا۔

''یار اول خیر، ایک کام تو ہو سکتا ہے ناں۔ ہم اس اسپتال والوں سے فون کر کے ہی پوچھ لیں کہ آخر یہ معاملہ کیا ہوا تھا؟ اور عابدہ...''

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک شکیلہ نمودار ہوئی۔ وہ ماں کو ان کے کمرے میں چھوڑ آئی تھی۔ سیل فون لیے، وہ میرے قریب آئی تو میں بے چینی سے اٹھ کھڑا ہوا کہ شاید امریکا سے ہی کوئی فون کال آئی ہو؟

''شہزی! امریکا سے کسی خاتون کا فون ہے تمہارے لیے۔'' کہتے ہوئے شکیلہ نے فون مجھے تھما دیا۔ میں حیران ہوا کہ بھلا امریکا میں یہ میری کون جاننے والی نکل آئی تھی؟ پھر میرا دھیان عارفہ کی طرف بھی گیا، مگر اس کی طرف سے امید کم ہی تھی، وہ لوگ تو جہاز میں سوار بھی ہو چکے ہوں گے۔

میں نے فون کان سے لگا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے ایک اجنبی خاتون کی آواز ابھری۔ لب و لہجہ امریکن انگلش تھا۔ اور یوایس اے انگریزی میں ہی اس نے مجھ سے بات کی۔

''ہیلو! کیا میں شہزاد احمد خان سے بات کر رہی ہوں؟'' دوسری جانب سے اس نے استفساریہ کہا، لہجہ اور انداز تخاطب شائستہ تھا۔ میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔

''جی ہاں! میں شہزاد احمد خان بات کر رہا ہوں.... معاف کیجیے گا میں آپ کو پہچانا نہیں۔''

''مسٹر شہزاد! بہت خوشی ہوئی آپ سے بات کر کے۔ آپ مجھے نہیں جانتے مگر میں آپ کو جاننے لگی ہوں۔ آپ کی گرل فرینڈ عابدہ کے توسط سے۔''

عابدہ کے ذکر پر جیسے میرے دل کی دھڑکن بے قابو ہونے لگی اور بے چینی فزوں تر۔ میں نے بے قراری سے پوچھا۔

''آپ کون؟ عابدہ کو آپ کیسے جانتی ہیں؟ اور وہ کہاں ہے اور کیسی ہے؟ پلیز، آپ مجھے اس کے بارے میں کچھ بتائیں پلیز۔''

''it,s my pleasure مسٹر شہزاد کہ میری آپ سے بات ہوگئی۔'' پھر اپنا تعارف کراتے ہوئے بولی۔ ''میرا نام آنسہ خالدہ ہے اور میں امریکن نژاد مسلم ہوں۔ یہاں ایک امریکن براڈ کاسٹ ادارے میں ڈسٹرکٹ فیکٹ رپورٹر ہوں اور ڈس کوری چینل میں فیلڈ اینڈ ریسرچ آفیسر بھی۔ میرا تعارف لمبا ہو جائے گا۔ آپ بس اتنا جان لیں کہ آج کل امریکا میں ہونے والے ایک عالمی نوعیت کے دل فگار واقعے نائن الیون کے سلسلے میں پس پردہ حقائق کے لیے کوشاں ہوں اور ساتھ ہی یہاں مقیم مسلم کمیونٹی پر اس واقعے کی وجہ سے پڑنے والے منفی اثرات کی پروڈکشن کے لیے بھی کام کر رہی ہوں۔ عارفہ کے سلسلے میں جو کچھ یہاں ہوا یا کیا گیا، اس کی چھان بین اور تحقیق بھی میں کر رہی ہوں۔''

اس کی بات پر میں چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔ اور اس روز کار میں ریڈیو سے نشر ہونے والی وہ رپورٹ، جس میں مسلم امریکی نژاد خاتون آنسہ خالدہ کا نام لیا گیا تھا، یکدم میرے ذہن میں تازہ ہوگئی۔

''جی، جی، مجھے یاد آگیا۔ میں نے اس سلسلے میں آپ کے نام کا ذکر سنا تھا۔'' میں نے فوراً کہا تو وہ بولی۔

''ضرور سنا ہوگا۔ مگر اس وقت آپ کو فون کرنے کا میرا مقصد آپ کو حالات سے آگاہی دینا اور اسی سلسلے میں آپ سے کچھ تعاون درکار تھا۔''

''میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری ایک بڑی پریشانی کو شیئر کیا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ میرا دل بے طرح دھڑک رہا تھا، آنسہ خالدہ کو میں اپنے لیے ایک امداد غیبی ہی تصور کر رہا تھا۔

''درحقیقت میں اس وقت عابدہ کی وجہ سے ہی پریشان تھا۔ کیونکہ ان کے دور ریلیٹیوز مسٹر منظور وڑائچ اور ان کی بہو کو چھوڑ دیا گیا ہے مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ امریکی حکام نے عابدہ کو کس جرم میں روک لیا ہے۔ پلیز، آپ میری عابدہ سے بات کروادیں۔''

میں ایک ہی سانس میں یہ سب کہہ گیا تو دوسری جانب سے آنسہ خالدہ کی آواز ابھری۔

''ایگزیکٹلی! میں بھی اسی نقطے پر اپنی تحقیقات کو آگے

بڑھا رہی ہوں۔ کیونکہ یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آرہی ہے کہ جس کے پیٹ میں تباہ کن ڈیوائس بم چھپایا گیا، اسے تو معمول کی تحقیقات کے بعد چھوڑ دیا گیا جبکہ ایک معمولی نظر آنے والی لڑکی کو کیوں روک لیا گیا۔ میں تمہاری گرل فرینڈ سے مریکی سی آئی اے سینٹر میں ایک ملاقات کرچکی ہوں۔ بڑی مشکل سے اور بالکل قلیل وقت دیا گیا تھا مجھے اس سے ملاقات کا۔ وہ مجھے ایک خوف زدہ چڑیا کے مانند ہی محسوس ہوئی تھی بالکل بےضرر سی۔''

اس کی بات سن کر میرا دل گھٹنے لگا اور سانسیں سینے میں اٹکنے لگی تھیں۔ وہ عابدہ سے متعلق ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی کہ وہ ایک نازک سی چڑیا تھی۔

''میں نے اس کی حمایت میں سی آئی اے کے چیف ڈائریکٹر مسٹر گمباٹ ڈک سے بات کی تھی کہ اس بھولی بھالی سی ڈری سہمی لڑکی میں آپ کو ایسا کون سا خطرناک مجرم چھپا نظر آرہا ہے، جسے یہاں لاکر رکھا ہوا ہے؟'' وہ بتا رہی تھی اور میں جیسے سناٹے کی سی کیفیات میں تھا۔

''اس پر انہوں نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا کہ ہماری جیلوں، کوکوران (cocoran)، گوانتا نامو (guantanamo) اور بگرام (bagram) کا اگر تم ایک وزٹ کرلو تو وہاں تمہیں اس سے زیادہ معصوم، بےضرر اور بھولی بھالی صورت والے دنیا کے خطرناک ترین مجرم نظر آجائیں گے جن کا ریکارڈ دیکھ کر ہی تم دنگ رہ جاؤ گی۔''

آنسہ خالدہ کی زبان سے امریکا کی ان خطرناک ترین جیلوں کا نام سن کر میں اندر سے لرز اٹھا تھا۔ میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''تت... تو پھر... اب عابدہ کے بارے میں وہ کیا کہتے ہیں؟''

''میں تمہیں خوف زدہ کرنا نہیں چاہ رہی ہوں مسٹر شہزاد!'' وہ قدرے ملائمت آمیزی سے بولی۔ ''بلکہ میں تمہاری اور عابدہ کی مدد کرنا چاہتی ہوں اور یہ میرا نہ صرف مشن ہے بلکہ ایک عزم بھی ہے۔ مجھے عابدہ نے ہی کہا تھا کہ میں کسی طرح تم سے رابطہ کرکے اس کے موجودہ حالات سے آگاہ کردوں اور تسلی بھی دے دوں۔''

میں دل مسوس کر رہ گیا۔ عابدہ، جو خود وہاں خطرناک حالات کا شکار تھی اور اسے میری خیریت کی فکر ہو رہی تھی۔ مجھے اس فرشتہ صفت مسلم امریکی خاتون کے نیک خیالات نے بھی متاثر کیا تھا۔ میں نے اپنے اندر کے غم کو پیتے ہوئے آنسہ خالدہ سے کہا۔

''میں آپ کا بہت مشکور ہوں گا، اگر آپ اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد کرسکیں۔ بلکہ آپ کا یہ احسان تو میں اور عابدہ ساری زندگی نہیں بھلا سکتے۔''

''میں تم پر کوئی احسان نہیں کررہی ہوں مسٹر شہزاد!'' وہ بولی۔ ''یہ میرا مشن اور میرے پیشے کا حصہ ہے کہ اصل حقائق کو دنیا کے سامنے لاؤں اور درپردہ عناصر کو بےنقاب کروں۔ میں فون پر تو زیادہ باتیں اس طرح کی نہیں کرسکتی اگر زندگی رہی تو تم سے بھی ملاقات ہوجائے گی۔ کیا میں سمجھوں کہ میرے فون کرنے کا مقصد پورا ہوا؟''

میں نے جواباً کہا۔ ''اس میں کوئی شک نہیں آنسہ خالدہ صاحبہ کہ آپ کے فون سے میرے بےچین دل کو کچھ تسلی ہوئی لیکن میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آخر عابدہ کو کس جرم کے تحت سی آئی اے سینٹر میں رکھا گیا ہے؟ اور وہ کب تک اسے اس طرح رکھیں گے؟... وہاں اس کا اللہ کے سوا اور کوئی نہیں، وہ وہاں تنہا ہے، کون اس کی وکالت کرے گا؟ کون اس کا کیس لڑے گا؟ بس! یہی سوچ سوچ کر میں پریشان ہو رہا ہوں۔''

''میں نے عارفہ اور مسٹر منظور وڑائچ سے بھی ملاقات کی تھی۔ انہیں مجھ پر شاید ابھی بھروسا... نہیں ہوسکا ہے۔ مگر تم تسلی رکھو، مجھ سے ایک مسلم بہن کے لیے جو ہوسکا وہ کروں گی۔ میرا نمبر نوٹ کرلو اور اپنا نمبر مجھے دے دو، میں وقتاً فوقتاً عابدہ کی خیریت وغیرہ کے سلسلے میں آگاہ کرتی رہوں گی۔''

میں نے اسے اپنا نمبر دے دیا اور اس کا نمبر نوٹ کرلیا۔ آنسہ خالدہ کے فون سے میرے دل کو کافی ڈھارس ہوئی تھی۔

اول خیر انگریزی نہیں سمجھتا تھا، البتہ شکیلہ تھوڑی بہت سمجھ لیتی تھی، وہ ہماری ٹیلی فونک گفتگو کافی حد تک سمجھ چکی تھی۔ اول خیر کو مجھے ہی اس گفتگو کے بارے میں بتانا پڑا۔ وہ بھی ششدر سا رہ گیا اور قدرے خوش ہوکر بولا۔

''او خیر کا کے! بڑا خوش ہوا دل یہ سن کر کہ اللہ پاک نے عابدہ بہن کی مدد کے لیے آنسہ خالدہ جیسی ایک فرشتہ صفت اور بہادر خاتون کو وہاں پہلے ہی سے بھیج رکھا ہے۔''

''ہاں اول خیر بھائی! اللہ عابدہ بہن اور شہزی بھائی کی مدد فرمائے۔ آنسہ خالدہ کی صورت میں عابدہ کی امدادِ غیبی وہاں پہنچ چکی ہے، ہمیں اب دعا کرنی چاہیے۔'' شکیلہ نے کہا۔

دونوں یہ گفتگو یقیناً میرا ذہنی دباؤ کم کرنے کے لیے کر رہے تھے، مگر مجھے قرار تب ہی ملتا جب میں عابدہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا۔

میں نے خودکلامیہ انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر سرمد بابا نے یہ کیا کھیل کھیلا ہے؟ دل ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتا کہ ان جیسا انسان ایسی خودغرضی بھی دکھا سکتا ہے؟''

''او، نہیں کاکے! یہ تیری غلط فہمی ہے، تو ان کی طرف سے بدگمان نہ ہو۔ یقیناً انہوں نے عابدہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ سوچ رکھا ہوگا۔'' اول خیر نے کہا تو شکیلہ بھی اس کی تائید میں بولی۔

''یہ بھی ممکن ہے کہ سرمد بابا کے پاس اس کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہ ہو؟ اور ان کے لوٹ آنے میں ہی خیریت ہو۔ بعد میں انہوں نے کوئی منصوبہ بنا رکھا ہو۔''

میں نے ان دونوں کے چہروں کی طرف باری باری تکتے ہوئے کہا۔ ''سیدھی بات تھی، سرمد بابا عابدہ کے بغیر لوٹ آنے سے انکار کر دیتے۔ اور وہاں رہتے ہوئے اس کا کیس لڑتے، ان کے پاس بہت آپشن تھے۔ وہ عارفہ اور عابدہ کو ایک قانون کے تحت امریکا لے کر گئے تھے، جس کے ٹھوس ثبوت ان کے پاس موجود تھے۔ یہاں آ کر وہ اب بھلا کیا کر سکتے ہیں؟''

میری بات کا ان دونوں کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ لمحے بھر کے لیے خاموشی چھائی رہی، پھر میں نے شکیلہ سے کہا۔

''شکیلہ! تم پلیز ذرا ماں جی کے پاس جا کر بیٹھ جاؤ۔ وہ پریشان ہو رہی ہوں گی۔'' شکیلہ نے اثبات میں سر ہلایا اور چلی گئی۔

مجھے ماں جی سے بھی بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ باجوہ صاحب سے ملاقات کے بعد میں نے ماں جی سے گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرنا تھیں۔ مگر یہاں آتے ہی مجھے ایک نئی پریشانی نے آن گھیرا تھا۔

اس نئی صورت حال کے بعد سے میرا دھیان عابدہ کی طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ہٹا تھا۔ شریفاں نے میرے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کیا تھا۔ مگر میرا دل بالکل بھی کچھ کھانے یا پینے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ دل کر رہا تھا کہ بس کسی طرح سرمد بابا یہاں جلد سے جلد پہنچ جائیں اور میں ان سے باز پرس کر سکوں کہ آخر انہیں ایسی کیا مجبوری آن پڑی تھی کہ وہ عابدہ کو وہیں سات سمندر پار دیار غیر میں چھوڑ آئے تھے۔ اور کس کے رحم و کرم پر؟

میں بار بار چشم تصور میں عابدہ کا پریشان حال اور الم زدہ چہرہ دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں تقدیر کو بھی کیا منظور تھا کہ وہ ہم دونوں کو ایک کے بعد ایک امتحان میں ڈال رہی تھی۔ آگے اور خدا کو کیا منظور تھا۔ یہ کسے معلوم تھا۔

کہاں تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا اور کہاں اب یہ حال تھا کہ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ میرے دل کی بے چینی لحہ بہ لحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی، کسی طور مجھے قرار نہیں آ رہا تھا۔ عابدہ مجھ سے اتنی دور گویا دارالکفر میں بے یار و مددگار بیٹھی تھی۔ اور میں یہاں بیٹھا بے بسی سے ہاتھ ملنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ تب مجھے ماں جی کا خیال آیا کہ اس پریشان حال گھڑی میں ایک ماں کا سہارا ہی دل کو سکون دے سکتا ہے، سو میں ان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

شکیلہ ان کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ ماں جی بھی مجھ سے باتیں کرنے کے لیے بے چین تھیں، مگر بے چاری مجھے پریشان حال پا کر خاموش تھیں البتہ ان کے چہرے پہ کئی سوالیہ نشان تھے جو میں دیکھ سکتا تھا۔ شاید شکیلہ نے انہیں بھی حقیقتِ حال سے تھوڑا بہت آگاہ کر ہی دیا تھا، کیونکہ مجھے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر بے اختیار ان کے لبوں سے دعائیہ کلمات برآمد ہوئے تھے۔

''میرا رب سوہنا میرے پتر شہزی کی پریشانی دور کرے۔ تو اتنا خود کو ہلکان نہ کر پتر! رب سوہنا خیر کرے گا۔ عابدہ کو کچھ نہیں ہوگا۔''

''ماں! بس تو دعا کر ماں دعا۔'' ماں کے ممتا بھرے پیارے لہجے پر میں از حد دکھی ہو کر آبدیدہ سا ہو گیا اور بے اختیار ان کی طرف بڑھا۔ وہ مسہری پر بیٹھی تھیں اور شکیلہ ان کے قریب ایک کرسی پر براجمان تھی۔

میں ماں جی کے پاس جا کر ان کے قریب جا بیٹھا اور اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔ ایک سکون اور ٹھنڈک تھی جس نے ایکا ایکی مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ایک چھایا تھی، جس نے مجھ جیسے آبلہ پا صحرا گرد کو ڈھانپ لیا تھا۔ وہ پیار سے اور بہت دھیرے دھیرے میرے سر پہ ہاتھ پھیرتی جا رہی تھیں۔ ایسے ہی وقت میں شکیلہ وہاں سے خاموشی سے جا چکی تھی۔

ماں نے آہستگی کے ساتھ میرا سر اپنے جھریوں بھرے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر ذرا اوپر اٹھایا اور بہ غور اپنی بوڑھی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے جیسے آپوں آپ

بولیں۔

''بالکل اپڑیں پیو تے ہے تو۔ وہی چہرہ۔ وہی آنکھیں اور اسی کی طرح او چالما (اونچا لمبا)۔ نجانے میرا دوسرا لختِ جگر کہاں ہوگا۔ ہوتا تو وہ بھی تیرے جیسا ہی ہوتا۔ آہ! میں بھی کیسی نصیبوں جلی ہوں۔ پہلے میرے سر کا تاج بچھڑا اور پھر میرا لختِ جگر لئیق۔''

ماں کے یہ الفاظ جیسے بم بن کر میری سماعتوں میں پھٹے تھے۔ میرے درماندہ و دریدہ وجود میں جیسے ان گنت زنجیروں کی جھنکار گونجی تھی۔ اور اس جھنکار میں کوئی رقصِ بسمل کی طرح تڑپ اٹھا تھا۔

''دوسرا لختِ جگر... لئیق؟'' یہ دو الفاظ جیسے میری دم بخود سماعتوں میں منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔

''ماں جی! تت... تم نے ابھی کیا کہا۔ کس کا نام لیا تھا۔'' خود میری آواز جیسے بہت دور سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

''کک... کیا میرا کوئی اور بھائی بھی تھا؟''

''ہاؤ پتر! لئیق شاہ نام تھا اس کا۔ تیرا وڈا بھرا سی او۔'' (تیرا بڑا بھائی تھا وہ) ماں جی نے گلوگیر سے لہجے میں بتایا اور میں سن ہو کر رہ گیا۔

''لئیق شاہ... لئیق شاہ... لئیق شاہ۔ بیگم صاحبہ۔ زہرہ بانو۔ بجلی۔ میرا ہم شکل۔ راجستھان کے ہیجڑوں کے ٹولے میں پھنسنے والا، وہ لڑکا جس کا باپ سرحدوں کا محافظ اور ایک بہادر سپاہی تھا۔ جس کی داستانِ دلستاں زہرہ بانو۔ مجھے سنا چکی تھی۔ آہ! یہ کیا غضب تھا؟ یہ کون سا وار تھا تقدیر کا مجھ تقتہ ماراں پر۔ یہ اب کیا نیا ہونے لگا تھا میرے ساتھ؟

کئی ثانیے تو میں ساکت و صامت رہ گیا۔ ماں جی ایسے میں کہتی چلی گئیں۔

''وہ بالکل تیرے جیسا ہی تھا۔ شاید بارہ تیرا سال کا ہوگا اس وقت وہ، آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا، جب بدقسمتی سے مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ تو بھی اس وقت دنیا میں آنے والا تھا۔ تیرا باپ مجھ سے کہتا تھا۔ ''نویدہ! دعا کر رب سوہنا مجھے اک ہور (یک اور بیٹا) دے۔ پھر میرے دو بازو ہوں گے۔ میں اپنے دونوں بیٹوں کو اس پاک وطن کا سپاہی بناؤں گا۔''

میں اس سے کہتی۔

''تاج! سچ پوچھے تو مجھے بیٹی کی خواہش ہے۔ پر میں پھر بھی تیری خواہش کا احترام کرتے ہوئے اپنے سوہنے رب سے ایک بیٹے کی ہی دعا کروں گی۔''

ماں کہے جا رہی تھی اور میرے سینے میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ زہرہ بانو کی داستانِ دل فگار کا ایک ایک لفظ میرے دماغ میں گونج رہا تھا۔ میں یک ٹک ماں کی سنے جا رہا تھا۔ مجھے گرد و پیش کا بھی ہوش نہ رہا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے ماضی سے پردہ اٹھائے جا رہی تھی۔

''آج میں تجھے بتاتی ہوں بیٹا کہ تو اس بدبخت، مکار اور دھوکے باز وزیر جان کا بیٹا نہیں ہے۔ ہاں یہ تیرا سوتیلا باپ ضرور ہے۔ تو میرے پہلے شوہر تاج دین شاہ کا بیٹا ہے اور اپنے بچھڑے ہوئے بھائی لئیق شاہ کا چھوٹا بھائی۔ تیرا باپ تاج دین شاہ تو وطن کا ایک سچا سپاہی تھا۔ وہ خود کو سرحدوں کا محافظ کہتا تھا۔ وہ بہت جوشیلا، نڈر اور دلیر تھا۔ پنڈ میں سب لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ وہ ہر وقت وردی میں رہتا تھا۔ چاہے بارش ہو، طوفان ہو، جب بھی بلاوا آتا وہ ہر دم جانے کے لیے تیار رہتا، کہنے کو تو وہ وہاں سرحدی چوکی میں بارڈر سیکیورٹی فورسز میں رینجرز کا ایک معمولی سپاہی تھا۔ اور تھرڈ رجمنٹ کمپنی کی سرچنگ ونگ میں انچارج واچ مین کے بھی فرائض انجام دیتا تھا، مگر اس نے اپنی جان پر کھیل کر وطن کے لیے بڑے کارنامے انجام دیے تھے۔

کئی خطرناک اسمگلروں کو اس نے پکڑوایا تھا اور بھارتی جاسوسوں کا تعاقب کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ ایک دن ایک بھارتی جاسوس کے تعاقب میں گیا تو پھر نہیں لوٹا۔ سب مجھے یہی کہتے تھے کہ تاج شہید ہو گیا ہے۔ اب اس کا انتظار چھوڑ دے۔ اگر ایسا ہوا بھی تھا، تو بھی شہزی بیٹا! میں ایک شہید کی بیوہ کہلانے میں زیادہ فخر کرتی۔ مگر...''

ماں رکی تو میں نے ایک تکلیف دہ بے قراری سے کہا۔

''ماں تجھے تو فخر ہونا چاہیے تھا کہ تو ایک جیالے جاں باز کی بیوی تھی۔ پھر... پھر تو نے اس رذیل وزیر جان سے کیوں شادی کر لی؟''

میرے اس چبھتے ہوئے سوال پر ماں نے ایک گھٹی گھٹی سی آہ بھری، پھر بولی۔ ''بیٹا! یہ انسان کی فطرت ہے۔ جب وہ حالات زدگی کا شکار ہوتا ہے ناں تو بدقسمتی اور کم عقلی بھی اس کے جلو میں چلتی ہے۔'' ماں نے ایک لمحہ توقف کیا پھر بتانے لگی۔

''تیرے باپ اور بھائی کے بچھڑنے کے بعد میں بہت ٹوٹ چکی تھی، پھر تو اس وقت میرے پیٹ میں تھا۔ سرکاری طور پر برائے نام میری مالی مدد تو کی گئی مگر کب تک۔ میری آخری امید اب بس ایک تو ہی تھا۔ ورنہ مجھے تو اپنی زندگی سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وزیر جان ان دنوں جیل سے رہا ہوا تھا۔ گاؤں میں اس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔

سب اس سے ڈرتے تھے۔ وہ شیدے پہلوان کے نام سے جانا جاتا تھا۔ سنا تھا کہ اس نے کشتی میں اپنے حریف کو جان بوجھ کر ہلاک کر ڈالا تھا۔ اس سے اس کی ذاتی دشمنی تھی۔

بہرحال اسے زیادہ سزا نہیں ہوئی تھی، جسے وہ بہ آسانی کاٹ کر باہر آ گیا تھا۔ میں تب تک تجھے جنم دے چکی تھی۔ ان دنوں میں ایک عمر رسیدہ زمیندارنی کے ہاں کام کرتی تھی۔ دنیا میں وہ بھی میری طرح اکیلی تھی۔ اس کی ایک ہی بیٹی تھی، جو شادی شدہ تھی اور پاس پنڈ میں ہی بیاہی ہوئی تھی، وہ بے اولاد تھی۔ جبکہ اس زمیندارنی کا شوہر مر چکا تھا، اسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ بے چاری زمیندارنی ایک ٹانگ سے معذور تھی، اور وہ بیمار رہتی تھی، مجھے اس نے صرف اپنی خدمت کے لیے رکھا ہوا تھا۔ اس کا شوہر ایک چھوٹی سطح کا زمیندار تھا۔

ان دنوں جس کے پاس زمین کا چھوٹا ٹکڑا ہوتا وہ زمیندار ہی کہلاتا تھا۔ اس کے پاس بھی یہی کچھ تھا، وہاں سے آمدنی ہو جاتی تھی۔ یوں بھی اکیلی عورت کا بھلا کیا خرچہ تھا؟ ایک اور بھی ملازمہ اس نے رکھی ہوئی تھی، گھر کے کام کاج وہی نمٹاتی تھی، جبکہ مجھے اس نے صرف اپنے لیے مقرر کر رکھا تھا، کیونکہ وہ تنہائی کا شکار تھی اور چاہتی تھی کہ کوئی گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہے، اس کی سنتا رہے، اور میں یہی کرتی تھی، مجھے بھی سہارا ہو گیا تھا۔

تجھے میں نے اس کے پاس ہی جنم دیا تھا، ہم پنجاب کے ایک دورافتادہ سرحدی گاؤں میں رہتے تھے، وہاں ڈاکٹروں یا لیڈی ڈاکٹروں کا کوئی تصور نہ تھا، ایسے موقع پر دائی اماں کو بلا لیا جاتا تھا۔ زمیندارنی نے تیری پرورش اپنے ذمے لے لی تھی۔

جبکہ مجھ سے وہ اکثر کہتی رہتی تھی کہ مجھے شادی کر لینی چاہیے۔ اس نے تجھے اپنی بے اولاد بیٹی کی گود میں ڈال دیا تھا کہ وہاں تیری بہتر پرورش ہو گی، میرے پاس بھلا کیا رہ گیا تھا؟

انہی دنوں شیدے پہلوان (وزیر جان) سے میرا سامنا ہونے لگا تھا، وہ مجھے شادی کے لیے بہلانے پھسلانے لگا، مگر میں صاف انکار کرتی رہی، وہ یہی کہتا کہ میرا شوہر شہید ہو چکا ہے، اگر زندہ ہوتا تو اب تک واپس آ چکا ہوتا۔

اس سے پہلے بھی گاؤں میں ایک دو واقعات اس طرح کے ہو چکے تھے، جن عورتوں کے شوہر سرحدی چوکی سے، اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران دشمن ملک کی سرحد میں غائب ہو جاتے تو ان کی عورتیں کچھ انتظار کرنے کے بعد دوسری شادی کر لیتی تھیں، ایسا وہی عورتیں کرتی تھیں جو میری طرح مجبور، جوان اور اکیلی ہوتی تھیں، تاہم میں نے پھر بھی اس کی بات نہیں مانی۔ آخر اس نے مجھے شادی پر رضامند کرنے کے لیے ایک دھوکا کیا اور ایسی چال چلی کہ میں دکھوں کی ماری حرماں نصیب اس کے فریب میں آ گئی۔

اس نے ایک دن مجھے میرے شوہر کے کپڑے لا کر دکھائے اور کچھ ایسی نشانیاں بھی... جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میرا شوہر شہید ہو چکا ہے۔ بدقسمتی سے انہی دنوں زمیندارنی کا انتقال ہو گیا۔ میں پھر اکیلی رہ گئی، تو اس کی بیٹی کی گود میں تھا، اور چند دنوں کا تھا جبکہ شیدا اس حقیقت سے واقف نہیں تھا کہ میرا کوئی بچہ بھی ہے، نہ ہی میں نے اسے بتایا تھا۔

میں نے ناچار وزیر جان سے شادی کر لی، وہ مجھے شہر لے آیا۔ مجھے تو بھی یاد آتا تھا اور میں ایک دو بار شیدے سے بہانہ بنا کر گاؤں کا چکر لگاتی تو اپنے بیٹے کو بھی دیکھ لیتی، زمیندارنی کے مرنے کے بعد اس کی بیٹی اپنے شوہر سمیت اب اسی گاؤں اور گھر میں رہنے لگی تھی۔

انہی دنوں مجھے اس حقیقت کا بھی علم ہو گیا کہ شیدے نے مجھ سے دھوکے سے شادی کی تھی، اس نے کسی طرح میرے شوہر کے کپڑے اور کچھ نشانیاں حاصل کر لی تھیں، جو میرے ہی گھر سے اس نے چوری کی تھیں، میں نے شیدے سے سخت جھگڑا کیا، وہ معافیاں مانگنے لگا، مگر میرا دل اس سے کھٹا ہو گیا تھا، مگر اب ہو بھی کیا سکتا تھا؟ پھر شیدے کا کسی سے جھگڑا ہو گیا اور اسے چند سالوں کی سزا ہو گئی، اور تقدیر نے بھی ایک اور پلٹا کھایا۔

زمیندارنی کی بیٹی اور اس کے شوہر کا ایک ناگہانی حادثے میں انتقال ہو گیا۔ میں اپنے بچے کو لے کر گھر آ گئی۔ شیدے سے بھی ملنے جیل جایا کرتی تھی، آخر کو وہ میرا شوہر تھا۔

تاہم میں پریشان تھی کہ اسے بچے سے متعلق کیا بتاؤں گی؟ مگر اس کا بھی آسان حل میرے پاس تھا، اگر اس نے مجھے دھوکا دیا تھا تو میں نے بھی اسے دھوکے میں رکھا اور اس سے یہی کہا کہ یہ بچہ اسی کا ہے، جسے میں نے اس کے جیل جانے کے بعد جنم دیا تھا۔

بچہ ابھی دودھ پیتا ہی تھا، اور پھر شیدے کو بھی لمبی سزا ملی تھی۔ میرا دھوکا چل گیا جب وہ سزا پوری کر کے آیا تو بچے سے بہت پیار کرنے لگا، وہ اسے اپنا ہی بچہ سمجھتا تھا۔

اپنی بدقماشی کی وجہ سے وہ کہیں نوکری نہ کر سکا۔ اور ایک بار پھر مجھے غربت کے دن دیکھنے پڑ گئے، شیدا بھی

پریشان رہنے لگا، تب اس نے جانے کیا چکر چلایا کہ ایک دولت مند بیوہ عورت کو اپنی چکنی چپڑی باتوں میں پھنسالیا اور اس سے دوسری شادی رچالی۔

مجھے بہت دکھ ہوا اور مجھے اس سے نفرت ہوگئی، وہ بھی میرے ساتھ ظلم پر اتر آیا۔ میری سوتن کا اپنا گھر تھا، شیدا وہاں رہنے لگا اور مجھے بھی لے جانا چاہا، میں بھلا اپنی سوتن کے گھر میں کیسے رہ سکتی تھی؟ انکار کرنے پر اس نے بچے کو مجھ سے چھین لیا اور چلا گیا، میں نے چیخ چیخ کر اس سے کہا کہ یہ بچہ اس کا نہیں ہے، اور اسے ثبوت کے طور پر کئی ایک ایسی باتیں بھی بتائیں، مگر وہ سمجھا کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ تاہم اس کے دل میں شک ضرور پیدا ہوگیا تھا۔ بچہ تو وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ مگر اسی مخمصے میں رہا کہ یہ بچہ اس کا ہے بھی یا نہیں۔ یہ معاملہ جتنا نازک ہوتا ہے اتنا ہی حساس بھی۔

ضد میں وہ بچہ تو لے گیا، اور مجھے بھی طلاق دے ڈالی۔ مجھے اس کا کوئی دکھ نہ تھا مگر بچے کی وجہ سے میں پاگل ہوگئی غم کے مارے۔ وہ اپنی نئی نویلی بیوی کے ساتھ نجانے کہاں رہنے لگا تھا؟ میں اسے ڈھونڈتی رہی، کئی سال بیت چلے، میں نے دارالامان میں پناہ لے رکھی تھی۔ تھانے جاکر بھی فریاد کی تھی مگر کچھ پتا نہ چلا۔ شہزی بیٹا! تم ذرا اس الم نصیب عورت کے غموں اور کٹھنائیوں کا تصور کرو، جس کا آشیانہ ہی بکھر گیا ہو۔ میں نیم پاگل سی دارالامان میں ایک زندہ لاش کی طرح پڑی رہی۔ نجانے کتنا عرصہ بیت گیا۔ آخر ایک دن خود ہی اس بدبخت نے مجھے تلاش کرلیا اور اپنے ہاں لے آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ تم زندہ ہو۔ اور آخری بار اس نے مجھ سے پوچھا، قسمیں دے کر، تب میں نے تیرے سر کی قسم کھا کر اسے بتادیا کہ میں نے تم سے جھوٹ نہیں بولا تھا کہ وہ تمہارا بیٹا نہیں ہے بلکہ میرے پہلے شوہر کا بیٹا ہے۔ اس کا ایک بھائی بھی تھا، جو بچھڑ چکا ہے، تب اسے میری بات کا یقین آیا تھا، کیونکہ وہ خود بھی اس سلسلے میں الجھن اور مخمصے کا شکار رہنے لگا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ کوئی بھی ماں اپنے لختِ جگر کی جھوٹی قسم نہیں کھاسکتی۔ پھر اس نے مجھے اپنی قید میں رکھ لیا تھا۔''

ماں اپنی داستانِ غم ناک سنانے کے بعد سسکیاں بھر بھر کے خاموش ہوگئی اور میں اپنی جگہ منجمد ہوکر ماں کی زبانی یہ ساری الم کتھا سنتا رہا اور اختتام کے بعد بھی کئی لمحوں تک میں گم صم سا بیٹھا رہا۔

آج میرے ماضی کے حوالوں سے وہ سب کچھ آشکارا ہوچکا تھا، جسے جاننے کے لیے اور، جس پر سے پردہ اٹھانے کے لیے میں آج تک بے چین و بے قرار رہتا تھا۔ آج مجھے خوشی بھی ہورہی تھی اور دکھ بھی۔ بڑی عجیب کیفیات اور ذہنی کرب سے میں دوچار ہورہا تھا۔ یہ کیسا اور کیا اتفاق تھا، یا پھر تقدیر کا مذاق۔ لئیق شاہ میرا بھائی تھا، بڑا بھائی، جو اب دنیا میں نہیں رہا تھا، اور اس کا قاتل تھا چوہدری ممتاز خان۔ جبکہ باپ میرا لاپتا تھا، لیکن نہیں، وزیر جان نے تو اس کا بھی پتا لگا لیا تھا، میرے انتقام نے اسے اندھا کردیا تھا اور مجھے زیر کرنے کے لیے وہ جذباتی سہارے تلاش رہا تھا۔

لئیق شاہ کی شادی بیگم صاحبہ یعنی زہرہ بانو سے ہوچکی تھی، گویا اب وہ میری بھابی تھی۔ بے شک بیوہ سہی۔ اور پھر وہ تو اس سے محبت بھی کرتی تھی، بہت شدت سے چاہت رکھتی تھی اس سے۔

اب میں ماں کو اپنے بھائی لئیق شاہ کے بارے میں کیا بتاتا، اور کیسے بتاتا، اور کہاں سے میں اتنا حوصلہ لاتا کہ ماں کو اس کے لختِ جگر کے بارے میں کہہ سکتا کہ وہ جس گمشدہ بیٹے کی راہ تک رہی ہے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔

''پتر شہزی! لگتا ہے، میرے رب سوہنے کو مجھ پر رحم آہی گیا ہے، وہ تو بڑا رحیم و کریم ہے۔ آج اس نے مجھے تجھ سے ملایا ہے کل وہ ضرور مجھے میرے دوسرے لختِ جگر سے بھی ملائے گا۔ ہے ناں شہزی بیٹا!''

ماں نے میری جانب پُرامید نگاہوں سے دیکھا تو مجھے بے اختیار اپنی بوڑھی اور دکھوں کی ماری ماں کے ان معصومانہ اور جگر پاش لفظوں پر رونا آگیا۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں، مجھ میں بالکل بھی ہمت نہیں ہورہی تھی کہ میں ماں کو اپنے بھائی لئیق شاہ کے بارے میں بتاتا۔

''ارے تو رو رہا ہے میرے لعل' کیوں؟'' میری آنکھوں میں نمی دیکھ کر ماں ایک دم پریشان سی ہوکر بولی تو میں نے ماں کا جھریوں بھرا ہاتھ محبت اور عقیدت سے تھام کر چوم لیا اور بولا۔

''ہاں ماں! بھائی یاد آگیا تھا۔ پر میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں ماں کہ باپ کو بھی... ایک دن تلاش کرکے ہی رہوں گا۔''

''میرے لعل! تجھ سے مجھے بڑی امیدیں ہیں۔ مجھے اللہ کے ساتھ تجھ پر بھی پورا بھروسا ہے مگر بیٹا اب میں تھک گئی ہوں، اب میرے اندر مزید غموں کو سہنے کا حوصلہ نہیں رہا۔ بس تو کسی طرح میرے لئیق شاہ کو ڈھونڈ کر لادے۔ میں اس کی یاد میں بہت تڑپی ہوں۔ پتا نہیں وہ بے چارہ کس حال میں اور کہاں ہوگا۔''

ماں کہے جا رہی تھی اور میری آنکھوں سے جیسے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی، کبھی جی کرتا ماں کو بتا دوں کہ لئیق شاہ میرا بھائی اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ مگر ماں کیا یہ دکھ سہہ لیتی؟ مجھ میں تو کم از کم یہ ہمت نہیں ہو رہی تھی، مگر ماں کو بتانا بھی ضروری تھا، ورنہ وہ اپنی بوڑھی آنکھوں میں اپنے دوسرے بیٹے کا غم لیے اس کے انتظار میں بیٹھی رہتی۔ اس طرح اسے کچھ سکون تو مل جاتا، ایک بار کا دکھ تھا ناں۔ مگر اس طرح تو وہ روزانہ ایک عذاب سے گزرتی تھی۔ مگر میں وہ ہمت کہاں سے لاؤں؟

دفعتاً میرے ذہن میں ایک جھما کا ہوا۔ وہ ایک نام تھا جو کسی نیون سائن کی طرح میرے دماغ میں روشن ہوا تھا۔

''بیگم صاحبہ۔''

یہ نام اب میرے لیے ایک بھابی کا درجہ اختیار کر گیا تھا۔ اپنے مرحوم بھائی کی بیوہ کی حیثیت سے زہرہ بانو کو دیکھ کر میں اب اپنے دل میں ان کے لیے بھی ایک احترام، عقیدت اور محبت سی محسوس کرنے لگا تھا۔ اور شہزی کا کا تو تھا ہی سراپا محبت۔ سب سے محبت کرنے والا۔ کسی کا دل نہ دکھانے والا۔

میں نے یہ معاملہ جلد سے جلد نمٹانے کے لیے زہرہ بانو کو فون کر دیا۔

وہ حیران ہوئیں، کیونکہ ابھی تو وہ مجھ سے مل کر گئی تھیں۔ میں نے سر دست انہیں فون پر کچھ نہیں بتایا۔ تاہم اتنا ضرور کہا کہ وہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے یہاں آ جائیں۔

میں اب چشم تصور سے زہرہ بھابی (اب میں انہیں بھابی ہی کہوں گا) کو ایک عجیب کیفیات سے دوچار ہوتا دیکھ رہا تھا، جب انہیں اس بات کا پتا چلتا کہ وہ میری کیا لگتی ہیں اور لئیق شاہ جس سے انہوں نے بے اندازہ محبت کی تھی، اس سے میرا کیا رشتہ ہے۔

میں نے اول خیر اور شکیلہ کو بھی ساری حقیقت بتا دی۔ دونوں ششدر رہ گئے۔ کئی لمحوں تک تو وہ منہ کھولے میرا چہرہ ہی تکتے رہ گئے۔ شکیلہ سے تو سر دست کچھ بولا ہی نہیں گیا، البتہ اول خیر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''او خیر کا کے! یہ تو سچ کہہ رہا ہے؟''

''ہاں اول خیر! یہ سچ ہے۔ لئیق شاہ میرا بھائی تھا، بڑا بھائی۔'' میں نے گہرے رنج و کرب سے کہا اور اول خیر ایک گہری دکھ بھری سی ہنکاری خارج کر کے رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد زہرہ بانو حیران و پریشان سی وہاں پہنچیں۔ میں، اول خیر اور شکیلہ انہیں لے کر دوسرے کمرے میں آ گئے۔ حسب معمول گبیل دادا بھی ایک باڈی گارڈ کی حیثیت سے ان کے ساتھ تھا۔

میں نے بڑے پُرسکون ماحول میں نہایت دھیرے دھیرے بھابی زہرہ بانو۔ کو ماں سے کی ہوئی وہ ساری حقیقت بتا دی اور وہ جیسے یک دم بت بن گئیں۔ گبیل دادا بھی مارے حیرت کے ہونقوں کی طرح میرا منہ تکنے لگا۔

''ش شش شہزی! ک ک... ک... کیا یہ سچ ہے؟'' زہرہ بانو کے کپکپاتے لبوں سے برآمد ہوا تھا، انہیں یقین کرنے میں ہنوز تامل ہو رہا تھا۔

''ہاں! زہرہ بھابی! یہ سچ ہے۔ بالکل ایسا ہی ایک پُریقین سچ جیسے آپ میرے سامنے بیٹھی ہیں۔'' میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا اور شاید میرے منہ سے بے اختیار بھابی کا لفظ سن کر ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ان کا حسین دلکش چہرہ ایک ارتعاش کا شکار نظر آنے لگا تھا جو ان کی اندرونی کیفیات کی بڑی واضح غمازی کر رہا تھا۔ میرے بھابی کہنے پر شاید ان کا ایک غم نہاں ہرا ہو گیا تھا۔

کئی لمحات اسی طرح سکتے کی سی حالت میں بیت گئے۔ پھر وہ بولیں۔ ''شہزی! کیا ماں جی کو تم نے بتا دیا ہے کہ...''

''ابھی نہیں بتایا۔ میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا، مجھ میں ماں جی سے اتنی بڑی بات کہنے کا حوصلہ نہیں ہو پا رہا۔'' میں نے بڑے کرب سے کہا تو وہ بھی سسک پڑیں۔

میں نے کہا۔ ''بھابی! میرا خیال ہے کہ اب آپ ہی ماں جی کو یہ حقیقت بتا سکتی ہیں کہ ان کا گم شدہ بیٹا لئیق شاہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔''

میری بات پر بے اختیار ان کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ ٹشو پیپر سے انہیں پونچھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں۔ ''شہزی! میری اپنی حالت بڑی عجیب سی ہو رہی ہے، دل تو چاہتا ہے کہ ابھی اٹھوں اور ماں جی کے قدموں میں جا کر اپنا سر رکھ کے رو دوں۔ لیکن ڈرتی ہوں کہ کیا وہ اتنا بڑا صدمہ سہہ پائیں گی؟''

''بھابی! اب آپ ہی اتنی بڑی بات ماں جی کو بتا سکتی ہیں۔ مجھ میں ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ میں نے اسی لیے آپ کو فوراً بلا لیا تھا۔ میں خود بھی آ سکتا تھا مگر مجھے ایک نئی مصیبت نے آن گھیرا ہے اور میں اسی سلسلے میں پریشان تھا۔'' میں نے کہا تو وہ قدرے چونک کر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

''خیریت ہے شہزی؟ ایسا آخر کیا ہوا ہے۔ مجھے

بتاؤ؟''
میں نے انہیں عابدہ وغیرہ سے متعلق ساری بات بتا دی اور یہ بھی کہ اب سرمد بابا اور عارفہ ہی پاکستان لوٹ رہے تھے، جبکہ عابدہ کو امریکی سی آئی اے والوں نے اپنی کسٹڈی میں رکھا ہوا تھا۔ نیز، زہرہ بانو کو آنسہ خالدہ کے بارے میں بھی بتادیا۔
یہ سب سن کے وہ بھی پریشان اور تشویش زدہ سی نظر آنے لگیں۔ چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد وہ بولیں۔
''شہزی! اللہ سے میری دعا ہے کہ وہ عابدہ بہن کے سلسلے میں بہتر کرے گا۔ میرا خیال ہے یہ معاملہ خاصا گمبھیر ہے، تمہاری بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ سرمد بابا کو اس طرح عابدہ کو وہاں دیارِ غیر میں بے یارومددگار چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا، لیکن ممکن ہے ان کے پاس بھی اس کے... سوا دوسرا آپشن نہ ہو۔ ہاں یہ انہوں نے ضرور سوچ رکھا ہوگا کہ وہ عابدہ کے سلسلے میں اب آگے کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے آنے کا انتظار کرلینا چاہیے۔ مجھے یقین ہے وہ عابدہ کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔''
زہرہ بانو نے بھی وہی بات کی تھی جو تھوڑی دیر پہلے اول خیر اور شکیلہ مجھے تسلی دینے کے دوران کہہ چکے تھے۔
میں نے کہا۔ ''میں بھی اسی لیے خاموش ہوں اور بے چینی سے سرمد بابا کی آمد کا منتظر ہوں۔ ورنہ تو میں بے حد غصے میں آگیا تھا یہ سن کر کہ وہ عابدہ کو وہیں چھوڑ کر صرف عارفہ کو لے کر لوٹ رہے ہیں۔''
''ویسے ایک بات سوچ طلب ہے۔'' وہ اچانک بولیں۔ اور میں ان کی طرف سوالیہ نظروں سے تکنے لگا۔ ''اسکینگ کے ذریعے تباہی پھیلانے والا مواد تو عارفہ کے جسم سے برآمد ہوا تھا۔ حراست میں تو اسے ہونا چاہیے تھا، مگر سی آئی اے والوں نے آخر بے چاری عابدہ کو کیوں دھرلیا؟''
''میں نے بھی انہی خطوط پر بہت غوروخوض کیا تھا۔ یہ بات خود میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔'' میں نے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔
وہ چند ثانیے خاموشی کے ساتھ کچھ سوچتی رہیں پھر بولیں۔ ''میرا خیال ہے، ابھی ماں جی سے کوئی بات نہیں کرتے ہیں۔ پہلے سرمد بابا کو آجانے دو، دیکھتے ہیں انہوں نے عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں کیا سوچ رکھا ہے۔ اس کے بعد ماں جی کو بھی ان کے بیٹے سے متعلق وہ حقیقت...''
''نہیں زہرہ بھابی!'' میں نے ان کی بات درمیان میں کاٹ دی۔ ''یہ سب جاننے کے بعد اب مجھ سے ماں جی کا اپنے بیٹے کے انتظار میں اس طرح بے چین رہنا، دیکھا نہیں جارہا۔ پلیز، آپ ابھی ماں جی سے جا کر یہ سب کہہ دیں۔''
''ماں جی کہاں ہیں اس وقت؟'' بالآخر زہرہ بانو نے پوچھا۔
''اپنے کمرے میں ہیں۔'' میں نے کہا۔ وہ کچھ سوچتی رہیں پھر بولیں۔
''تم بھی میرے ساتھ آؤ۔ ہم دونوں ماں جی کے پاس چلتے ہیں۔'' میں نے ان کی بات پر ہولے سے اپنے سر کو جنبش دی۔ تاہم کچھ سوچ کر شکیلہ کو بھی آنے کا اشارہ کر دیا۔
ہم تینوں ماں جی کے کمرے میں پہنچے۔ ماں جی، میرے ساتھ ایک اجنبی خاتون کو دیکھ کر ذرا حیرت زدہ سی ہوگئیں، پھر سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگیں۔ میں چپ تھا۔ شکیلہ آگے بڑھ کر ماں جی کے قریب جا بیٹھی تھی، جبکہ زہرہ بانو ایک ذرا الجھے کو رکیں، پھر ماں جی کو سلام کیا اور ان کے قدموں میں بیٹھ کر اپنا سر بڑی محبت سے ماں جی کی گود میں رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیں، خود میں بھی رقیق زدہ سا ہونے لگا تھا۔ ماں جی حیران پریشان یہ سارا ماجرا دیکھتی رہیں پھر بے اختیار ان کا ہاتھ زہرہ بانو کے بالوں کو چھونے لگا، وہ بڑے پیار سے ان کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگیں۔
'بیٹی! تو کون ہے؟ اس طرح کیوں رو رہی ہے؟'' ماں جی نے بڑے پیار اور ملائمت آمیزی سے پوچھا اور پھر میری جانب دیکھنے لگیں۔
''پتر شہزی! تو بتاتا کیوں نہیں۔ یہ کون ہے بے چاری۔ اسس قدر دکھ کے ساتھ رو رہی ہے یہ کہ جیسے اس کا اور میرا دکھ سانجھا ہو۔''
''ہاں ماں! تو نے ٹھیک کہا۔ اس کا اور تیرا دکھ ایک ہی ہے۔ تو جس بیٹے کی جدائی میں تڑپ رہی ہے، یہ بدنصیب بھی اسی کی جدائی کا شکار ہے۔'' میں نے ڈبڈبائے لہجے میں کہا اور مجھے حیرت ہوئی کہ مجھ میں اتنی ہمت کیسے آگئی تھی؟
''کیا مطلب بیٹا! میں سمجھی نہیں؟'' ماں پھر الجھ گئیں۔
''ماں! یہ تیری بدنصیب بہو ہے، زہرہ بانو۔'' بالآخر میں نے کہا۔
''کک... کیا؟''
''ہاں ماں! یہ بھائی لئیق شاہ کی...'' مجھ میں آگے بتانے کی ہمت نہ ہوسکی، تب زہرہ بانو نے اپنا سر اٹھا کر ماں جی کی طرف دیکھا اور زاروقطار روتے ہوئے بولیں۔

''ماں جی! میں تیرے بیٹے لئیق شاہ کی بیوی ہوں تیری بہو۔''

میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔ زہرہ بانو کی بات پر ماں کے جھریوں بھرے چہرے پر ایک مسرت بھرا ارتعاش ابھرا، بوڑھی آنکھوں میں خوش آئند دنوں کی نوید ایک امید بن کر چمکی۔ انہوں نے ایک نگاہ حیرت وانبساط کی مجھ پر اور پھر زہرہ بانو کے جھکے ہوئے چہرے پہ ڈالی، اس کے بعد جیسے پیاسی ممتا چیخ اٹھی۔

''تت... تو مم... میرے لعل لئیق کی بیوی ہے؟ سچ بتا بیٹی!''

ماں جی نے کہتے ہوئے یک دم زہرہ بانو کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔ اور پیار سے پیشانی چوم لی.... زہرہ بانو ایک غم نہاں تلے مسلسل روئے جارہی تھی۔

''ہاں ماں جی! یہ سچ ہے۔ بھلا اتنی بڑی بات میں جھوٹ کیسے کہہ سکتی ہوں۔''

زہرہ بانو نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا اور میری طرف ذرا گردن موڑ کے دیکھا تو میں نے بھی مغموم لہجے میں ماں جی سے تائید میں کہا۔

''ہاں ماں! یہ سچ کہہ رہی ہے، اس سے کہ تو نے مجھے جو بتایا تھا، وہی کچھ یہ مجھے بتا چکی تھی۔ اس کا نام زہرہ بانو ہے۔''

نہ مجھ میں اصل بات کی طرف آنے کی ہمت ہو پارہی تھی نہ ہی زہرہ بانو میں کہ ماں کو اب لئیق شاہ کے بارے میں کیا اور کیسے بتاتے؟ آخر ماں نے ہی ہماری یہ مشکل آسان کردی۔ پوچھا۔

''میں یہ کب کہہ رہی ہوں کہ میری بیٹی جھوٹ بول رہی ہے، پر میرا بچھڑا لعل، لئیق شاہ کدھر ہے؟ وہ اس کے ساتھ کیوں نہیں آیا؟ وہ کہاں گیا؟ جب سے وہ بچھڑا ہے، میری آنکھیں اسے دیکھنے کو ترس گئی ہیں۔ تم دونوں بتاتے کیوں نہیں۔ میرا لعل لئیق شاہ کدھر ہے؟ میں نے تو ابھی تک اس کے بچپن کے کپڑے بھی سنبھال کے رکھے ہیں، انہیں ہی دیکھ دیکھ کر میں اپنا دل بہلاتی اور آنسو بہاتی رہتی ہوں۔ تم دونوں خاموش کیوں ہو؟''

ماں کے الفاظ جگر چھلنی کیے دے رہے تھے، ایک ناقابل بیاں کرب اور غم کی کیفیات طاری تھی مجھ پر اور زہرہ بانو پر بھی۔

''ماں جی! لئیق شاہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔''

بالآخر زہرہ بانو کے لبوں سے یہ دل فگار الفاظ برآمد ہو گئے، اور ماں کو جیسے یک دم سکتہ ہو گیا۔ ان کا پورا وجود جیسے پتھر گیا۔ آنکھیں ساکت ہو گئیں۔ اور پھر جیسے پانی، کبھی کبھی پتھر توڑ کے نکل آتا ہے، یہ عین اسی طرح ماں کی کھبور آنکھوں سے بھی آنسوؤں کے آبشار پھوٹ پڑے۔ وہ دکھی لہجے میں بولیں۔

''کک... کیا میرا لئیق اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے اور میں بدنصیب اس کی راہ تک رہی ہوں۔ کب ہوا یہ؟ کیسے ہوا شہزی پتر! تو بتا، کیا یہ سچ ہے؟''

مارے غم کے ماں کو غش آنے لگے۔ زہرہ بانو اپنا دکھ بھول کر ماں کو سنبھالنے لگی، شکیلہ ان کے لیے پانی لینے دوڑی، میں آگے بڑھا اور ماں سے لپٹ گیا۔

''ماں! غم نہ کر ابھی تیرا یہ بیٹا تو زندہ ہے ناں۔ تجھے پتا ہے بھائی لئیق شاہ بھی بالکل میری جیسی شکل وصورت کا تھا۔''

''ہاں ماں جی! وہ بالکل تیرے اس گبرو بیٹے شہزی کی طرح تھا۔'' زہرہ بانو بھی بولی۔ پھر وہ دھیرے دھیرے ماں جی کو لئیق شاہ کے متعلق مختصراً بتانے لگی۔

☆☆☆

غم چاہے کتنا ہی بڑا ہو اسے سہنا پڑتا ہے۔ پھر سہہ کے بھلانا بھی پڑتا ہے۔ یہی زندگی ہے۔ بھولنے کا عمل نہ ہو تو زندگی ہی رک جائے۔ وہیں ٹھہر جائے اور انسان ادھ موا ہو جائے۔ مجھے بھی بھائی کا غم سہنا تھا اور ماں کو اپنے جوان بیٹے کی موت کا۔

وہ دن بڑا افسردگی سے گزرا تھا، زہرہ بانو خاصی دیر ماں جی کے پاس بیٹھی رہیں، پھر جانے لگیں تو ماں نے انہیں نہ جانے دیا۔ بولیں۔

''زہرہ بیٹی! نہ جا تو ادھر ہی رہ، میرے پاس، تیرے پاس سے میرے لعل لئیق کی خوشبو آتی ہے۔ میں تجھے نہیں جانے دوں گی کہیں بھی۔'' ماں کی بات پر زہرہ بانو نے میری طرف دیکھا۔ پھر اٹھ کر میرے قریب آئیں اور ہولے سے بولیں۔

''شہزی! کیا میں ماں کو کچھ روز کے لیے اپنے ساتھ لے جاسکتی ہوں؟''

میں سوچ میں پڑ گیا تو شکیلہ اور اول خیر نے میرے قریب آ کر زہرہ بانو کی تائید میں کہا کہ ماں کو کچھ روز کے لیے زہرہ بانو کے پاس بھیج دیا جائے، ان کا دل بہل جائے گا۔

لہٰذا پھر ایسا ہی کیا گیا اور ماں، زہرہ بانو کے ہمراہ بیگم

والا چلی گئیں۔

سرمد بابا کی فلائٹ لیٹ ہوگئی تھی۔

شکیلہ اونگھتے اونگھتے سوگئی تھی، اول خیر کا بھی یہی حال تھا، صرف میں ہی جاگ رہا تھا، نیند تو سولی پہ بھی آجاتی ہے کہ مصداق میری بھی ذرا دیر کو آنکھ لگ گئی۔

خواب میں، میں نے عابدہ کو دیکھا۔ وہ مجھ سے شکوہ کناں تھی۔ ''شہزی! میں تم سے ہر بار فون پر کہتی تھی ناں کہ میں یہاں خطرہ محسوس کررہی ہوں۔ ایک انجانا خطرہ۔ جیسے کوئی نادیدہ جال ہو، جسے میرے گرد دھیرے دھیرے لپیٹا جارہا ہو۔ مگر... تم مجھے تسلیاں ہی دیتے رہے۔ آخر تک مجھے بس بہلاتے ہی رہے کہ یہ میرا وہم ہے، بھلا میرا وہاں کون دشمن ہے؟ اب دیکھ لیا ناتم نے خود۔ شہزی! میں تمہارے لیے، تمہاری جدائی میں تڑپ رہی ہوں، آجاؤ ناں اب میرے پاس تم۔ دیکھو... میں تم سے کتنی دور ہونے لگی ہوں۔ جلدی آجاؤ میرے شہزی! ورنہ میں بہت دور چلی جاؤں گی۔ لو میرا ہاتھ تھام لو۔ کبھی نہ چھوڑنے کے لیے۔ آجاؤ۔ تم تو کہتے تھے کہ محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ لو تھام لو اب میرا ہاتھ یہ کرو میرا انتظار۔'' اس نے یہ کہہ کر اپنے دونوں ہاتھ میری جانب بڑھادیے۔ میں چلایا۔

''نہیں، نہیں عابدہ! میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔'' یہ کہہ کر میں اسے تھامنے کے لیے آگے بڑھا۔ مگر وہ پیچھے ہٹتی چلی گئی، جیسے اسے کوئی کھینچ رہا ہو۔ مجھ سے دور لے جانا چاہتا ہو۔ میں دیوانہ وار اس کی طرف دوڑتا، وہ اتنی تیزی کے ساتھ مجھ سے دور۔ اور دور، بہت دور ہوتی چلی جارہی تھی۔ حتیٰ کہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ میں دیوانہ وار اسے پکارنے لگا تو کسی نے جھنجوڑ کر مجھے جگا دیا۔ یہ اول خیر تھا، جو ڈرائنگ روم میں ہی میری طرح ایک قریب کے صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ شاید میرے چیخنے سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

میں جاگ کر زور زور سے ہانپنے لگا، جیسے نجانے کتنی میلوں کی مسافتیں طے کی ہوں۔

''اوئے شہزی کاکا حوصلہ کر میرے یار! وہ مجھے دلاسا دینے لگا۔ میرے سینے میں ایک الاؤ سا دہکنے لگا تھا۔ پورا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ تب ہی گیٹ پر متعین گارڈ نے انٹرکام پر میری ہدایت کے مطابق مجھے مطلع کیا کہ سرمد بابا آگئے ہیں۔ میں اور اول خیر سنبھل کر بیٹھ گئے۔

میری کیفیات ایک بار پھر جوالا مکھی جیسی ہونے لگی تھی، صاف نظر آتا تھا کہ میں سرمد بابا کو دیکھتے ہی پھٹ پڑوں گا۔ شاید میری اس دروں و بروں کیفیات کا قریب بیٹھے اول خیر کو بھی اندازہ ہوگیا تھا، مجھ سے بولا۔

''شہزی کاکے! ابھی سرمد بابا سے ایسا کچھ مت کہنا۔ پہلے ان کی بات غور سے سن لینا۔ دیکھتے ہیں انہوں نے عابدہ بہن کے بارے میں کیا لائحہ عمل طے کیا ہے۔''

میں نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔ یہی سوچ رہا تھا کہ کیا اچھا ہوتا کہ اس وقت سرمد بابا کے ساتھ عارفہ کے علاوہ عابدہ بھی ہوتی۔

اول خیر نے شکیلہ کو جگا دیا تھا، شریفاں اور اس کا شوہر فضل محمد بھی جاگے ہوئے تھے۔ یہ دونوں دوڑ کر باہر کو لپکے تھے۔ میرا اول تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ عجیب کیفیت ہورہی تھی میرے دل و دماغ کی، دونوں ہی آتش فشاں کی مثل بھڑکے ہوئے تھے۔ مجھے خود پہ قابو پانا دوبھر ہورہا تھا۔ کچھ ایسا ہی لگتا تھا کہ آج میرے اور بابا سرمد کے درمیان بڑی گرما گرمی ہوجائے گی۔ میرے اندرونی ابال کی کیفیات میرے مرتعش وجود سے ہویدا ہورہی تھی۔ جسے دیکھتے ہوئے اول خیر مجھے بار بار صبر و برداشت کی تلقین کیے جارہا تھا۔

ایسے ہی وقت میں سرمد بابا اور عارفہ اندر داخل ہوئے تھے۔ ہم تینوں ان کا استقبال کرنے اٹھ کھڑے ہوئے۔

عارفہ وہیل چیئر پہ تھی۔ وہ کافی بہتر نظر آرہی تھی۔ البتہ ایک معمول کے مطابق اور دوسری بار ایمرجنسی آپریشن سے گزرنے کے بعد وہ کافی کمزور دکھائی دے رہی تھی جبکہ سرمد بابا نارمل ہی دکھائی دے رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پہ ہمیشہ کی طرح ایک پر شفیق سی مسکراہٹ ابھری تھی۔ جبکہ ان کی بہو عارفہ نے بس ایک ہلکی سی نگاہ مجھ پر ڈالی تھی، البتہ وہ اول خیر اور شکیلہ کو کچھ چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔

مجھے اس کا یوں ان دونوں کو دیکھنا سخت برا لگا تھا۔ اپنا مطلب اس عورت نے نکلوالیا تھا مجھ سے اور اب مجھے اس کے تیور بدلے ہوئے ہی نظر آنے لگے تھے، ایسے میں سیٹھ نوید سانچے والا کی باتیں بھی میرے ذہن میں گردش کرنے لگی تھیں۔

ابھی سلام دعا اور رسمی کلمات کی ابتدا ہی ہوئی تھی کہ عارفہ نے شکیلہ اور اول خیر کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے قدرے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''یہ دونوں کون ہیں؟'' اس نے مجھے مخاطب کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

''یہ میرے دوست ہیں۔'' میں نے بھی جواباً قدرے روکھے پن سے کہا اور پھر فوراً ہی عارفہ کی طرف سے توجہ ہٹا

کر میں نے سرمد بابا سے عابدہ سے متعلق پوچھا تو وہ بولے۔

''شہزی بیٹا! میں جانتا ہوں اس وقت تمہاری دلی کیفیات کو، لیکن بہتر ہوگا کہ اس موضوع پر کل صبح بات کی جائے۔ بات لمبی اور گمبھیر بھی ہے اور۔۔۔''

''کمال کر دیا سیٹھ منظور صاحب آپ نے بھی۔'' میں نے فوراً ان کی بات کاٹ کر تلخ اور تیز لہجے میں کہا۔ ''ایک طرف آپ خود اعتراف کر رہے ہیں کہ اس وقت میرے دل پہ کیا بیت رہی ہے اور دوسری جانب آپ فرما رہے ہیں کہ اس موضوع پر کل بات کریں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے آپ کی امریکا سے واپسی کا کس بے چینی اور کرب و قیامت سے گزر کر انتظار کیا ہے، صرف یہ جاننے کے لیے کہ عابدہ کے ساتھ آخر ایسا کیا ہوا ہے۔ اور آپ دونوں اسے دیارِ غیر میں اکیلا کیسے چھوڑ آئے ہیں؟ آپ کو وہاں رہتے ہوئے اس کا دفاع کرنا چاہیے تھا، نا کہ اس طرح اسے ہزاروں میل دور ایک اجنبی دیس میں تنہا چھوڑ آئے، میرا سکھ چین حرام ہو گیا ہے مجھ پر جب تک میں عابدہ کو صحیح سلامت اپنی آنکھوں کے سامنے نہ دیکھ لوں۔ حیرت ہے ایسے میں آپ آرام کی باتیں کیسے کر رہے ہیں؟''

میری بات سن کر سرمد بابا کے چہرے پہ خجالت کے آثار ابھرے تھے، ندامت کی ایک رمق بھی میں نے ان کی پیشانی پر نمودار ہوتے محسوس کی تھی، مگر اس سے پہلے کہ وہ مجھے کوئی جواب دیتے، عارفہ میری طرف دیکھ کر قدرے اکھڑے ہوئے لہجے میں بولی۔

''شہزاد! میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا، پہلے اس کا جواب دو۔ یہ دونوں کون ہیں اور میرے گھر میں کیوں ہیں؟''

عارفہ کی اس بات نے تو جیسے میرا دماغ بھک سے اُڑا دیا۔ میں بڑی تیزی کے ساتھ اور درشت انداز میں بولا۔

''محترمہ! آپ کے سوال سے کہیں زیادہ اہم ترین سوال میرا ہے۔ مجھے پہلے اس کا جواب درکار ہے۔ عابدہ آپ لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں آئی؟ جبکہ وہ اپنے کسی ذاتی کام سے نہیں بلکہ آپ کی بیماری، آپ کی تیمارداری، اور دل جوئی کی خاطر گئی تھی۔''

میری جوابی کارروائی نے ایک لمحے کے لیے عارفہ کا چہرہ سرخ کر دیا، اور اس کے چہرے سے پھوٹتی تندی سے صاف عیاں ہوتا تھا کہ وہ بھی جواب میں مجھ سے کوئی سخت بات کہنے والی تھی مگر پھر شاید صورتِ حال کی نزاکت کا بھی اسے احساس ہوا اور پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر خود کو پُرسکون کیا اس کے بعد قدرے ہموار لہجے میں بولی۔

''دیکھو شہزی! ہم تمہارا اور عابدہ کا یہ احسان مانتے ہیں لیکن اب یہ تو ہمیں نہیں پتا تھا نا کہ آگے کیا حالات پیش آنے والے ہیں؟ اگر پتا ہوتا تو ہم امریکا جاتے ہی کیوں؟''

''میں نے کوئی احسان کیا ہے نا عابدہ نے۔ ہم نے جو کیا سرمد بابا کی شفقت اور محبت میں اور ایک انسانی ہمدردی کے طور پر کیا ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ''پیش آئند حالات کا کسی کو بھی پیشگی علم نہیں ہوتا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اپنے کسی ہمدرد کو اکیلا چھوڑ دو۔ تم لوگوں کو اول تو عابدہ کے بغیر آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ بے چاری سیدھی سادی لڑکی ہے۔ کبھی بھی ایسے حالات سے نہیں گزری ہے۔''

''بیٹا! ہم تمہیں یہی بات تو سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ ہم نے عابدہ بیٹی کو اکیلا نہیں چھوڑا ہے۔'' سرمد بابا نے کہا تو میں ان کی طرف دیکھ کر بولا۔

''میں بھی آپ سے یہی پوچھ رہا ہوں کہ مجھے بتایا تو جائے کہ آخر آپ لوگوں نے اس کے دفاع سے متعلق کیا سوچ رکھا ہے؟ مگر آپ کو آرام کرنے کی سوجھ رہی ہے۔''

''شہزی! تمہیں باباجی سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ تم چھوٹے بڑے کا احترام ہی بھول گئے ہو؟''

عارفہ نے میری طرف دیکھ کر درشت لہجے میں کہا تو سرمد بابا نے فوراً مداخلت کی، پہلے اپنی بہو کو خاموش رہنے کو کہا پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور بدستور مجھ سے خلیقانہ لہجے میں بولے۔

''شہزی بیٹا! تمہاری پریشانی بجا ہے۔ اچھا ٹھیک ہے بیٹھو۔ ہم اِدھر ہی بات کر لیتے ہیں۔'' پھر انہوں نے شریفاں کو کہا کہ عارفہ کو ان کے کمرے میں چھوڑ آئے۔ وہ اس کی وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

ہم چاروں صوفوں پر بیٹھ گئے۔ اول خیر اور شکیلہ سے وہ واقف ہی تھے۔ چند ثانیے تک نشست گاہ کی محدود فضا میں دھڑکتی ہوئی خاموشی طاری رہی اس کے بعد سرمد بابا نے مختصراً مجھے وہی کچھ بتایا جو اَب تک کی اطلاعات کے مطابق میں بھی جانتا تھا۔ لہٰذا میں نے کہا۔

''لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ عابدہ کو وہاں انہوں نے کس قانون کے تحت روکے رکھا ہے؟ اور افسوس آپ نے عابدہ کے دفاع کے لیے کچھ بھی نہیں کیا؟ جبکہ سازش کا نشانہ عارفہ بنی تھی۔ اصولاً تو اسے امریکیوں کے دائرہ تفتیش میں آنا چاہیے تھا۔''

میری مدلل گفتگو سن کر ایک لمحے کو سرمد بابا بھی لاجواب ہوتے نظر آنے لگے، تاہم بولے۔ ''شہزی بیٹا! تمہاری ساری باتیں اپنی جگہ درست اور حق بہ جانب ہیں، کاش میں تمہاری غلط فہمی دور کرسکوں، یہ معاملہ بہت نازک صورت اختیار کر چکا تھا، خود ہم پریشان ہوگئے تھے کہ آخر یہ اتنا بڑا واقعہ کیسے اور کیوں کر رونما ہوا؟ ہمیں تو اس پر یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ہم اس خطرناک سازش کا شکار کیسے اور کیوں ہوئے۔ دیکھو بیٹا! جیسے عارفہ میرے لیے بیٹیوں کی طرح ہے اسی طرح عابدہ بھی، بلکہ عابدہ اور تمہاری تو بات ہی اور ہے۔''

وہ اتنا کہہ کر ذرا سانس لینے کو رکے پھر بولے۔ ''شہزی بیٹا! وہاں ہم بدقسمتی سے جن حالات کا شکار ہوئے، ہمیں خود سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر کیا کیا جائے؟ تاہم اپنے دفاع کے لیے ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ شکر ہوا کہ ہمیں ایک مقامی لائر فراہم کردیا گیا، جس نے ہمارا کیس لڑا اور عارفہ کی بیماری سے متعلق سارے ثبوت پیش کیے گئے، اور اس اسپتال کی بھی نشاندہی کی گئی جہاں عارفہ بیٹی کا علاج ہوتا رہا تھا۔ لہٰذا ہمارا موقف یہی تھا کہ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا، وہ اسی اسپتال میں ہی کیا گیا تھا۔

''بیٹا! کیس تو ہم جیت گئے تھے۔ مگر عابدہ بیٹی کے پاس سے بدقسمتی سے کچھ ایسی اشیا برآمد ہوئی تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس سازش میں شریک رہی ہے، اب اسے بدقسمتی کہہ لو بیٹا! یا عارفہ کی غلطی کہ سی آئی اے سینٹر میں موجود ایک اسپیشل ایجنٹ باسکل ہولارڈ کو عارفہ نے جب دورانِ تفتیش عابدہ کے متعلق یہ بتایا کہ اس سے ہماری کوئی رشتہ داری یا خاندانی رشتہ نہیں ہے اور وہ محض ہماری ایک ہیلپر ہے تو بس ادھر ہی عابدہ بے چاری کا معاملہ بگڑ گیا۔''

سرمد بابا کی اس بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ میں آنکھیں سکیڑے بڑے غور سے ان کی بات سن رہا تھا۔

''باسکل ہولارڈ'' کا نام میں نے بارہا فون پر عابدہ سے گفتگو کے دوران بھی سن رکھا تھا۔ وہ سب سے زیادہ اسی شخص سے خوف زدہ رہتی تھی، جو اکثر اسپتال میں آکر ان سے ''تفتیشی'' ملاقات کے دوران عابدہ کو زیادہ مشقِ ستم بناتا تھا۔

نیز میں اس نقطے پر بھی غور کرنے پر مجبور ہوا کہ آیا عارفہ نے اپنی جان چھڑانے کے لیے دانستہ عابدہ کے سلسلے میں غلطی کی تھی یا پھر یہ واقعی اس کی ''نادانستہ'' غلطی تھی؟

سرمد بابا آخر میں حلق سے ایک گہری اور آزردہ سی ہنکاری

۔۔۔ خارج کرتے ہوئے بولے۔ ''شہزی بیٹا! یقین کرو مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہوا کہ انہوں نے ہمیں تو جانے دیا مگر عابدہ کے سلسلے میں انہوں نے عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے اس بے چاری کو مزید تفتیش کے نام پر روک لیا۔ ہم مجبور تھے بیٹا! لائر نے بھی ہمیں یہی مشورہ دیا تھا کہ آپ ابھی عارفہ کو لے کر لوٹ جاؤ، میں باقی کی صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کروں گا۔''

وہ اپنی بات ختم کرکے خاموش ہوئے تو میں نے طنز آمیز تلخی سے کہا۔ ''مجھے پورا یقین ہے سرمد بابا کہ یہ مشورہ آپ کو لائر نے نہیں بلکہ عارفہ نے دیا ہوگا، کیونکہ اس کا وہاں اپنا مقصد پورا جو ہوچکا تھا۔ لیکن بابا! عارفہ کی خود غرضی اپنی جگہ ۔۔ مجھے کم از کم آپ سے ایسی توقع نہ تھی۔''

میری بات پر وہ فوراً تڑپ کر بولے۔ ''نہیں بیٹا! تم غلط سمجھ رہے ہو۔ عارفہ بیٹی تو۔۔۔''

''رہنے دیں بابا!'' میں نے زہریلی تلخی سے ان کی بات درمیان میں کاٹی۔ ''آپ خود بھی اپنی بہو سے اور اس کی پست ذہنیت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ پہلے اس نے آپ کے اکلوتے بیٹے کو مٹھی میں کیا اور آپ کو بوڑھا مریض بنا کر اطفال گھر کے دارالضعیف میں پھنکوا دیا، اور وہاں آپ سیٹھ منظور وڑائچ سے سرمد بابا بنا دیے گئے اور سارا کچھ بیٹے نے آپ سے لے کر اپنے قبضے میں کرلیا، مگر خدا کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آئی اور آپ نے دیکھا پھر کیا ہوا، آپ کے بیٹے محمود کا ایک ناگہانی حادثے میں انتقال ہوگیا اور آپ کی اسی بہو کو دوبارہ آپ کی ضرورت پڑگئی، اور وہ آپ کو چکنی چپڑی باتوں سے بہلا پھسلا کر اطفال گھر سے لے گئی۔

''میں حالانکہ اس وقت ایک معصوم بچہ ہی تھا، مگر حالات کی تلخی اور استادی نے مجھے وقت سے پہلے اس خود غرض زمانے کا چلن اچھی طرح سمجھا دیا تھا عارفہ آپ کو اپنی ذاتی غرض کے لیے اپنے ساتھ لے گئی اور آپ یہی سمجھتے رہے کہ آپ کی بہو کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے اور آپ ایک بار پھر خود کو سیٹھ منظور سمجھنے لگے، مگر میں تو اسی دن سمجھ گیا تھا جب وہ سیٹھ نوید احمد سانچے والا آپ سے ملنے آیا تھا، میں تو یہی سمجھتا آرہا تھا کہ آپ آج بھی اس اونچی اور عالیشان کوٹھی کے مالک اور اپنے وسیع کاروبار کے کرتا دھرتا سرمد بابا نہیں، بلکہ سیٹھ منظور وڑائچ ہیں۔ مگر یہ میری بھول تھی۔ آپ آج بھی سرمد بابا ہیں اور مجھے تو اب یہ ڈر ہے کہ آپ ایک بار پھر یہاں سے نکال دیے نہ جائیں، کیونکہ اب عارفہ بالکل بھلی چنگی ہوگئی ہے۔ وہ اب بھی جوان ہے، خوب صورت

ہے، ایک مرد کے سہارے کی اسے پھر ضرورت پڑ سکتی ہے بس۔۔ اب فرق یہ ہوگا کہ پہلے آپ کو اپنے بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر گھر سے نکالا تھا، اب عارفہ کا شوہر آپ کو۔"

"شہزاد احمد خان! اپنی زبان کو لگام دے دے۔"

سرمد بابا ایک دم چیخ پڑے۔ وہ غصے سے سرخ ہو گئے تھے، میں نے بھی تشنیع جاری رکھتے ہوئے زہریلے طنز سے کہا۔

"کیوں بابا جی! اب آپ کی دکھتی رگ پر ہاتھ پڑا تو چلا اٹھے۔ میرے دل سے پوچھو بابا جی!" میں بھی طیش میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور چیخ کر ایک مُکا اپنے سینے پر عین دل کے مقام پر ٹھونکتے ہوئے بولا۔

"یہاں کیا بیت رہی ہے۔ عارفہ آپ کی اپنی تھی ناں۔ مرحوم بیٹے کی بیوہ اور آپ کے پوتے پوتی کی ماں۔ آپ کی نسل کی تربیت اور پرداخت کرنے والی، اسے پروان چڑھانے والی۔ اس لیے آپ نے صرف اسی کے لیے سوچا، جبکہ عابدہ آپ کی بھلا کیا لگتی تھی؟ اس بے چاری کو تو آپ لوگوں نے ایک ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے وہیں پھینک دیا۔ مگر نہیں بابا جی! میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ بتا دینا اس کو، اپنی بہو کو، میرا نام بھی شہزاد احمد خان ہے، زمانے کو بھگتا ہوا ہوں میں، ایک دنیا کو میں نے ننگی کا ناچ نچا رکھا ہے۔ صرف کل تک کی مہلت ہے آپ دونوں کے پاس۔ عابدہ کے سلسلے میں آپ اور عارفہ کو امریکا کا دوبارہ سفر کرنا پڑے تو کرنا ہوگا۔ اور میری عابدہ کو یہاں لانا ہوگا۔"

میرا رُواں رُواں بپھرا ہوا تھا۔ ایسے میں اول خیر بھی میرے سامنے آنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

میں نے ان لوگوں کو اسی وقت یہاں سے کوچ کرنے کا حکم دیا اور ماں جی کو بھی ساتھ لینے کا کہا۔ سرمد بابا یک دم ٹھنڈے پڑ گئے۔ مجھے "پاور" والوں کی طرف سے کوارٹر ملا ہوا تھا، جس کے بارے میں مجھے رینجرز ٹورس کے میجر باجوہ بتا چکے تھے، اور میں وہیں جانا چاہتا تھا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ بعض تلخ حقیقتوں کو انہوں نے بھی جانتے سمجھتے ہوئے قبول کر رکھا تھا۔

ابھی تک سرمد بابا کو ماں جی کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔

"تم کہیں نہیں جا رہے ہو، شہزی!" معاً سرمد بابا کی آواز ابھری۔ اور وہ میرا راستہ روک کے آن کھڑے ہوئے۔ وہ بڑے غور سے میرے چہرے کو تکے جا رہے تھے اور میں بھی ان کی آنکھوں میں گھورر ہا تھا۔

"مجھے پتا ہے شہزی بیٹا کہ تم نے جن حالات کی گود میں پرورش پائی ہے ایک اچھے بھلے سیدھے اور شریف انسان کو کیا سے کیا بنا ڈالتے ہیں، تمہیں یاد تو ہوگا کہ جب پہلی بار اطفال گھر میں تمہارا اور میرا سامنا ہوا تھا تو تمہیں دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ تم ایک غیر معمولی طور پر ذہین اور ایک حیرت انگیز قوتِ ارادی کے مالک ہو۔ اور اطفال گھر میں رہنے اور پرورش پانے والے سب بچوں سے بالکل مختلف۔ تم جتنے مزاج کے تیز ہو اتنے ہی محبت کرنے والے مخلص اور سچے انسان بھی ہو، یہ تمہاری شخصیت کا ایک خاصہ ہے۔

"میں آج بھی اپنی اس بات پر قائم ہوں کہ اپنے بیٹے۔۔۔ کی طرح تمہیں سمجھنے لگا ہوں اور اس حوالے سے بھلا میں عابدہ بیٹی کو بھی اپنی بیٹی، بلکہ اپنی ہونے والی بہو کیسے نہیں سمجھوں گا۔ لیکن بیٹے! تم نے بھی شاید ٹھیک ہی کہا ہے۔ میں ابھی تک سرمد بابا ہوں، سیٹھ منظور وڑائچ نہیں۔ مجھ سے شاید واقعی تمہارے اور عابدہ کے سلسلے میں کہیں کوئی غلطی ضرور ہو گئی ہے۔

"اس وقت مجھے جو مناسب لگا وہی میں نے کیا۔ لیکن بیٹا! مجھ پر بھروسا کرو اور تھوڑا صبر کرو۔ میں یہاں پاکستان صرف عارفہ بیٹی کو چھوڑنے آیا ہوں۔ ایک دو روز بعد میں دوبارہ امریکا جاؤں گا۔ اور عابدہ کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرنے کی کوشش کروں گا۔ کیا تم اس بڈھے کو معاف نہیں کر سکتے؟ مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ شہزی بیٹا! میں تمہیں واقعی اپنا بیٹا ہی سمجھتا ہوں اور اپنا بازو بھی۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے بیٹا! مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے جیسے ایک بار پھر میرے ساتھ وہی پرانی کہانی دہرائی جانے والی ہے۔ لیکن مجھے اس کی نہ پہلے پروا تھی نہ اب ہے پروا ہے تو بس اپنے پوتے پوتی کی۔ ایک ماں کی طرح مجھے ان معصوموں کی فکر رہتی ہے، شاید اس تلخ حقیقت نے میری بھی آنکھیں کھول دی ہیں کہ ایک جوان اور بیوہ عورت کسی کے بھی بہکائے میں آسکتی ہے، شاید تم میری باتیں سمجھ رہے ہو تو خدا کے لیے بیٹا! مجھے معاف کر دو اور میرا ساتھ نہ چھوڑو۔"

وہ اتنا کہنے کے بعد رو پڑے۔ مجھے ان پر بے اختیار ترس آنے لگا۔ میرے اندر ابال سرد پڑنے لگا۔

دیکھا جائے تو اس میں سرمد بابا کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ یا اتنا نہیں تھا جتنا کہ میں نے سمجھ لیا تھا، البتہ عارفہ کے حوالے سے میرے اندر ایک کھٹک پڑ چکی تھی۔ وہ کوئی نیا گل کھلانے کے چکروں میں نظر آ رہی تھی اور اس کے لیے وہ چاہتی بھی تھی کہ میں یہاں نہ رہوں۔ مجھے اب یہاں بھی ایک سازش کی بو آنے لگی تھی۔ جس کا تعلق عارفہ سے ہی تھا۔

میں نے بھی سرمد بزبا سے اپنے سخت لب و لہجے کی معافی مانگ لی اور انہیں بتا دیا کہ آپ کا میرا ساتھ ایک منہ بولے بیٹے جیسا ہی رہے گا۔ لیکن میرا یہاں رہنا اب بنتا نہیں ہے۔ پھر میں نے انہیں اپنی ماں جی کے بارے میں بھی مختصر بتا دیا۔ وہ حیرت آمیز خوشی کا اظہار کیے بنا نہیں رہ سکے تھے۔

صبح تک گفتگو ہوتی رہی۔ عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں بھی سوچ و بچار ہوتی رہی۔ طے پایا گیا کہ ہمیں یہاں بھی کسی بڑے اور قابل وکیل کو ہائر کر لینا چاہیے نیز میں نے میجر باجوہ سے بھی اس سلسلے میں صلح و مشورہ کرنے کا سوچ رکھا تھا۔

القصہ کوتاہ میں اپنی مختصر ٹیم، اپنے ضروری ساز و سامان کے ساتھ مال سمیت اپنے کوارٹر آ گیا۔ اور میجر صاحب کو بھی اس کی اطلاع دے دی۔ وہ میرے اس فیصلے پر بے حد خوش ہوئے تھے۔

کہنے کو تو یہ کوارٹر ہی تھا مگر کسی کشادہ مکان سے کم نہ تھا۔ شکیلہ اور اول خیر خوش تھے، ماں بھی آرام سے تھیں، جبکہ مجھے بھی ذرا تسلی ہوگئی تھی کہ زندگی کسی ٹھکانے تو لگی تھی۔ اور اب میں آرام سے اپنے مقصد میں مصروف رہ سکتا تھا۔ یہاں سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ سیکیورٹی کا کوئی بڑا ایشو نہ تھا۔ ہمارے استعمال کے لیے ایک ہزار سی سی کی گاڑی بھی دے دی گئی تھی۔

ہم نے کوارٹر میں آرام کیا، کیونکہ میری وجہ سے شکیلہ اور اول خیر بھی نہیں سوئے تھے، وہ بھی رات والے ناخوشگوار واقعے کے باعث بے آرام تھے۔ تازہ دم ہونے کے بعد میں نے ہیڈ کوارٹر جا کر میجر باجوہ صاحب سے ملنے کا قصد کیا اور جانے سے پہلے انہیں فون کیا تو انہوں نے کہا کہ وہ خود ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے یہاں پہنچ رہے تھے۔

شکیلہ نے کچن سنبھال لیا تھا۔ اول خیر چھوٹے موٹے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹا لیا کرتا تھا۔ دونوں بہت پہلے سے ہی کافی گھل مل گئے تھے۔

میجر باجوہ کو ہم نے لنچ پر ہی بلا لیا تھا کیونکہ اب کھانے کا وقت بھی ہو چلا تھا۔ ان کی آمد ہوئی تو وہ مجھے یہاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پھر کھانے کے بعد بہت سی اہم باتوں پر تبادلہ خیال ہوتا رہا، عابدہ کی سی آئی اے اور ایف بی آئی کی حوالگی سے متعلق گفتگو ہوئی۔ دیگر موضوعات پر بھی بات چیت ہوتی رہی۔

وہ چلے گئے اور جاتے ہوئے مجھ سے کہہ گئے کہ وہ کچھ مزید ضروری ''اسٹف'' یہاں بھیجنے والے تھے، جن میں لیپ ٹاپ، کمپیوٹر، اور اسی سے متعلق چند دیگر اشیا شامل تھیں۔ مجھے خود بھی ان چیزوں کی ضرورت پڑنے والی تھی۔ ضرورت کی حد تک مجھے یہ ساری چیزیں استعمال کرنا آتی تھیں۔

میجر باجوہ کے جانے کے بعد ہم تینوں بھی مختلف امور پر گفتگو کرنے لگے۔

''مجھے تو عابدہ کی گرفتاری میں اپنے ہی دشمنوں کی کارستانی نظر آتی ہے۔'' شکیلہ نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''یہ بہت اچھا خیال آیا ہے شکیلہ کے ذہن میں۔ کیونکہ وزیر جان اور چوہدری ممتاز خان میرے سامنے بارہا اپنی ان دھمکیوں کا اعادہ کر چکے ہیں کہ وہ امریکا میں موجود عابدہ کے لیے مشکل کھڑی کر سکتے ہیں۔ ایسے میں شکیلہ کے ذہن نے صحیح خطوط پر سوچا ہے۔''

اول خیر نے کہا۔ ''بے شک وہ ایسا کر سکتے ہیں، کیونکہ دونوں ہی ''اسپیکٹرم'' جیسی ایک عالمی مجرمانہ سرگرمی کی حامل تنظیم کے بڑے عہدے دار نما ایجنٹ ہیں۔ لیکن باسکل ہولارڈ ایک الگ شخصیت ہے۔ وہ امریکا کی ذمے دار خفیہ ایجنسی کا کوئی افسر ہے۔ اور لامحالہ اپنی ڈیوٹی نبھا رہا ہے اور بس۔''

''میں تمہاری اس بات سے بالکل بھی متفق نہیں ہوں میرے یار!'' میں نے اول خیر کی طرف دیکھ کر نہایت سنجیدگی سے کہا۔

''تم امریکی خفیہ ایجنسی کو کیا دودھ کا دھلا سمجھ رہے ہو؟ جس کی کارستانیاں پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ اور اپنے مفادات کی خاطر یہ رائج بین الاقوامی قوانین کی بھی بڑی ڈھٹائی سے دھجیاں بکھیرتی رہتی ہیں، یہی نہیں اپنے حریف ممالک کی جاسوسی بھی کرتے ہوئے اسے کئی بار طشت ازبام کیا جاتا رہا ہے۔ اور اپنے کیے پر صاف مکرتی بھی رہی ہیں۔ ان میں سی آئی اے پیش پیش اور بدنام زمانہ ہے۔''

''لیکن اس سے یہ ظاہر کب ہوتا ہے کہ وہ ایک مجرم تنظیموں سے بھی لنک رکھتی ہے؟'' اول خیر نے سنجیدگی سے کہا۔

''بالکل انوالو رہی ہے سی آئی اے۔ میں نے کہا تاں کہ اپنے وسیع تر مفادات کے لیے یہ ہر حد سے گزر جاتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر یہ عالمی سطح کے گینگسٹرز سے بھی خفیہ رابطہ کرنے سے نہیں چوکتے۔ بلکہ ان کے ادارے میں خود

بڑے بڑے نامی گرامی گینگسٹرز موجود ہیں۔ اور شاید تم بھول رہے ہو اوّل خیر! عابدہ مجھے فون پر اکثر باسکل ہولارڈ کے بارے میں بتایا کرتی تھی کہ نائن الیون کے واقعے کے بعد امریکا میں مقیم سمیت آنے جانے والوں پر امریکی خفیہ ایجنسیاں کڑی نظر رکھتی تھی اور جن پر انہیں ذرا بھی شبہ ہوتا، وہ انہیں تفتیش کے لیے لے جاتی۔ پاکستانیوں پر تو زیادہ کڑی نگاہ رکھتے تھے اور جب تک عابدہ اور عارفہ اسپتال میں مقیم رہیں، ایف بی آئی سے لے کر سی آئی اے اور جانے کتنے خفیہ اداروں کے لوگ وہاں ان کے پاس مختلف انداز میں پوچھ گچھ کے لیے آتے رہتے تھے۔ انہی میں ایک باسکل ہولارڈ بھی شامل تھا۔

میں عابدہ بےچاری کو یہ تسلی دے دیا کرتا تھا کہ یہ وہاں کے تازہ ترین ناخوشگوار حالات کے پیش نگاہ ہو رہا ہے، اور یہ معمول کی کارروائی ہے، اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، تو جواب میں عابدہ مجھے بالخصوص باسکل ہولارڈ کے بارے میں بتاتی تھی کہ وہ اسے زیادہ نظروں میں لیے رہتا تھا اور اسی سے زیادہ پوچھ گچھ کرتا تھا۔ بےچین تو میں بھی تھا لیکن بہرحال...' میں رکا اور شکیلہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

''تم نے ایک اچھے نقطے کی طرف توجہ دلائی، اب تم ہمارے لیے ایک اچھی سی چائے بنا کر لے آؤ، میں تب تک آنسہ خالدہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں اٹھا اور دوسرے کمرے میں آ گیا۔ اوّل خیر بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

میں اپنی اسکائپ اور ای میل آئی ڈی بنا چکا تھا، جو میں نے آنسہ خالدہ کو اس کے سیل فون پر ایس ایم ایس کر دی تھی۔ فوراً ہی اس کا ری پلائی آ گیا اور اس کے بعد میں نے اس کے سیل فون پر رابطہ کیا۔

مختصر رسمی کلمات کے بعد میں نے اس سے عابدہ کے متعلق پوچھا، ابھی کوئی تازہ خبر نہ تھی، وہی سب کچھ تھا جو وہ مجھے بتا چکی تھی، تاہم میں نے اسے سرمد بابا کے بارے میں بتایا کہ وہ آج یا کل کی فلائٹ سے امریکا پہنچنے والے تھے، لہٰذا میں نے آنسہ خالدہ سے عاجزانہ درخواست کی کہ اس سے جو ہو سکے وہ سرمد بابا کی ممکنہ مدد کرے۔ جس کا آنسہ خالدہ نے پورے تہ دل سے وعدہ کیا۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر کسی طرح ممکن ہو سکے تو وہ باسکل ہولارڈ کے بارے میں مجھے تفصیلی بائیو ڈیٹا فراہم کر دے۔ میری اس بات پر وہ قدرے چونک کر بولی۔

''باسکل ہولارڈ کے سلسلے میں تمہاری اس دلچسپی کی وجہ جان سکتی ہوں مسٹر شہزاد؟''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اسے میں اپنے حالات کی لمبی چوڑی تفاصیل کیا بتاتا، لہٰذا سرِدست بات بناتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے ابھی بہت سی باتیں مجھے مکمل صراحت ... سے آپ کے ساتھ شیئر کرنا ہوں گی۔ تب ہی میں آپ کے اس سوال کا جواب دے پاؤں گا، آپ پلیز، میرا یہ کام کر دیں۔''

''نو پرابلم میں سمجھ رہی ہوں تمہاری بات، میں آج یا کل تمہیں اس کا جواب دے دوں گی، ٹیک کیئر بائی۔''

رابطہ منقطع ہونے کے بعد میں کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ اس دوران شکیلہ چائے لے آئی تھی۔ چائے پینے کے بعد میرا ارادہ سرمد بابا سے ملنے کا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں اور اوّل خیر سرمد بابا کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔

ابھی شام ہونے میں تھوڑی دیر باقی تھی، ہم سرمد بابا کی کوٹھی کے گیٹ سے تھوڑی ہی دور تھے کہ میں چونک پڑا۔

ایک کار کھلے گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔

چونکنے کی وجہ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود سیٹھ نوید احمد سانچے والا تھا۔ وہ یقیناً عارفہ سے ہی ملنے، اس کی مزاج پرسی کے لیے آیا ہوگا۔ میں نے کچھ سوچ کر کار وہیں روک دی اور اوّل خیر سے بولا۔

''تم اِدھر ہی کار میں رکو، میں ذرا ایک ایڈونچر کر کے آتا ہوں۔''

''او خیر'' وہ مسکرایا۔ اور میں کار کا دروازہ کھول کے نیچے اتر گیا... تب تک وہ کار اندر جا کر غائب ہو چکی تھی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہی میں بھی گیٹ پر پہنچ گیا۔

گارڈ مجھے جانتا تھا، میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ وہ قدرے حیرت سے بولا۔ ''خیریت ہے صاحب؟ آپ کی کار؟''

''ہاں یار! وہ ابھی آتے ہوئے راستے میں خراب ہو گئی تھی، کام زیادہ تھا، ادھر مکینک کے پاس ہی چھوڑ آیا ہوں۔ سیٹھ صاحب تو اندر موجود ہیں ناں؟''

''جی ہاں سر! تشریف لائیں۔'' وہ خوش اخلاقی سے بولا تو میں اندر داخل ہو گیا۔

اب میری کوشش تھی کہ اور کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ گارڈ میری طرف سے اپنی توجہ ہٹا چکا تھا۔ میں نے کار پورٹیکو میں ایک نگاہ ڈالی۔ وہاں حسبِ توقع سیٹھ نوید سانچے والا کی کار کھڑی تھی۔ میں لپک کر ایک بالکونی کے

ذریعے اندر داخل ہوگیا۔

میں اس کوٹھی کے چپے چپے سے واقف تھا۔ اسی لیے میں نے جو سوچ رکھا تھا اس کے ٹھیک عین مطابق میں ایک ایسے کمرے میں رازداری کے ساتھ جا پہنچا تھا، جس سے ملحقہ وہ نشست گاہ تھی، جدھر میرے محتاط اندازے کے... مطابق سیٹھ نوید عارفہ یا سرمد بابا کے ساتھ ''بیٹھک'' جمائے ہوئے ہوگا۔

میں نے ایک کھڑکی کا پردہ ذرا سرکا کے اندر دیکھا۔ اندر صرف عارفہ اور سیٹھ نوید آمنے سامنے کے صوفوں پر براجمان تھے۔ عارفہ نے شاید اب وہیل چیئر چھوڑ دی تھی۔ یوں بھی اس کی طبیعت اب کافی سے زیادہ بہتر تھی۔ تاہم خالی وہیل چیئر ایک طرف پڑی نظر آرہی تھی۔

میں نے پردے کے پیچھے سے بہ غور ان دونوں کا جائزہ لیا۔ سیٹھ نوید نے اپنی تیاری میں خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ اس کے دراز قامت... جسم پر بہترین تراش کا بیش قیمت سفاری سوٹ تھا۔ عارفہ نے بھی اپنی سج دھج اور ڈریسنگ پر خاصی توجہ دے رکھی تھی۔ وہ دونوں آپس میں مسکرا مسکرا کر باتیں کررہے تھے۔ ان کے درمیان میں اشیائے... خورونوش کی نفیس ٹرالی نظر آرہی تھی۔

میری ابھی چند دن پہلے ہی سیٹھ نوید احمد سانچے والا سے ایک خاموش سی ملاقات ہو چکی تھی۔ میں اسے... ''خاموش'' ملاقات ہی کہوں گا، کیونکہ اس روز صرف ان کے اور سرمد بابا کے درمیان ہی گفتگو ہوتی رہی تھی، اور مجھے یاد تھا، انہوں نے سیٹھ نوید کا بڑی سرد مہری سے استقبال کیا تھا، وہ اسے سخت ناپسند کرتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ نوید، عارفہ سے شادی کا خواہشمند تھا، جبکہ سرمد بابا، اپنی بہو کو ابھی تک اپنے بیٹے کی بیوہ ہی سمجھے ہوئے تھے، اور یہی وہ دن تھا جب مجھے اس تلخ حقیقت کا اندازہ بھی ہوا تھا کہ سرمد بابا، ابھی تک سرمد بابا ہی تھے، سیٹھ منظور نہیں۔

ان دونوں کے درمیان کچھ دیر رسمی گفتگو ہوتی رہی۔ سیٹھ نوید بار بار عارفہ کی مکمل صحت یابی پر اسے ڈھیروں مبارک باد سے نواز رہا تھا۔ اور عارفہ مسکرا مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیے جارہی تھی۔

ان کے درمیان ابھی کاروباری نوعیت کی گفتگو شروع نہیں ہوئی تھی، جس کی میں توقع کیے ہوئے تھا۔ وہ ابھی اسے امریکا میں ہونے والی اپنے ساتھ اس ٹریجڈی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ایک موقع پر سیٹھ نوید نے اپنی چندی چندی مکار آنکھوں سے عارفہ کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت کمینے پن سے کہا۔

''ویسے میڈم جی! آپ کی ذہنی فراست کی داد دینا پڑے گی، جس طرح آپ نے اس خطرناک صورتِ حال کو ہینڈل کیا تھا، ورنہ تو وہ بڈھا اپنے ساتھ آپ کو بھی لے ڈوبنے لگا تھا۔'' اس کی اس بات پر یک لخت میرے کان کھڑے ہوگئے۔

عارفہ بھی بڑے کمینے انداز میں مسکرا کر ذرا نیچی آواز میں بولی۔ ''آہستہ بولو سیٹھ صاحب! اندر وہ بڈھا موجود ہے، کہیں سن نہ لے۔''

''ویسے میڈم! آپ کے ذہن نے کیسے اچانک یہ ترکیب نکالی تھی؟''

''بس! حالات کے مطابق میرے اندر اچانک ہی ایک خیال در آیا تھا اور میں نے سارا ملبا عابدہ پر الٹ دیا تھا۔'' وہ بولی تو میرا دل جیسے سلگتی ہوئی کنپٹیوں پر دھڑ کنے لگا۔

''امریکی اہلکاروں کی تفتیش کے دوران ہی میں نے بھانپ لیا تھا کہ ایک امریکی افسر عابدہ کو سب سے زیادہ شبہے کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا، تب میں نے بھی انہیں اشاروں کنایوں میں یہی بتایا کہ عابدہ سے ہمارا کوئی بھی فیملی تعلق نہیں ہے، اور مزید کہ اس نے ہمارے ساتھ آنے پر خود ہی اصرار کیا تھا۔ مجبوراً ہمیں اسے ہیلپر کے طور پر ساتھ لانا پڑا تھا۔ پھر مجھ سے باسکل ہولارڈ نامی اسی افسر نے علیحدگی میں بھی سوالات کیے، جو عابدہ پر شبہ کیے ہوئے تھا، تو میں نے اسے عابدہ کے متعلق مزید جھوٹ سچ بیان دے ڈالا کھل کر۔ اور یہ بھی بتایا کہ اس کا ایک ساتھی بھی وہاں پاکستان میں ہے، شہزاد احمد۔ وہ ایک بڑا کرمنل ہے اور اس لڑکی (عابدہ) سے اکثر ملنے آتا رہتا تھا۔ مجھ سے متعلق تو شواہد مضبوط تھے کہ میں اپنے علاج کے سلسلے میں آئی تھی اور منظور وڑائچ میرے فادر ان لا، اور میرے گارجین تھے۔ بس ان سے ہی میرا تعلق ہے۔''

''گریٹ! آپ تو واقعی جینئس ہیں میڈم جی۔'' سیٹھ نوید اس کی مکروہ ذہانت کی تعریف کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ اس بڈھے سے بھی وہیں جان چھڑا لیتیں جو ہماری راہ کا سب سے بڑا کانٹا بنا ہوا ہے اب تک۔''

''نہیں، اس طرح میرا ابھی لوٹنا مشکل ہوجاتا۔ ویسے اس بڈھے کی تم فکر نہ کرو، جب تک میں بیمار تھی، میں نے ایک ناگن کی طرح اپنی کیچلی بدل رکھی تھی، اب میں پھر سے

بھلی چنگی ہوگئی ہوں تو کیا ڈر ہے۔''
''وہ تو ٹھیک ہے، مگر میں اس بڈھے سے ایک ملاقات کر چکا ہوں۔ وہ اب بھی آپ کو اپنے مرحوم بیٹے محمود کی بیوہ سمجھے ہوئے ہے۔ اور لگتا ہے آپ کو ایسے ہی بوڑھی کر دے گا، اپنی طرح۔''
''اونہہ، مائی فٹ! یہ کون ہوتا ہے مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ ستی کر دینے والا۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔ میں نے دیکھا ہی کیا ہے۔''
''بالکل میڈم جی! آپ تو ابھی تک جوان اور حسین ہیں۔ ایسے ہی تو نہیں ہم آپ کے دیوانے ہیں۔ اور آپ کی یادوں میں آہیں بھرتے رہتے ہیں۔'' سیٹھ نوید سانچے والا نے اپنے سینے پر ایک ہاتھ رکھ کر نہایت بھونڈے عاشق کے سے انداز میں کہا اور عارفہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
اس کے بعد مختصر وقفے میں کچھ کھانے پینے کا دور چلا۔
میں پردے کے پیچھے چھپا یہ سب سن رہا تھا اور آتش فشاں کے مانند میرا پورا وجود دہک رہا تھا۔ دماغ میں چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں، اور سانسیں، میرے اندر کے ابال کی طرح چڑھنے لگی تھیں۔ جی چاہتا تھا اسی وقت اندر داخل ہو جاؤں اور سب سے پہلے اس حرافہ، عارفہ کا گلا دبوچ ڈالوں۔ اس نے عابدہ کے ساتھ بے حسی اور خود غرضی کے علاوہ وہ اس بے چاری معصوم کے ساتھ بڑا ظلم بھی کیا تھا۔
بہت مشکل سے میں نے اپنے اندر کے اشتعال پر قابو پائے رکھا تھا، کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جبکہ ان کے آئندہ کے زہریلے عزائم جاننا میرے لیے زیادہ ضروری تھا۔ بہت ضروری۔
''چھوڑیں، یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی، اب کچھ کاروبار کی بھی باتیں ہو جائیں، تم کچھ اڑیسہ کمپنی کے بارے میں بتا رہے تھے۔ کیا بنا اس کا؟''
عارفہ نے گفتگو کا رخ موڑنا چاہا، مگر شاید سیٹھ نوید پر اس وقت ریشہ خطمی کا دورہ پڑا ہوا تھا، عشق کا بھوت اس پر سوار ہو گیا تھا یا پھر وہ ایک دولت مند بیوہ کو ''ہاتھ'' دکھانا چاہ رہا تھا کہ اس کی طرف مخموری سی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔
''چھوڑیں جی کاروبار کو۔ میرے ہوتے ہوئے بھلا آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ میں ہوں ناں میڈم جی! آپ کی یہ ساری دردسری لینے کے لیے۔ آج خوشی کا موقع ہے، آپ کو میں خوش اور صحت مند دیکھ رہا ہوں۔ اور آپ کی سنگت میں یہ حسین و لطیف لمحات... بس جی شاعری کرنے کو جی چاہتا ہے۔''
وہ عارفہ پر بری طرح فریفتہ ہوتا دکھائی دے رہا تھا اور عارفہ جیسے اس کی لچھے دار باتوں سے مسرور ہوئی جا رہی تھی۔
یہ دونوں خبیث کسی اور کی خوشیوں کو تاراج کر کے اس کے مقبرے پر خوشیاں منا رہے تھے اور میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا، میں نے بھی اسی وقت یہ عہد کر لیا تھا کہ خوش، میں بھی انہیں نہیں رہنے دوں گا۔
کسی طرح گفتگو کاروباری نہج پر آ ہی گئی تھی....
سیٹھ نوید سانچے والا اب عارفہ کو اڑیسہ کمپنی اور اس کے شیئرز سے متعلق آگاہ کر رہا تھا۔ نیز اس نے اس سلسلے میں تھوڑے دن پہلے ہی، سرمد بابا سے ہونے والی تلخ گفتگو کے بارے میں بھی اسے بتایا۔ تو میں نے دیکھا، عارفہ کے چہرے پہ پُر سوچ تاثرات پھیل گئے۔
''تمہارا کیا مشورہ ہے نوید! اگر ہم اڑیسہ کمپنی کے شیئرز سرے سے فروخت ہی نہ کریں بلکہ اس امریکی سوداگر... کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا؟''
''لولووش۔''
''ہاں، لولووش! اگر ہم اسے بھاری قیمت دے کر وہ پچاس فیصد شیئرز خرید لیں تو کیسا رہے گا؟''
''بہت اچھا رہے گا۔ یہی تو میں بھی چاہتا ہوں میڈم جی!'' سیٹھ نوید سانچے والا نے فوراً اس کی طرف دیکھ کر کہا اور مجھے اس کی بات پر ایک حیرت کا جھٹکا لگا۔ کیونکہ ابھی تھوڑے دن پہلے ہی اس کے اور سرمد بابا کے درمیان ہونے والی گفتگو میں خود سیٹھ نوید اس بات پر بضد تھا اور سرمد بابا پر زور دے رہا تھا کہ شیئرز فروخت کر دیے جائیں۔ مگر اب وہ عارفہ کے سامنے اس کے بالکل الٹ کہہ رہا تھا۔ آخر یہ کیا معاملہ تھا؟ کیا اس وقت سیٹھ نوید کے مفادات اور تھے؟ یا پھر کوئی اور معاملہ تھا یہ؟
''نوید صاحب! اگر یہ کام ہو جاتا ہے تو سمجھو میں اس ملک کی ہی نہیں بلکہ ایشیا کی امیر ترین خاتون کہلاؤں گی۔'' عارفہ نے ایک خواب کی سی کیفیت میں کہا۔ اس کا حسین چہرہ اس وقت لالچ و طمع کے باعث عجیب سا تاثر پیش کر رہا تھا۔
''ایکسکیوزمی میڈم جی! کیا آپ مجھے صرف نوید کہنا پسند کریں گی؟'' سیٹھ نوید شوخ سے لہجے میں بولا تو عارفہ بے اختیار ہنس پڑی بولی۔
''تو پھر تم بھی مجھے میڈم جی نہ کہا کرو، صرف عارفہ کافی ہے۔''

''نہیں، مجھے آپ کو میڈم جی کہنا اچھا لگتا ہے، اس میں مجھے ایک محبت سی محسوس ہوتی ہے''۔ وہ معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

مجھے اندازہ ہونے لگا تھا کہ دونوں کے درمیان خاصی سے زیادہ بے تکلفی تھی۔ تاہم وہ فوراً ہی سنجیدگی سے بولا۔

''میڈم جی! یہ اسی صورت میں ہی ممکن ہو سکے گا کہ آپ اس بڈھے سے شیئرز اور کاغذات کی فائل اپنے نام کروالیں۔ نہ صرف یہ بلکہ شیئرز ہولڈرا کاؤنٹ میں بھی اپنا نام درج کروالیں۔''

''یہ میرے لیے کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔'' عارفہ نے غرور سے کہا تو وہ بولا۔

''یہ بڈھا اتنا تر نوالہ نہیں ہے میڈم جی! جتنا آپ اسے سمجھ رہی ہو، میں اس سلسلے میں اس سے بات کر چکا ہوں۔ مجھے تو حیرت ہے، آپ نے اپنے مرحوم شوہر کا سب کچھ جب اپنے نام کروالیا تھا تو یہ اتنا اہم کام کیسے بھول گئیں؟ بلکہ بھولنا تو کیا، آپ نے تو اسے کوئی اہمیت ہی نہ دی، اَب دیکھ لو۔ آپ کی ساری امارت کا دارومدار ہی انہی شیئرز پر ہے۔''

''مجھے واقعی اس کی اہمیت کا اندازہ نہ تھا اور نہ ہی میں نے کبھی اس میں دلچسپی لی تھی، نہ محمود نے بھی کبھی اس کا تذکرہ مجھ سے کرنا ضروری سمجھا تھا۔ اب تم نے مجھے یہ نئی کہانی سنا کر ایک عجیب مسرت والی پریشانی سے دوچار کر دیا ہے۔''

''ہاں، شیئرز کے کاروبار میں یہی کچھ ہوتا تو رہتا ہے، بالخصوص ایسے شیئرز میں جب کمپنی شدید مالی خسارے سے دوچار بھی ہو اور پھر ایک دم پو بارہ ہو جاتے ہیں۔ خیر اب زیادہ حیرانی اور پریشانی میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اس بڈھے سے وہ سب بھی ہتھیانے کی کوشش کرو۔ کیونکہ میرا اب دوبارہ یہاں آنا مناسب نہیں ہوگا، وہ بڈھا شک میں پڑ گیا تو پھر ہمارے لیے مشکلات پیدا کر دے گا، اسے تو میری صورت سے بھی نفرت ہے، جب سے میں نے تمہارے ایما پر اس سے رشتے کی بات کی تھی۔''

''ہاں! میں بھی یہی مناسب سمجھتی ہوں، ابھی میں خود بھی اس کی نظروں میں بری نہیں بننا چاہتی، وہ اب بھی مجھے ایک بہو اور اپنے مرحوم بیٹے کے روپ میں ہی دیکھ رہا ہے، اسی لیے کبھی اس نے مجھ سے جائداد یا کاروبار وغیرہ اپنے نام کروانے کی بات نہیں کی۔ کام نکلنے کے بعد میں اسے پھر دودھ کے بال کی طرح نکال باہر پھینکوں گی۔''

عارفہ کی بات پر میرا دماغ ایک بار پھر گرم ہونے لگا۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ وہ شریفاں تھی جو شاید کسی کام کے سلسلے میں کمرے کے اندر داخل ہوئی تھی۔ مگر میں اس کی آہٹ پاتے ہی قریب ہی دیوار پہ ایستادہ بڑے سے ڈیوائیڈر کے پیچھے ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ چلی گئی تو میں دوبارہ کھڑکی کی طرف آیا مگر بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کمرے میں اب کوئی نہیں تھا۔

میں اسی خاموشی سے دوبارہ کمرے سے باہر آ گیا اور دوسری طرف سے گھوم کر اندر داخل ہوا۔ پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ ادھر سے ہی واپس لوٹ جاؤں، لیکن یہ میں نے مناسب نہیں سمجھا کیونکہ گارڈ کو معلوم تھا کہ میں اندر آیا تھا، وہ کسی کو میرے بارے میں بتا سکتا تھا کہ میں اندر آیا تھا۔ اور میں کسی کو اپنے بارے میں کسی شک میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا، کم از کم عارفہ کو تو نہیں۔

اسی لیے میں نے اندر داخل ہو کر سرمد بابا سے ملاقات کی، میں ان سے مختصراً بات کر کے یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا۔ عارفہ نے بھی چار و ناچار ہمارے ساتھ نشست جمائی تھی۔ اس دوران اس نے اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ سرمد بابا کا ابھی اس طرح اور اتنی جلدی دوبارہ امریکا جانا مناسب نہ تھا اور ناممکن بھی۔ تاہم سرمد بابا کا جلد سے جلد امریکا جانے کا مصمم ارادہ تھا۔

سرمد بابا کا جانا ضروری تھا۔ تاہم میں نے سرمد بابا سے اپنے لیے بھی امریکا روانہ ہونے کے لیے کہا تو وہ بولے۔

''شہزی بیٹا! تمہارا امریکا جانا اول تو اتنا آسان نہیں ہے اور پھر ان حالات میں بالکل بھی نہیں ہو سکتا ہے امریکی تمہیں بھی گرفتار کر لیں۔ ابھی میں جا کر عابدہ کا دفاع کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور جب تک کوئی حتمی صورت نظر نہیں آتی میں وہیں رہوں گا۔''

میں نے سرمد بابا کو آنسہ خالدہ کے بارے میں بھی بتانے کا سوچا، مگر پھر عارفہ کی موجودگی میں اس کے بارے میں ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ عارفہ کی موجودگی میں، میں اپنے اندر کی کیفیات پر بڑی مشکل سے قابو پائے ہوئے تھا۔

''میرا تو خیال ہے ابھی آپ کا اتنی جلدی امریکا جانا ویسے بھی مناسب نہ ہوگا۔'' عارفہ نے زہر اگلا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہی تھی۔

''امریکی ابھی اتنی آسانی سے عابدہ کو نہیں چھوڑیں گے کہ آپ وہاں جائیں اور وہ عابدہ کا ہاتھ آپ کو تھما دیں۔ وہاں ہم نے عابدہ کے لیے ایک لائر کا بندوبست کر رکھا ہے... وہ یہ معاملہ دیکھ رہا ہے، جب وہ کہے گا، تب ہی آپ کا امریکا جانا بہتر ہوگا۔''

میں نے عارفہ کی طرف ایک ثانیے کے لیے بڑی خوفناک نظروں سے دیکھا تھا، اس قدر کہ ایک لمحے کو میرے چہرے کے خوفناک تاثرات محسوس کر کے اس کے چہرے پر بھی ذرا دیر کو ایک خوف کا تاثر ابھر آیا تھا۔

میرا جی تو چاہا کہ ابھی پھٹ پڑوں، اور اس کے اور اس خبیث سیٹھ نوید سانچے والا کے کریہہ منصوبے کو سرمد بابا کے سامنے آشکار کر دوں۔ مگر اس کا ابھی کوئی فائدہ نہ تھا۔

میں نے خود کو جلدی نارمل کر لیا اور اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔ ''لائر کو کیس سے زیادہ اپنی فیس سے دلچسپی ہوتی ہے۔ جبکہ اس کے ساتھ مستقل طور پر ہم میں سے کسی ایک کو وہاں موجود رہنا چاہیے۔ یہ ضروری ہے، پھر اپنا کوئی وہاں ہوگا تو عابدہ کو بھی ڈھارس بندھی رہے گی۔''

''تمہاری بات سے میں متفق ہوں بیٹا! اسی لیے یہ بحث کرنا ہی فضول ہے کہ ہم میں سے امریکا کسی کو جانا چاہیے یا نہیں۔'' سرمد بابا نے یہ کہہ کر عارفہ کا منہ ہی بند کر دیا۔

''میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں شہزی بیٹا کہ عابدہ کو لیے بغیر میں واپس پاکستان نہیں لوٹوں گا۔''

میں نے دزدیدہ نظروں سے عارفہ کی طرف دیکھا، وہ خاصی پریشان دکھنے لگی تھی، اور میں اس کی وجہ جانتا تھا۔

میں تھوڑی دیر بعد واپس آ گیا۔ میں سرمد بابا سے ایک اور ملاقات کرنا چاہتا تھا مگر تنہائی میں۔ جب عارفہ موجود نہ ہو۔

میں کوٹھی سے باہر آ گیا اور تیز تیز چلتا ہوا ذرا دور کھڑی اپنی کار کے قریب پہنچا اور پھر دروازہ کھول کر اس میں سوار ہو گیا۔ میرا چہرہ اس وقت جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔

''او خیرے۔'' اول خیر نے ایک بھانپتی ہوئی نگاہ میرے چہرے پہ ڈالی تھی اور یک دم کار آگے بڑھا دی۔

''لگتا ہے کوئی خاص بات ہوئی ہے آج۔ کوئی لڑائی شڑائی تو نہیں ہوئی اس زنانی سے کاکے؟'' اول خیر نے کار کی رفتار کو بڑھاتے ہوئے کہا۔ اسے میرے چہرے کے پُر غیظ تاثرات نے فکرمند کر دیا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر خود کو پُرسکون کیا اور اول خیر کو عارفہ اور سیٹھ نوید سانچے والا کی گفتگو کے بارے میں بتا دیا۔

''او خیر کاکے! یہ زنانی عارفہ تو واقعی ایک حرافہ ہے، اور احسان فراموش بھی۔''

''ہاں اول خیر! احسان فراموش بھی اور محسن کش بھی، یہ عورت نہیں ایک زہریلی ناگن ہے۔''

''زہریلی ناگن کا علاج اس کا سر کچلنے میں ہی ہے کاکے!'' اول خیر خرائٹ لہجے میں بولا۔ ''اس کمینی عورت نے عابدہ بہن کو امریکی انٹیلی جنس کے ہاتھوں پھنسایا ہے اور دوسری طرف یہاں وہ اس خبیث سیٹھ کے ساتھ خوش آئند خواب بن رہی ہے۔ کاکے! زنانیوں پر ہاتھ اٹھانا ایک مرد کی شان تو نہیں ہوتی، لیکن یہ عورت ایک ناگن ہے۔ جسے دودھ پلاؤ تو یہ اسی کو ڈستی ہے۔ اس کا بندوبست کرنا ضروری ہے۔''

یہ تلخ حقیقت جاننے کے بعد اول خیر کے دل میں بھی عارفہ کے خلاف نفرت کی آگ دو چند ہونے لگی تھی۔

میں نے کہا۔ ''ہاں، اول خیر! اب ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ پہلے ذرا عابدہ کا معاملہ واضح ہو جائے، ورنہ یہ حرافہ اس کا معاملہ خراب کر سکتی ہے۔ کیونکہ مجھے اس کے ساتھ اس سیٹھ نوید سانچے والا کی ساجھے داری کسی خطرناک ڈرامے کی ابتدا ہی معلوم ہوتی ہے۔''

''تیرا کیا مطلب ہے کاکے! کیا سیٹھ نوید کھانچے والا۔''

''سانچے والا۔'' میں نے تصحیح کی۔

''ہاں! وہی، کیا اس بدبخت کے تعلقات اسپیکٹرم کے سپریم چیف لولووش کے ساتھ بھی ہو سکتے ہیں؟''

''یہ ممکن ہے، ہو سکتا ہے یہ اس کا ایک کاروباری ٹاؤٹ ہو۔ لگتا ایسا ہی ہے کہ سیٹھ نوید سانچے والا لولووش کے ملکی و غیر ملکی کاروباری معاملات کے تحفظات کے لیے کام کرتا ہے۔'' میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ ''ہمیں اب سانچے والے پر بھی نگاہ رکھنا پڑے گی۔ میں اس کا حدود اربع جاننا چاہتا ہوں جو مجھے سرمد بابا ہی بتا سکتے ہیں۔''

تب اچانک میرے ذہن میں انکل جمال سے ملنے کا خیال آیا۔ وہی مجھے ایک مخلص اور ایمان دار آدمی نظر آتا تھا۔ اول خیر نے میرے اس خیال سے اتفاق کیا تھا۔

ہمارے گھر پہنچتے ہی امریکا سے آنسہ خالدہ کا فون آ گیا۔

''مسٹر شہزاد! میں نے باسکل ہولا رڈ سے متعلق کچھ مفصل اسٹف تمہیں ای میل کر دیا ہے۔ باسکل ہولارڈ سے متعلق یہ مواد عمومی نوعیت کا نہیں ہے۔ اس میں اس کے بارے میں اتنی زیادہ گہری تفاصیل نہیں ہیں، یہ مواد جو میں نے تمہیں بھیجا ہے، وہ میں نے اپنی ذاتی کاوشوں اور بعض خفیہ ذرائع سے حاصل کیا ہے، اس میں میرے لیے بھی بعض چونکا دینے والے انکشافات ہیں، خیر، پہلے تم انہیں غور سے دیکھ لو اور آج پاکستانی وقت کے مطابق مجھ سے اسکائپ پر ایک ٹیس ٹو فیس ملاقات بھی کر لو۔''

میں نے اسے اثبات میں جواب دے کر رابطہ منقطع کر دیا اور پھر جلدی سے اپنے کمرے میں آ کر کمپیوٹر پر بیٹھ گیا۔

اپنا ای میل چیک کیا تو وہاں آنسہ خالدہ کا برقی پیغام موجود پایا۔ میں نے اس کا بھیجا ہوا اسٹف نکالا اور اسے اوپن کر کے بہ غور دیکھنا شروع کر دیا۔

سب سے پہلے باسکل ہولارڈ کی تصویر میں نے دیکھی۔ وہ ایک چالیس، پینتالیس سالہ خاصا بھاری بھرکم شخص تھا۔ کاندھے چوڑے تھے اور قد کا درمیانہ تھا۔ چہرہ قدرے لمبوترا اور آنکھیں چھوٹی مگر اندر کو دھنسی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ایسی آنکھوں میں غضب کا کینہ بھرا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ رنگ گورا ہی تھا، بال سولجر کٹ تھے، یعنی بہت چھوٹے۔ صورت سے ہی وہ ایک خطرناک ٹاپ ایجنٹ دکھائی دیتا تھا۔ لیکن جب میں نے اس کی بایوڈیٹا پر ایک نظر ڈالی تو اندر سے دہل سا گیا۔

باسکل ہولارڈ نسلاً ایک یہودی تھا اور ایک طویل عرصے سے امریکا میں رہائش پذیر تھا۔ اس کے باپ کا تعلق اسرائیل سے تھا اور وہ یہودی تھا، جبکہ ماں اس کی امریکی کیتھولک کرسچن تھی۔ دونوں نے پسند کی شادی کی تھی، جو زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔

دونوں کے بیچ اس کی پیدائش کے بعد ہی علیحدگی ہو گئی اور باپ اپنے بیٹے کو لے کر واپس اسرائیل چلا گیا۔ وہیں اس کی ابتدائی تربیت ہوئی۔ اس کا باپ ایک کٹر اسلام دشمن اور یہودی تھا۔ اپنے بیٹے باسکل ہولارڈ کی بھی اس نے اسی انداز میں تربیت کی تھی۔ باسکل کو پولیس کا محکمہ اچھا لگتا تھا، وہ فطرتاً جارحانہ مزاج، مطلق العنان اور انتقامی خو رکھنے والا لڑکا تھا اور چاہتا تھا کہ رعب داب والی زندگی گزارے، اس کے لیے اس نے اپنے ملک اسرائیل کے بجائے امریکا کا انتخاب کیا اور پھر وہ امریکا آ گیا۔ باقی کی تعلیم اس نے ادھر ہی حاصل کی اور پولیس میں بھرتی ہو گیا۔

اسی دوران Salvadoran Civil War میں اسے ''ٹائیگر ٹیگ فورس'' کا کمانڈ وانچارج بنا کر بھیجا گیا جہاں اس نے بے گناہ اور معصوم لوگوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے اور امریکا نے اس کے اس ''کارنامے'' پر اسے زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ اس کے بعد اسے ایف بی آئی میں بھرتی کر لیا گیا۔ ان دنوں امریکا بری طرح نسل پرستی شکار تھا۔ یہاں بھی اس نے اپنی ٹائیگر ٹیگ فورس (جو اب اس کی ذاتی قوت کا درجہ اختیار کر چکی تھی) کے ذریعے ان پر بے تحاشا ظلم ڈھائے۔

اس کے کچھ عرصے بعد جب ایف بی آئی میں اس کی ترقی ۔۔۔ ڈپٹی ڈائریکٹر کے طور پر ہونا متوقع تھی وہ سی آئی اے میں چلا گیا۔ اور اب وہاں اس کا شمار ایک ٹاپ ڈبل ایجنٹ میں ہونے لگا تھا۔ اور وہ سی آئی اے کا ایک بااختیار افسر کہلاتا تھا۔

اپنے محکمے میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کے لیے یہ خفیہ طور پر غیر قانونی ہتھکنڈے بروئے کار لانے میں ذرا بھی عار محسوس نہیں کرتا تھا، اس کے لیے وہ اپنی ذاتی فورس ''ٹائیگر ٹیگ فورس'' کو استعمال کرتا تھا، جس کے کئی زیر زمین بدنام زمانہ اور مافیائی ''ڈون'' سے روابط تھے۔

اس نے حال ہی میں اپنی بیٹی انجیلا ہولارڈ کی شادی ایک عالمی مافیائی ڈون ''لولوڈش'' سے کی تھی۔ جو بظاہر ایک معزز اور عالمی کروک کا ایک بڑا بزنس ٹائیکون کہلاتا تھا۔

باسکل ہولارڈ کی یہ ایک ہی بیٹی تھی۔ بیوی مر چکی تھی۔

سفاکی، انتشار پسندی، کمزوروں پہ جبر اور کینہ پروری باسکل ہولارڈ کی نسلی فطرت کا حصہ تھی، یہی سبب تھا کہ جب امریکا میں نائن الیون کا واقعہ وقوع پذیر ہوا تو اس نے اس کا سارا ملبا سب سے پہلے تو امریکا میں مقیم مسلم کمیونٹی پر ڈال دیا۔ تفتیش وغیرہ کے بہانے ان کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دی۔ نیز ایک خفیہ مہم کے ذریعے اس نے ان کے خلاف ۔۔۔ امریکی عوام کے دلوں میں مختلف پروپیگنڈوں سے نفرت ابھارنے کا بھی سلسلہ شروع کر دیا۔

مسلم دشمنی اسے اپنے باپ سے ملی تھی۔ وہ۔۔۔۔ اب بھرپور طریقے سے اس کا استعمال کر رہا تھا۔ لہٰذا اب نائن الیون کے واقعے کے بعد سے اسے امریکی مسلمانوں کے خلاف ۔۔۔۔ ایک نیا گل کھلانے کا موقع مل گیا۔ بڑے پیمانے پر ان کی پکڑ دھکڑ شروع کی اور کئی بے گناہ معصوم لوگوں کو اس

بدبخت نے امریکا کی غلیظ اور خطرناک جیلوں میں سڑنے کے لیے بھیج دیا۔

باسکل ہولارڈ کی اصل رہائش گاہ لاس اینجلس کے مضافاتی علاقے، ویسٹ روڈ کی ڈلشائر بولیوارڈ پر واقع فیڈرل بلڈنگ میں تھی۔

باسکل ہولارڈ کے بارے میں یہ سب جاننے کے بعد میرے اندر ہول سے اٹھنے لگے تھے۔ حقیقت یہی تھی کہ میں کئی لمحوں تک اپنی جگہ سن ہو کے رہ گیا تھا۔ مجھے اس بات کی قطعاً امید نہ تھی میری یہ جنگ دیکھتے ہی دیکھتے اتنے وسیع پیمانے پر پھیل جائے گی۔ کسی نے سچ ہی تو کہا ہے کہ کیچڑ میں گرنے سے آدمی سارا ہی لتھڑ جاتا ہے۔ تب پھر میں نے بھی یہ عزم صمیم کرلیا تھا کہ اگر ایسا تھا تو پھر میں بھی اپنے دشمنوں کے لیے ''کیچ'' کی جونک بن جاؤں گا۔

شکیلہ اور اول خیر بھی اس وقت میرے قریب بیٹھے ہوئے تھے اور میں کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ میرے چہرے پر یکلخت پھیلنے والے سناٹوں کی تہ میں چھپی ہوئی تشویش آمیز ہولناک خاموشی کو وہ دونوں بھی فوراً بھانپ گئے تھے۔

''اوخیر کاکے! تجھے تو ایک خوفناک سی چپ کھا گئی، خیریت تو ہے؟'' اول خیر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''آخر آنسہ خالدہ نے ایسا کیا بھیج دیا ہے تجھے، ہمیں بھی بتا۔''

میں نے جواباً اپنے حلق سے ایک گہری ہمکاری... خارج کر کے کہا۔ ''اول خیر! ایسا لگتا ہے کہ ہماری جنگ بہت دور تک پھیل گئی ہے۔''

وہ کچھ سمجھے بغیر ہنس کر بولا۔ ''تو کیا خیال ہے کاکے! اپنے گوڈوں، گٹوں پر تیل کی مالش کرلیں؟''

ان تشویش ناک حالات میں بھی اول خیر کی اس بات پر بے اختیار میں ہولے سے ہنس دیا۔ البتہ شکیلہ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اول خیر کو ٹوکا۔

''تمہیں ہر وقت مذاق ہی سوجھتا رہتا ہے۔ کبھی کوئی کام کی بات بھی منہ سے نکال لیا کرو۔''

''جاؤ پھر ایک کپ چائے بنا کر لے آؤ، میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ کام کی بات اور نہیں ہوسکتی۔'' اول خیر نے کہا تو وہ منہ بنا کر بولی۔

''میں نوکرانی نہیں لگی ہوئی ہوں تمہاری۔ جاؤ خود ہی بنالو جا کر۔''

''ارے یار! کیوں تنگ کرتے ہو تم اس کو... ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے بے چاری۔ پہلے ہی یہ بہت کام کرتی ہے۔'' میں نے شکیلہ کی طرف داری کی تو وہ بولی۔

''شہزی! میں آپ کے لیے نہیں کہہ رہی تھی۔ آپ کے لیے بنالاؤں؟''

''چائے کا موڈ تو واقعی ہو رہا ہے، بہ شرطیکہ تم تھکی ہوئی نہ ہو۔''

''نہیں، نہیں، میں تھکی ہوئی نہیں ہوں۔ ابھی بنالاتی ہوں۔'' وہ بے چاری جلدی سے بولی، تو اول خیر نے کہا۔

''اوکاکی! بیٹھ جا تو، میں ہی بنالاتا ہوں۔''

''تمہارا شکریہ۔'' شکیلہ نے اس کی طرف دیکھ کر گھورا اور کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد اول خیر ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ پھر مجھ سے مستفسر ہوا۔ ''کاکے! مجھے بھی بتا یار! آخر ایسا کیا ہے اس میں۔ یہ کس کی تصویر ہے؟''

اس نے سامنے مانیٹر کی اسکرین پر باسکل ہولارڈ کی تصویر کی طرف اشارہ کیا تو میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ جسے سن کر اس کا منہ بھی کھلا رہ گیا۔ اور وہ ''اوخیر'' کہنا بھی بھول گیا۔ مگر چند پل بیتنے کے بعد اس کے حلق سے یہ جملہ بالآخر برآمد ہو ہی گیا۔

''اوخیر کاکے! یہ تو واقعی میں لمبا معاملہ لگ رہا ہے۔''

''ہاں اول خیر! کچھ ایسا ہی ہے۔ لیکن ہم بھی... ''ترنوالہ... ثابت نہیں ہوں گے دشمنوں کے لیے۔'' میں نے بھی ہولے سے مگر پُرعزم ہو کے کہا۔

نامساعد حالات ایک زنجیر کی طرح کڑی در کڑی مجھے اپنے گھیرے میں لیتے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے۔ گویا جہاں سر اٹھا کے دیکھتا، مجھے ایک سے بڑھ کر ایک طاقت ور دشمن کھڑا نظر آتا تھا۔

باسکل ہولارڈ کی ہسٹری جاننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں اب معاملہ نہ صرف کھنائی میں پڑنے والا تھا بلکہ بہت دور تک جانے والا تھا۔ اور اس کے لیے مجھے کچھ خصوصی نوعیت کے ''ایفرٹس'' لینے چاہیے تھے۔

سرمد بابا اس سلسلے میں بے شک ایک مبہم امید تھے، مگر ان کے علاوہ بھی مجھے عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں کوئی بندوبست کرنا تھا۔ عابدہ یقیناً اسی بات کی منتظر ہوگی کہ اس اندوہناک واقعے کے بعد میں بھی خاموش نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ وہ اسی امید پر میری بھی راہ تک رہی ہوگی۔

آنسہ خالدہ کی اگر بات کی جاتی تو وہ اس سلسلے میں قوی امید تھی میری، میں نے سوچا کہ سرمد بابا کو بھی آنسہ

خالدہ کے بارے میں بتادینا چاہیے تھا، مگر ابھی ان کی امریکا روانگی کا پروگرام حتمی نہیں ہوا تھا۔ ایک تیسری امید بھی تھی۔

میجر ریاض باجوہ یا پی ایس ایس (پاور سیکریٹ سروس والے) جبکہ میں باجوہ صاحب سے اس موضوع پر بات کر چکا تھا اور انہوں نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ پہلے سرمد بابا اور آنسہ خالدہ کی کاوشوں کو دیکھ لیتے ہیں، وہ کہاں تک بارآور ثابت ہوتی ہیں، جب تمام امیدیں ختم ہو جائیں، تب ہی ہم اپنے تئیں کچھ کرنے کا سوچ سکتے ہیں۔ مجھے باجوہ صاحب کا یہ مشورہ اچھا لگا تھا، اور میں ان کے اس مشورے سے پُرامید بھی تھا۔ مگر اب دیکھنا یہ تھا کہ سرمد بابا اور آنسہ کی کاوشیں کہاں تک کامیاب ہوتی ہیں۔ جبکہ سرمد بابا نے امریکا میں ایک لائر بھی ہائر کر رکھا تھا۔

اپنی مہم جوئی کے سلسلے میں باجوہ صاحب نے پہلا اشارہ یہی دیا تھا کہ ملکی سطح پر امریکا پر سفارتی دباؤ ڈالنے پر بھی غور ہو سکتا تھا، ناکامی کی صورت میں ہمارے پاس آخری آپشن یہی تھا کہ عابدہ کی رہائی کے لیے خود میدانِ عمل میں کودنا پڑے تو اس سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ مگر یہ مشن نہ صرف خفیہ ہوگا بلکہ اس میں صرف مجھ سمیت پی ایس ایس کے چند انتہائی تربیت یافتہ کمانڈوز ہی شامل ہو سکتے ہیں۔ جن کی کوئی شناخت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ ہیں کون؟ وغیرہ۔

مجھے اسی آخری آپشن میں زیادہ دلچسپی تھی۔ مگر مجھے ابھی اس کے کوئی امکانات ہوتے نظر نہیں آتے تھے۔

میں نے ابھی پچھلے دنوں ہی اسپیکٹرم کو کاری ضرب لگائی تھی، اور آرک سمیت اس شیطان ڈاکٹر گلمٹ کو جہنم واصل کیا تھا بلکہ ان کی اہم عمارت زیرِ دباؤ س بھی تباہ کر ڈالی تھی، پھر اسی دوران میرا وزیر جان اور چوہدری ممتاز خان کے ساتھیوں سے بھی ٹکراؤ ہوا اور انہیں اپنے زخم چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

لیکن وزیر جان کی دھمکی مجھے یاد تھی، جو اس نے مجھے، آرک اور ڈاکٹر گلمٹ کی ہلاکت کے بعد دی تھی کہ میری اس تازہ مہم کی وجہ سے اب لولوش خود براہِ راست میدان میں اترنے والا تھا۔ کیونکہ آرک اور گلمٹ اس کے بے حد قریبی اور اہم ساتھیوں میں شمار کیے جاتے تھے۔

میں خود لولوش سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بے چین تھا۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ عابدہ کی سی آئی اے سینٹر میں منتقلی کے بعد وہ مجھے زیر کرنے یا جھکانے کے لیے پھر کوئی بزدلانہ حرکت کر سکتے تھے۔

لہٰذا ابھی میں صرف عابدہ کی رہائی کے لیے ہی اپنی توجہ مرکوز کرنا چاہتا تھا، جبکہ اپنے باپ کی تلاش بھی میرے اہم منصوبوں میں شامل تھی۔

ماں جی سے اپنے ماضی کے بارے میں جان کاری کے بعد کہ لئیق شاہ اور میں ایک ہی باپ کی اولاد تھے اور میرے اصل باپ کا نام تاج دین شاہ تھا، جس نے رینجرز کا ایک عام سپاہی ہوتے ہوئے بھی کسی گمنام مجاہد کی طرح ملک دشمن عناصر کی سازشوں کو ملیامیٹ کیا تھا اور آخر میں وہ ایک بھارتی جاسوس کے تعاقب میں سرحد پار کر گیا تو پھر اس کا کچھ پتا نہ چلا تھا۔

میں اب بھی شاید اس معاملے میں زیادہ دلچسپی نہ لیتا۔ اگر وزیر جان مجھے یہ نہ بتاتا کہ میرا باپ زندہ ہے اور وہ بھارتی جیل میں ایک گمنام جنگی قیدی کی حیثیت سے نجانے کس حال میں تھا۔ بات چند سالوں کی نہیں بلکہ کئی سال پرانی تھی۔ مگر مجھے اس کی تلاش کرنا تھی اور میں نے میجر باجوہ سے تازہ ملاقات میں تاج دین شاہ کا ریکارڈ تلاشنے اور اس سلسلے میں تفصیل حاصل کرنے کی درخواست کی تھی۔

انہیں بہرحال یہ سن کر خوشی بھی ہوئی تھی کہ میں ایک سرحد کے بہادر سپاہی کا بیٹا تھا۔ اور وہ اس حیرت انگیز اتفاق پر حیران بھی تھے کہ یہ عین میں بھی اسی راہ پہ دانستہ و نادانستہ چل پڑا تھا۔

اگلے دن ہی میجر صاحب کا فون آ گیا اور انہوں نے مجھے دفتر بلا لیا۔ انہیں ریکارڈ روم سے بابا (میرے باپ) ... کی وہ پرانی فائل مل گئی تھی، جس میں ان کے بارے میں ساری ... تفاصیل درج تھی۔

میں ایک جوش کی سی کیفیت میں وہاں پہنچا۔ فائل اوریجنل حالت میں تھی اور خاصی پرانی بھی۔ میں وہیں ایک کمرے میں فائل کا بہ غور مطالعہ کرنے لگا اور جیسے جیسے پڑھتا جا رہا تھا، میرے رگ و پے میں ایک جوش کی سی کیفیات سرایت کرتی جا رہی تھی۔

فائل میں میرے بابا کی تصویر بھی چسپاں تھی، یہ ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر تھی۔ گمشدگی سے پہلے اور بعد کی بھی مفصل تحقیقاتی رپورٹ موجود تھی۔ جس کے مطابق تاج دین شاہ ایک محبِ وطن اور بہادر سپاہی تھا اور اپنے فرض سے کبھی غفلت نہیں برتتا تھا۔

اس کی ایک سرحدی کیمپ میں ڈیوٹی ہوتی تھی، وہاں وہ بارڈر سیکیورٹی فورسز کی تھرڈ رجمنٹ کمپنی کی سرچنگ ونگ

کا انچارج وا چ مین تھا۔

تحقیقاتی رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ایک بھارتی جاسوس، جو جانے کس طرح سرحد پار کرنے میں نہ صرف کامیاب ہوگیا تھا بلکہ اپنا کوئی خفیہ مشن نمٹانے کے بعد اب وہ واپس بھارت کا قصد کیے ہوئے تھا۔

ایسے ملک دشمن جاسوسوں کو، جو سرحد پار کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے اور واپس لوٹنے کی کوشش کرتے تھے انہیں، اپنی اصطلاح میں ''ریڈ پرسن'' کہا جاتا تھا، اور یہ سب سے زیادہ خطرناک جاسوس سمجھے جاتے تھے کیونکہ یہ وطنِ عزیز میں اپنا ملک دشمن خفیہ منصوبہ نمٹا کر واپس جارہے ہوتے تھے اور ان کے پاس اہم ملکی راز ہوتے تھے۔ ایسے ریڈ پرسن جاسوس کو چھاپنا زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔ ایسے خطرناک جاسوس کو اپنی جان پر بھی کھیل کر دھرنا پڑتا تھا یا ہلاک کرنا لازمی ہوتا تھا۔

تاج دین شاہ نے ایک سرد اور اندھیری رات میں ایک ایسے ہی ریڈ پرسن جاسوس کو فرار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایسے جاسوسوں کی خطرناکی سے واقف تھا۔ اپنا ایک مختصر پیغام چھوڑ کر وہ اس جاسوس کو دھرنے یا جہنم واصل کرنے کے لیے اس کے تعاقب میں لپکا۔ یہاں تک کہ دشمن کی سرحد پار کر گیا۔

اس کا کچھ پتا نہ چلا۔ تاہم اس کے چھوڑے ہوئے پیغام کے مطابق اعلیٰ حکام کو اندازہ تو ہو چکا تھا کہ وہ کسی ریڈ پرسن جاسوس کی تلاش میں ہی گیا ہے۔ جب کئی دنوں تک اس کی واپسی نہ ہوئی اور نہ ہی اس کی کوئی خیریت کی اطلاع آئی تو پتا چلایا گیا کہ آخر دشمن ملک کا وہ جاسوس یہاں کس مشن کے تحت آیا تھا اور آیا وہ کوئی اہم ملکی راز بھی چوری کر گیا تھا یا نہیں؟

اس سلسلے میں بڑی ہنگامی بنیادوں پر تحقیق اور کھوجنا کی گئی تو پتا چلا وہ بھارتی جاسوس اپنے ایک دیرینہ ''چانکیہ پلان'' کے تحت یہاں آیا تھا اور ایک اہم ملکی دفاعی راز چوری کرنے میں کامیاب ہو کر بھاگا تھا۔ تاج دین اسی کے تعاقب میں گیا تھا۔

وہ راز اس قدر اہم تھا کہ اگر وہ بھارت کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ خدانخواستہ اپنے مذموم جنگی ارادوں میں کامیاب ہوجاتا۔

اس تحقیق کے بعد ایک کھلبلی اور تشویش آمیز بے چینی سی پھیل گئی۔ دشمن کی طرف سے ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا۔ مگر اب کئی دن بیت چکے تھے، جس کا ایک ہی واضح مطلب تھا کہ سپاہی تاج دین نے اس ریڈ پرسن بھارتی جاسوس کو اس کے ہی ملک میں دھر لیا تھا اور وہ ہم راز اس نے ضائع کر دیا تھا، پھر خود بھی شہید ہوگیا تھا۔

تاج دین کی غیر موجودگی میں اسے خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے اس کی بیوی یا بیوہ کو تلاش کیا گیا۔ مگر وہ تو بے چاری خود اپنے لاپتا بچے (لئیق شاہ) کی تلاش میں نجانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتی پھر رہی تھی۔ بہت تلاش کیا گیا اسے مگر وہ نہ ملی۔

یہ رپورٹ پڑھنے کے بعد بے اختیار میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میرے ماضی کا شیرازہ کس دھوم سے بکھرا تھا کہ اس کی دادرسی بھی نہ ہو سکی تھی۔ میرے ماں باپ کا محبت اور جاں فشانی سے بنایا ہوا وہ آشیانہ جو یقیناً انہوں نے اپنے خون سے سینچا ہوگا، کس طرح تنکا تنکا ہو گیا تھا، اس عورت کے دکھوں کا کون اندازہ لگا سکتا ہے، جس کا شوہر اپنا فرض نبھانے نامعلوم منزل کی طرف نکل گیا اور اس کا ایک بیٹا گاؤں کے میلے میں بچھڑا تو دوسرے کو وہ حرماں نصیب اپنی کوکھ میں لیے ڈھوتی رہی اور جب وہ دنیا میں آیا تو حالات اور اس ظالم زمانے نے اسے مکروفریب سے اس قدر خوف زدہ کر دیا کہ وہ ایک مرد کا سہارا لینے پر مجبور ہوگئی، اور اسی ''تحفظ'' دینے والے مرد نے اس کے ساتھ بھی دھوکا کیا، اور اس کا دوسرا بچہ بھی چھین لیا گیا۔

اب اسی الم نصیب ماں کو اپنے ایک جوان بیٹے کی ہلاکت کا صدمہ جھیلنا پڑا تو دوسرا میری صورت میں اسے پہلے ہی نامساعد حالات کی گود میں پڑا ہوا ملا۔ آہ! زندگی آخر اتنے امتحان کیوں لیتی ہے؟ اور یہ سارے امتحان کمزور اور نادار انسانوں کے حصے میں ہی کیوں آتے ہیں؟ کیا وہ زیادہ اللہ کو محبوب ہوتے ہیں جنہیں وہ آزماتا ہے؟

میں کافی دیر تک اسی طرح آزردہ اور بدحواسی کی حالت میں وہیں بیٹھا رہا۔ اس کے بعد ڈھیلے ڈھالے قدموں سے چلتا ہوا واپس اپنے کوارٹر میں آگیا۔

میرے لیے اب وزیر جان کو چھاپنا ضروری ہوگیا تھا۔ کیونکہ بہ قول اس کے، وہی اس حقیقت کو جانتا تھا کہ میرا باپ اب کہاں اور کس حال میں تھا؟ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو تلسی کے ساتھ اس کے روابط پر ہی اس نے یہ جان کاری لی تھی۔ اور پاور والوں کی رپورٹ کے مطابق اسپیکٹرم ایک ''بگ ڈیل'' کے تحت بلیو تلسی کے بعض خفیہ مفادات کے لیے کام کر رہی تھی۔ یہ اور بہت سی باتوں کا ''امین'' اسپیکٹرم کا یہ اسٹیشن چیف وزیر جان ہی بتا سکتا تھا۔ جبکہ وزیر جان

سے مڈبھیڑ ہونے کی صورت میں، مجھے چوہدری ممتاز خان کے بارے میں بھی اسے بتانا تھا کہ اس نے اپنی تنظیم (اسپیکٹرم) کے مفادات پر اپنے مفاد کو ترجیح دیتے ہوئے مجھے اس کی قید سے رہائی دلوائی تھی۔ اور ظاہر ہے اسے میں آنجہانی ثریا کے اسپیکٹرم میں چھپے باغی گروپ کے اس ہمدرد کے بارے میں نہیں بتا سکتا تھا، جو بے چارہ، میرے ذمی ہمدرد، یعنی ممتاز خان کے آدمیوں کے ہاتھوں نادانستگی میں ہی مارا گیا تھا۔

میں جانتا تھا کہ اسپیکٹرم میں، یہ ممتاز خان کا ایک ناقابلِ معافی جرم مانا جاتا۔ بشرطیکہ وزیر جان اس پر کوئی ایکشن لیتا۔

اسپیکٹرم کی مقامی قیادت میں آرک کے واصلِ جہنم ہونے کے بعد اب ''ہینڈلر ایجنٹ'' کا عہدہ خالی ہو گیا تھا۔

میں ان ساری باتوں پر غور کر ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے کال موصول ہوئی۔ یہ عارفہ کی کال تھی۔ میری بھویں سکڑ گئیں۔ میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے عارفہ کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔

''شش... شہزی! پلیز، تم اس وقت آسکتے ہو۔''

''آجاتا ہوں، ویسے خیریت تو ہے؟ آپ کچھ پریشان اور گھبرائی ہوئی سی ہیں؟'' میں نے پوچھا، میری پیشانی پر سلوٹ ابھری۔

''خیریت ہی تو نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ... وہ بابا جی پتا نہیں کدھر چلے گئے ہیں؟ آج صبح سے غائب ہیں، ان کا سیل فون بھی بند جا رہا ہے۔'' اس نے بتایا اور میں پریشان سا ہو گیا۔

''صبح کہاں کے لیے نکلے تھے وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''دفتر ہی گئے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ جانا چاہتی تھی، مگر انہوں نے مجھے ابھی کچھ دن آرام کرنے کا مشورہ دیا، اور خود اپنی کار میں نکل گئے۔'' وہ بتانے لگی۔

''کافی دیر گزر گئی تو دفتر سے ان کے پی اے جمال کا فون آیا کہ سیٹھ صاحب نے آج دفتر آنے کا کہا تھا اور ایک میٹنگ بھی انہوں نے کرنا تھی۔ جب میں نے کہا کہ وہ تو کافی دیر ہوئی دفتر کے لیے نکل چکے ہیں تو جمال کے ساتھ مجھے بھی پریشانی ہوئی، میں نے ان کے سیل پر بھی فون کیا مگر وہ بند ملا۔ میں سخت پریشان ہوں شہزی! پلیز تم کچھ کرو۔ دانی اور پنکی بھی رو رہے ہیں، اپنے دادو سے اتنے قریب جو ہیں۔'' وہ روہانسی ہونے لگی۔ مجھے اس کی گلوگیر آواز، مگرمچھ کے آنسو بہاتی محسوس ہونے لگی۔

''آپ اللہ سے خیریت کی دعا کریں، ایک کام کریں، مجھے سرمد بابا کے پی اے انکل جمال کا نمبر دے دیں۔ میں ذرا ان سے بھی بات کرلوں۔''

اس نے نمبر دے دیا اور میں نے رابطہ منقطع کر کے فوراً انکل جمال کے سیل پر ان سے رابطہ کیا۔

میں نے ان سے صرف اتنا کہا کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں، تو انہوں نے مجھے دفتر بلا لیا۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر میں دفتر میں تھا۔ ان کا امپورٹ ایکسپورٹ کا روبار تھا، اور یہ دفتر ملتان کینٹ کمرشل ایریا میں واقع تھا، میں تھانہ روڈ بازار سے سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ گیا تھا۔ انکل جمال نے مجھے اس کا تفصیلی پتا بتایا تھا۔

انکل جمال خاصے پریشان اور گھبرائے ہوئے نظر آرہے تھے۔ وہ مجھے لے کر سیدھا اپنے آفس روم میں پہنچے تھے۔ پریشانی اور تشویش کیا ہوتی ہے، وہ ان کی آنکھوں اور چہرے سے صاف عیاں تھی۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا، وہ اچانک کہاں چلے گئے، کیا تم سے کوئی بات ہوئی تھی سیٹھ صاحب کی؟ کیونکہ تم ان کے زیادہ قریب تھے۔''

''نہیں، میں خود یہ خبر سن کر پریشان ہوں۔'' میں نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا اور ان کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''آپ کی ان سے کوئی بات ہوئی؟''

''بس، رات ہی مجھ سے بات ہوئی تھی ان کی، اور وہ پتا نہیں کس نوعیت کی میٹنگ بھی کرنا چاہتے تھے آج صبح، ہم ان کا انتظار ہی کرتے رہ گئے۔ بالآخر مجھے ہی فون کرنا پڑا تھا میڈم عارفہ کو۔''

''انہوں نے فون پر کیا جواب دیا تھا آپ کو؟''

''یہی کہ وہ بھی یہی سمجھی ہوئی تھیں کہ سیٹھ صاحب دفتر میں ہی ہیں۔''

''ہم!'' میں نے ایک پُرغور ہمکاری بھری اور بولا۔

''آپ نے پولیس کو اطلاع دی؟''

''میری تو خود سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں، اچھا ہوا تم آگئے، کیونکہ میں نے میڈم سے اس سلسلے میں بات کی تھی کہ وہ پولیس کو فوراً مطلع کردیں، مجھے حیرت ہے کہ

انہوں نے مجھے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ پولیس بلاوجہ سب کو پریشان کرے گی، تھوڑا اور انتظار کر لیتے ہیں۔ ممکن ہے ان کے سیل فون کی بیٹری ڈاؤن ہوگئی ہو، اور وہ کسی اور طرف نکل گئے ہوں۔'' انکل جمال کی اس بات نے میرے اندر کی کھٹک کو فزوں تر کر دیا۔

''میرا تو خیال ہے ہمیں پولیس میں اطلاع کر دینی چاہیے۔ اللہ خیر ہی کرے۔ اتنے گھنٹے تو بیت چکے ہیں۔'' مجھے سوچتا پا کر وہ بولے۔

''فوراً سے پیشتر اور اسی وقت پولیس کو مطلع کریں انکل جمال!''

''میں یہی کرنے لگا ہوں، مگر میڈم صاحبہ سے بھی ڈر رہا تھا۔ اب آپ نے بھی کہہ دیا ہے تو...'' وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ٹیبل پر پڑے فون کو اپنی جانب کھسکانے لگے۔ ذرا دیر بعد متعلقہ تھانے فون کر کے تھانہ انچارج کی موجودگی کا پتا کیا اور اپنے آنے کا بھی کہہ کر فون بند کر دیا۔

''آپ چل رہے ہیں میرے ساتھ شہزاد صاحب؟'' وہ کھڑے ہو کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے تو میں نے کہا۔

''آپ ہی چلے جائیں اور پولیس کو ضابطے کی کارروائی میں پورا تعاون دینے کی کوشش کریں۔ آپ سے صرف ایک بات پوچھنی تھی مجھے۔''

''جی جی، پوچھیں؟'' وہ جلدی سے بولے تو میں بھی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

''آپ سیٹھ نوید سانچے والا کو تو جانتے ہی ہوں گے؟''

''بہت اچھی طرح جانتا ہوں اس نو دولتیے اور موقع پرست شخص کو۔'' وہ دانت پیستے ہوئے بولے۔ پھر میں سیٹھ نوید کی رہائش گاہ اور دفتر سمیت سارا اتا پتا معلوم کر کے انکل جمال سے رخصت ہو گیا۔ آخر میں وہ بھی کچھ الجھ سے گئے تھے، پھر اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کچھ استفسار کرتے، میں نکل آیا تھا۔

انکل جمال سے میں نے سیٹھ نوید کا سیل اور لینڈ لائن نمبر بھی لے لیا تھا۔ ابھی انہیں تھانے جانے کی جلدی تھی اسی لیے میں نے ان سے سیٹھ نوید سانچے والا کے بارے میں تفصیلی معلومات لینے کے لیے کوئی اور وقت اٹھا رکھا تھا۔

میں نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا، سہ پہر کے تین بج رہے تھے، یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ سیٹھ نوید اس وقت اپنے دفتر میں ہی ہوگا، روانہ ہو گیا۔

جلیل آباد ہاؤسنگ ایریا کے قریب ہی کہیں اس کا... خاصا بڑا بنگلا نما مکان تھا اور اس سے صرف ایک ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر ریلوے روڈ کے پاس ہی اس کا دفتر تھا۔

دفتر کی عمارت اگرچہ خالصتاً کاروباری نظر نہیں آتی تھی، لیکن دو ہزار گز پر واقع یہ دو منزلہ عمارت بھی بادی النظر میں ایک وسیع و عریض کوٹھی کا ہی منظر پیش کرتی تھی۔ جس کی پیشانی پر براس شیلڈ میں ''گوگو انٹر پرائزز'' کا نام کندہ تھا۔

میں نے اپنی گاڑی اس کے دفتر کے باہر روک دی۔

احاطے میں اور بھی کئی چھوٹی بڑی گاڑیاں کھڑی تھیں، میری عقابی نگاہوں نے وہاں، نسبتاً ایک الگ تھلگ کونے میں کھڑی سیٹھ نوید سانچے والا کی سفید کرولا کار دیکھ لی تھی، جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ اندر موجود تھا۔

گیٹ پر دو گن مین موجود تھے۔ ان کے جسموں پر سیکیورٹی گارڈز کی نیلی وردیاں تھیں۔ ایک نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے صرف اپنا نام بتایا اور یہی کہا کہ میں سیٹھ نوید سے ملنا چاہتا ہوں۔

''صاحب سے آپ کی اپائنٹمنٹ ہے؟'' دوسرے نے میری طرف دیکھ کر سپاٹ لہجے میں پوچھا تو مجھے اس کے سوال پر حیرت ہوئی، کیونکہ مجھے امید نہ تھی کہ اتنی جلدی اور باہر گیٹ پر ہی مجھ پر ایسا سوال داغا جائے گا۔

بہرحال میں نے جواب دیا۔ ''نہیں، میری ایسی کوئی اپائنٹمنٹ تو نہیں تھی لیکن وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ ان سے جا کر فقط اتنا کہہ دیں کہ مجھے سیٹھ منظور وڑائچ نے بھیجا ہے۔''

''سیٹھ منظور وڑائچ۔'' پہلا والا گن مین اس نام پر یوں چونکا تھا، جیسے وہ اس نام سے اچھی طرح واقف ہو۔ بھویں سکیڑ کر میری طرف تکتے ہوئے بولا۔

''تم سیٹھ منظور کے کیا لگتے ہو؟''

''میں بیٹا ہوں اُن کا۔''

''ان کا تو ایک ہی بیٹا تھا، جو...''

''مجھے معلوم ہے، محمود نام تھا مرحوم کا۔ میں سیٹھ منظور کا منہ بولا بیٹا ہوں۔ اور اب مجھے اندر جانے دیا جائے۔'' میں آخر میں دانستہ بھڑکنے والے انداز میں بولا۔ پھر میری کسی الیکٹرک فائینڈر ٹائپ آلے سے مختصراً چیکنگ کی گئی اور اندر جانے کی اجازت مل گئی۔

میں ابھی گراؤنڈ فلور پر ہی تھا اور اپنے قدم میں نے دانستہ آہستہ کر رکھے تھے۔

مجھے یقین تھا کہ یہاں صرف نئے آنے والوں کو ہی

ایسے روکا جاتا تھا جیسے مجھے روکا گیا تھا۔
گراؤنڈ فلور پر شاید گودام وغیرہ بنے ہوئے تھے۔ دو تین آفیشلی کیوبیکل بھی نظر آئے، جو شیشے کے بنے ہوئے تھے، ان کے اندر چند افراد بیٹھے دکھائی دیے، میں بہ ظاہر سرسری نگاہ ان پر ڈالتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا اور فرسٹ فلور پر ہی مجھے سینٹرل اے سی اسپلٹ پلانٹ کی ٹھنڈک محسوس ہوئی اور شیشے کے مختلف آفس کیبن نظر آئے، زینے کے اختتام کے بالکل سامنے مجھے استقبالیہ ٹائپ کا ایک بڑا سا کاؤنٹر دکھائی دیا۔ یہاں بھی دو مخصوص وردی پوش گن مین چاق چوبند انداز میں کھڑے تھے۔ وہ میری طرف سرد نظروں سے دیکھنے لگے۔ جبکہ سامنے استقبالیہ کاؤنٹر پر موجود دو جوان مردوں اور ایک الٹرا فیشن ایبل لڑکی بھی مجھ پر اپنی سوالیہ نظریں جما چکے تھے، جس کا صاف مطلب تھا کہ آگے بڑھنے سے پہلے ان سے مخاطب ہوا جائے، ورنہ پیچھے سے آواز دے کر بلا یا جائے گا۔

سو، میں بھی سیدھا انہی کی طرف بڑھا، کم و بیش یہاں بھی یہی کچھ ہوا جو میں نیچے داخلے کے وقت گیٹ پر بھگت چکا تھا۔ البتہ مجھے یہاں روک کر باس کے پی اے سے رابطہ کر کے پہلے اسے میرے بارے میں بتایا گیا۔ اس نے حکم صادر کیا کہ وہ ملاقاتی یعنی مجھے ادھر ہی روکے رکھیں، وہ باس سے کنفرم کر کے دوبارہ انٹرکام پر بتائے گا۔

لہٰذا، مجھے ایک طرف بچھے گہرے سبز رنگ کے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا اور میں خاموشی سے وہیں براجمان ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ مجھے ان تینوں میں سے ایک نے اشارے سے بلایا۔ میں اٹھ کر اس کے قریب پہنچا تو اس نے کہا کہ باس آپ کو نہیں پہچان رہے ہیں، مگر آپ نے جن صاحب کا ریفرنس دیا ہے، انہیں فون کر کے پہلے مطلع کریں، اور وہ باس کو آپ سے ملاقات کے لیے فون کریں گے۔ تب...''

''وہ صاحب آج صبح سے لاپتا ہیں۔ اور میں اسی سلسلے میں سیٹھ نوید سانچے والا سے ملنے آیا ہوں۔ بتاؤ اپنے باس کو یہ بات۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر ایک ایک لفظ چبا کر اور اتنی بلند آواز میں کہا کہ وہاں دائیں بائیں کام کرنے والے سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے، جبکہ وہ دونوں گارڈز بھی تیزی سے میری طرف بڑھے تھے، مگر انہیں مجھے ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ میرے چہرے اور لہجے سے ایسا اعتماد جھلکنے لگا تھا جیسے میں ان کا کوئی بڑا افسر ہوں، اپنی پرسنالٹی کو بارعب بنانے کے لیے میں اپنے لباس پر بھی خصوصی توجہ دیا کرتا تھا۔ جبکہ میرے بال بھی سولجر کٹ تھے۔

مجھے دراصل اس سازشی سانچے والے تو دولتیے سیٹھ پر ایک دم ہی غصہ آ گیا تھا، جو مجھے سرمد بابا کے حوالے سے جان لینے کے باوصف، کم ظرف دولتیوں والے نخرے کر رہا تھا اور ملنے سے بھی انکاری تھا۔ اس میں مجھے اپنی سبکی محسوس ہوئی تھی، جس سے میں کھول کر رہ گیا تھا۔

''سر! آپ یہاں آ جائیں۔ پلیز۔''

ایک گارڈ نے مجھ سے طوعاً و کرہاً شائستہ لہجے میں کہا تو میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا، اس کے چہرے پر بھی جارحانہ تناؤ دیکھ کر میں نے اپنی جیب سے رینجرز فورس کا مخصوص نشان والا کارڈ اسے دکھا دیا۔ وہ اسے ایک نگاہ دیکھتے ہی گویا اپنی جگہ منجمد ہو گیا، میں دوبارہ کاؤنٹر بوائے کی طرف متوجہ ہوا اور بارعب لہجے میں بولا۔

''سیٹھ نوید سانچے والا کو بولو! مجھ سے ملو گے یا میں دوبارہ اپنی پوری ٹیم کے ساتھ آؤں اور اس ادارے کو بھی سیل کر جاؤں؟''

اب تو تینوں کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ مجھے آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی ٹائپ کی کوئی شے سمجھنے لگے اور اسی نے دوبارہ سانچے والا کے پی اے سے انٹرکام پر رابطہ کیا۔ اب اس کے چہرے سے بھی بوکھلاہٹ نمایاں تھی، جبکہ وہ دونوں گارڈز مجھ سے کئی قدم پرے ہو کر کھڑے ہو گئے تھے کہ مبادا، میں ان کی کسی اخلاقی حرکت کو بھی غلط حرکت پر محمول کر کے، ان کے لیے مشکل نہ کھڑی کر دوں۔

مجھے فوراً گویا شرف باریابی بخش دیا گیا۔ اور کاؤنٹر کا ہی ایک آدمی نہایت ''احترام'' سے میرے ساتھ ہو لیا۔

میں عموماً اپنی اس طرح کی شناخت ہر ایری غیری جگہ پہ شو آف کرنا پسند نہیں کرتا تھا، جب تک کہ اس کی کہیں اشد ضرورت نہ پڑ جاتی۔

اوپر فلور کافی نیچی چھت والے تھے، اسی لیے اوپر نیچے جانے والے زینوں کے ''قدمچے'' مختصر اور چھوٹے تھے، مطلب انہیں طے کرنے میں زیادہ وقت یا تھکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

دوسرے فلور پر ہی ایک بھاری بھرکم اور درمیانے قد و قامت کے سوٹڈ بوٹڈ شخص نے میرا بڑا تپاک سے استقبال کیا۔ ساتھ ہی وہ مجھے غور غور سے تکنے بھی جا رہا تھا۔ وہ مجھے لے کر سیدھا ایک شاہانہ آفس روم کا دروازہ کھول کر اندر ہی

لے گیا۔

سامنے ہی ایک بڑی سی ٹیک کی میبل پر، بھاری بھرکم اور اونچی پشت گاہ والی چیئر سنبھالے سیٹھ نوید سانچے والا براجمان تھا۔ اس کی سکڑی ہوئی بھویں اور تنگ پڑتی پیشانی بتا رہی تھی کہ وہ میری طرف سے شدید الجھن آمیز پریشانی کا شکار ہو گیا تھا اور میرے ہی بارے میں سوچ جا رہا تھا کہ آخر میں تھا کیا؟

''بہت افسوس ہوا مجھے آپ سے مل کر سیٹھ نوید سانچے والا صاحب!''

میں نے اس کی طرف ناگوار نظروں سے گھورتے ہوئے، قدرے تلخ لہجے میں کہا تو وہ بھی ایک کائیاں تھا، میرے کڑوے انداز تخاطب کی وجہ جان کر اپنے چہرے پہ جبراً مسکراہٹ کا تو بڑا سجاتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بھی بڑھا دیا۔

اتنی ''ڈوز'' اس کے لیے کافی تھی، لہٰذا میں نے بھی اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے فوراً اس آدمی کو، شاید اس کا پی اے تھا، باہر جانے کا کہہ دیا۔ پھر اپنے لہجے میں خجالت سمونے کی کوشش کرتا ہوا مجھ سے بولا۔

''بیٹھو بیٹھو شہزاد صاحب! دراصل میں صرف بائی فیس ہی آپ کو جانتا تھا، کبھی آپ کے نام...''

''سفید جھوٹ۔'' میں اس کے سامنے والی کرسی سنبھالتے ہوئے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ مجھ پر سخت خار کھائے ہوئے تھا۔ مگر میری ''شناخت'' اس کی رعونت اور غرور کے آڑے آ رہی تھی۔

''حالانکہ آپ... شاید سیٹھ منظور وڑائچ کے منہ سے تو نہیں، البتہ، میڈم جی کے لبوں سے تو میرا ذکر سن ہی چکے تھے، اس کے باوجود آپ مجھے نہیں پہچان سکے؟ اینی وے چھوڑیں اس بات کو۔ تشریف رکھیں آپ بھی۔''

میں نے دانستہ اسی کے لہجے میں، جس سے وہ عارفہ کو ''میڈم جی'' کہہ کر پکارتا تھا، ایسا کہا تھا اور یقیناً اسے اندر سے ایک زبردست شاک پہنچا تھا کہ میں اس کی ''خلوت'' کی اس بھونڈی ادا سے کس طرح واقف ہوا تھا؟

اس کا چہرہ میں نے ایک لمحے کے لیے دھواں دھواں پڑتے دیکھا تھا۔ تاہم وہ میری طرف تکتے ہوئے... اپنی کرسی پر دوبارہ براجمان ہو گیا تھا۔

''حیرت ہے، کیا آپ کو ابھی تک اس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ سیٹھ منظور وڑائچ کو آج صبح چند نامعلوم افراد نے اغوا کر لیا ہے؟''

میں نے اس پر ایک اندھیرے میں نفسیاتی تیر چلایا...

... جس کا لامحالہ نتیجہ خاطر خواہ ہی برآمد ہوا تھا۔ کیونکہ اگلے ہی لمحے بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''تت... تمہیں کیسے پتا چلا کہ انہیں چند نامعلوم افراد نے اغوا کیا ہے؟''

اصولاً اسے یہ کہنا چاہیے تھا کہ ''مجھے نہیں معلوم'' مگر میرے نفسیاتی حربے نے اسے بے اختیار مجھ سے وضاحتی سوال کرنے پر مجبور کر دیا تھا، جو اسے میری نظروں میں مشکوک بنا گیا تھا۔ مجھے جس بات کا شبہ تھا وہ سچ ثابت ہوا تھا کہ سرمد بابا کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اغوا ہی کیا گیا تھا، اور وہ بھی رازداری سے۔

نوید سانچے والا کو پھر فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس کی حالت ویدنی ہونے لگی، سنبھلنے کی کوشش میں دوبارہ بولا۔

''مم میرا مطلب تھا کہ کیا واقعی وہ اغوا ہوئے ہیں؟''

''قرائن سے تو یہی نظر آتا ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

وہ اپنے حلق سے ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔ اب اس کا اعتماد بحال تو ہونے لگا تھا لیکن اس کا چہرہ مخمصے کا اب بھی شکار نظر آ رہا تھا۔ اس کے بعد میز کی دراز سے اپنا لمبا چوڑا اسمارٹ فون نکال کر بولا۔

''میں ابھی عارفہ سے ذرا خیر خبر لے لوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے انہیں معلوم ہے اور انہوں نے ہی تو مجھے سیٹھ صاحب کی گمشدگی کے بارے میں بتایا تھا۔'' میں نے کہا۔

''میں پھر بھی انہیں کم از کم فون کر کے پوچھ تو لوں کہ...''

''سیٹھ سانچے والا فون رکھ دو۔ تمہارے اور میڈم جی کے ڈرامے کا ڈراپ سین ہو چکا ہے۔''

میں نے یک دم گمبھیر آواز میں کہا اور اس کے ہاتھ سے اسمارٹ فون چھوٹ کر اس کی گود میں گر گیا۔

وہ مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکے جا رہا تھا۔

ٹھیک اسی وقت دروازہ کھلا اور اندر در آنے والے ایک فرد کو دیکھ کر میں بری طرح ٹھٹکا تھا۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

انتھک محنت ہی کامیابی کی کنجی ہے... جس سے ہر دروازہ بہ آسانی کھولا جا سکتا ہے... مگر بعض خوش قسمت ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں بناکسی محنت اور جدوجہد کے وہ سب میسر آجاتا ہے... جس کے لیے لوگ برسوں دربدر ہوتے ہیں... ایک خوش قسمت فنکارہ کا ماجرا... کامیابی اور شہرت اس کے پیچھے تھی... اور وہ ان سے دور بھاگ رہی تھی...

سعیِ لاحاصل

سیرینا راضی

کچھ کھودینے اور پالینے کے درمیان اٹھنے والے بھنور کے الجھاوے...

ایلینسر پوسٹ آفس سے باہر نکلتے ہی مجھے احساس ہوا کہ کوئی میری گھات میں بیٹھا ہوا ہے۔ وہ اکتوبر کی ایک سرد دوپہر تھی اور میں یہاں اپنی ڈاک لینے آئی تھی۔ شہر کا یہ چھوٹا سا مرکزی علاقہ ایک گرجا گھر، ٹاؤن ہال، چند پرانی عمارتوں اور ایک مرکزی ڈاک خانے پر مشتمل تھا جہاں میں اپنی ڈاک لینے آتی تھی۔ میری گھات میں بیٹھا شخص اچانک ہی ڈینا کے ریستوران سے نکلا اور جیسے ہی میں اپنی شیورلیٹ پک اپ کی جانب بڑھی، وہ میرا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔ ریستوران،

ایسے ہی ایک اداکار ... اسے بوسٹن سے آتے
ہوئے ایک فلمساز نے دیکھا اور اس کے باپ سے کہا کہ وہ
ٹینا کو اپنی فلم ... کے لیے کاسٹ کرنا چاہتا
ہے۔ اس چھوٹی سی عمر نے اس پر فلمی دنیا کے دروازے کھول
دیے اور اس ... بوسٹن کی ایک اور فلم میں کاسٹ کر لیا
گیا۔ ... دوستوں کو یقین نہیں آ رہا ...
کرتی تھی ... وہ فلمیں نہیں چھوٹے سینماؤں میں لگائی
گئی تھیں جنہیں ... جاتا تھا۔ اس زمانے میں وی سی
آر بھی بہت چلتے تھے۔ قصبے میں چند لوگوں کے پاس ہی
... موجود تھے ... کسی کو بھی دلچسپی نہیں تھی کہ
وہ اس کی ... [illegible]
کرتے۔

پھر ایک ... ہوا۔ ایک شام کسی عورت نے اس
... ٹیلی فون ... اس کے ڈیڈی
سے باتیں ... چند فون اور آئے۔ اس کے
ساتھ ہی ... اور وہ آنے والی فلم
... میں کاسٹ کر لی گئی جس کا مصنف و
ہدایت کار ایوارڈ یافتہ جیسن تیان لینڈرو تھا۔

ٹینا کو فلم کا اسکرپٹ ملا تو اسے یوں لگا جیسے اسے کرسمس
کا بہترین تحفہ ملا ہو۔ وہ کاؤچ پر بیٹھی اسکرپٹ کے صفحات پر
زرد مارکر سے اپنی لائنوں پر نشان لگا رہی تھی اور اس کا باپ
ٹیلی ویژن پر فٹ بال میچ دیکھ رہا تھا۔ تبھی باپ نے اسے پکارا۔
وہ ایک گھنٹے پہلے ہی کام سے واپس آیا تھا اور اس نے لباس
بھی تبدیل نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے پاس گئی تو اس کے باپ
نے اپنا بازو اس کی گردن کے گرد حمائل کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے تم پر فخر ہے ٹینا اور تمہاری ماں کی روح بھی آج
بہت خوش ہو رہی ہوگی۔“

ٹینا نے نظریں اٹھا کر آتش دان کی طرف دیکھا جہاں
بہت سی فریم شدہ تصویریں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک
بلیک اینڈ وہائٹ تصویر اس کے ڈیڈی کی تھی جب وہ ہائی
اسکول میں تھے۔ دوسری جب وہ آرمی میں تھے اور تیسری
تصویر ممی اور ڈیڈی کی شادی کی تھی۔ کچھ تصویریں ٹینا
کے بچپن کی تھیں۔ اس نے اپنی ماں کو نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے
اس سے وابستہ کوئی یاد اس کے ذہن میں نہیں تھی۔ ڈیڈی نے
ہی اسے ماں بن کر پالا تھا اور اس پر پورا بھروسا کرتے تھے۔

ڈیڈی نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ”یہ فلم تمہاری
زندگی بدل دے گی بنی۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”جانتی ہوں آپ ان پیسوں
کی بات کر رہے ہیں جو مجھے ملیں گے۔“

”لیکن جب تک اٹھارہ سال کی نہ ہو جاؤ تم ان
پیسوں کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتیں۔“ باپ نے ... دیا۔

میں ماضی میں کھوئی ہوئی تھی کہ کپ کی آواز نے مجھے
چونکا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تم اداکارہ کس طرح بن گئیں؟“

میں نے اپنے بچپن کے بارے میں سوچ کر ...
میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ کوئی بڑی چیز ہوں۔
حقیقت یہ تھی کہ میں اسپنسر کے مضافات میں رہنے والی ایک
غریب لڑکی تھی جس کا باپ ایک مل میں کام کرتا تھا۔

”بس یہ محض اتفاق ہی تھا۔“ میں نے ہمیشہ کی طرح
جھوٹ کا سہارا لیا۔

”مشہور فلم ڈائریکٹر کے ساتھ کام کرنا کیسا لگا؟“ کپ
نے پوچھا۔

میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے صرف یہ
معلوم تھا کہ وہ اپنی فلموں کی وجہ سے مشہور ہے۔ شوٹنگ
کنٹریکٹ سائن ہونے سے پہلے اس کی صرف ایک فلم دیکھی
ہوئی تھی۔ وہ اپنے کام میں مگن رہنے والا شخص ہے۔ اس کے
سیٹ پر لوگوں کا ہجوم دیکھ کر میرا دماغ گھومنے لگا اور
سازوسامان کی کثرت دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ صرف دو منٹ
کے شاٹ کے لیے بجلی کے تار، لائٹس، کیمرے، ساؤنڈ سسٹم
اور نہ جانے کیا کچھ دن بھر آتا رہا۔“

کپ نے اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھا اور بولا۔ ”میں
شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ مقامی لوگ اسے اور اس کی فلم کے کریو کو
قصبے میں دیکھ کر بہت حیران ہوتے ہوں گے؟“

”تھوڑے سے بہت، نیوہیمپشائر ایک چھوٹا قصبہ ہے۔
یہاں کے لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور باہر کے لوگوں
سے زیادہ متاثر نہیں ہوتے۔ جو لوگ شوٹنگ دیکھنے آئے بھی تو
وہ اس قصبے کے نہیں تھے۔“

کپ نے پوچھا۔ ”تمہاری لینڈرو سے کتنی مرتبہ
ملاقات ہوئی؟“

میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ٹھیک
طرح سے یاد نہیں۔ یہ ملاقاتیں میرے کام کے لیے کافی
تھیں۔“

”اور تم نے بھی کیا خوب کام کیا۔“ اس نے بیگ میں
ہاتھ ڈال کر فوٹو کاپیز کا ایک پلندا نکالا۔ ”نیویارک ٹائمز،
ورائٹی، پیپل میگزین، سیسکل اور ایبرٹ، سب نے ہی تمہاری
پرفارمنس کو زبردست قرار دیا ہے۔“

”پلیز۔“ میں نے کہا۔ ”میں یہ سب جانتی ہوں۔“

اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اور اس کے بعد تم نے اداکاری چھوڑ دی؟''

نینا نہیں جانتی تھی کہ وہ فلم کس موضوع پر بنائی گئی تھی۔ اس کے کئی منظر میں وہ شامل نہیں تھی لیکن وہ اس کی بنیادی تھیم سے واقف تھی۔ وہ ایک نوجوان لڑکی بریجیٹ مین کا رول کر رہی تھی جو نیوہیمپشائر کے ایک چھوٹے سے قصبے میں رہتی تھی۔ اس کے والدین ٹریفک حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ بریجیٹ کے دادا، دادی، مین ہٹن سے آئے اور وہ اسے اپنے ساتھ اس بڑے شہر میں لے جانا چاہ رہے تھے لیکن وہ لڑکی اپنا قصبہ چھوڑنے پر تیار نہ تھی۔

کہانی بہت اچھی تھی۔ خاص طور پر اس کا کلائمکس سین دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا جب اس کے دادا، دادی بحالت مجبوری اسے ایک بوڑھی عورت آنٹی کی زیر نگرانی قصبے میں چھوڑنے پر رضامند ہو گئے۔ یہ منظر بہت پُراثر تھا۔ جس نے دیکھنے والوں پر گہرا تاثر چھوڑا۔ نینا نے اپنی لائنیں شروع سے یاد کیں اور پہلی مرتبہ میں ہی بہترین اداکاری کی لیکن اندر سے وہ اپنے آپ کو اس کیریکٹر میں ڈھالنے میں دقت محسوس کر رہی تھی۔ کیا واقعی وہ اسپینسر جیسے چھوٹے قصبے کو چھوڑ کر نیویارک سٹی یا لاس اینجلس نہیں جانا چاہے گی۔ نینا چاہتی تھی کہ اسے بالآخر براڈوے یا بالی ووڈ جانا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے باپ کو بھی کہنا پڑ گیا کہ وہ ساری زندگی اس چھوٹے قصبے میں نہیں گزار سکتی۔

شوٹنگ کے پہلے چند دنوں میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ پہلے اس کے دادا دادی کے کچھ سین عکس بند کیے گئے۔ پھر اس کی باری آئی۔ وہ ایک سادہ سا سین تھا جس میں وہ جنگل سے برآمد ہوتی ہے۔ اس کے ننگے پاؤں کیچڑ میں لت پت ہیں۔ اس نے بلیو جینز اور پھٹی ہوئی سفید ٹی شرٹ پہن رکھی ہے۔ وہ تقریباً پانچ منٹ تک اس منظر میں دوڑتی رہی پھر لینڈرو اپنی جگہ سے اٹھ کر فریم میں آ گیا۔ وہ تقریباً اس کے باپ کی عمر کا تھا۔ چھوٹی سی داڑھی، لمبی ناک، گہری نیلی آنکھیں، اس نے نیلی جینز اور سیاہ ہائی نیک جرسی کے اوپر چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی اور اس کی گردن میں سیاہ ڈوری سے بندھا ڈائریکٹر کا کارڈ لٹک رہا تھا۔

''نینا! میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' اس نے نرم لہجے میں کہتے ہوئے اپنا بھاری بازو اس کے کندھے کے گرد ڈالا اور اسے جنگل کی طرف لے گیا پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہاری کارکردگی دیکھ کر بہت متاثر ہوا ہوں۔ کاسٹنگ ڈائریکٹر نے کبھی مایوس نہیں کیا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم ہمارے ساتھ ہو لیکن یہ فلم میرے لیے بہت خاص ہے۔ بہت ہی خاص۔ میں جانتا ہوں کہ تم جیسی لڑکی کے لیے یہ ایک بھاری ذمے داری ہے کیونکہ یہ تمہاری کہانی ہے۔ تمہیں ہی اس فلم کو لے کر آگے چلنا ہے۔ میں پوری سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ تم دل سے بریجیٹ مین بن جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اپنے آپ کو ایک اداکارہ سمجھو جو اس کا کیریکٹر کر رہی ہے۔ جب میں ایکشن کہوں تو مجھے نینا کے بجائے بریجیٹ مین نظر آنی چاہیے جس سے امریکا کی ہر لڑکی محبت کرے، نفرت کرے اور آخر میں اس کے لیے روئے، نینا! کیا تم میرے لیے یہ کر سکتی ہو؟''

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''ہاں مسٹر لینڈرو، میں ایسا ہی کروں گی۔''

وہ بھی جواب میں مسکرا دیا اور آہستہ سے اس کا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''گڈ گرل، آؤ دوبارہ وہیں سے شروع کرتے ہیں۔''

نینا کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا جب لینڈرو اس پر جھکا اور اس کے ماتھے کا بوسہ لے لیا پھر وہ واپس کیمرے کے پیچھے چلا گیا۔ نینا اپنی جگہ کھڑی پلکیں جھپکاتی رہی۔ آج تک باپ کے علاوہ کسی نے اس کا بوسہ نہیں لیا تھا۔ اس نے ڈائریکٹر اور کریو کی جانب دیکھا۔ سب اس کے جنگل میں واپس جانے کا انتظار کر رہے تھے۔

اس کے لیے یہ بہت ہی حیران کن بات تھی۔ وہ اپنے اندر ایک خوشگوار بے چینی محسوس کر رہی تھی جیسے لینڈرو اس کا ہاتھ پکڑ کر اس نظر نہ آنے والی لکیر تک لے آیا ہو جو بچپن اور جوانی کو الگ کرتی ہے۔ اسے یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ واپس جنگل میں چلی گئی۔ اس نے وہی لباس پہن رکھا تھا۔ اس نے اپنے بازو پھیلائے، سرگوشی کے انداز میں اپنی لائنیں دہرائیں اور جب وہ جنگل سے نکل کر کیمرے کے سامنے آئی تو پوری طرح بریجیٹ مین بن چکی تھی۔

جب شام کے وقت روشنی کم ہونے لگی تو لینڈرو نے شوٹنگ پیک اپ کر دی۔ وہ ہر ایک سے کہہ رہا تھا کہ آج کا دن بہت اچھا رہا اور اس کے لیے وہ نینا کا شکر گزار ہے۔ اس پر لوگوں نے تالیاں بجائیں تو نینا کا دل خوشی سے بھر گیا۔ لینڈرو اس کے پاس آیا اور بازو سے پکڑ کر اسے گلے لگاتے ہوئے ایک بار پھر اس کے ماتھے کو بوسہ دیا۔ اس نے سوچا کہ واقعی وہ ایک بہت اچھا دن تھا۔

☆☆☆

مجھے شروع میں ہی کپ سے پوچھ لینا چاہیے تھا کہ وہ یہ

انٹرویو کس کے لیے کر رہا ہے لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گزشتہ دس سالوں میں یہ سوال کئی لوگوں سے پوچھ چکی تھی اور سب نے میرے انٹرویوز کو اپنے اپنے انداز میں چھاپا تھا۔ یہاں بھی مجھے مزید چھ منٹ تک کیپ کے سوالوں کا جواب دینا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر ایک ضخیم فولڈر نکالا اور جب اسے کھولا تو میں اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گئی۔ اگر میں ذرا سی بھی ہوشیار ہوتی تو مجھے فوراً وہاں سے بھاگ جانا چاہیے تھا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ اس نے وہ تمام فوٹو کاپیاں میز پر پھیلا دیں اور انہیں دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہ ان انٹرویوز کی کاپیاں ہیں جو تم نے گزشتہ دس سال کے دوران دیے ہیں۔ انہیں حاصل کرنے کے لیے مجھے بہت سا وقت اور پیسا صرف کرنا پڑا۔ تم نے ہر انٹرویو میں ایک ہی جیسی باتیں کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اداکارہ بننا محض ایک اتفاق تھا۔ اداکاری چھوڑنے کا یہی مناسب وقت تھا۔ مجھے یاد نہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور اب یہی سب تم میرے سامنے بھی دہرا رہی ہو، اس سے میں کیا سمجھوں؟''

میں نے جواب دینے کی کوشش کی۔ ''یہی کہ میں بالکل کند ذہن ہوں۔''

اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی جو بہت زیادہ دوستانہ نہیں تھی۔ ''نہیں بلکہ تم بہت زیادہ ہوشیار ہو۔ تم نے ایک اچھی اداکارہ کی طرح یہ جملے یاد کر رکھے ہیں۔ جیسے تم کوئی کہانی تیار کر رہی تھیں۔ کیا تم مجھے مزید بتانا چاہو گی؟''

''نہیں۔''

☆☆☆

ٹینا کو کام کرتے ہوئے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ شروع شروع میں ڈیڈی دو تین مرتبہ اس کے ساتھ شوٹنگ پر آئے کیونکہ ٹینا کو اس فلم سے اتنا معاوضہ مل رہا تھا جو وہ مل کی ملازمت کر کے پورے سال میں بھی نہیں کما سکتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ باقاعدگی سے کام پر جا رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ٹینا کی کمائی اپنی جگہ لیکن وہ مل کی ملازمت نہیں چھوڑ سکتے جہاں سے انہیں طبی سہولیات اور ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن ملنے کی امید تھی۔

ٹینا کو سیٹ پر اکیلے رہنے میں کوئی تکلف نہیں تھا۔ جب اس کا کام نہ ہوتا تو وہ بھی دوسرے اداکاروں کی طرح اپنے آپ کو مصروف رکھتی۔ اپنی لائنیں یاد کرنے کے علاوہ وہ سیٹ پر ہونے والی دیگر سرگرمیوں کو بھی دلچسپی سے دیکھتی۔ کس طرح کیمرے ترتیب دیے جاتے ہیں۔ مائیکروفون اور لائٹس کی پوزیشن کیا ہے۔

ایک دن وہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی لنچ کر رہی تھی کہ اسے اپنے عقب میں دو آدمیوں کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں الیکٹریشن تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ''کام تو تھکا دینے والا ہے لیکن یہاں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اسے دیکھ کر ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔''

دوسرے الیکٹریشن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''واقعی شوٹنگ بُری ہے۔ خاص طور پر جب سے لینڈرو اس لڑکی پر مہربان ہوا ہے۔''

پہلے الیکٹریشن نے کہا۔ ''تم دیکھنا کل صبح وہ کُتیا سیٹ پر آ رہی ہے۔ لینڈرو کس طرح اس کے آگے پیچھے دم ہلاتا نظر آئے گا۔''

ٹینا بالکل نہ سمجھ سکی کہ وہ کسے کُتیا کہہ رہا تھا لیکن دوسرے روز لینڈرو کی بیوی مرنیڈا کو دیکھ کر اس کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ وہ طویل قامت اور سنہرے بالوں والی عورت تھی جس نے ڈھیر سارا میک اپ کیا ہوا تھا۔ اس نے بے حد چست جینز، گھٹنوں تک لمبے جوتے اور فر کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ پورے سیٹ پر ٹہل رہی تھی اور اس کی نظریں اپنے شوہر پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ بڑی دلچسپ صورتِ حال تھی۔ ٹینا ہمیشہ یہی سمجھتی آئی تھی کہ لینڈرو ایک بھاری بھرکم اور دبنگ شخص ہے لیکن اپنی بیوی مرنیڈا کی موجودگی میں وہ ڈائریکٹر کی کرسی میں سمٹ کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

کیپ نے کاغذات میز پر پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''کم آن ٹینا! کیا تم نہیں جانتیں کہ میں یہ سب تمہیں کیوں دکھا رہا ہوں۔ کیا اب بھی تم اس کی وضاحت نہیں کرو گی؟''

میں نے آہستگی سے کاغذات اس کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے اور میرا خیال ہے کہ تمہارا وقت بھی ختم ہو گیا ہے۔''

کیپ نے کاغذات اٹھائے اور بولا۔ ''نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ابھی تو ابتدا ہوئی ہے۔''

☆☆☆

آخری شاٹ کے بعد شوٹنگ ختم ہو گئی۔ اگلے روز ایک الوداعی پارٹی کا اہتمام کیا گیا۔ ٹینا بیک وقت خوش تھی اور اداس بھی۔ خوش اس لیے کہ اس نے اپنا کام بڑی خوبی سے مکمل کر دیا تھا اور اداسی کی وجہ یہ تھی کہ یہ باصلاحیت اور دلچسپ لوگ اس کے چھوٹے سے قصبے سے جانے والے تھے لیکن اسے یقین تھا کہ بالآخر وہ آئندہ ایک یا دو سالوں میں ان سے مل سکے گی۔ اسے اداکاروں اور اداکاراؤں نے اپنے

کارڈ زدیے اور کہا کہ جب بھی وہ لاس اینجلس آئے تو ان کے ساتھ لنچ ضرور کرے۔

اس رات لینڈرو نے اسے علاقے کے سب سے اچھے ریستوران میں ڈنر پر مدعو کیا۔ کھانے کے دوران میں وہ اس سے نرم لہجے میں گفتگو کرتا رہا اور ساتھ ہی وائن سے بھی شغل کرتا رہا۔ وہ جب ہوٹل واپس آئے تو لینڈرو نے اسے اپنے کمرے میں آنے کی دعوت دی اور ان کے درمیان مزید گفتگو ہوئی۔ لینڈرو اس کے کام کی بات سے متاثر نظر آ رہا تھا۔ وہ اسے یہ بھی بار بار یاد دلاتا اور اس کی تعریف بھی کرتا جاتا۔ اس کا کہنا تھا کہ ٹینا کے ساتھ کام کر کے اسے بہت مسرت ہوئی ہے۔

''ڈبلیو سی فیلڈز نے ایک دفعہ کہا تھا کہ وہ بچوں کے ساتھ کام کرنا پسند نہیں کرتا لیکن تم سے ملنے کے بعد وہ اپنی رائے تبدیل کر لیتا۔'' لینڈرو نے اس کی جانب پُرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ٹب کی پرانی تک پر ٹانگ رکھے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے وائن کا ایک اور گلاس ختم کیا اور ٹینا کے لیے بھی ایک چھوٹا سا گلاس بنایا۔ جسے اس نے ہچکچاتے ہوئے حلق میں انڈیل لیا۔

کافی دیر ہو چکی تھی۔ ٹینا نے محسوس کیا کہ اسے اب جانا چاہیے۔ لینڈرو نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے گھر چھوڑ دے گا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''کافی دیر ہو گئی، مجھے اب چلنا چاہیے۔ کیا تم واقعی مجھے گھر تک چھوڑ دو گے؟''

وہ مسکرایا اور اپنا گلاس میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''کچھ ایسی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ ٹینا! تم جانتی ہو کہ تمہاری جیسی کتنی اداکارائیں مشہور فلم ڈائریکٹر لینڈرو کے ساتھ بخوشی وقت گزارنا چاہتی ہوں گی؟''

اس نے کندھے اچکا دیے اور سوچنے لگی کہ شاید یہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ وہ ہالی ووڈ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔

لینڈرو نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور بولا۔ ''کیوں نہ پہلے ہم گرم پانی کے تالاب میں ایک ڈبکی لگا لیں۔ اس کے بعد میں تمہیں گھر لے جاؤں گا۔''

یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا اور ٹینا بھی ایک معمول کی طرح اس کے پیچھے چل دی۔ تاہم اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''لیکن میرے پاس نہانے کا لباس نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس بھی نہیں ہے۔''

☆☆☆

میں نے میز پر سے اپنی ڈاک اٹھائی اور ویٹرس کو بل لانے کے لیے کہا۔ میرا موڈ دیکھ کر وہ بولا۔ ''ابھی میرا کام ختم نہیں ہوا ہے۔''

''لیکن میں جا رہی ہوں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تم کس میگزین کے لیے کام کرتی ہو؟''

اس نے اپنی جیب سے لیمرے کا والٹ نکال کر اس میں سے میری جانب بڑھا دیا۔ اس میں ایک کارڈ رکھا ہوا تھا جس پر لکھا تھا۔ ''آپ کا دوست ہمیشہ حاضر۔ رسل ہیمنڈ، لاس اینجلس پولیس ڈیپارٹمنٹ۔''

میں نے کہا کہ میں میگزین رائٹر ہوں۔'' وہ بولا۔

☆☆☆

باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ٹینا نے اپنے جسم کو ایک سفید موٹی چادر سے لپیٹ رکھا تھا جو لینڈرو نے اسے دی تھی۔ اس نے ننگے پیروں کو ٹھنڈی زمین نے چھوا تو وہ سردی سے کپکپانے لگی۔ لینڈرو اس کے پاس آیا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ ''تم دیکھ رہی ہو بھئی کہ تالاب کا پانی کتنا گرم ہے۔ پہلے تم جاؤ۔ میں بعد میں آؤں گا۔ مجھ پر بھروسا کرو۔ تم یقین نہیں کر سکتیں کہ یہ سب کتنا اچھا محسوس ہوگا۔''

ٹینا تھوڑی سی ہچکچائی۔ وہ اسے اچھا نہیں سمجھ رہی تھی لیکن وہ لینڈرو کے سامنے اپنے آپ کو کمزور ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ایک اسمارٹ لڑکی تھی اور جانتی تھی کہ ایک بڑی فلم میں کام کرنے اور لینڈرو جیسے ہدایت کار کی مدد سے وہ ایک روشن مستقبل کی جانب بڑھ سکتی ہے۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ لینڈرو کی نظریں ہوٹل کی جانب تھیں۔ وہ تالاب کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے چادر ہٹائی اور تیزی سے پانی میں چلی گئی۔ پانی بہت گرم تھا۔ وہ ایک کونے میں رکھی گدے نما کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا پورا جسم پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف چہرہ نظر آ رہا تھا۔

لینڈرو نے مڑتے ہوئے کہا۔ ''اب اچھے بچوں کی طرح آنکھیں بند کر لو۔''

ٹینا نے آنکھیں بند کر لیں پھر اس نے لینڈرو کے قدموں کی آہٹ سنی اور وہ بھی تالاب میں کود گیا۔

''اب تم آنکھیں کھول سکتی ہو۔'' اس نے کہا۔

ٹینا نے ایسا ہی کیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ تالاب کے دوسرے کونے پر جانے کے بجائے وہ اس کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں وائن کے دو گلاس تھے۔ اس نے ایک گلاس ٹینا کو پکڑا دیا۔

☆☆☆

میں نے ایک بار پھر لیمپ کے بیچ کو غور سے دیکھا اور بولی۔ ''لیکن یہ تمہارا علاقہ نہیں ہے۔''

''میں نے اس سلسلے میں متعلقہ حکام سے اجازت حاصل کر لی ہے۔''

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

''میرا تعلق غیر حل شدہ کیسز کے یونٹ سے ہے۔''

''تم کس کیس کی تحقیقات کر رہے ہو؟''

''ٹینا!'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔''

☆☆☆

اگرچہ یہ عجیب سی بات تھی لیکن گرم پانی میں بیٹھ کر اسے بہت مزہ آرہا تھا۔ لینڈرو اس سے باتیں کر رہا تھا اور وہ بڑے غور سے سن رہی تھی۔ لینڈرو نے اسے بڑی دوڑ کے بارے میں بتایا کہ وہ کن مشکلات سے گزر کر اس مقام تک پہنچا ہے اور اب بھی وقتاً فوقتاً اس پر دورہ آتا رہتا ہے۔ ٹینا نے اپنا گلاس ختم کیا تو [illegible] گرم پانی اور شراب کا نشہ [illegible] ہو گئے تھے۔ [illegible] لینڈرو نے [illegible] اپنے بازو اس کے گلے میں [illegible] اچھا لگ رہا تھا۔

''[illegible]'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں تمہیں ایک خاص بات بتانا چاہتا ہوں۔ [illegible] یہ فلم بہت اہم ہے اور میرے [illegible] اس کی کامیابی بہت ضروری ہے۔ [illegible] اخراجات ادا کر رہا ہوں [illegible] فلم ہی مجھے اس بحران سے نکال سکتی ہے۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے مجھے اس کا موقع دیا؟''

[illegible] اور اس کے دونوں [illegible] اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ ٹینا [illegible] چڑیا کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

☆☆☆

''کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اتنی ہی احمق ہوں جتنا تم سمجھ رہے ہو؟'' میں نے کہا۔ ''تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

''سیبسٹین لینڈرو؟''

''یہ بہت پرانی بات ہے۔''

''یقیناً۔'' اس نے کہا۔ ''تقریباً تیس برس پرانی۔''

''تم کیا جاننے کی کوشش کر رہے ہو؟''

''یہی کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟''

میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''اتنے عرصے بعد گڑے مردے اکھاڑنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کس کو اس کی پروا ہو سکتی ہے؟''

''کئی ایک ہیں اور لاس اینجلس کاؤنٹی شیرف ڈپارٹمنٹ ان میں سے ایک ہے۔ تم جانتی ہو کہ قتل کی فائل کبھی بند نہیں ہوتی۔''

☆☆☆

ٹینا پانی میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ تالاب کا ٹائمر رک گیا تھا اور پانی میں بلبلے بننا بند ہو گئے تھے۔ لینڈرو نے اسے تالاب سے باہر آنے کے لیے کہا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ لینڈرو اسے برا بھلا کہتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی وہ وہیں بیٹھی رہی۔ اس نے اپنے دونوں بازو سینے کے گرد باندھ رکھے تھے اور بری طرح کپکپا رہی تھی۔ اسے رونا آرہا تھا لیکن اپنے آپ پر ضبط کیے بیٹھی رہی۔ وہ [illegible] سوچ رہی تھی [illegible] چند منٹ پہلے اس پر کیا گزر چکی تھی۔ وہ تو بس اتنا جانتی تھی کہ وہ ٹینا مر گئی جو تصویریں بناتی تھی جس نے مشہور اداکارہ بننے کا خواب دیکھا تھا جو اسکول میں ہمیشہ [illegible] رہی تھی۔ اس وقت جو ٹینا تالاب میں اپنے [illegible] بیٹھی ہوئی تھی، وہ وہاں سے [illegible] برائی [illegible] ایک [illegible] ٹینا بننا [illegible] چاہ رہی تھی۔

[illegible] ٹینا بننا چاہ رہی تھی جسے لینڈرو کے ساتھ [illegible] تھا۔ وہ دوبارہ اس [illegible] تک پہنچ گئی تھی۔

[illegible] اس نے لینڈرو کے کمرے کی طرف دیکھا۔ دروازہ [illegible] تھا۔ مرنیڈا [illegible] آ گئی تھی اور اس پر چلا رہی تھی۔ پھر وہ تالاب کی طرف آئی اور اس نے ٹینا کی طرف دیکھا۔ [illegible] خوف زدہ ہو کر دور ہٹ گئی۔ اسے ڈر تھا کہ مرنیڈا اس کے ساتھ بھی برا سلوک کرے گی لیکن وہ آندھی اور طوفان کی طرح دوبارہ کمرے میں چلی گئی اور وہاں سے چیزوں کے ٹوٹنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ ان میں ایک آواز سب سے نمایاں تھی۔

''کیا تمہیں احساس ہے کہ تم نے کیا، کیا ہے؟'' مرنیڈا نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے سب کچھ خاک میں ملا دیا ہے۔ ہم دوبارہ بننے کے کتنے قریب آ گئے تھے لیکن تم نے سب پر پانی پھیر دیا۔''

لینڈرو نے بڑبڑاتے ہوئے کچھ کہا۔ اس کے بعد مزید چیزوں کے ٹوٹنے کی آواز آئی اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ مرنیڈا آہستہ آہستہ چلتی ہوئی تالاب تک آئی۔ اس وقت بھی اس نے فر کا کوٹ، جینز اور لانگ بوٹ پہن رکھے تھے۔

اس نے کہا۔ ''کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟''
''میں گھر جانا چاہتی ہوں۔'' ٹینا دور ہٹتے ہوئے بولی۔
''ٹینا پلیز، میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔''
ٹینا نے جیسے اس کی بات نہیں سنی اور بولی۔ ''میں گھر جانا اور اپنے باپ سے ملنا چاہتی ہوں۔''

☆☆☆

کپ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''اس وقت کے سبھی اخبارات نے اس خبر کو نمایاں طور پر شائع کیا۔ 'مشہور فلم ڈائریکٹر لاپتا ہوگیا۔' اسٹیٹ پولیس، مقامی پولیس، رضا کار، سبھی اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے پھر انہیں اس کی لاش مل گئی۔ تم جانتی ہو کہاں سے؟''
''بریوسٹر چارج۔''
وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، اس کی لاش ایک پام کے درخت کے نیچے سے ملی تھی۔ اس کے چہرے پر گولی ماری گئی تھی لیکن اس کے قاتل کے بارے میں کچھ نہ معلوم ہوسکا۔ کئی ماہ بعد اس سلسلے میں کچھ پیش رفت ہوئی جب ایک ماہی گیر کو دریا کی تہ سے آلۂ قتل ملا۔''
یہ کہہ کر اس نے ایک تصویر نکالی اور میز پر رکھ کر اس کی جانب کھسکا دی۔ وہ ایک ریوالور کی تصویر تھی۔
''اسے پہچانتی ہو؟'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔
''نہیں۔''
''یہی آلۂ قتل ہے۔ کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ اسے نہیں پہچانتیں؟''
''میں نے کہا نا کہ نہیں۔ میں اسے کیسے پہچان سکتی ہوں۔''
''حالانکہ اس میں تمہیں کوئی مشکل نہیں ہونی چاہیے۔'' وہ بولا۔ ''یہ تمہارے ڈیڈی کا ریوالور ہے۔''

☆☆☆

ٹینا کپڑے پہن چکی تھی اور اب وہ مرنیڈا کی کرائے کی کار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مرنیڈا نے گاڑی ٹینا کے گھر کے سامنے کھڑی کی اور اس کا انجن بند کرتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ مجھے کتنا افسوس ہے۔ میں تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے تھوڑا سا وقت دیا۔ تم واقعی ایک بہادر لڑکی ہو۔''
''میں اپنے باپ سے ملنا چاہتی ہوں۔''
''یقیناً لیکن کیا میں تم سے کچھ باتیں کرسکتی ہوں۔''
ٹینا نے سر ہلا دیا۔ مرنیڈا نے بولنا شروع کیا۔ وہ اپنے شوہر کے بارے میں بتا رہی تھی جو باصلاحیت ہونے کے باوجود گندی ذہنیت کا مالک تھا۔ وہ اس سے بہت پہلے طلاق لے سکتی تھی لیکن اس کے مالی حالات اچھے نہ تھے، اب اس کی ساری امیدیں اس فلم سے وابستہ تھیں۔
جیسے ہی مرنیڈا خاموش ہوئی، ٹینا نے ایک بار پھر کہا۔
''میں اپنے باپ سے ملنا چاہتی ہوں۔''
اسی سمے کچھ فاصلے پر ایک گاڑی کی روشنیاں نظر آئیں۔

☆☆☆

کپ نے تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت اس ریوالور نے پولیس کو الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس میں ایک گولی کم تھی اور لیبارٹری تجزیے سے ثابت ہوگیا تھا کہ یہی آلۂ قتل ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ ریوالور کس کا ہے۔''
''معاف کرنا، میں نہیں سمجھ سکی۔ کیا یہ ریوالور رجسٹرڈ نہیں تھا؟''
''یہ امریکی نہیں بلکہ ایک نایاب قسم کا روسی ساختہ ریوالور ہے۔ اس کا نہ تو حکومت کے ریکارڈ میں کوئی اندراج ہے اور نہ ہی یہ ریوالور اسلحے کی دکانوں پر دستیاب ہے جس کی وجہ سے پولیس چکرا کر رہ گئی اور آج تک یہ کیس حل نہیں ہو سکا۔''
''اب ایسی کیا بات ہوگئی کہ تم اس ریوالور کے مالک کی تلاش میں نکل پڑے ہو؟''
''انٹرنیٹ۔'' اس نے ایک اور تصویر نکالتے ہوئے کہا۔ یہ ڈیڈی کی جوانی کی تصویر تھی جس میں وہ فوجی وردی پہنے ویت نام میں کسی محاذ پر کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ چار فوجی اور بھی تھے اور وہ سب مسلح تھے اور ڈیڈی کے ہاتھ میں ویسا ہی ریوالور تھا جس کی تصویر میرے سامنے پڑی ہے۔''
کپ نے کہا۔ ''گزشتہ سال ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس میں ہالی ووڈ کی کچھ اداکاراؤں نے اپنے تجربات بیان کیے تھے کہ کس طرح انہوں نے کئی سال تک شراب اور منشیات میں مبتلا رہنے کے بعد ایک نئی زندگی شروع کی۔ ایسی ایک دو کتابیں ہر سال شائع ہوتی ہیں لیکن یہ کتاب ان سے مختلف تھی۔ اس میں ایک اداکارہ نے اعتراف کیا تھا کہ اس کے مسائل اس وقت شروع ہوئے جب لینڈرو نے اس کے ساتھ زیادتی کی جبکہ اس کا کیریئر ابھی شروع ہی ہوا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد مزید دو اداکاراؤں نے بھی لینڈرو پر ایسے ہی الزامات عائد کیے۔''
''میں یہ سب اچھی طرح جانتی ہوں اور اس پر کوئی

تبصرہ نہیں کرنا چاہتی لیکن تم یہ سب مجھے کیوں سنا رہے ہو؟''

''اس سے میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ وہ اداکارہ تمہارے علاوہ کون ہو سکتی ہے اور لینڈرو کو قتل کس نے کیا ہو گا؟'' اس نے ڈیڈی کی تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے باپ نے۔ کیا تم جانتی ہو کہ وہ ویت نام میں کیا کرتے رہے ہیں؟''

''وہ سپاہی تھے۔''

''صرف سپاہی نہیں بلکہ اس سے زیادہ۔ وہ دشمن کی صفوں میں گھس کر ریکی کرتے اور پھر اپنے ساتھیوں کو حملے کے لیے بلاتے۔ یہ بڑی بہادری اور جان جوکھوں کا کام تھا۔''

میں نے باپ کی تصویر پر نظر ڈالی۔ وہ مجھ سے جنگ کے بارے میں بہت کم باتیں کرتے تھے۔ اس بارے میں میری معلومات برائے نام تھیں۔ میں نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میرے ڈیڈی کو پر کوآپر یٹو پیپر مل میں کنٹرولر تھے۔''

اس نے ایک بار پھر تصویر پر انگلی رکھی اور بولا۔ ''وہ بہت ہی سخت جان تھے۔ انہوں نے ویت نام میں امریکی فوج کی پانچویں اسپیشل فورس کے اسکول میں تربیت حاصل کی اور بڑی کامیابی سے اپنے فرائض ادا کیے۔ جب وہ کوئی مشن مکمل کر کے واپس آتے تو ان کے پاس دشمن کے ہلاک ہونے والے سپاہیوں کا اسلحہ بھی ہوتا، یہ ہتھیار روسی ساختہ اور نایاب تھے۔ بالکل اس ریوالور کی طرح جو تم فوٹو میں دیکھ رہی ہو اور اسی ریوالور سے لینڈرو کو قتل کیا گیا۔''

''تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے؟''

''ہاں اور آج شام تک اسٹیٹ پولیس میری درخواست پر تمہارے باپ کو گرفتار کر لے گی لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تم اعتراف کرلو۔''

☆☆☆

گاڑی کی روشنی اب قریب آتی جارہی تھی۔ ٹینا کے اندر اچانک ہی غصے کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے مرنیڈا سے کہا۔ ''اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے کہ ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔''

مرنیڈا نے آہستہ سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولی۔ ''ہمیں مزید بات کرنی چاہیے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''میں نے کبھی اپنے باپ سے جھوٹ نہیں بولا اور اب بھی ایسا نہیں کر سکتی۔''

مرنیڈا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں سمجھ رہی ہوں۔ تمہیں جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

☆☆☆

''کیسا اعتراف؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہیں اعتراف کرنا ہوگا کہ یہ قتل تمہاری وجہ سے ہوا۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ جب تم نے اپنے باپ کو بتایا کہ لینڈرو نے تمہارے ساتھ کیا زیادتی کی... تبھی وہ اس کے پیچھے گیا ہوگا اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تم دونوں باپ بیٹی نے ہی مل کر اسے کسی طرح ہوٹل سے باہر نکالا اور جائے وقوعہ تک لے آئے۔''

میں نے اپنا منہ بند رکھا اور پُرسکون رہنے کی اداکاری کرتی رہی۔ کیپ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم ہرگز یہ نہیں چاہوگی کہ تمہارا باپ گرفتار ہو، اس پر مقدمہ چلے اور اسے لینڈرو کو قتل کرنے کے الزام میں سزا ہو البتہ اگر تم اعتراف کرلو تو تمہارے باپ کے ساتھ نرمی ہو سکتی ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اسے کم سے کم سزا ہو بشرطیکہ عدالت کو یہ باور کرایا جائے کہ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر خود پر قابو نہ رکھ سکا اور اس نے اشتعال کے عالم میں اس ریوالور سے لینڈرو کو قتل کر دیا۔''

''یقیناً۔'' میں نے طنزاً کہا۔ ''میں تصور کر سکتی ہوں۔ تم غیر حل شدہ مقدمات کے یونٹ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر یہ کتاب منظر عام پر آئی۔ تم نے اس پر تھوڑی سی ریسرچ کی، انٹرنیٹ کا سہارا لیا اور یہ امید ہوگئی کہ تم تیس سال پرانا کیس حل کر کے اپنے ساتھیوں اور دوستوں کو متاثر کر سکو گے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟''

وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ''میں کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ اب میں تمہیں حقیقت بتاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے ڈینا کو آواز دی جو کیش رجسٹر پر جھکی ہوئی تھی۔

''کیا بات ہے ہنی؟'' اس نے پوچھا۔

''ذرا وہ تصویر تو لانا اور ساتھ میں بل بھی۔''

☆☆☆

ٹینا ایک درخت کے ساتھ کھڑی اب بھی کپکپا رہی تھی۔ گلابی رنگ کا بیگ اس کے کاندھے پر لٹکا ہوا تھا۔ کار اس کے قریب آ کر رک گئی۔ اس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک ہیولا باہر نکلتا نظر آیا۔ اسے

مرنیڈا سے کہے ہوئے الفاظ یاد آئے جو اس نے بار بار دہرائے تھے۔ ''میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔''

''ٹینا ڈیئر! کیا یہ تم ہو؟'' ایک مردانہ آواز آئی۔

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔

مرد اس کے قریب آ گیا۔ ٹینا نے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور اس کی جلد نے ریوالور کے ہینڈل کی ٹھنڈک محسوس کی۔

''ٹینا!'' لینڈرو نے کہا۔ ''کتنی عجیب بات ہے۔ میرا مطلب ہے تم میرے دروازے کے نیچے سے یہ خط ڈال کر چلی آئی تھیں۔ تم سے مل کر بہت خوشی محسوس کر رہا ہوں۔''

''اور میں بھی۔'' یہ کہہ کر ٹینا نے ریوالور باہر نکال لیا۔

☆☆☆

[illegible] ایک بڑی سی فریم شدہ تصویر سے آئی جو اس کے [illegible] دیوار پر آویزاں تھی۔ یہ تصویر مقامی فٹ بال کے [illegible] کی تھی جو کئی سال پہلے کھینچی گئی تھی۔ میں نے وہ [illegible] ''یہ رودالفو [illegible] [illegible] کے موقع پر لی [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جس رات لینڈرو کا قتل ہوا، میرے ڈیڈی اپنی ٹیم کی فتح کا جشن تین تا ڈان دور منا رہے تھے اور انہیں وہاں بیس سے زیادہ لوگوں نے دیکھا ہوگا۔''

☆☆☆

ٹینا ساکت کھڑی ہوئی تھی۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔ لینڈرو نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ ٹینا بولی۔ ''تم صرف یہ بتا دو کہ تم نے ہوٹل واپس آنے کے بعد کیا کہا تھا۔ یہی کہ تم مجھے اسٹار بنا دو گے اور جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو اپنی بیوی کو چھوڑ دو گے۔ کیا وہ سب سچ تھا؟''

لینڈرو سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں ہنی، وہ سب سچ تھا۔''

ٹینا نے اپنے عقب میں ایک آہٹ سنی لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی اور نہ ہی خوف زدہ ہوئی۔ مرنیڈا جھاڑیوں سے نمودار ہوئی اور ٹینا کے برابر میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے آہستہ سے ریوالور ٹینا کے ہاتھ سے لیا اور اپنے شوہر پر گولی چلا دی۔ پھر وہ مڑی اور اس نے وہ ریوالور دریا میں پھینک دیا۔

ٹینا نے پوچھا۔ ''اب کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ بڑے اطمینان سے بولی۔ ''لینڈرو کے انشورنس کی جو رقم ملے گی، اس سے ہم فلم کی ایڈیٹنگ کروائیں گے۔ تمہارے ڈیڈی کا نام پروڈیوسرز میں شامل کر لیا جائے گا۔ اس طرح فلم کے کامیاب ہونے کی صورت میں تمہیں اچھی خاصی آمدنی ہو جائے گی۔''

ٹینا ایک بار پھر کپکپانے لگی۔ مرنیڈا نے پوچھا۔ ''اب کیا کریں؟''

ٹینا نے کہا۔ ''کیا تم مجھے گھر تک چھوڑ دو گی؟''

☆☆☆

ڈیٹا تصویر سے [illegible] اور اس نے اسے اپنی جگہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

''چھ سال کی تھی جب اعشاریہ 3/2 کا ریوالور چلایا۔ دس سال کی عمر میں پہلی بار رائفل چلائی۔''

اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے دوبارہ کہا۔ ''شاید میں غلط آدمی پر شک کر رہا تھا۔''

اس کا اشارہ واضح طور پر میری جانب تھا۔ دوسرے الفاظ میں وہ یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے اپنے باپ کے ریوالور سے لینڈرو پر گولی چلائی ہوگی۔ میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم جو کچھ کہہ رہے ہو اسے ثابت بھی کرو۔ میرے پاس چھپانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

''کیا ہوا اگر میں نے اداکاری چھوڑ دی۔ بہرحال میں ایک اداکارہ تو تھی۔''

آئینے کا سچ

تنویر ریاض

ماہ و سال کی گردشوں سے کوئی نہیں بچ سکا... وقت کا تغیر ہر کسی کو جھیلنا پڑتا ہے... مگر بسا اوقات اس کے گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا... اور ایک دن اچانک ہی آئینہ احساس دلاتا ہے کہ پلوں کے نیچے سے کتنا پانی گزر چکا ہے... حقیقت و آگاہی کا اور سچ کا احساس دلانے والا آئینہ ہی اصل پیمانہ ہے... سب کچھ عیاں کردینے والا...

خاندانی وقار اور محبت کی آہٹ بنتے والے قصے کے کرداروں کا انجام

آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ ممکن ہے کہ یہ سو فیصد سچ ہو یا اس میں کچھ مبالغہ ہو سکتا ہے۔ میں نے کبھی یہ جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن اس روز بیدار ہوتے وقت کلارا کے بستر کے پاس لگے ہوئے آئینے میں اپنا اور اس کا عکس دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی آئینے سے کچھ چھپانا ممکن نہیں۔ اس میں وہ سب کچھ نظر آجاتا ہے جو بعض اوقات ہم خود نہیں دیکھ پاتے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم آئینے کو پلٹ نہیں سکتے۔ میں نے کلارا کو بستر سے اٹھتے اور انگڑائی لیتے دیکھا۔

س نے مجھے دیکھا اور مسکرا دی۔ اس مسکراہٹ میں بہت کچھ تھا۔ محبت، پچھتاوا اور سب سے بڑھ کر رضامندی۔ وہ جانتی تھی کہ ہم ٹوٹ رہے ہیں اور اس نے پسپائی اختیار کر لی۔ کچھ کہے اور لڑے بغیر۔ یقیناً اس میں اداسی بھی تھی لیکن ساتھ ہی یہ اطمینان بھی کہ اس کا انتظار ختم ہوا۔ یہ ایک خودکش مسکراہٹ تھی جو گولی نگلنے سے پہلے نمودار ہوتی ہے۔

کلارا کے باتھ روم میں نہانے کے دوران یہی احساس مجھے ستاتا رہا اور میں اسے خدا حافظ کہے بغیر چلا آیا۔ میں اس سے اتنا ہی ناراض تھا جتنا کسی عورت سے ہوا جا سکتا تھا۔ میری پارٹنر زینا ریڈنف، دفتر میں انتظار کر رہی تھی جو ہوز رسینٹر میں واقع تھا اور میں ان دنوں مشی گن پولیس ڈپارٹمنٹ کے میجر کرائمز یونٹ سے وابستہ تھا۔ یہ ایک احساس سے عاری جگہ تھی جہاں دو لوہے کی سلیٹی رنگ کی میزیں، ایک شیشے کے کیبن میں آمنے سامنے رکھی ہوئی تھیں۔ زینا جیسی سخت اور مضبوط عورت میں نے زندگی میں نہیں دیکھی۔ اس میں نسوانیت نام کو نہیں تھی۔ وہ کسی اینٹ کی طرح مستقبل اور سخت تھی اور ہمیشہ مسلح رہتی۔ اس کے ہولسٹر میں سروس آٹومیٹک ریوالور کے علاوہ بیک اپ کے طور پر اسمتھ اینڈ ویسن بھی ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے موزے میں ایک چاقو بھی رکھتی تھی یہاں تک کہ اس کا لباس بھی ایسا ہوتا جیسے وہ لڑنے جا رہی ہو۔ سیاہ جینز، سیاہ ٹی شرٹ، سیاہ پولیس جیکٹ، اس نے اپنے چمکدار سیاہ بال لڑکوں کی طرح چھوٹے کروا رکھے تھے۔

''ہائے بائی۔'' اس نے کہا پھر میرے چہرے کو پڑھتے ہوئے اس نے اپنے لیپ ٹاپ کی اسکرین میری جانب گھما دی۔ جس میں ایک کار کھڑی نظر آ رہی تھی لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں دیکھ سکا۔ اس کا ونڈ شیلڈ برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ ''یہ قتل کی واردات ہے۔''

''گڈ'' میں نے طنزاً کہا۔

وہ ایک سلور کلر کی بی ایم ڈبلیو تھی جو وائل بیلا کے پرانے ملاتے روز ویلٹ ڈرائیو میں کھڑی تھی۔ جہاں زیادہ تر تین چار منزلہ وکٹورین طرز کے مکان تھے جو پہلی جنگ عظیم سے پہلے بنائے گئے تھے۔ سردی کی وجہ سے ان کے برف سے ڈھکے ہوئے لان ویران پڑے ہوئے تھے جیسے وہاں کوئی نہ رہتا ہو۔ اس سرد موسم کے باوجود ڈرائیور کی طرف والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور وہ اسٹیئرنگ وہیل پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی کنپٹی میں گولیوں کے دو نشان نظر آ رہے تھے اور ان کے گرد چار کول کے جلنے سے دائرے بن گئے تھے۔ زینا نے میرے چہرے کے تاثرات پڑھ لیے اور بولی۔ ''کیا ہوا ڈیلن؟''

''میں اس شخص کو جانتا ہوں۔'' میں نے اعتراف کیا اور شاید اسے بھی جس نے اسے قتل کیا ہے۔''

''اوکے۔'' وہ محتاط انداز میں تائید کرتے ہوئے بولی۔ ''عام حالات میں یہ ایک اچھی بات ہوتی لیکن اس مرتبہ نہیں، یہ کون ہے؟''

''یہ بلیک اسٹین نامی ایک وکیل ہے۔ اس شہر میں نیا ہے اور یہ چھ سات ماہ پہلے یہاں آیا تھا۔ زیادہ تر چھوٹے موٹے منشیات اور طلاق کے مقدمات لیتا تھا۔''

''تم ایک ایسے وکیل کو جانتے ہو جو طلاق کے مقدمات لیتا ہے۔ کہیں تمہارے اور کلارا کے بیچ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگئی۔ اگر ایسی بات ہے تو مجھے معلوم ہونا چاہیے۔''

وہ اپنی دانست میں مذاق کر رہی تھی لیکن میری آنکھوں میں غصہ دیکھ کر بولی۔ ''اچھا، تم اسے جانتے ہو مگر کیسے؟''

''دس روز پہلے میں جیوری ان، میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ریستوران عدالت کے سامنے سڑک کی دوسری طرف ہے اور یہاں زیادہ تر پولیس والے، وکیل اور میڈیا کے لوگ آتے ہیں۔ میں ایک کونے کے بوتھ میں بیٹھ ناشتا کر رہا تھا کہ ایک شخص سوٹ میں ملبوس میرے سامنے والی بینچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ دیکھنے میں وہ پولیس والا کیس لگ رہا تھا۔ لمبا، دبلا اور اسٹائلش۔ سلیقے سے بنے ہوئے بال، تراشیدہ ناخن، وہ یقیناً ایک وکیل تھا۔

''مراغ رساں لاکروز۔'' اس نے بولنا شروع کیا۔ ''میرا نام بلیک اسٹین ہے اور میں تمہارے کزن اینڈری کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''اب اینڈری نے کیا کر دیا؟'' میں نے بیزار کن لہجے میں کہا۔ ''میں اس کی حرکتوں سے تنگ آ چکا تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے بلکہ ایک ذاتی معاملہ ہے۔ میں مارلے اینڈ بینس میں وکیل ہوں اور آٹھ ماہ سے نام مارلے کے ساتھ کام کر رہا ہوں لیکن طلاق اور منشیات کے مقدمات میں پھنس کر رہ گیا ہوں۔ مجھے شکاگو کی ایک فرم سے بہتر پیشکش ہوئی ہے اور میں جلد ہی وہاں جانے والا ہوں لیکن اس میں ایک مسئلہ ہے۔''

''ایک اچھی پیشکش میں کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟'' میں نے کہا۔

''میں تمہارے کزن کی سابق گرل فرینڈ ٹریسی سے

ملتا رہا ہوں۔''

''ٹریسی اس کے لیے گرل فرینڈ سے کچھ زیادہ تھی۔ وہ دو سال اکٹھے رہے۔ ان کی ایک بیٹی بھی ہے۔''

''مینڈی بہت پیاری بچی ہے۔ ہم اتنے قریب آچکے ہیں کہ جب میں نے ٹریسی سے اپنے ساتھ شگاگو چلنے کے لیے کہا تو وہ فوراً تیار ہوگئی۔''

میں نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ٹریسی اور مینڈی کو اپنے ساتھ شگاگو لے جانے کا پروگرام بنایا ہے؟''

''یہ سب لوگوں خاص طور پر مینڈی کے حق میں بہتر رہے گا۔ شگاگو کے اسکول، ہرن کے شکار کے سیزن کے پہلے روز بھی بند نہیں ہوتے۔''

''تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے یہ کوئی بڑی بات ہے۔''

''مہذب معاشرے میں یقیناً ایسا نہیں ہوتا۔ ہرن کے شکار سے بچوں کا کیا تعلق۔ اور ویسے بھی بڑے شہر میں مینڈی کے بیک گراؤنڈ کے حوالے سے کم مسائل ہوں گے۔ تم جانتے ہو کہ لڑکیاں کتنی حساس ہوتی ہیں۔''

''کیا مینڈی کے بیک گراؤنڈ کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''میں کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا لیکن مینڈی کو زندگی میں ایک مناسب شروعات دینا چاہتا ہوں۔''

''ایسی زندگی جو ورکنگ کلاس کے برعکس ہو، تم وکیل ہو پھر بھی کام کرتے ہو۔''

''لیکن اس میں ہاتھ سے محنت نہیں ہوتی۔'' اس نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

''بہت سے لوگ ہاتھ سے کام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ میرا باپ درخت کاٹتا اور بیچتا تھا۔ اس نے زندگی کا بیشتر حصہ آری چلاتے ہوئے گزار دیا۔ میں نے خود بھی آری چلائی ہے۔''

''میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ ''تم اپنے بیک گراؤنڈ سے باہر آئے اور اپنی زندگی کو بہتر بنایا۔ تمہارے پاس ایک ڈگری ہے۔ تم جب گھر آتے ہو تو تمہارے ناخنوں میں گرد نہیں ہوتی۔''

یہ کہہ کر اس نے ویٹرس کو مزید کافی لانے کا اشارہ کیا۔ اسٹین نے مجھ پر کافی ہوم ورک کیا تھا۔ میں نے پولیس سائنس میں ڈگری لی تھی اور میرے ناخنوں میں گرد نہیں ہوتی تھی لیکن اس کے باوجود وہ میرے بارے میں بہت سی باتیں نہیں جانتا تھا۔ میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''کیا تم نے اینڈری سے ٹریسی اور مینڈی کو یہاں سے لے جانے کی بات کی ہے؟''

''میں تمہارے کزن اینڈری سے صرف ایک بار ملا ہوں اور وہ کوئی خوشگوار ملاقات نہیں تھی۔''

''مجھے یہ سن کر حیرت نہیں ہوئی۔ اینڈری، وکیلوں کی زیادہ پروا نہیں کرتا۔''

''درحقیقت وہ ایک سٹی کونسلر پر حملہ کرنے کے الزام میں جیل جاچکا ہے۔''

''اس نے دو سپاہیوں سے بھی جھگڑا کیا تھا۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''لیکن یہ کئی سال پرانی بات ہے۔ اُس وقت وہ ایک گرم دماغ نوجوان تھا۔ اس کے نتیجے میں اسے اٹھارہ مہینے کی سزا ہوئی تھی۔''

''وہ دوبارہ بھی اندر جاسکتا ہے۔ میری فرم کے سراغ رساں کو ایسی علامات ملی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مجرمانہ سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔ وہ کئی بار کینیڈا جاچکا ہے اور اس کی آمدنی کا کوئی حساب نہیں ہے جبکہ وہ کوئی باقاعدہ کام بھی نہیں کرتا۔''

''وہ نو سے پانچ کام کرنے والا شخص نہیں ہے۔ مختلف کام کرتا رہتا ہے مثلاً لکڑیاں کاٹنا، ٹرک چلانا اور مچھلیاں پکڑنا۔ بعض اوقات اسے وہ کام بھی کرنا پڑتے ہیں جو کتابوں میں درج نہیں ہیں۔''

''گویا تم یہ دعویٰ کررہے ہو کہ تمہیں اس کی کسی بھی غیر قانونی سرگرمی کا علم نہیں ہے۔''

''میں نے کوئی دعویٰ نہیں کیا لیکن قانوناً اپنے کسی رشتے دار کی تحقیقات نہیں کرسکتا۔ البتہ تم اپنا شوق پورا کرسکتے ہو۔''

اس نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے اندرونی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور میز پر رکھ دیا۔

''یہ کیا ہے؟''

''یہ ایک مخلصانہ پیشکش ہے۔ اس طرح ہم سب اس صورت حال سے نکل کر آگے بڑھ سکیں گے۔ اس رقم کو تم اور اینڈری آپس میں کس طرح تقسیم کرتے ہو، یہ تمہارا دردسر ہے۔ تمہیں اینڈری کو قائل کرنا ہوگا کہ وہ ٹریسی اور مینڈی کو کسی رکاوٹ کے بغیر جانے دے۔''

''تم چاہتے ہو کہ میں اینڈری کو رشوت دوں؟''

''وہ پہلے بھی پیسے لیتا رہا ہے اور ان دنوں اس کی مالی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے میں ایک معقول رقم کی

''مجھے تحفظ نہیں چاہیے ڈیلن۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔''

''اس علاقے کے آدھے سے زیادہ لوگ یہی کہیں گے کہ وہ بے گناہ ہیں۔ بعض اوقات یہ سچ بھی ہوتا ہے لیکن تم ان لوگوں میں نہیں ہونا چاہو گے۔ اس کے لیے تمہیں ایسے شخص کی ضرورت پڑے گی جو جائے واردات سے تمہاری غیر موجودگی کی گواہی دے سکے۔''

''اوہ میرے خدا! کیا تم واقعی یہ سمجھ رہے ہو کہ یہ قتل میں نے کیا ہے؟''

میں ہچکچایا اور مناسب جواب تلاش کرنے لگا۔

اینڈری سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اس سے پچاس ہزار ڈالر لیے تھے تاکہ اس کے راستے کی رکاوٹ نہ بنوں۔ وہ میں نے چار دن پہلے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیے تھے۔''

''اسٹین نے تمہیں رشوت دی اور تم نے اسے قبول کر لیا؟''

''ہاں، میں نے ٹریسی کے ساتھ دو سال گزارے۔ وہ ایک اچھی عورت تھی لیکن اس کے ساتھ پوری زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔''

''کوئی بات نہیں۔ اسٹین کے پیسوں سے تمہاری مالی حالت بہتر ہو جائے گی لیکن شاید یہ کافی نہ ہو۔ اگر تمہارے ڈیڈی جائے وقوعہ سے تمہاری غیر موجودگی کی گواہی دے دیں تو تمہارا کیس مضبوط ہو جائے گا اور شبے کی گنجائش نہیں رہے گی۔''

''میں دیکھ رہا ہوں کہ صرف تم ہی مجھ پر شبہ کر رہے ہو۔ بہتر ہے کہ میں واپس جوئے کی میز پر چلا جاؤں۔ اس سے پہلے کہ مچھلی ہاتھ سے پھسل جائے۔''

☆☆☆

مارلے اینڈ بیٹس کا دفتر دریا سے چند بلاک کے فاصلے پر شمال کی جانب واقع تھا۔ دروازے پر صرف 'مارلے' کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ بیٹس، اس کے باپ کا پارٹنر تھا، اس کا انتقال اسّی کی دہائی میں ہو گیا تھا لیکن قصبے کی روایات کے مطابق اس کا نام قانونی فرم سے جڑا رہا۔ میں تنگ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کمرے کے وسط میں پڑی میز پر بیٹھے سفید قمیص اور ٹائی لگائے ایک شخص نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا۔

''نومی، تم کیسے ہو؟''

''ڈیلن! میں پاگل ہو جاؤں گا۔'' نومی اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آیا اور گرم جوشی سے مصافحہ کرنے کے بعد بغل گیر ہو گیا۔

''تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی۔'' وہ اپنی جگہ واپس جاتے ہوئے بولا۔ اس کا وزن مجھ سے چالیس پونڈ زیادہ تھا۔ اس کا سر درمیان سے گنجا لیکن اطراف کے بال سلیقے سے جمے ہوئے تھے۔ اس کی مسکراہٹ بھی پہلے جیسی تھی۔ بس نام بدل گیا تھا۔ پہلے وہ نومی باریسکی تھا اور اس نے میرے ساتھ کلب ہاکی کھیل رکھی تھی پھر وہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے شکاگو چلا گیا۔ دس سال بعد گھر واپس آ کر اس نے نومی مارلے کے نام سے اپنے باپ کا دفتر سنبھال لیا۔

''میں نے سنا تھا کہ تم واپس آ گئے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے حیرانی ہوئی کیونکہ اسکول کے زمانے میں تم ہر وقت اس قصبے سے جانے کی بات کیا کرتے تھے۔''

''میں نے ڈگری حاصل کرنے کے بعد نیومیکسیکو کی تاؤس کاؤنٹی میں کوشش کی تھی لیکن وہ بڑی فضول جگہ ہے۔ اس صحرا میں اگر آپ کتے کو ٹہلانے لے جائیں اور اتفاق سے راستہ بھول گئے تو ایک گھنٹے میں آپ کی موت واقع ہو جائے گی۔''

''یہ تو یہاں بھی ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''سردی میں ٹھٹھر کر مرنا، سانپ کے کاٹنے یا لُو لگنے کے مقابلے میں آسان ہے۔'' نومی دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ''جب ڈیڈی بیمار ہوئے تو مجھے اس آفس کو سنبھالنے کے لیے آنا پڑا لیکن میری بیوی ماریا نہیں آئی۔ وہ تاؤس میں رک گئی۔''

''معاف کرنا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔ بات کیا ہوئی تھی؟''

''اس نے کہا کہ وہ اپنے آپ کو دریافت کرنا چاہتی ہے۔ میں اس کی بات نہیں سمجھ سکا۔ اس کے بارے میں آخری بار یہ سنا کہ وہ کسی یوگا انسٹرکٹر کے ساتھ دیکھی جا رہی ہے۔''

''یہ تو تم نے بہت بری خبر سنائی۔'' میں نے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔

نومی کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''آج کل آدھی سے زیادہ شادیاں اسی طرح ناکام ہو رہی ہیں۔ یہی میری دردناک کہانی ہے، تم کیسے آئے؟''

''بلیک اسٹین۔'' میں نے کہا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہاں، یہ اچھا نہیں ہوا۔'' وہ اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ وہ یہاں سے جائے۔ ہم کالج میں بھائیوں کی طرح تھے۔ اس سے گزشتہ برس ایک کنونشن میں ملاقات ہوئی۔ وہ کارپوریٹ فرم میں کام کر کے اکتاہٹ محسوس کر رہا تھا اور اسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ وہ امیر گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور شاید یہی اس کا مسئلہ تھا۔''

''کیسا مسئلہ؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا خاندانی پس منظر۔ میرا خیال تھا کہ اسے اپنے ساتھ ملانے سے ہمیں کچھ بڑے گاہک مل جائیں گے لیکن وہ یہاں کے منتخب کلب میں شگاف نہیں ڈال سکا۔''

''زیادہ تر لوگ نسل در نسل خاندانی وکیلوں پر ہی بھروسا کرتے چلے آئے ہیں۔ ان کے آپس میں پرانے تعلقات ہیں۔ اس کے لیے صرف امیر ہونا ہی کافی نہیں۔''

''میں نے اپنا نام ماریسکی سے مارلے کر لیا لیکن اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مجھے بلیک اسٹین سے بڑی امیدیں تھیں لیکن...'' وہ پھٹ پڑا اور غصے سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''تم بلیک کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''وہ مر چکا ہے ٹام۔''

''کیا؟'' اگر مجھے ٹومی پر کوئی شبہ تھا تو وہ فوری طور پر ختم ہو گیا۔ وہ سکتے کی کیفیت میں چلا گیا۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ اسے کرسی میں آرام سے بٹھایا۔ ایک منٹ بعد اس کے حواس بحال ہوئے تو وہ بولا۔ ''یہ کیسے ہوا؟''

''اسٹین کو روز ویلٹ ڈرائیو پر اس کی کار میں کسی نے گولی مار دی۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ جانتا ہوں کہ تم اس کے کلائنٹ کے بارے میں بات نہیں کر سکتے لیکن ہم ابھی تک کچھ معلوم نہیں کر سکے۔''

''تمہیں تو بہت کچھ معلوم ہونا چاہیے تھا۔'' وہ سنگدلی سے بولا۔ ''اسٹین تمہارے کزن کی سابق محبوبہ سے ڈیٹنگ کر رہا تھا بلکہ اس کے ساتھ قصبے سے جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔''

''ان کے درمیان معاملات طے پا گئے تھے۔''

''کیا واقعی؟ اور اب اسٹین قتل کر دیا گیا۔ کیا یہ محض اتفاق ہے؟''

''ایسا نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''پھر حقیقت کیا ہے ڈیلن؟ ہم اسی قصبے میں پلے بڑھے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ یہاں کس طرح رہا جاتا ہے۔ اسٹین نے کبھی ان باتوں کا خیال نہیں کیا۔ وہ ایسے کیس لیتا رہا جو اسے نہیں لینے چاہیے تھے۔ جب اس نے اینڈری کی سابق محبوبہ سے ڈیٹنگ شروع کی تو میں جانتا تھا کہ وہ اسے کبھی حاصل نہیں کر سکے گا۔ تم یہاں کے رہنے والے ہو اور تمہیں معلوم ہے کہ کس راستے پر نہیں جانا چاہیے۔ اسٹین شگاگو میں پلا بڑھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ یہاں کے بارے میں کتنا جانتا تھا۔''

''کچھ زیادہ نہیں۔'' میں نے کہا۔

گھر واپس آتے ہوئے میں ٹومی کے بارے میں سوچ رہا تھا جو نام تبدیل کرنے کے باوجود یہاں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس طرح کے قصبوں میں جغرافیائی محل وقوع کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ آپ کہاں پیدا ہوئے تھے۔ کس خاندان سے تعلق ہے وغیرہ وغیرہ۔ کسی کو اس سے غرض نہیں کہ آپ نے کالج میں کون سا گریڈ لیا یا اپنے لیے کس کیریئر کا انتخاب کیا۔ ٹومی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ صرف پیسوں کے ذریعے اسٹین یہاں فٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ یہاں کا رہنے والا نہیں تھا اور اس نے ایک ایسی فرم میں نوکری کر لی تھی جو دریا کے دوسرے کنارے پر تھی۔

اسٹین نے اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کیا اور ایک ایسی عورت سے تعلقات استوار کر لیے جس کی ایک بچی بھی تھی۔ شاید اسی وجہ سے وہ میرے کزن کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہو۔ اینڈری کے مزاج میں غصہ بہت تھا۔ لڑکپن میں ہم دونوں میں تقریباً روزانہ باکسنگ کرتے اور ہاکی کھیلتے ہوئے بھی لڑائی ضرور ہوتی تھی۔ اینڈری کے باپ نے بھی اپنی بیوی اور اس کے محبوب کو مار دیا تھا۔ اینڈری اسی باپ کا بیٹا ہے لیکن اس پر شبہ کرنے میں دو باتیں حائل تھیں۔ اینڈری کا کہنا تھا کہ اس نے اسٹین سے پیسے لے لیے تھے تاکہ وہ ٹریسی کو اپنے ساتھ لے جائے۔ اینڈری کے بیان کی تصدیق اس کا بینک اکاؤنٹ چیک کر کے ہو سکتی تھی۔ دوسری بات یہ کہ میں نے ساری زندگی اسے کسی لڑکی کے لیے لڑتے ہوئے نہیں دیکھا تھا بلکہ لڑکیاں تو اس پر مرتی تھیں۔ اس لیے اس کا امکان بہت کم تھا کہ وہ ٹریسی کی خاطر اسٹین کو قتل کر دیتا۔

کیا میں یہ فرض کر لوں کہ اینڈری، ٹریسی کے جانے پر مشتعل ہو گیا ہو کیونکہ اس نے بھی آئینے میں وہی کچھ دیکھا جو میں اپنے طور پر محسوس کر رہا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے اس مسئلے کو حل کرنے کے بارے میں سوچا اور میرے قدم بلیئر سینٹر کی طرف بڑھ گئے جو خصوصی توجہ کے طالب

علموں کا اسکول تھا۔ کلارا کے کلاس روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور مجھے اس کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اسی وقت گھنٹی بجی اور طالب علم کلاس روم سے باہر آنے لگے جب سب لوگ چلے گئے تو میں اندر داخل ہو گیا۔ کلارا اپنی میز پر خاموش بیٹھی کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ مجھے وہاں دیکھ کر حیران ہو گئی۔ اس نے سفید لیب کوٹ پہن رکھا تھا اور کچھ مضمحل نظر آ رہی تھی جیسے اس کی نیند پوری نہ ہوئی ہو۔

''ہائے۔'' وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''مجھے امید نہیں تھی کہ تم آؤ گے۔ دراصل میں ڈر رہی تھی۔''

''تم مجھ سے بات کرتے ہوئے ڈرتی ہو؟ کب سے؟'' میں نے کلاس روم کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس صرف تیس منٹ ہیں۔'' اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کافی مشین کونے میں ہے۔''

''نہیں شکریہ۔'' میں نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

''ہم ایک دوسرے سے دور ہو رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں اسے محسوس کر سکتا ہوں۔''

''ہم اس مسئلے کو تیس منٹ میں حل نہیں کر سکتے۔''

''ہم پانچ منٹ میں اسے لپیٹ سکتے ہیں۔ صرف یہ کہہ دو کہ ایسا نہیں ہو رہا۔''

وہ کچھ نہیں بولی۔ میرا دل ڈوبنے لگا جیسے کوئی تیز رفتار لفٹ نیچے کی جانب جا رہی ہو۔

میں نے مایوسی سے سر ہلایا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہم کہاں رہیں گے؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

''کیا؟''

''تم ایک سال پہلے میرے پاس آئے تھے اور ہم نے شادی کے بارے میں بات کی تھی۔''

''ہاں میں نے اس بارے میں بات کی تھی۔'' میں نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ''تم صرف سن رہی تھیں۔''

''تم میری بات نہیں سن رہے ڈیٹن۔ میں نے پوچھا ہے کہ ہم کہاں رہیں گے۔ کسی پرانی آبادی میں جہاں سب لوگ میری عمر کے ہوں گے اور وہاں کوئی بچہ بھی نہیں ہوگا۔ مجھے یاد دلانے کے لیے کہ میں تمہیں اولاد نہیں دے سکتی یا کسی ایسے علاقے میں جہاں نوجوان فیملیز رہتی ہوں اور بچوں کی بہتات ہو تاکہ تم ان کی کمی محسوس نہ کرو۔''

''میرے لیے بچوں کا نہ ہونا کوئی مسئلہ نہیں کلارا۔''

''ممکن ہے کہ ابھی نہ ہو لیکن میں جانتی ہوں کہ تمہیں اپنے خاندان پر کتنا ناز ہے۔ ایک نہ ایک دن تمہارے دل میں بھی یہ خواہش سر اٹھا سکتی ہے کہ تمہارے بھی بچے ہوں۔''

''سارا الزام مجھے مت دو۔ میں کوئی وہمی انسان نہیں ہوں۔''

''نہیں، تم میری محبت ہو۔ اس لیے یہ بہت ضروری ہے کہ ہم صحیح فیصلہ کریں۔''

''کیا ہمیں اس لیے علیحدہ ہو جانا چاہیے کہ ہمارے درمیان سب کچھ ٹھیک ہے۔ تم غلط سوچ رہی ہو۔ ہمیں انسان ہونا چاہیے کہ یہ پاگل پن ہے۔''

''ہمیں حقیقت کا سامنا کرتے ہوئے اعتراف کر لینا چاہیے کہ ہم مستقبل کے بارے میں کوئی منصوبہ بندی نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارا کوئی مستقبل نہیں ہے۔''

''تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے اور اب تک جو ہوتا رہا، اس کا ذکر فضول ہے۔''

''نہیں، ہم نے جو وقت ساتھ گزارا، اس کے لیے میں تمہاری شکر گزار ہوں لیکن تم آئینہ دیکھو تو اس میں تمہیں سب پتہ نظر آ جائے گا۔''

''دفع کرو آئینے کو۔ جو کچھ تم اس میں دیکھ رہی ہو، وہ حقیقت نہیں ہے کلارا۔ میں اسے اتار دوں گا۔''

''آئینہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''بلکہ اصل مسئلہ ہم خود ہیں۔''

گھر واپس آتے ہوئے میں کلارا کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ اس نے ٹھیک ہی پوچھا تھا کہ ہم کہاں رہیں گے۔ اس قصبے کے تمام علاقے اپنی خصوصیات کی وجہ سے بالکل نمایاں تھے۔ دریا کے شمال میں **بلیو کالر تھا جہاں زیادہ** تر دکانیں اور کارخانے تھے۔ وہاں مزدور طبقہ رہتا تھا۔ مینیلکس میں دکاندار اور چھوٹے وکیلوں کی رہائش تھی۔ دریا کے جنوب میں بالائی متوسط طبقہ مثلاً بڑے اسٹورز کے مالک، منیجرز، پروفیسر اور سفید پوش لوگ رہتے تھے۔ جس سڑک پر ہمیں اسٹیفن کی لاش ملی، وہ ایک قدیم لیکن بہتر علاقہ تھا۔ جہاں تین چار منزلہ مکان تھے اور ان کا رقبہ تین چار ہزار مربع فٹ سے کم نہ تھا۔ یہ مکان بہت کم فروخت ہوتے تھے اور ایک ہی خاندان میں نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے تھے۔ یہ ایسا علاقہ نہیں تھا جہاں لوگ گولی سے مرتے ہوں اور یہ علاقہ سفید فام لوگوں کے لیے محفوظ تھا۔

لیکن کبھی کبھی جو نظر آتا ہے، ویسا نہیں ہوتا۔ گزشتہ برس اسی علاقے میں تین لڑکیاں نشے کی حالت میں پائی

گئی تھی۔ زیادہ مقدار میں منشیات پینے کی وجہ سے اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے اسی علاقے میں ہونے والی ایک ہاؤس پارٹی میں شرکت کی تھی۔ وہ اچھے گھرانوں کی لڑکیاں تھیں اور اس جگہ سے تھوڑے ہی فاصلے پر رہتی تھیں جہاں سے اسٹین کی لاش ملی تھی۔ اس نے اپنی کار کا شیشہ اتار دیا کیونکہ وہ قاتل کو جانتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ محفوظ علاقے میں ہے۔

میں اینڈری کے والد اور اپنے انکل آرمنڈ سے بہت محبت کرتا ہوں کیونکہ ہم دونوں مختلف زندگی گزار رہے ہیں لیکن ہمارے درمیان کوئی رشتہ تو ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ فون پر حیران ہو جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔

"کیا بات ہے ڈونی؟"

"مجھے تمہاری مدد چاہیے۔ کوئی شخص اولڈ روز ویلٹ ڈرائیو میں منشیات کا کاروبار کر رہا ہے، میں اس کا نام جاننا چاہتا ہوں۔"

"تم کس حیثیت سے کہہ رہے ہو۔ میں اپنے بھتیجے کی تو مدد کر سکتا ہوں لیکن پولیس سراغ رساں ڈاکروز کی نہیں۔"

"میں اپنے لیے نہیں بلکہ اینڈری کو بچانے کے لیے پوچھ رہا ہوں۔"

"اس کی فکر نہ کرو، وہ محفوظ ہے۔ میں نے اس کے لیے گواہ کا بندوبست کر دیا ہے۔"

"اگر یہ کیس سٹیٹ پولیس کے پاس چلا گیا تو میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے ہی یہ مقدمہ ختم ہو جائے۔ مجھے چپکے سے اس منشیات فروش کا نام بتا دو اور اینڈری کو مکمل طور پر اس کیس سے نکلنے میں میری مدد کرو۔"

کافی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ڈینی ہوم گرین۔ وہ سنتھیا کا پوتا ہے اور گزشتہ ایک سال سے اپنی دادی کے تہ خانے سے یہ کاروبار کر رہا ہے۔ اس کے یہاں سے بھاری مقدار میں منشیات منتقل ہوتی ہے اور لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے ان گاڑیوں پر اینڈری یا قالین کی دھلائی کے بورڈ لگا دیے جاتے ہیں۔ اس لیے کوئی بھی ان کی جانب متوجہ نہیں ہوتا۔ یہ بتا کر میں نے تم پر احسان کیا ہے۔ اب اینڈری کو بچانا تمہاری ذمے داری ہے۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" میں نے کہا۔

"تمہاری اطلاع کے لیے ایک بات اور بتا دوں۔ صرف ایک مرتبہ چند ماہ پہلے ڈینی کا نام اس معاملے میں آیا تھا لیکن اس کے وکیل نے بچا لیا۔ جانتے ہو وہ کون تھا؟"

میں نے جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ فضول باتوں کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا۔

☆☆☆

"وہ بالکل بھی پریشان نہیں لگ رہا۔" زینا نے کہا۔ ہم اس وقت بوزر سینٹر کے تہ خانے میں بیٹھے شیشے کے دوسری جانب تفتیشی سیل میں ڈینی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک لوہے کی میز پر بیٹھا ہوا تھا لیکن اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی یا زنجیر نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا جیسے وہ کسی پارٹی میں آیا ہو۔ شاید وہ خود بھی منشیات کے زیر اثر تھا۔ ہم اس کا ذہن صاف ہونے کا انتظار کر سکتے تھے یا اس کا ڈوپ ٹیسٹ کرواتے جس کے بعد اسے کم از کم ایک سال کی سزا ہو جاتی لیکن میں نے ایسا کچھ نہیں کیا کیونکہ ابھی تک اس نے اپنے وکیل کو بلانے کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اب اس کے پاس ایسا کوئی وکیل نہ ہو۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ اس لڑکے نے اسٹین کو قتل کیا ہوگا؟" زینا نے پوچھا۔

"ایسا لگتا تو نہیں ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "یہ لڑکپن میں دو مرتبہ جیل جا چکا ہے لیکن اٹھارہ سال کی عمر ہونے پر اس کا پرانا ریکارڈ سیل کر دیا گیا۔ بالغ ہونے کے بعد یہ صرف ایک مرتبہ گرفتار ہوا لیکن اسٹین نے اسے رہا کروالیا۔ یہ اس علاقے میں اسٹین کا واحد موکل تھا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ڈینی نے اسے قتل نہیں کیا تو وہ کون ہو سکتا ہے؟"

"یہ ایک معقول سوال ہے۔" زینا نے کہا۔ "اسی سے پوچھتے ہیں۔"

زینا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ بالکل بھی پریشان نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے کالج کے لڑکوں والا سویٹر اور موزوں کے بغیر بھاری جوتے پہن رکھے تھے حالانکہ باہر شدید سردی تھی لیکن وہ پتھر کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔ میرا اس سے کھیلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لہٰذا اس پر بھرپور وار کرنے کا فیصلہ کیا۔

"گواہوں نے تمہیں اسٹین پر حملہ کرتے دیکھا ہے۔ تم اس علاقے کو جانتے ہو۔ وہاں کی بوڑھی عورتیں اپنے گھروں سے باہر جھانک رہی ہوتی ہیں جن کے پاس تمہاری دادی کی طرح کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔"

’’وہ غلطی پر ہیں۔‘‘ وہ تھوڑا سا خوف زدہ ہوا لیکن اب بھی پریشان نہیں تھا۔ وہ اتنا پُرسکون تھا کہ اس پر کوئی شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔

’’ٹھیک ہے ڈینی۔‘‘ اگر تم کہتے ہو کہ وہ غلطی پر ہیں تو میں پوری بات سننا چاہوں گا۔ میں تمہیں اور تمہارے خاندان کو جانتا ہوں لیکن تمہارا یہ بیان ناکافی ہے۔ مجھے سرکاری وکیل کو دکھانے کے لیے کچھ چاہیے۔ تم اس کاروبار کے بارے میں جانتے ہو۔ اس بارے میں مجھے کچھ بتاؤ۔‘‘

’’میں اس پر بات نہیں کر سکتا۔ تم جانتے ہو کہ وہ کیسے لوگ ہیں۔‘‘

’’کون؟ لوکوس؟‘‘

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ کرسی میں ڈھلک گیا۔ ’’تم لوکوس کے بارے میں جانتے ہو؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’ہمیں ہمیشہ سے ان کے بارے میں معلوم تھا۔‘‘

’’لیکن میرا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں۔‘‘

’’پھر کیا ہوا تھا؟‘‘

’’مجھے اب بھی اسٹین کو دس ہزار ڈالر دینا تھے۔ اس نے مجھے فون کر کے کہا کہ وہ شہر چھوڑ کر جانے والا ہے اور اپنے پیسے لینے آ رہا ہے۔ میں نے اسے ادائیگی کر دی اور اس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا لیکن وہاں لوکوس کا ایک کارندہ سالومن بھی موجود تھا جو ڈلیوری دینے آیا تھا۔ اس نے مجھے پیسے دیتے ہوئے دیکھ لیا۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ میں نے مان لیا۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ پڑوسن سے غلطی ہوگئی۔ اس نے سالومن کو اسٹین پر حملہ کرتے دیکھا تھا۔ وہ لان کی دیکھ بھال کرنے والی وین میں آیا تھا؟‘‘

’’اس نے پہلے اسٹیکر اتار دیا تھا۔‘‘ ڈینی نے مضطرب انداز میں کہا۔

’’ٹھیک ہے۔ سالومن چلتا ہوا اسٹین کے پاس آیا اور اس نے اسے دیکھ کر شیشہ اتار دیا۔ کیا وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے؟‘‘

’’نہیں، اس کی غلطی کی وجہ سے سالومن نے اس پر حملہ کیا۔‘‘

’’یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟‘‘

’’سالومن نے اس کے چہرے پر گن رکھ دی۔ اس کے باوجود اسٹین مزاحمت کرتا رہا۔ اس نے سالومن کا بازو پکڑنے کی کوشش کی اور مارا گیا۔ صرف دس ہزار ڈالر کی خاطر۔ کیوں؟ وہ امیر آدمی تھا۔ اس کے لیے دس ہزار ڈالر کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ کیا وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس خاموش علاقے میں آ کر وہ بلٹ پروف ہو گیا ہے۔‘‘

’’اس نے سوچا ہو گا کہ وہ سفید فام ہونے کی وجہ سے محفوظ ہے۔‘‘

جب ڈینی مکمل طور پر ہوش و حواس میں آ گیا تو میں نے اس کے نئے وکیل ٹومی مارلے کو بلا کر پوری تفصیل سے آگاہ کیا۔ ڈینی ان کے ساتھ کاروبار میں شریک تھا۔ وہ بھی سالومن کے ساتھی کے طور پر جیل کی کوٹھری میں بند ہو سکتا تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ لوکوس اور اس کے ساتھیوں کی نشاندہی کرتا۔ ایسی صورت میں اسے بطور گواہ تحفظ مل سکتا تھا اور اسے کچھ عرصے کے لیے محفوظ جگہ منتقل کر دیا جاتا۔ ٹومی کے خیال میں اس کے لیے ٹاؤس مناسب مقام تھا جہاں کسی کا خیال بھی نہیں جا سکتا تھا۔

روز ویلٹ ڈرائیو اب ہمیشہ کی طرح پُرسکون اور محفوظ جگہ ہے۔ جہاں سب سفید فام رہتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ کہ میں اور کلارا ابھی تک ساتھ رہ رہے ہیں۔ اس ویک اینڈ پر میں اسے شپ ریک نامی ریستوران میں ڈنر کے لیے لے گیا۔ یہ ہماری پسندیدہ جگہ ہے۔ میری نوجوان کزن سارہ ایک کونے میں کھڑی کوئی دھن گا رہی تھی۔ شاید اس کے اداس گانے گم شدہ محبت نے ہمیں بچا لیا لیکن ہمارا تعلق پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ اب یہ ایک کنارے پر پہنچ گیا ہے۔ ہم جان گئے ہیں کہ محبت کا رشتہ کتنا نازک ہوتا ہے اور کتنی آسانی سے ٹوٹ جاتا ہے۔

ڈنر سے واپس آنے کے بعد کلارا نے غسل کیا اور میں بستر پر لیٹا اس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ میرے برابر میں آ کر لیٹ گئی لیکن جونہی میری نگاہ آئینے پر گئی تو میں نے دیکھا کہ وہ میرے بجائے کلاک پر نظریں جمائے ہوئے تھی جو ہمارے ساتھ گزرے ہوئے وقت کی گنتی کر رہا تھا اور یاد دلا رہا تھا کہ ہم نے کتنا وقت گنوا دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ ہم آنے والے وقت کو اپنے لیے محفوظ کر سکتے ہیں، لیکن کلارا جو کچھ آئینے میں دیکھ رہی ہے، میں اسے تبدیل نہیں کر سکتا۔ آئینوں کے ساتھ یہی مسئلہ ہے کہ ہم انہیں پلٹ نہیں سکتے اس لیے میں سوچتا ہوں کہ کلارا کے ساتھ جو وقت گزر جائے وہی غنیمت ہے۔

ایک پولیس والے کے لیے سب سے مشکل کیس وہ ہوتا ہے جس میں اس کا کوئی بیٹی بند بھائی ملوث ہو یا کیس اس سے متعلق ہو۔ اس قسم کے کیسوں سے اکثر پولیس افسران گھبراتے ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کی تفتیش ان کے ذمے نہ آئے۔ مشتاق علی کا کیس بھی ایسے ہی کیسوں میں سے تھا۔ مشتاق علی اسپیشل برانچ میں انسپکٹر تھا۔ جسے عرف عام میں سی آئی ڈی کہتے ہیں۔ اگرچہ ہم نے آگے پیچھے کورس کیا تھا مگر میرا مشتاق سے چند ایک بار ہی واسطہ رہا تھا۔ پہلی بار

نامعلوم

آصف ملک

چھوٹی چھوٹی نازیبا حرکتیں اگر عادت بن کر پختہ ہو جائیں تو بڑے بڑے واقعات کا پیش خیمہ بن جاتی ہیں... اس کو بھی اس حرکت کی عادت تھی... جو اخلاقی اور سماجی ہر لحاظ سے ناپسندیدہ اور قابلِ گرفت تھی... ایک اندوہ ناک حادثے کا سبب بن جانے والی عادت کا انجام

ایک دیانت دار پولیس آفیسر کے قتل کا ماجرا جو عجب رخ اختیار کر گیا تھا...

جب ہم دونوں انویسٹی گیشن میں تھے تو ڈی آئی جی انویسٹی گیشن کے دفتر میں ہوتے تھے۔ دوسری بار ہم دونوں ایک تھانے میں ساتھ ہوئے اور تیسری بار جب ایک کیس کے سلسلے میں مشتاق کو انویسٹی گیشن کی طرف سے بھیجا گیا اور میں اس کیس کا تفتیشی افسر تھا۔ اس سے پہلے اس سے بس سلام دعا کی حد تک واسطہ تھا لیکن اس کیس کے دوران میں نے جانا کہ مشتاق علی کس قسم کا شخص تھا؟

وہ بہت خشک مزاج سمجھا جانے والا شخص تھا۔ محکمے میں یہ اصطلاح ان لوگوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو پولیس جیسے محکمے میں ہوتے ہوئے بھی عابدانہ حد تک حرام حلال کا خیال رکھتے ہوں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ وہ تھانے کا پانی تک نہیں پیتا تھا۔ اپنی بوتل گھر سے لاتا تھا۔ اس کے پاس ایک کھٹارا بائیک تھی جس میں صرف انجن، پہیے اور بریک ہی درست حالت میں تھے۔ ویسے یہ ہیوی بائیک تھی۔ عام بائیک رفتار اور قوت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اتنا شور مچاتی تھی کہ دور ہی سے اس کی آمد کا پتا چل جاتا تھا۔ کیس ایک گینگ کا تھا جو منشیات فروشی اور بھتا خوری میں ملوث تھا۔ اس کے چند افراد پکڑے گئے تھے اور انویسٹی گیشن کے پاس یہ کیس پہلے سے تھا اس لیے مشتاق کو بھیجا گیا۔ ہم نے مل کر اس کیس پر چار مہینے کام کیا اور اسے تقریباً حل کر لیا۔ گینگ کے درجن بھر اہم ارکان پکڑے گئے البتہ اس کا سربراہ بیرونِ ملک فرار ہو گیا تھا۔

مشتاق علی کیس کے بعد واپس چلا گیا اور پھر میں نے اسے اس وقت دیکھا جب وہ اپنے گھر کے سامنے اس حالت میں اوندھے منہ پڑا ہوا تھا کہ اس کی گدی میں گولی کا سوراخ تھا۔ گولی آگے سے نہیں نکلی تھی بلکہ اندر ہی موجود تھی۔ اس کے جسم پر سادہ لباس تھا اور اس کی بائیک نزدیک ہی پڑی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جب اسے نشانہ بنایا گیا تو وہ بائیک پر گھر کے پاس پہنچ کر رکا تھا۔ اسی وقت قاتل نے عقب سے اسے گولی ماری اور وہ بائیک سمیت نیچے گر گیا۔

میں نائٹ ڈیوٹی پر تھا جب مجھے ایس ایس پی کی کال آئی۔ اس نے بتایا کہ کسی نے اسپیشل برانچ کے انسپکٹر مشتاق علی کو قتل کر دیا ہے۔ وہ ڈیوٹی سے واپس آیا تھا۔ رات کے دو بج رہے تھے اور وہ یقیناً کسی خاص ڈیوٹی پر تھا۔ مشتاق علی اسی تھانے کی حدود میں رہتا تھا جہاں میں ان دنوں نائٹ شفٹ کا ایس ایچ او تھا۔ میں ایک موبائل اور چند پولیس مین لے کر جائے وقوع پر پہنچا۔

مشتاق علی کا گھر ایک عام سے علاقے میں تھا اور گھر بھی عام سا تھا۔ ایک سو بیس گز پر بنا ہوا یہ دو منزلہ مکان پرانا تھا مگر اس پر رنگ و روغن حال میں ہی کیا گیا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو ایک موبائل وین پہلے ہی سے موجود تھی اور اس نے جائے واردات سے عام لوگوں کو دور کر دیا تھا۔ رات دو بجے بھی وہاں رش تھا دو ڈھائی درجن لوگ جمع تھے۔ لوگوں نے اپنے مکانوں کی بیرونی لائٹس جلا دی تھیں اس لیے گلی میں خاصی روشنی تھی۔ نزدیکی مکانات والے اپنی چھتوں پر چڑھ کر صورتِ حال دیکھ رہے تھے۔ مشتاق علی کے گھر سے عورتوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے آتے ہوئے پولیس سرجن کو کال کر دی تھی وہ ایمبولینس کے ساتھ آ رہا تھا۔ میں نے لاش کا معائنہ کیا۔ موبائل کے ساتھ آنے والے اے ایس آئی کے مطابق لاش کسی نے نہیں چھیڑی تھی سوائے مشتاق علی کی بیوی کے، کیونکہ لاش سب سے پہلے اسی نے دیکھی تھی۔ وہ اس سے لپٹ گئی تھی تب مشتاق علی کے چھوٹے بھائی شارق نے آ کر اسے لاش سے الگ کیا اور اسی نے پولیس کو اطلاع دی تھی۔ مشتاق علی کی کوئی چیز غائب نہیں تھی۔ اس کا سروس پستول بیلٹ سے بندھا ہوا تھا۔ اس کا پرس اور موبائل بھی موجود تھا۔ جب تک میں نے لاش کا معائنہ مکمل کیا، پولیس سرجن بھی آ گیا۔ اس نے لاش دیکھی اور اپنی رپورٹ لکھنے لگا۔ پھر اس نے بتایا۔

”اسے مرے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں ہوا ہے۔ ایک ہی گولی لگی ہے اور موت فوری واقع ہوئی ہو گی، کیونکہ زیادہ خون نہیں نکلا ہے۔ بظاہر موت کی وجہ یہی گولی ہے۔ باقی بات پوسٹ مارٹم سے پتا چلے گی۔“

میں نے اسے لاش اٹھوانے کو کہا اور شارق کے پاس آیا جو ایک طرف افسردہ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ مشتاق علی تقریباً پینتیس برس کا تھا مگر شارق خاصا کم عمر تھا، وہ پچیس سے زیادہ کا نہیں تھا۔ میں نے رسمی تعزیت کی اور کہا۔ ”مجھے احساس ہے کہ تم اس وقت کس دکھ سے گزر رہے ہو لیکن پولیس کا کام تفتیش کرنا ہوتا ہے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں سمجھتا ہوں، میں بھی کچھ عرصے پولیس میں رہا ہوں۔“

میں چونکا۔ ”اب نہیں ہو؟“

”میں نے تین سال بعد استعفا دے دیا تھا۔ مشتاق بھائی نے مشورہ دیا تھا کیونکہ میں جہاں تھا وہاں کھائے پیے بغیر رہنا ممکن نہیں تھا اور مشتاق بھائی کو آپ جانتے ہوں گے۔“

میں واردات کی طرف آیا۔ ”یہاں کیا ہوا تھا؟“

''میں اوپر والے پورشن میں رہتا ہوں۔'' اس نے مکان کے اوپری حصے کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں بیوی اور بچے کے ساتھ سو رہا تھا جب فائر کی آواز نے مجھے جگا دیا اور پھر بھابی کے چلانے کی آواز آئی تو میں نیچے بھاگا اور یہاں...'' وہ بولتے بولتے رکا جیسے آگے بتانے کی ہمت کر رہا ہو۔ ''مشتاق بھائی نیچے گرے ہوئے تھے، میں نے تازیہ... بھابی کو الگ کیا، وہ ان سے لپٹ کر رو رہی تھیں۔ پھر میں نے مشتاق بھائی کو دیکھا، ان کی نبض ساکت تھی اور سانس بھی رکی ہوئی تھی۔ تب میں نے ون فائیو کو کال کر کے اطلاع دی۔''

''وقت کیا ہوا تھا؟''

''میں نے نیچے آنے سے پہلے دیکھا تھا تو گھڑی میں دو بجنے میں دو منٹ تھے۔''

''اور تم نے ون فائیو کو کال کس وقت کی؟''

''گھڑی نہیں دیکھی تھی مگر میرا خیال ہے کہ چند منٹ بعد ہی کی تھی۔ دس منٹ کے اندر کی ہوگی۔''

فی الحال اس سے زیادہ سوالات ممکن نہیں تھے۔ مشتاق علی کی لاش اٹھائی جا رہی تھی کہ اس کی بیوی اندر سے نکل آئی۔ میں اسے دیکھ کر حیران ہوا تھا، وہ مشکل سے تیس اکیس برس کی اور نہایت حسین لڑکی تھی۔ عملی طور پر وہ عورت تھی مگر جسامت اور چہرے مہرے سے وہ لڑکی ہی لگ رہی تھی۔ وہ بُری طرح رو رہی تھی اور مشتاق علی کی لاش تک جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہاں موجود تمام ہی لوگ اسے دیکھ رہے تھے۔ شارق اسے روک رہا تھا مگر وہ اس سے سنبھل نہیں رہی تھی۔ میں نے پیرا میڈک عملے کو اشارہ کیا کہ وہ لاش لے کر یہاں سے جائیں اور انہوں نے عجلت میں اسٹریچر ایمبولینس میں ڈالا۔ دروازہ بند کیا اور ایمبولینس سائرن بجاتی ہوئی وہاں سے روانہ ہوگئی۔ اس دوران میں شارق نے تازیہ کو سمجھایا تھا اور وہ اسے اندر لے جانے میں کامیاب رہا۔ میں نے وہاں موجود لوگوں کو للکارا۔

''یہاں قتل ہوا ہے اور تم لوگ تماشا دیکھ رہے ہو۔''

اس پر ایک نوجوان نے کہا۔ ''ہمارے پاس دیکھنے کے لیے یہی تماشے رہ گئے ہیں۔''

میں اس کی طرف بڑھا۔ ''کیا خیال ہے تمہیں کچھ اور تماشے دکھاؤں۔''

نوجوان جلدی سے پیچھے ہٹا۔ ''ناراض کیوں ہوتے ہو بھائی، میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا۔''

میں نے مجمع کی طرف دیکھا۔ ''کسی نے کچھ دیکھا ہے تو بتائے؟''

مگر حسب توقع کوئی سامنے نہیں آیا۔ مجھے غصہ اس بات پر آیا کہ وہ یہاں ہونے والے سانحے سے بے نیاز مشتاق علی کی بیوہ کو دیکھ رہے تھے۔ خاص طور سے اس نوجوان کی آنکھوں میں بہت گندگی تھی۔ یہ سب محلے والے تھے اور ان کا ردعمل افسوسناک ہی کہا جا سکتا تھا۔ بہرحال اب تماشا ختم ہو گیا تھا اس لیے محلے والے بھی رخصت ہو گئے۔ میں نے تماشا دیکھنے والے نوجوان کو مشتاق علی کے مکان کے بالکل سامنے والے مکان میں جاتے دیکھا۔ گویا وہ ان کا پڑوسی تھا اور ایسے میں اس کا رویہ زیادہ افسوسناک تھا۔ موبائل چلی گئی تھی اور میرے ساتھ صرف تھانے کے اہلکار تھے۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں زمین کا جائزہ لیا۔ یہاں کبھی سڑک ہوا کرتی تھی مگر اب وہ مٹی تلے جا چکی تھی اور تمام گلی کچی تھی۔ میں نے نوٹ کیا کہ گلی میں صرف ایک بائیک اور دو گاڑیوں کے ٹائروں کے نشانات تھے۔ بائیک مشتاق علی کی تھی جبکہ گاڑیاں پولیس موبائلز تھیں۔ ان کے علاوہ کسی گاڑی کے تازہ نشانات نہیں تھے۔ ہوا خاصی تیز تھی اور یہ نشان بھی تیزی سے مٹ رہے تھے۔ پیروں کے نشانات تو لاتعداد تھے اور انہیں دیکھنا اور یاد رکھنا ممکن بھی نہیں تھا۔

اگر قاتل کسی گاڑی میں آیا تھا تو اس نے گاڑی یقیناً گلی سے باہر رکھی ہوگی اور یہاں سے پیدل ہی گیا ہوگا۔ میں نے ذہن میں تصور کیا کہ قاتل نے کس طرح یہ کام کیا ہوگا۔ وہ مشتاق علی کو چونکنے یا سنبھلنے کا موقع دیے بغیر وار کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے وہ گلی میں گاڑی یا کسی چیز کے بغیر آیا تھا۔ مگر اس صورت میں اسے چھپنا ہوتا ورنہ مشتاق علی لازمی اس کی موجودگی سے چوکنا ہو جاتا اور یہاں چھپنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ گلی بیس فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ مکانوں کے سامنے چھوٹے سلوپ تھے کیونکہ گلی اونچی ہو چکی تھی اور اکثر لوگوں نے اپنی گاڑیاں اور موٹر سائیکلز اندر کھڑی کی ہوئی تھیں۔ پوری گلی میں صرف دو گاڑیاں باہر تھیں اور وہ مشتاق علی کے گھر سے خاصی آگے تھیں۔ اگر قاتل ان کے پیچھے چھپتا تو مشتاق علی کی نظروں سے بچ کر وہ اس کے عقب تک نہیں آ سکتا تھا۔ مشتاق علی کا گھر گلی کے وسط میں تھا اور گلی ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوئی تین سو فٹ لمبی تھی۔ اگر قاتل گلی کے سرے سے آتا تب بھی وہ بائیک کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

لاش کی حالت سے لگ رہا تھا کہ بائیک رکتے ہی قاتل نے عقب سے وار کیا تھا اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب قاتل پہلے سے یہاں موجود ہوتا۔ تب یہ ایک ہی

صورت میں ممکن تھا کہ مشتاق علی قاتل سے واقف تھا۔ رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔ میرے ساتھ آنے والے سپاہی جمائیاں لے کر ظاہر کر رہے تھے کہ اب انہیں واپس تھانے جانے کی جلدی تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ انہیں اصل کس چیز کی جلدی تھی۔ تھانوں میں کمائی کے اصل دھندے رات کے وقت ہوتے ہیں اور جو تھانوں سے دور ہوں، وہ کمائی سے رہ جاتے ہیں۔ اس لیے پولیس میں گشت کو اصل میں سزا تصور کیا جاتا ہے۔ ہاں مخصوص علاقوں میں گشت کے لیے پولیس والے منہ مانگی رقم بھی دیتے ہیں۔ بالآخر میرا ماتحت اے ایس آئی نزدیک آیا اور دبی زبان میں بولا۔

''سر جی واپس نہ چلیں۔''

''چلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ میں بائیک کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ یہ بھی وقوع میں شامل تھی اور اصولاً اسے بھی تھانے لے جانا چاہیے تھا مگر ہماری موبائل میں اس کی گنجائش نہیں تھی اس لیے میں نے شارق کو بلا کر بائیک اس کے حوالے کی اور اسے خبردار کر دیا کہ اسے نہ چھیڑے، ممکن ہے پولیس بعد میں اس کا معائنہ کرے۔ اس نے یقین دلایا کہ بائیک کو کوئی نہیں چھیڑے گا۔ پھر اس نے مجھ سے مشتاق علی کی لاش کا پوچھا۔

''ہمیں جنازے کا انتظام بھی کرنا ہے؟''

''میرا خیال ہے صبح تک مل جائے گی۔ مگر یہ پوسٹ مارٹم پر ہے، اگر وہ مکمل ہو گیا تو جلد مل جائے گی ورنہ دیر بھی ہو سکتی ہے۔'' میں نے کہا اور موقع پا کر اس سے کچھ سوالات اور کر لیے۔ ''مشتاق علی کے تمہارے علاوہ کتنے بہن بھائی ہیں؟''

''ہم دو بھائی اور ایک بہن ہیں۔'' اس نے کہا اور پھر سرد آہ بھر کر بولا۔ ''اب ایک بھائی اور ایک بہن رہ گئے ہیں۔ بہن کی شادی ہو گئی ہے، وہ مشتاق بھائی سے چھوٹی اور مجھ سے بڑی ہے۔ ابھی اسے نہیں بتایا ہے۔''

''تم لوگ آرام کرو، تدفین کے بعد میں تم سے آ کر بات کروں گا۔ ممکن ہے تمام گھر والوں سے بیان لوں۔''

اس نے سر ہلایا اور اندر چلا گیا۔ میں واپس تھانے آیا اور ابتدائی رپورٹ لکھی۔ ایف آئی آر کا مرحلہ باقی تھا مگر اس کا فیصلہ مشتاق علی کے لواحقین اور افسران ...... نے کرنا تھا۔ میری ڈیوٹی صبح آٹھ بجے تک تھی پھر میں آف کر کے گھر چلا گیا۔ پچھلے کچھ عرصے سے پولیس افسران اور اہلکاروں کی تواتر سے ٹارگٹ کلنگ کی وارداتوں نے تمام ہی پولیس والوں کو چوکنا کر دیا تھا۔ اب ہم ڈیوٹی پر آتے جاتے سادہ لباس میں ہوتے تھے۔ بظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ مشتاق علی کا قتل اسی ٹارگٹ کلنگ کی لہر کا ایک حصہ تھا جس کا مقصد پولیس اور حکومت کو دہشت گردوں اور جرائم پیشہ عناصر کے خلاف سرگرمی سے روکنا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ قتل اس قسم کی ٹارگٹ کلنگ نہیں تھی جو شہر میں اس وقت جاری تھی بلکہ اس کے پس پشت کچھ اور عوامل کارفرما ہو سکتے تھے۔

لیکن جب میں دوپہر کو سو کر اٹھا تو ٹی وی پر چلنے والی ہیڈ لائنز کے مطابق ڈی آئی جی انویسٹی گیشن نے اسے جرائم پیشہ عناصر کی کارروائی قرار دے دیا تھا کیونکہ مشتاق علی ان کے خلاف سرگرم تھا اور اس نے اپنی خفیہ ڈیوٹی کے دوران کئی جرائم پیشہ افراد کو گرفتار کرایا تھا جو سنگین جرائم میں ملوث تھے۔ ڈی آئی جی کا کہنا تھا کہ مشتاق علی کو ان ہی لوگوں نے قتل کیا ہے۔ قتل کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ڈیوٹی کے مقام سے اس کے پیچھے لگے تھے اور عین اس وقت جب وہ گھر میں داخل ہونے والا تھا عقب سے گولی چلا کر اسے شہید کر دیا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ افسران بالا نے طے کر دیا تھا کہ یہ ٹارگٹ کلنگ تھی اور اس کا مجرم قسمت سے ہی ہاتھ آتا جب وہ کسی اور کیس میں پکڑا جاتا اور دوران تفتیش اس کا بھی انکشاف کرتا لیکن میری چھٹی حس اپنی رائے پر قائم تھی کہ یہ قتل ٹارگٹ کلنگ نہیں تھی۔

قتل کے اصل محرکات اور قاتل تک پہنچنے کے لیے تفتیش لازمی تھی اور ڈی آئی جی کی پریس کانفرنس کے بعد ایسا لگ رہا تھا کہ کیس جلد اسپیشل برانچ کو منتقل کر دیا جائے گا اور کچھ عرصے بعد یہ داخل دفتر ہو جائے گا کیونکہ سیکڑوں پولیس والوں کی ٹارگٹ کلنگ کی گئی اور چند ایک کے قاتل اتفاق سے ہاتھ آئے تھے۔ ورنہ باقاعدہ تفتیش کر کے آج تک ایک بھی ٹارگٹ کلر کو نہیں پکڑا گیا تھا۔ حد یہ کہ جن کی سی سی ٹی وی فوٹیج تھیں، وہ بھی نہیں پکڑے گئے۔ میں نے معلوم کیا تو مشتاق علی کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد وارثوں کے حوالے کر دی گئی تھی اور عصر کے وقت تدفین تھی۔ میں جنازے میں شریک ہوا اور پھر تھانے آیا تو انچارج سلامت قریشی نے مجھ سے کہا۔ ''یاور شاہ آج ہی تمام متعلقہ لوگوں کے بیانات قلم بند کر لو۔''

''ایف آئی آر کا کیا ہو گا؟''

''شارق نے ایف آئی آر کٹوا دی ہے اور نامعلوم قاتلوں پر الزام لگایا ہے۔''

''جو شاید اب نامعلوم ہی رہیں گے۔'' میں نے تلخی سے کہا تو سلامت قریشی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''کیا ہوا ہے؟''

''آپ نے ڈی آئی جی کی پریس کانفرنس نہیں دیکھی۔ اس قتل کو ٹارگٹ کلنگ قرار دے دیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کل تک یہ کیس اسپیشل برانچ چلا جائے گا۔''

''یار یہ ڈی آئی جی صاحبان پریس کانفرنس اس شوق میں کرتے ہیں کہ ٹی وی پر آتے رہیں۔ تم اس چکر میں مت پڑو اور اپنے طور پر کام کرو۔''

''جیسا آپ کہیں۔'' میں نے کہا اور اپنے کمرے میں آکر کیس فائل منگوائی۔ اس میں ایف آئی آر کی نقل اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ شامل تھی۔ معاملہ ایک پولیس والے کا تھا اس لیے سارا کام بہت تیزی سے ہورہا تھا۔ اگر کوئی عام آدمی ہوتا تو اب تک ایف آئی آر بھی نہ کٹی ہوتی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ بہت سادہ تھی۔ اس کے مطابق موت گولی دماغ پر لگنے سے واقع ہوئی تھی۔ طبی وجہ سانس اور دل کا رکنا تھا۔ وقت دو بجے کے آس پاس تھا۔ ایف آئی آر بھی سادہ تھی، اس میں شارق نے بھائی کے قتل کا الزام نامعلوم افراد پر لگایا تھا۔ بیانات کا حصہ خالی تھا۔ میں نے اپنی ابتدائی رپورٹ فائل میں لگائی اور کمر کس کر تیار ہوگیا اگرچہ مجھے لگ رہا تھا کہ میں فضول میں بھاگ دوڑ کروں گا۔ یہ کیس بالآخر مجھ سے لے لیا جائے گا۔ مگر ابھی تو یہ میرے پاس تھا اور مجھے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

میرا تعلق ایک سکہ بند پولیس خاندان سے ہے۔ میرے دادا، چچا، تایا اور خاندان کے بے شمار دوسرے لوگ ساری عمر پولیس کی ملازمت کرتے رہے تھے۔ اس وقت بھی میرے قریبی ایک درجن رشتے دار پولیس میں مختلف عہدوں پر تھے اور دور کے رشتے دار بھی شامل کیے جائیں تو یہ تعداد دو درجن سے بھی اوپر چلی جاتی۔ میرے دو بڑے بھائی ڈی ایس پی اور ایس پی کے عہدے پر کام کررہے تھے۔ بڑے بھائی تو فیڈرل چلے گئے تھے البتہ ان سے چھوٹے یہیں ہوتے تھے۔ شاید اسی لیے میرا پولیس کیریئر آسانی سے بن گیا اور ملازمت کے دس سالوں میں بھی مجھے کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ چھوٹی موٹی مشکلات کا سامنا تو سب کو کرنا پڑتا ہے۔ مگر ایسی صورتِ حال درپیش نہیں آئی کہ مجھے استعفے کا سوچنا پڑتا۔ ان دس سالوں میں، میں نے بہت گھاٹ گھاٹ کا پانی پی لیا تھا۔ مجھے بحرانوں سے نکلنا آگیا تھا۔ میں مشتاق علی کے گھر پہنچا تو باہر ہی ٹینٹ لگا ہوا تھا اور بہت سے لوگ قرآن خوانی اور گپ شپ میں مصروف تھے۔ شارق مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر آیا اور اندر لے گیا۔ اس نے نشست گاہ کھلوائی۔ مکان کے اندر اب خاموشی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سوگ کا زور گزر گیا تھا۔

''جناب کیا پسند کریں گے ٹھنڈا یا گرم؟''

''کچھ نہیں بس ایک گلاس پانی منگوالو۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہارا اور گھر والوں کا بیان لینے آیا ہوں۔''

''میں تیار ہوں لیکن نازیہ... بھابی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ڈاکٹر نے نیند کی دوا دے کر سلا دیا ہے۔''

میں نے نوٹ کیا کہ اس نے دوسری بار نازیہ کا نام لیا اور پھر ذرا رک کر اس کے ساتھ بھابی لگایا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اسے بھابی نہیں کہتا تھا۔ رشتے میں وہ اس سے بڑی سہی لیکن عمر میں یقیناً کم تھی۔ میں نے سر ہلایا۔ ''کوئی بات نہیں اس سے بعد میں بات کرلوں گا۔ یہ بتاؤ کہ اس مکان میں کتنے لوگ رہتے ہیں؟''

''میں، میری بیوی رائنا اور بھابی۔'' اس نے جواب دیا۔

''بچے کتنے ہیں؟''

''صرف میرا ایک بیٹا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مشتاق بھائی کی کوئی اولاد نہیں ہے۔''

''مشتاق علی کی شادی کب ہوئی تھی؟''

''دو سال پہلے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''اس کا مطلب ہے مشتاق نے خاصی تاخیر سے شادی کی۔''

''وہ کہتے تھے کہ میں نے اپنی نوکری سے شادی کر لی ہے مگر میں نے اور رائنا نے انہیں قائل کرلیا۔''

نازیہ صرف حسین ہی نہیں کم عمر بھی تھی اور مشتاق علی کے بارے میں، میں نے بتایا کہ وہ عام سا اور کرخت نقوش والا بندہ تھا۔ پھر مولوی بھی تھا یعنی رشوت سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔ اس لحاظ سے نازیہ جیسی بیوی مل جانا اس کی خوش قسمتی تھی اور بدقسمتی یہ تھی کہ وہ اس کے ساتھ صرف دو سال گزار سکا۔ میں مشتاق علی کے پورشن کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا اور یہاں بالکل معمولی سا فرنیچر تھا۔ مکان کی حالت رنگ و روغن کے بعد بھی بہت اچھی نہیں تھی۔ شارق کا بیان لے کر میں نے اس کی بیوی سے بات کی۔ اصولاً مجھے اس سے اکیلے میں بات کرنی چاہیے تھی لیکن اگر کیس کسی پولیس والے سے متعلق ہو تو خود پولیس مشکل میں پڑ جاتی ہے اور اسے تفتیش کے بہت سے طریقے چھوڑنے پڑتے ہیں۔

رائنا تقریباً بائیس برس کی مناسب صورت والی لڑکی تھی۔ اگرچہ وہ نازیہ کی طرح حسین نہیں تھی مگر اس میں دل کشی موجود تھی۔ اس کی گود میں تقریباً ڈیڑھ سال کا بیٹا تھا۔

ظاہر اس کی شادی کو بھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔
''جس وقت یہ واقعہ ہوا تم سو رہی تھیں؟''
''جی انسپکٹر صاحب۔'' اس نے جواب دیا۔
''تمہیں کیسے پتا چلا؟''
''مجھے شارق نے اٹھایا۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔ ''تب پتا چلا۔''

میں نے اس سے چند سوالات اور کیے۔ جوابات میں اپنی چھوٹی سی نوٹ بک میں لکھتا جا رہا تھا۔ اس کے پاس بتانے کو زیادہ نہیں تھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے شارق سے کہا۔ ''میں بیانات کو باقاعدہ ٹائپ کروا کے بھیج دوں گا، تم دونوں دیکھ کر سائن کر دینا۔''

شارق میرے ساتھ باہر آیا۔ اس نے انکار کیا کہ مشتاق علی کو کسی طرف سے خطرہ تھا۔ اس نے اس سوال کے جواب میں کہا تھا کہ اگر ایسا تھا بھی تو اسے علم نہیں۔ اس سوال کے جواب پر کہ مشتاق اور اس کے تعلقات بے تکلفانہ تھے، اس نے کسی قدر ہچکچا کر کہا کہ وہ عمر میں اس سے بڑے تھے اور ان کے درمیان بے تکلفی نہیں تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ''ایک بات میرے علم میں ہے لیکن پتا نہیں اس سے آپ کو مدد ملے یا نہیں۔''
''کیسی بات؟''
''دو دن پہلے مشتاق بھائی اسی طرح رات کے وقت آئے تو میں جاگ رہا تھا اور واش روم میں تھا۔ میں نے مشتاق بھائی کو کسی سے بات کرتے سنا۔ مشتاق بھائی اونچی آواز میں یوں رہے تھے...''
''ایک منٹ۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''تم واش روم میں تھے تو تم نے کیسے سن لیا؟''
''میرے کمرے کا واش روم مین گیٹ کے بالکل اوپر ہے۔'' اس نے اشارے سے دکھایا۔ واقعی واش روم اس جگہ سے بہت نزدیک تھا اور باہر کے رخ پر اس میں ایک بڑا سا روشن دان بھی تھا۔ میں نے سر ہلایا۔
''ٹھیک ہے اس کے بعد کیا ہوا؟''
''میں عجلت میں باہر آیا کہ دیکھوں مشتاق بھائی کس سے بات کر رہے ہیں مگر اس وقت تک دوسرا فرد جا چکا تھا اور گلی میں صرف مشتاق بھائی تھے۔''
''تم نے دوسرے فرد کی آواز بھی نہیں سنی؟''
''وہ بہت دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔ عجیب بات ہے کہ میں مشتاق بھائی کے بھی چند ... سمجھ سکا تھا۔ وہ کسی سے غصے میں بات کر رہے ہیں۔''
''تم نے مشتاق سے پوچھا کہ وہ کس سے بات کر رہا تھا؟''
''پوچھا تھا مگر انہوں نے جواب نہیں دیا اور رکھائی سے بولے۔ ''کوئی نہیں تھا۔''
''گیٹ کس نے کھولا؟''
''مشتاق بھائی کے پاس چھوٹے گیٹ کی چابی ہوتی ہے، وہ اس کا لاک کھول کر اندر آ جاتے ہیں۔''
''تم نیچے آئے تو تم نے کسی گاڑی یا بائیک کی آواز سنی تھی؟''
''نہیں، مجھے ایسی کوئی آواز نہیں آئی۔''
''تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟''
''کل تو میرے حواس ہی گم تھے اور آج میں سوچ رہا تھا کہ شاید آپ اس بات کو اہمیت نہ دیں۔ اس لیے بیان میں نہیں بتایا مگر پھر مجھ سے رہا نہیں گیا اور اب بتا رہا ہوں، چاہیں تو اسے بیان کا حصہ بنا لیں۔''
''یہ تو کرنا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اس لحاظ سے بے سود ہو گا کہ تم نے نہ تو اس شخص کو دیکھا اور نہ ہی شناخت کر سکے۔ تم یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ گیا کہاں؟''

باہر نکل کر میں نے محلے والوں کو پکڑا۔ خاص طور سے جن کے مکانات مشتاق علی کے مکانات کے پاس تھے۔ مگر ان میں سے کسی نے اعتراف نہیں کیا کہ اس نے گولی چلنے کی آواز سنی تھی۔ وہ سب نازیہ کی چیخ و پکار پر باہر آئے تھے۔ یہ عجیب بات تھی۔ کیا ایک عورت کی چیخ گولی کی آواز سے زیادہ بلند تھی۔ میں نے چار افراد کے بیان قلم بند کیے جو واقعے کے پانچ منٹ کے اندر اندر باہر آئے تھے اور انہوں نے مشتاق کی لاش دیکھی تھی۔ نازیہ اس سے لپٹ کر رو رہی تھی اور شارق اسے الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر لوگوں کے جمع ہونے پر وہ بہ مشکل اسے اندر لے گیا تھا۔ بیانات میں کچھ خاص نہیں تھا۔ ان سے بس فائل کا پیٹ بھرتا اور خانہ پری ہوتی۔ مگر مشتاق علی کے قاتل یا قاتلوں تک کوئی رہنمائی نہیں ہو رہی تھی۔ چار پڑوسیوں کے بیانات قلم بند کر کے میں واپس جانے کا سوچ رہا تھا کہ مجھے وہی نوجوان نظر آیا۔ وہ بائیک پر کہیں سے آیا تھا۔ وہ جس گھر میں رہتا تھا اس کے مالک فیاض احمد سے میں نے بیان لے لیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کا ایک بیٹا ریاض احمد ہے۔ میں نے اسے اشارے سے بلایا۔
''تم یقیناً ریاض احمد ہو؟''

''بازی نے بتایا ہوگا۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''مجھ سے کیا کام ہے؟''

''تم پوچھتے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہ تمہارے باپ کا کہنا ہے، میرا خیال ہے تم صرف وقت اور خود کو ضائع کر رہے ہو۔''

اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ''آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

''کچھ نہیں، یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسے پتا چلا کہ محلے میں کچھ ہوگیا ہے۔''

''میں یہاں تک رہتا'' اس نے جواب دیا۔ ''میں اوپر رہتا ہوں اور میرے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔'' اس نے اوپری کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ کھڑکی باہری حصے میں تھی۔

''تم نے کیا دیکھا؟''

''مشتاق بھائی کی بیوی اور شارق بھائی کو دیکھا تھا۔ وہ مشتاق بھائی کی لاش کے پاس تھے۔''

''اور پھر تمہاری ساری توجہ مشتاق کی بیوہ کی طرف ہوگئی۔'' میں نے خفیف سے طنز کے ساتھ کہا تو اس نے بدمزہ ہوکر جواب دیا۔

''صرف میں تو نہیں دیکھ رہا تھا۔''

اس کی بات درست تھی اس لیے میں نے اس کی جان چھوڑ دی اور تھانے آکر بیانات تحریر کرائے اور شارق کے بیان کا بھی ذکر کروالیا۔ اگرچہ اس سے کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ اس نے نہ تو کسی کو دیکھا تھا اور نہ ہی کوئی آواز سنی تھی۔ پھر بھی یہ ریکارڈ کا ایک حصہ تھا۔ میں نے بیانات بھجوانے سے پہلے سلامت قریشی کو دکھائے اور اس نے بھی مشتاق کی کسی سے لڑائی کو پوائنٹ آؤٹ کیا۔ ''اس سے تو لگ رہا ہے کہ مشتاق کو ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنایا گیا ہے۔''

''ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر عام طور سے ٹارگٹ کلرز اتنی خاموشی سے کام نہیں کرتے۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کا شکار بچنے نہ پائے باقی انہیں کوئی دیکھ لے اس سے انہیں خاص فرق نہیں پڑتا ہے۔ وہ اپنے شکار سے ذاتی لڑائی بھی نہیں کرتے ہیں۔''

سلامت قریشی نے سر ہلایا۔ ''یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لگتا ہے اس کیس میں بھی قاتل کا کوئی سراغ نہیں ملے گا۔''

''کیونکہ ہمارے بڑوں کی یہ نیت ہی نہیں ہے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''مارے جانے والے سارے نچلے درجے کے افسران ہیں جن سے کام لیا جاتا ہے اور جب کام نکل جاتا ہے تو انہیں قاتلوں کے آگے مرنے کے لیے بے یار و مددگار چھوڑ دیا جاتا ہے۔''

''یہ تو ہے یار، پر کیا کریں نوکری نوکری ہوتی ہے۔'' سلامت قریشی نے سر ہلایا۔ ''کچھ قصور ہمارا بھی ہے، اوپر والوں کی نظروں میں چڑھنے اور ترقی پانے کے لیے سب کر گزرنے کو تیار ہوجاتے ہیں۔''

''حالانکہ بیشتر ترقی پاکر ہمیشہ کے لیے اوپر چلے جاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''مشتاق علی کے بارے میں معلوم کیا ہے کہ وہ آج کل کس ڈیوٹی پر تھا؟''

''ظاہر ہے سی آئی ڈی کی ڈیوٹی تھی مگر یہ نہیں معلوم کہ وہ کسی خاص مشن پر تھا یا معمول کی ڈیوٹی کر رہا تھا۔''

''یہی تو معلوم کرنا ہے۔''

''میں نے اس کی مکمل رپورٹ مانگی ہے، اب دیکھو کب ملتی ہے، ملتی بھی ہے یا نہیں۔''

معاملہ سی آئی ڈی کا تھا اور ان لوگوں کی اپنی منطق ہوتی ہے۔ یہ ان باتوں کو خفیہ سمجھ رہے ہوتے ہیں جن سے سارا شہر واقف ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ان سے کچھ حاصل کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ سلامت قریشی نے مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔ ''یار تفتیش آرام سے کرو۔ کچھ عرصے بعد کیس انویسٹی گیشن کو چلا جائے گا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔''

میرا بھی یہی خیال تھا مگر نہ جانے کیوں جب مجھے مشتاق علی کا خیال آتا تو مجھے لگتا وہ اس انجام کا مستحق نہیں تھا۔ اس نے اپنی ساری سروس میں کوئی ناجائز کام نہیں کیا تھا، نہ تو رشوت نہ کوئی فائدہ اٹھایا تھا اور نہ ہی کسی پر ظلم کیا تھا بلکہ تھانے میں وہ بہت سے بے گناہ پھنس کر آنے والوں کی مدد کرتا تھا اور اسی وجہ سے اپنے ساتھیوں کی نظروں میں بُرا بنتا تھا۔ وہ بے دردی سے اپنے گھر کے دروازے پر قتل کر دیا گیا تھا اور وہ مستحق تھا کہ اس کے قاتل یا قاتلوں کو گرفتار کرکے سزا دلوائی جائے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اسے بہت نزدیک سے گولی ماری گئی تھی اور فاصلہ شاید چند فٹ تھا۔ پوسٹ مارٹم کے ساتھ لیب کی رپورٹ بھی آگئی تھی جس کے مطابق گولی جس ہتھیار سے چلائی گئی وہ بائیس بور کا پستول تھا۔

مجھے تعجب ہوا کیونکہ ٹارگٹ کلر وارداتوں میں ننانوے فیصد نائن ایم ایم استعمال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے میگزین میں خاصی گولیاں آتی ہیں۔ دوسرے یہ جام نہیں ہوتا ہے۔ گولی کی قوت بہت زیادہ

ہوتی ہے اور نزدیک سے فائر کرنے پر یہ ہمیشہ جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ مگر مشتاق علی کو قتل کرنے والے نے بائیس بور کا کمزور پستول استعمال کیا تھا۔ اس کی گولی عام طور سے دس بارہ فٹ کے فاصلے سے ہی جان لیوا ہوتی ہے اگر فاصلہ اس سے زیادہ ہو تو شکار کے مارے جانے کے امکانات بہت کم رہ جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ قاتل نے چند فٹ کے فاصلے سے گولی چلائی تھی۔ میں نے لیب کال کر کے پوچھا کہ اس سال مارے جانے والے افراد میں سے کتنے بائیس بور کے ہتھیار کی گولی کا شکار ہوئے ہیں؟ آدھے گھنٹے بعد جواب ملا کہ واحد شکار مشتاق علی تھا۔ اس کے علاوہ جو ساڑھے نو سو افراد مارے گئے تھے ان میں سے کوئی بھی بائیس بور کے پستول کا شکار نہیں ہوا تھا۔ یہ حیران کن انکشاف تھا۔

ٹارگٹ کلرز تو چھوڑیں عام لڑائی جھگڑوں اور دشمنی میں ہونے والے قتل میں بھی بائیس بور کا ہتھیار استعمال نہیں ہوا اور یہاں قاتل نے ایک تربیت یافتہ اور سی آئی ڈی میں کام کرنے والے مسلح پولیس افسر کو بائیس بور کے ہتھیار سے قتل کیا تھا۔ مشتاق علی کے پاس بتیس بور کا سروس پستول تھا اور یہ بہت خطرناک ہتھیار تھا۔ سلامت قریشی نے بتایا کہ اس نے مشتاق علی کی ڈیوٹی کی تفصیلات طلب کی تھیں مگر امکان کم تھا کہ یہ تفصیلات ہمیں آسانی سے ملیں۔ اس کے لیے مجھے ہی کوشش کرنا تھی۔ مگر مجھے کوشش کرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ میرے خیال میں مشتاق کا قتل ٹارگٹ کلنگ کا نتیجہ نہیں تھا۔ اس خیال نے مجھے دوسرے امکانات پر غور کرنے پر مجبور کیا۔ اگر قتل کا محرک گھر یا اس کے آس پاس تھا تو مجھے گھر یا آس پاس والوں سے ہی تفتیش کرنی تھی۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر شارق کی بات آرہی تھی کہ قتل سے دو دن پہلے مشتاق علی کی کسی سے تلخ کلامی ہوئی تھی۔ ممکنہ طور پر قتل اسی تلخ کلامی کا نتیجہ تھا۔

میں نے نازیہ کا بیان نہیں لیا تھا۔ اگلے دن میں شام کے وقت مشتاق علی کے گھر پہنچا تو سوگ کی علامت یعنی ٹینٹ اٹھا لیا گیا تھا اور زندگی جیسے معمول پر آگئی تھی لیکن گھر والے یقیناً کئی دن ڈسٹرب رہتے۔ خاص طور سے مشتاق علی کی بیوہ جس کا سہاگ اجڑ گیا تھا۔ کال بیل کے جواب میں رائنا نے دروازہ کھولا اور سلام کے بعد مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''میں مسز مشتاق کا بیان لینے آیا ہوں۔''

''اب وہ مسز مشتاق کہاں؟'' اس نے کسی قدر استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''ہاں ان کی بیوہ کہہ لیں۔''

میں چونکا کیونکہ رائنا نے شارق کی موجودگی میں مجھ سے بہت سادہ سے انداز میں بات کی تھی۔ وہ نپے تلے جواب دے رہی تھی اور اس نے اپنی طرف سے ایک بات بھی نہیں کی تھی لیکن اس وقت اس نے نہ صرف اپنی طرف سے بات کی تھی بلکہ اس کا لہجہ بھی کسی قدر بدلا ہوا تھا۔ میں نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ''چلو بیوہ ہی سہی۔''

''اندر آئیے۔'' اس نے چھوٹا گیٹ وا کر دیا۔

''شارق کہاں ہے؟''

''وہ قبرستان گئے ہیں۔'' رائنا نے کہا اور مجھے اندر لے آئی۔ ''نازیہ آپ کے سامنے نہیں آسکے گی لیکن پردے کے پیچھے رہ کر بات کر سکے گی۔''

''کوئی مسئلہ نہیں، اسے صرف میرے سوالوں کے جوابات دینے ہیں۔''

رائنا اندر چلی گئی اور چند منٹ بعد ڈرائنگ کے آرچ نما حصے پر لگے پردے کے پیچھے نازیہ آگئی۔ سلام کے بعد میں نے رسمی تعزیت کی اور مشتاق علی کا افسوس کیا تو وہ سسکیاں لینے لگی۔ میں نے اسے کچھ وقت دیا۔ وہ سنبھل گئی اور بھرائی آواز میں بولی۔ ''میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ مشتاق یوں مجھے چھوڑ جائیں گے۔''

''موت کا ایک وقت مقرر ہے اور وہ اپنے وقت پر آتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم صبر سے کام لو اور مشتاق کی مغفرت کے لیے دعا کرو۔''

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ہاں اب یہی رہ گیا ہے۔''

میں سوالات کی طرف آیا۔ ''جب مشتاق علی گھر کے سامنے پہنچا تو آپ جاگ رہی تھیں؟''

''میں روز ہی جاگی رہتی ہوں تاکہ انہیں کھانا گرم کر کے دوں۔''

''دروازہ کون کھولتا ہے؟''

اس سوال کا اس نے شارق والا جواب دیا۔ ''ان کے پاس باہر کے چھوٹے گیٹ کے لاک کی چابی ہوتی تھی، وہ خود کھول کر اندر آتے تھے۔ میں نے دو تین بار ان سے کہا کہ میں کھول دیا کروں گی مگر انہیں پسند نہیں تھا کہ میں اتنی رات کو باہر گیٹ تک آؤں۔''

''تم نے فائر کی آواز سنی تھی؟''

''ہاں، اگرچہ آواز بہت مدھم تھی مگر میں نے سن لی تھی اور اسی وقت مشتاق کی موٹر سائیکل کا انجن بند ہوا تھا۔ میں منتظر ہوئی تھی اور انجن کی آواز سن کر اٹھی تھی۔ فائر کی آواز سنتے ہی میرے دل کو کچھ ہوا اور میں تڑپ کر بھاگی تھی۔

گیٹ کھول کر باہر آئی تو۔۔۔'' اس کی آواز گھٹ گئی اور وہ پھر سسکیاں لینے لگی۔ میں انتظار کرتا رہا حتیٰ کہ اس نے سسکیوں پر قابو پالیا اور بولنے لگی۔ ''موٹر سائیکل گری ہوئی تھی اور مشتاق۔۔۔ بھی گرے ہوئے تھے۔ ان کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے انہیں جھنجوڑا مگر وہ ساکت رہے پھر میں چیخنے لگی اور میری چیخیں سن کر اوپر سے شارق آ گیا۔ وہ مجھے کیسے اندر لایا، مجھے ہوش نہیں تھا۔''

''فائر ہونے کے کتنی دیر بعد تم باہر نکلیں؟''

''مشکل سے ایک منٹ کے اندر۔'' اس نے یقین سے کہا۔ ''انسپکٹر صاحب میں بہت تیز بھاگی تھی۔ مجھے تو دوپٹا لینے کا خیال بھی نہیں رہا تھا۔''

''جب تم باہر آئیں تو تم نے مشتاق علی کے علاوہ کسی کو گلی میں دیکھا؟''

''نہیں اور مجھے اس کا ہوش ہی کہاں تھا۔ میرے حواس تو مشتاق کو یوں گرے دیکھ کر اڑ گئے تھے۔''

''دیکھو بعض اوقات انسان سمجھتا ہے کہ اس نے کچھ نہیں دیکھا لیکن آنکھیں جو دیکھتی ہیں، وہ دماغ محفوظ کر لیتا ہے۔ اپنے ذہن پر زور دو اور اس وقت کی کوئی ایسی چیز یاد کرنے کی کوشش کرو جو تم نے دیکھی تھی مگر اس پر توجہ نہیں دی تھی۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے بے بسی سے کہا۔ ''مجھے ایسا کچھ یاد نہیں آ رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں کچھ ذاتی سوالات کرنا چاہوں گا امید ہے تم محسوس نہیں کرو گی، یہ ہم پولیس والوں کی مجبوری ہوتی ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''آپ پوچھیں۔''

''تمہارے اور مشتاق علی کے تعلقات کیسے تھے؟''

''بہت اچھے۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''وہ میرا بہت خیال رکھتے تھے اور بہت محبت کرتے تھے۔''

''حالانکہ تم دونوں کی عمروں میں خاصا فرق ہے۔''

''وہ مجھ سے پندرہ سال بڑے تھے لیکن ہمارے درمیان یہ فرق بھی حائل نہیں ہو سکا۔''

''یہ شادی کیسے ہوئی؟''

''مشتاق کا رشتہ آیا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ مجھے رشتے کی ایک خالہ نے پالا ہے مگر اب وہ خود اپنے بچوں کی محتاج ہو گئی تھیں اس لیے وہ چاہتی تھیں کہ جلد از جلد میری شادی کر دیں۔ اس لیے جب مشتاق کا رشتہ آیا تو انہوں نے یہ دیکھ کر وہ اچھے آدمی ہیں اور پھر یہ مکان ہے ہاں کر دی۔''

گویا ارینج میرج تھی۔ نازیہ نے شادی والے دن ہی مشتاق علی کو پہلی بار دیکھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے دل و جان سے مشتاق کو قبول کیا تھا اور اس کے ساتھ بہت خوش تھی۔ بچوں کے بارے میں اس نے کہا کہ وہ اور مشتاق علی دونوں ہی بچوں کے خواہش مند تھے اور انہوں نے طبی معائنہ بھی کرایا تھا۔ وہ دونوں بالکل ٹھیک تھے بس قدرت کی طرف سے دیر تھی۔ یہ سب بتاتے ہوئے نازیہ روہانسی ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ''اب میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے، میں بالکل خالی ہوں۔''

میں نے اسے تسلی دی پھر پوچھا۔ ''واقعے سے دو دن پہلے جب مشتاق رات گھر آیا تب تم جاگ رہی تھیں؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں ہر روز جاگتی تھی۔''

''تم نے کوئی ایسی آواز سنی تھی جیسے مشتاق کسی سے بات کر رہا ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے انکار کیا۔ ''ویسے میں باہر نہیں گئی تھی۔ مشتاق خود اندر آئے تھے۔''

''اس کا موڈ کیسا تھا؟''

میرے سوال پر وہ سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے کہا۔ ''وہ کچھ غصے میں تھے مگر میرے ساتھ انہوں بالکل ٹھیک سے بات کی تھی۔''

''مشتاق نے کبھی ایسا ذکر کیا کہ اسے کسی سے خطرہ ہے؟''

''نہیں اور وہ ایسی باتیں کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔''

یعنی صرف شارق نے مشتاق کو کسی سے بات کرتے سنا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے اس بارے میں شارق سے مزید سوالات کی ضرورت ہے۔ مگر وہ قبرستان گیا ہوا تھا۔ مجھے دیر تک بیٹھنا مناسب نہیں لگا۔ یہاں کیونکہ گھر میں صرف عورتیں تھیں۔ میں نے نازیہ سے کہا۔ ''میں نے بیان لے لیا ہے لیکن اگر کوئی اور بات پوچھنی ہوئی تو میں پھر آؤں گا۔''

''جی اچھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم کو مشتاق کے حوالے سے کوئی ایسی بات یاد آئے جو اس کے قاتل تک پہنچنے میں پولیس کی معاون ہو تو مجھ سے شارق کے توسط سے رابطہ کرنا۔''

میں باہر نکلا تو رانا منتظر تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کو اٹھا رکھا تھا، وہ دروازے تک آئی۔ جب میں باہر نکل رہا تھا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ''نازیہ نے آپ سے جھوٹ کہا

منٹ تک کوئی ردِعمل نہیں ہوا مگر جب میں نے دوبارہ کال بیل دی تو کچھ دیر بعد اندر سے ریاض برآمد ہوا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ ''آپ... کیوں آئے ہیں؟''

''بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا اور اسے دھکیل کر اندر داخل ہوا۔

''یہ کیا کر رہے ہیں۔'' اس نے مزاحمت کی کوشش کی۔

''آپ میرے گھر میں یوں داخل نہیں ہو سکتے۔''

''میں تمہاری... میں بھی داخل ہو سکتا ہوں۔'' میں نے پولیس کی زبان استعمال کی اور اسے گدی سے پکڑ کر آگے دھکیلا۔ ''اپنے کمرے میں چلو۔''

''کیوں؟'' وہ زور سے بولا۔ ''اباجی دیکھیں، یہ پولیس والا زبردستی اندر آیا ہے۔''

ذرا سی دیر میں فیاض اور اس کی بیوی بھی وہاں آگئے اور وہ بھی احتجاج میں شامل ہو گئے۔ مگر ان کی آوازیں بس اس حد تک تھیں کہ گھر سے باہر نہ جا سکیں۔ میں ان کے احتجاج کی پروا کیے بغیر ریاض کو دھکے دیتا ہوا سیڑھیوں سے اوپر اس کے کمرے تک لایا اور اندر داخل ہوا تو اس نے لپک کر کھڑکی کا پردہ برابر کرنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے گدی سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا اور کہا۔ ''اتنی جلدی کیا ہے برخوردار، تمہارے کرتوت تمہارے ماں باپ کو بھی دکھاتا ہوں۔''

''انسپکٹر صاحب۔'' فیاض نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔ ''یہ سب کیا ہے، آپ میرے بیٹے کے ساتھ کیوں تشدد کر رہے ہیں؟''

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا مگر جب مجھے مطلوبہ منظر نظر نہیں آیا تو میں نے کھڑکی کے ساتھ لگے بیڈ پر چڑھ کر دیکھا اور میں جو دیکھنا چاہ رہا تھا وہ مجھے نظر آگیا۔ مشتاق علی کا مکان پرانا تھا اور کسی قدر نیچا تھا جبکہ فیاض کا مکان نیا اور گلی سے خاصی بلندی پر تھا اس لیے دونوں کی بلندی میں فرق تھا اور اسی فرق کی وجہ سے یہ سب ہو رہا تھا۔ میں نے فیاض صاحب سے کہا۔ ''دیکھیں اپنے بیٹے کے کرتوت۔''

وہ نہ سمجھتے ہوئے بیڈ پر چڑھے اور جب انہوں نے میری بتائی ہوئی سمت دیکھا تو ان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور انہوں نے بڑبڑا کر لاحول پڑھی۔ رانا اپنے واش روم میں نہا رہی تھی اور بڑے سے روشن دان سے یہ منظر بڑی حد تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ریاض کو کھڑکی پر چڑھے دیکھا تھا اور مجھے علم تھا کہ رانا اس وقت واش روم میں نہا رہی ہے اس لیے معاملہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ فیاض نے نیچے اترتے ہی ریاض کو تھپڑ مارا۔ ''ذلیل شخص، مجھے معلوم نہیں تھا تو اتنا گرا ہوا نکلے گا۔ تو نے پڑوسیوں کی تو کیا ہماری عزت بھی نہیں رکھی۔''

''اباجی میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔'' اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔ ''یہ شخص بلاوجہ میرے پیچھے پڑا ہے۔''

''بکواس نہ کر۔'' فیاض نے اسے پھر تھپڑ مارنا چاہا مگر اس نے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا اور غرا کر بولا۔

''بس اباجی، اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔''

''عزت کے بچے۔'' میں اس کی طرف بڑھا۔ ''تم اس لفظ کا مطلب سمجھتے ہو۔''

لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے پکڑتا یا کچھ کہتا اس نے نہایت پھرتی سے اپنی پتلون میں اڑسا ہوا چھوٹا سا پستول نکال لیا اور میری طرف کر کے بولا۔ ''میرے پاس مت آنا۔''

ریاض کی ماں چلائی۔ ''یہ کیا کر رہا ہے؟''

فیاض بھی پریشان ہو گیا۔ ''ریاض پستول رکھ لو، یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟''

مگر میری نظر پستول پر مرکوز تھی۔ یہ چھوٹا بائیس بور کا پستول تھا۔ ویسا ہی ہتھیار جس سے مشتاق علی کو قتل کیا گیا تھا۔ ریاض پیچھے ہٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ دھمکیاں دے رہا تھا۔

''خبردار میرے نزدیک مت آنا ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔''

''جیسے تم نے مشتاق علی پر چلائی تھی۔'' میں نے سکون سے کہا اور ایک قدم آگے بڑھایا۔

''رک جاؤ۔'' ریاض چلایا۔ اس کا چہرہ خاصے خنک موسم میں بھی پسینے میں تربتر ہو گیا تھا۔ وہ دروازے کے پاس پہنچ گیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ دروازے سے نکلتا اچانک ایک نوعمر لڑکی نمودار ہوئی اور ریاض سے ٹکرائی۔ وہ گھبرا کر مڑا تھا کہ مجھے موقع مل گیا اور ایک منٹ سے بھی پہلے میں اسے قابو کر کے پستول اس سے چھین چکا تھا۔ میں نے احتیاط کی کہ پستول پر اس کی انگلیوں کے نشانات متاثر نہ ہوں اور پستول کو رومال میں لپیٹ کر اپنی جیب میں رکھ لیا پھر تھانے کال کر کے موبائل بلوائی۔ نہتا ہونے اور پکڑے جانے کے بعد ریاض کی ساری اکڑفوں غائب ہو چکی تھی۔ وہ اب معافی مانگ رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اس سے غلطی ہو گئی ہے۔ اس کے ماں باپ بھی میرے سامنے گڑگڑا رہے تھے کہ ان کے بچے سے غلطی ہوئی ہے۔ مگر میں اسے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ کچھ دیر میں موبائل آئی اور میں نے ریاض کو تھانے بھجوا دیا۔ فیاض کو پابند کر دیا کہ اس نے جو دیکھا تھا وہ اپنے تک رکھے۔ اگر یہ بات شارق یا اس کے گھر والوں تک پہنچی تو اس کی خیر نہیں ہوگی۔ اس نے کہا۔

''پتا نہیں مجھے کس بات کی سزا مل رہی ہے جو میرا بیٹا ایسا نکلا ہے۔ لیکن میں عزت والا آدمی ہوں اور دوسروں کی

عزت رکھنا چاہتا ہوں۔''

حسبِ توقع ایک رات تھانے میں گزار کر ریاض نے اقرارِ جرم کرلیا۔ اگر وہ ایسا نہ بھی کرتا تو اس کے پاس سے پستول برآمد ہوا تھا اور یہی سب سے بڑا ثبوت تھا۔ اسی سے وہ گولی چلائی گئی تھی جس نے مشتاق علی کی جان لی تھی۔ ریاض نے اقرار کیا کہ اسی نے مشتاق کو قتل کیا تھا کیونکہ مشتاق نے ایک بار اسے اپنی کھڑکی سے رائنا کو غسل کے دوران تاڑتے دیکھ لیا تھا۔ مشتاق نے اسے لتاڑا تھا اور دھمکی دی کہ اب ایسا کرتے دیکھا تو اسے گھر میں گھس کر مارے گا۔ تب ریاض نے ڈر کر اسے قتل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے خوف یہ تھا کہ مشتاق اسے گرفتار کر کے کسی کیس میں نہ پھنسا دے۔ حالانکہ مشتاق علی اس ذہن کا پولیس افسر نہیں تھا جو بے گناہوں کو ناکردہ جرم میں پھانس لے۔ یہ یقیناً ریاض کی ذہنی کج روی تھی جو اس نے اتنا بڑا فیصلہ کرلیا۔

بائیس بور کا یہ پستول اسے ایک لڑکے نے صرف ہزار روپے کے عوض فروخت کیا تھا اور اس نے اسے گھر والوں سے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ دو دن بعد وہ رات کے وقت مشتاق علی کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی اس کی بائیک آکر رکی، وہ گیٹ کھول کر دبے قدموں باہر آیا۔ بائیک کے انجن کے شور میں مشتاق علی اس کی آمد سے باخبر نہیں ہوسکا۔ اس نے عقب سے چند فٹ کے فاصلے سے گولی چلائی اور مشتاق کے گرتے ہی وہ بھاگ کر اپنے گھر میں داخل ہوا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد جب شور ہونے پر محلے والے نکلے تو وہ بھی یہ ظاہر کرتا ہوا باہر آیا جیسے سو رہا تھا اور شور سن کر آیا ہے۔ ہمارے لیے یہ ناقابلِ یقین تھا کہ اس نے اتنی سی بات پر ایک پولیس والے کو قتل کر دیا تھا۔ اس سے تفتیش کرنے والے پولیس اہلکار اس کا اعتراف سن کر مشتعل ہو گئے اور انہوں نے ریاض کو تشدد کا نشانہ بنانا چاہا لیکن میں نے انہیں روک دیا۔

تشدد کے نشانات آنے کی صورت میں اس کے وکیل کو آسانی ہوتی اور وہ اس کے اعتراف کو تشدد کا نتیجہ قرار دیتا۔ فوری طور پر اس کے اعتراف کو ایک مجسٹریٹ کے سامنے ریکارڈ کیا گیا۔ پولیس نے اس کا ایک ہفتے کا ریمانڈ لیا اور ایک ہفتے بعد چالان پیش کر دیا۔ اپنے بیان میں ریاض نے اعتراف کرلیا تھا کہ وہ کھڑکی سے رائنا کو نہاتے دیکھتا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ رائنا اس سے واقف تھی مگر اس نے کبھی روشن دان کا پٹ بند نہیں کیا۔ مجھے بھی اس کی بات میں صداقت محسوس ہوئی تھی کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی عورت اس بات سے مسلسل بے خبر رہے کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے اور وہ بھی اس طرح نہاتے ہوئے۔ ایک دو بار بے خبری میں ایسا ممکن ہے لیکن مستقل ممکن نہیں ہے۔ میں نے اس کے بیان کے اس حصے کو ریکارڈ کا حصہ نہیں بنایا۔ شارق حیران تھا اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے بھائی کا قاتل اس کا پڑوسی نکلے گا اور بیان سے قتل کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے اگلے ہی دن روشن دان مستقل بند کر دیا تھا۔

سیشن کورٹ نے ریاض کو سزائے موت سنائی تھی مگر ہائی کورٹ نے اسے پندرہ سال قید بامشقت میں بدل دیا۔ مگر یہ پندرہ سال دن رات والے نہیں تھے اسے اپنی عمر کے قیمتی پندرہ سال اب جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنے تھے۔ جس دن اسے قید کی سزا سنائی گئی کورٹ میں شارق اور نازیہ بھی تھے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ نازیہ کی گود میں شارق اور رائنا کا بیٹا تھا۔ میں اس سے ملا تو اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔

''آپ کی وجہ سے مشتاق بھائی کا قاتل پکڑا گیا۔''

''میں نے تو اسے اخلاقی مجرم سمجھا تھا مگر جب اس نے پستول نکالا تو مجھے اس کے قاتل ہونے کا پتا چلا۔''

''اخلاقی مجرم صرف وہی نہیں تھا۔'' شارق نے تلخی سے کہا۔ ''رائنا بھی اس میں ملوث تھی۔''

میرا بھی یہی خیال تھا مگر میں نے حیرت سے کہا۔ ''وہ کیسے؟''

''وہ ایسے کہ وہ میرے کہنے کے باوجود روشن دان کھول کر نہاتی تھی اور اگر میں بند کر دیتا تو وہ اندر جانے کے بعد کھول لیتی تھی اور نہا کر واپس آتے ہوئے دوبارہ بند کر دیتی تھی۔ وہ مجھے دھوکا دے رہی تھی۔''

''تب تم نے کیا کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ظاہر ہے ایسی عورت کو کون رکھتا ہے، میں نے اسے طلاق دے دی ہے اور جلد نازیہ سے شادی کرلوں گا۔ اس کی عدت ختم ہونے والی ہے۔''

رائنا جیسی عورتوں کا یہی انجام ہوتا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ نازیہ اب بے سہارا نہیں رہے گی۔ میں بہت عرصے سے سوچ رہا تھا کہ شہر میں ہونے والا ہر قتل ٹارگٹ کلنگ نہیں ہوتی ہے اور اسے نامعلوم افراد کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ بہت سے قتل ایسی ہی وجوہات کی بنا پر ہوتے ہیں۔ اگر صحیح سے تفتیش کی جائے تو قاتل پکڑا جاسکتا ہے۔ یہ حقیقت سامنے آئی کہ ہمارے معاشرے میں عجیب نفسانفسی ہوگئی ہے اور اب یہاں لوگ بہت چھوٹی چھوٹی باتوں پر قتل کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ ریاض نے مشتاق علی کو قتل کیا۔

سرورق کی پہلی کہانی

بڑا کام

سرور اکرام

حسن و خوب صورتی خدا کی لاتعداد نعمتوں میں سے ایک ایسا تحفہ ہے... جس پر ناز ہی کیا جا سکتا ہے... وہ حسین تھی... دلنشین تھی... مگر وہ اپنے حسنِ بے مثال سے نالاں تھی... ناز و ادا کا یہ خزانہ اس کی زندگی کو مشکل تر بنا رہا تھا... رکاوٹوں بھری زندگی میں اچانک ہی ایک ظالم دیو نمودار ہوا اور اس نے اپنے ظلم کی انتہا کردی...

زندگی انسان پر کس قدر مہربان ہے لیکن انسان زندگی سے کس قدر بیگانہ ہے... منظر امام کا انداز جداگانہ

دو ہوس زدہ آنکھیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔

وہ آنکھیں ایک ایسے انسان کی تھیں جس کا نام سکندر تھا۔ بے انتہا دولت مند... بدمعاش... اسمگلر اور نہ جانے کیا کیا۔

وہ جب چلتا تو اس کے ساتھ اس کے مسلح محافظوں کی ایک قطار سی ساتھ ہوتی۔ خونخوار چہروں والے لوگ۔ جن کے پاس جدید ترین ہتھیار ہوتے۔ سکندر کی شاندار قیمتی لینڈ کروزر جہاں سے گزرتی، پولیس والے بھی اسے سیلوٹ کر کے باادب ہو جاتے تھے۔

کیونکہ وہ سب اس کی لینڈ کروزر کو پہچانتے تھے جس کی نمبر پلیٹ پر سکندر کا نام لکھا ہوتا تھا۔ سکندر ون... سکندر ٹو... سکندر تھری وغیرہ۔

وہ بگ باس تھا۔ اسے بگ باس ہی کہا جاتا تھا۔ اس کے تعلقات بہت وسیع تھے۔ کیونکہ تعلقات کو وسیع کرنے کا فریضہ دولت انجام دیتی ہے اور سکندر کے پاس دولت تھی۔ طاقت تھی۔ سب کچھ تھا۔ اسی سکندر نے اس لڑکی کو دیکھ لیا تھا جو ایک دکان سے کچھ لے کر پیدل ایک طرف چل پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دو شاپرز تھے جن میں یقیناً گھر کا سودا سلف ہوگا۔

سکندر اس وقت اپنی لینڈ کروزر میں وہاں سے گزر رہا تھا جب وہ لڑکی اسے دکھائی دے گئی تھی۔

”گل جان۔“ سکندر نے اپنے ڈرائیور کو حکم دیا۔ ”وہ جو لڑکی سامنے جا رہی ہے، اس کا گھر معلوم کرنا ہے۔ دیکھو کہاں جا رہی ہے۔“

”یس سر۔“ گل جان نے گاڑی ایک کنارے روک دی۔ اس کے پیچھے آنے والی دوسری گاڑی بھی رک گئی۔ اس میں سکندر کے محافظ سوار تھے۔

گل جان، سکندر والی گاڑی سے اتر کر دوسری گاڑی کی طرف چلا گیا۔ دو منٹ کے بعد اس نے واپس آ کر بتایا۔ ”میں نے فہیم کو پیچھے لگا دیا ہے سر۔“

فہیم، سکندر کے ان آدمیوں میں سے تھا جو سکندر کے لیے اسی قسم کے کارنامے انجام دیا کرتے تھے۔ کس کو اٹھانا ہے۔ کس پر کتنا دباؤ ڈالنا ہے۔ کس کے ساتھ کیا کرنا ہے۔ سکندر نے اپنے تمام آدمیوں کو ٹرینڈ کر رکھا تھا۔

لینڈ کروزر آگے روانہ ہوگئی۔ فہیم دوسری گاڑی سے اتر کر لڑکی کا پیچھا کرنے لگا۔ سکندر کو اطمینان ہوگیا کہ فہیم اس لڑکی کو پاتال میں جا کر بھی تلاش کر کے لے آئے گا۔

وہ اس وقت اپنے گھر ہی کی طرف جا رہا تھا۔

وہ گھر جہاں وہ بادشاہوں جیسی زندگی گزارتا تھا... جہاں کی ہر چیز اتنی قیمتی تھی کہ کسی ایک چیز کی قیمت سے کسی غریب کا جھونپڑا بن سکتا تھا۔

لینڈ کروزر کو دیکھ کر گیٹ پر کھڑے چوکیداروں نے گیٹ کھول دیا۔ لینڈ کروزر پورچ میں آکر کھڑی ہوگئی۔ سکندر گاڑی سے اتر کر اپنے عالیشان گھر میں داخل ہوگیا۔

سامنے ہی شمائلہ بیٹھی تھی۔

ایک خوب صورت سی لڑکی، سہمی سہمی سی۔ اب سے دو مہینے پہلے سکندر نے اسے پسند کیا تھا۔ وہ سکندر ہی کی ایک فرم میں ایک معمولی سے عہدے پر کام کرتی تھی۔

سکندر نے اس کو بلا کر اس سے باتیں کیں، اسے خواب دکھائے۔ یہ وعدہ کیا کہ وہ دو تین کاروباری معاملات سے نمٹنے کے بعد اس سے شادی کرلے گا۔

شمائلہ کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی۔ وہ سکندر جیسے دولت مند کی بیوی بننے جا رہی تھی۔ اس کے بے شمار خواب پورے ہونے جا رہے تھے۔ ایسے خوابوں کی تکمیل کے لیے دولت ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ سکندر کی باتوں میں آگئی تھی۔

اسے امید ہو چلی تھی کہ اس کے گھر کے حالات بدل جائیں گے۔ اس کی بقیہ دونوں بہنوں کی شادیاں ہو جائیں گی۔ اس کا بھائی اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر چلا جائے گا۔ اس کے بیمار باپ کا علاج ہو سکے گا وغیرہ وغیرہ۔

سکندر نے اس سے فائدہ اٹھانے کے بعد نہ صرف اسے اپنے دامن سے جھٹک دیا تھا بلکہ اسے دفتر سے بھی نکال دیا تھا۔

اس لیے وہ آج شمائلہ کو اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ''تم یہاں کیوں آئی ہو؟'' اس نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''آپ سے ایک ضروری کام ہے۔'' شمائلہ نے کانپتی آواز میں بتایا۔

''کیا کام ہے؟'' وہ اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''میں، میں ماں بننے والی ہوں۔'' شمائلہ نے بتایا۔

''تو پھر، میں کیا کروں؟''

''میرا مطلب ہے کہ آپ، آپ ہی اس کے باپ ہیں۔''

''چلو مان لیا ایسا ہے تو بھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''آپ کے لیے نہ پڑتا ہو لیکن میرے لیے تو پڑتا ہے۔''

''جاؤ، ختم کراؤ یہ جھنجھٹ۔ پچاس ہزار سے جاؤ مجھ سے۔'' سکندر نے بے رخی سے کہا۔

''یہ۔۔۔ یہ گناہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔'' شمائلہ کی آواز بلند ہو گئی۔

''وہ۔'' سکندر نے ایک گہری سانس لی۔ ''ہاں، یہ ہے تو گناہ۔'' اب اس کا لہجہ بھی بدلا ہوا تھا۔ ''چلو ٹھیک ہے تم گھر جاؤ، میں کل تمہارے گھر آ رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''کیا؟'' شمائلہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ شاید وہ کچھ غلط سن رہی تھی۔

''ہاں بے وقوف لڑکی۔'' سکندر مسکرا دیا۔ ''تم کیا سمجھتی ہو کہ میں نے صرف وقت گزارنے کے لیے تمہیں پسند کیا تھا۔ نہیں، میں تمہارے ساتھ وقت نہیں، زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔''

''تو پھر اب تک آپ کا وہ رویہ؟'' شمائلہ گڑبڑائی ہوئی تھی۔

''بھول جاؤ اس رویے کو۔'' سکندر نے اس کے پاس آ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''معاف کر دو مجھے۔ کبھی کبھی مجھ پر پاگل پن بھی سوار ہو جاتا ہے۔ یہی ہوا تھا میرے ساتھ۔ اب تم بے فکر ہو کر گھر جاؤ۔ جب میں تمہیں اپنا لوں گا تو پھر کسی کو تمہاری طرف آنکھ اٹھانے کی بھی ہمت نہیں ہوگی۔''

''آپ سچ کہہ رہے ہیں نا؟'' شمائلہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''یہ تمہیں کل پتا چل جائے گا، تم خود ہی دیکھ لینا۔'' سکندر نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ ''یہ لو، یہ پچاس ہزار روپے ہیں۔''

''کیوں، یہ کیوں دے رہے ہیں، میں اب آپ سے پیسے نہیں لوں گی۔''

''بے وقوف مت بنو، اب ہمارے پیسے الگ نہیں ہیں۔ جو کچھ میرے پاس ہے، وہ سب تمہارا ہے۔ اب جاؤ شاباش، اب کچھ لوگ آنے والے ہیں بلکہ ایسا کرو، میں تمہیں بھیج دیتا ہوں۔''

اس نے انٹرکام پر ڈرائیور کو ہدایت دے دی۔

شمائلہ سرخوشی کے عالم میں باہر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی سکندر نے موبائل پر کسی کا نمبر ملا کر کہا۔ ''سنو، جو لڑکی ابھی ڈرائیور خدا بخش کے ساتھ باہر نکلی ہے، وہ تنگ کرنے لگی ہے۔ میری بات سمجھ گئے نا، ہاں کل تک۔''

☆☆☆

سکندر کے آدمی نعیم نے اس لڑکی کا گھر دیکھ لیا تھا۔

نعیم ایک جوان اور ذہین انسان تھا۔ وہ پڑھا لکھا بھی تھا۔ وہ پہلے سکندر کی فرم میں کام کیا کرتا تھا۔ سکندر نے اس کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اسے خود سے قریب کر لیا تھا۔ سکندر کی مہربانیوں نے نعیم کو اس کا غلام بنا لیا تھا۔

اب وہ سکندر کے اشاروں پر چلتا تھا۔ اس نے سکندر کے لیے بہت سے کارنامے انجام دیے تھے۔ نہ جانے وہ کتنی لڑکیوں کو سکندر کے پاس پہنچا چکا تھا۔ آج وہ اس کے اشارے پر اس لڑکی کا پیچھا کر رہا تھا جو بہت خوب صورت لیکن شریف اور غریب دکھائی دے رہی تھی۔

وہ جس گلی سے گزر رہی تھی، اس میں دو رویہ کچے پکے مکانات بنے ہوئے تھے۔ جیسے عام طور پر اس قسم کے محلوں میں ہوا کرتے ہیں۔

اس لڑکی کو اس بات کا احساس نہیں تھا کہ کوئی اس کا تعاقب کرتا ہوا اس کے دروازے تک پہنچ چکا ہے۔ وہ جس مکان کے دروازے پر رکی تھی، وہ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ شاید دو یا تین کمروں سے زیادہ کا نہیں ہوگا۔

اس لڑکی نے اپنے بیگ سے چابی نکالی اور دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ نعیم اس دروازے کو ایک نظر دیکھتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔

ایک تو اسے اس مکان کا اندازہ ہو گیا تھا پھر یہ بھی کہ شاید وہ لڑکی اپنے مکان میں اکیلی رہتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے گھر والے بھی اس کے ساتھ ہوں اور اس وقت کہیں گئے ہوئے ہوں۔

نعیم کو اس لڑکی کا پتا ہی تو معلوم کرنا تھا، وہ اس نے معلوم کر لیا تھا اور اب وہاں رکنا بیکار تھا۔ اس لیے وہ آگے جا کر واپس مڑا اور اسی وقت دو جوان اور صحت مند لڑکے اس کے سامنے آ گئے۔ ان کے تیور جارحانہ تھے۔

''ہاں بھائی، اس گلی میں کس کو دیکھتا پھر رہا ہے؟'' ان میں سے ایک نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''کیوں؟'' نعیم کا لہجہ بھی درشت تھا۔ ''یہ گلی کیا بند کر دی گئی ہے۔ یہاں آنا منع ہے؟ یا یہ گلی تمہارے باپ کی ہے۔''

''اوہو، بہت ہی کڑے تیور ہیں اس کے تو۔'' دوسرے نے پہلے سے کہا۔ ''استاد ذرا اس کے تیور تو صحیح کر دو۔''

نعیم کے لیے یہ سب کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ درجنوں بار اس قسم کے حالات سے گزر چکا تھا۔ پہلے والے

نے اس کے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ فہیم نے بجلی کی سی تیزی سے ساتھ اپنی جیب سے پستول نکال کر اس کی نال اس کے پیٹ پر رکھ دی تھی۔

''اس پستول میں سائلنسر لگا ہوا ہے۔'' وہ کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔ ''آس پاس والوں کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ تیرے پیٹ میں سوراخ کیسے ہوا ہے۔''

دونوں ہی کو اس ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ جس کے پیٹ سے پستول کی نال چپکی ہوئی تھی، اس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں اور دوسرا پھٹی پھٹی آنکھوں سے فہیم کو دیکھے جا رہا تھا۔

''بس، تم دونوں میرے ساتھ ساتھ گلی سے باہر کی طرف چلو۔'' فہیم نے کہا۔ ''ہوشیاری دکھائی تو دونوں کو اسی گلی میں ڈھیر کر جاؤں گا اور پھر میرا کوئی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

فہیم کے تیور اور اس کے اعتماد نے ان دونوں کو یہ سمجھا دیا تھا کہ وہ کوئی اناڑی نہیں ہے۔ وہ دونوں خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ گلی سے باہر کی طرف چلنے لگے اور اچانک کسی کی آواز نے فہیم کو چونکا دیا۔

''ارے فہیم استاد، تم یہاں؟''

فہیم کے ساتھ ساتھ وہ دونوں بھی چونک گئے تھے۔ سامنے سے ایک آدمی بہت پُرجوش انداز میں ان کی طرف آ رہا تھا۔

فہیم نے اس کو پہچان لیا تھا۔ وہ شیرا تھا۔ نام اس کا شاید بشیر احمد ہو لیکن وہ خود کو شیرا کہلوانا پسند کرتا تھا۔

فہیم درجنوں بار اس سے کام لے چکا تھا۔ فہیم نے اس سے کام لینے سے پہلے ایک دو بار اس کی بدمعاشی بھی جھاڑ دی تھی اور اب وہ فہیم کا بہت احترام کرتا تھا۔

شیرا ان کے پاس آ گیا۔ ''استاد! تم اس گلی میں کیا کر رہے ہو، مجھے تو بتا یا ہوتا۔''

''شیرا! میں اس گلی میں کسی کام سے آیا تھا کہ ان دونوں جوانوں نے مجھے گھیر لیا۔ مجبوراً یہ ہتھیار دکھا کر ان کو گلی سے باہر لے جا رہا ہوں۔''

شیرا نے ان دونوں کو ایک ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ ''بدبختو، بے تم لوگوں کو معلوم ہی نہیں کہ تم نے کس پر ہاتھ ڈالنا چاہا تھا۔''

''اب معلوم ہو گیا ہے شیرا استاد۔'' ایک نے کہا۔ ''ورنہ اتنی جلدی اور اتنی پھرتی کے ساتھ کوئی ہم کو قابو میں کر سکتا تھا۔''

''چلو معافی مانگو ان سے۔''

''نہیں شیرا جانے دو۔'' فہیم نے پستول جیب میں رکھ لیا۔ ''یہ دونوں جانتے نہیں تھے اسی لیے ان سے بھول ہو گئی، اب میں چلتا ہوں۔''

''نہیں فہیم استاد، اس طرح تو نہیں جانے دوں گا۔'' شیرا نے اس کا ہاتھ تھام لیا پھر اس نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ''اب دفع ہو جاؤ اور جلدی سے فہیم استاد کے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو۔''

فہیم نے ایک لمحہ سوچ کر رضامندی ظاہر کر دی۔ شیرا سے اس لڑکی کے بارے میں بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا تھا۔

☆☆☆

اور جس لڑکی کے لیے یہ سب ہنگامہ ہو رہا تھا۔

وہ اس وقت اپنے چھوٹے سے باورچی خانے میں کھانا بنانے میں لگی ہوئی تھی۔ زلفوں کی ایک لٹ بار بار اس کے خوب صورت چہرے پر جھک آتی اور وہ اسے ایک انداز سے ہٹا دیا کرتی۔

اس کا نام ریشماں تھا۔ ماں باپ نے نہ جانے کیا سوچ کر یہ نام رکھا تھا اور وہ واقعی ریشم جیسی تھی۔ نرم و نازک، کومل سی۔

کمرے سے کسی کی آواز آئی۔ کچھ عجیب سی آواز تھی۔ ریشماں نے باورچی خانے کے دروازے کی طرف دیکھ کر آواز لگائی۔ ''آئی ہوں، ابھی آئی۔ کھانا تیار ہو رہا ہے۔''

وہ پھر ہانڈی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ آلو گوشت بنا رہی تھی۔ بہت دنوں کے بعد۔ کامران کو اس کے ہاتھ کا یہ سالن بہت پسند تھا۔

وہ اس کا کزن تھا۔ اس کی پھوپی کا بیٹا۔ وہ جب بھی اس کے گھر آتا، ریشماں سے یہی فرمائش کرتا۔ ''کیا، تم مجھ غریب کے لیے آج آلو گوشت کا سالن بنا سکتی ہو؟''

''کیا ضروری ہے کہ غریب جب آئے تو آلو گوشت کا سالن ہی کھائے۔''

''نہ جانے کیوں اس سالن میں تمہارے خوب صورت ہاتھوں کا سارا ذائقہ اتر آتا ہے۔''

''اوہو، تو جناب ہاتھوں کا ذائقہ بھی پہچانتے ہیں۔''

''تمہاری آنکھوں کی قسم، میں تمہارے ہاتھوں کے سارے ذائقے پہچانتا ہوں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا کرتا۔ ''اور جب تم کبھی میرے گھر آتی ہو تو مجھے احساس ہونے لگتا ہے کہ تم آ رہی ہو۔''

''وہ کس طرح، کیا جناب کوئی نجومی وغیرہ ہیں۔''
''خیر نجومی وغیرہ تو نہیں ہوں لیکن...
بہت پہلے سے تیرے قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں
اس وقت ریشماں کے چہرے پر خوشی کا جو تاثر دکھائی دیتا، وہ اس کے مزید حسین ہونے پر مہرِ صداقت لگا دیتا۔
کامران فلمی انداز میں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگتا۔
لیکن یہ سب خواب وخیال ہو چکا تھا۔ سارے حسین مناظر دھواں بن کر نگاہوں اور زندگی سے اوجھل ہو چکے تھے۔ اس نے جلدی جلدی ہانڈی میں چمچ ہلانا شروع کر دیا۔
دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس نے ہانڈی کی طرف دیکھا۔ سالن تیار ہو چکا تھا۔ اس نے ہانڈی اتار کر ایک طرف رکھ دی۔
دروازے پر محلے کا ایک لڑکا کھڑا تھا۔ نصیر نام تھا اس کا۔ وہ ایک سیدھا سادہ لڑکا تھا۔ ریشماں کو باجی باجی کہا کرتا۔ بہت احترام کرتا تھا اس کا۔
''ہاں نصیر، کہو کیا بات ہے؟'' ریشماں نے پوچھا۔
''باجی! آپ ذرا ہوشیار ہو جائیں۔'' نصیر نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔
''ہوشیار ہو جاؤں؟ وہ کیوں؟ کس سے ہوشیار ہو جاؤں؟''
''باجی، کوئی آدمی آپ کا پیچھا کرتا ہوا اس گلی میں آیا تھا۔'' نصیر نے بتایا۔ ''میں اس کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے دو بار آپ کے گھر کا چکر لگایا اور تیسری بار سلمان اور حکیم نے اس کو گھیر لیا۔''
''کون سلمان اور حکیم، وہ جو غنڈے ہیں؟'' ریشماں نے پوچھا۔
''ہاں باجی، وہی دونوں۔'' نصیر نے بتایا۔ ''لیکن اس آدمی نے ذرا سی دیر میں ان دونوں پر قابو پا لیا۔ اس نے سلمان کے پیٹ پر پستول رکھ دیا تھا۔''
''اوہ خدا۔'' ریشماں یہ سب سن کر پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ ''پھر کیا ہوا؟''
''پھر شیرا آ گیا۔ شیرا کو تو جانتی ہیں نا؟''
''ہاں، وہ تو بہت بڑا بدمعاش ہے۔ اس نے تو اس آدمی کو چیر پھاڑ دیا ہوگا۔''
''ارے نہیں باجی، ایسا لگا جیسے شیرا اس آدمی سے دبتا ہو۔ اس نے سلمان اور حکیم کو تھپڑ مارے اور اس آدمی کو بہت عزت کے ساتھ اپنے اڈے کی طرف لے گیا۔''
''او خدا، کیا ہو رہا ہے یہ سب۔ میں تو کچھ بھی نہیں جانتی۔''
''اسی لیے میں آپ کو خبردار کرنے آیا ہوں۔''
''تمہارا بہت بہت شکریہ نصیر، اچھا ہوا تم نے مجھے بتا دیا۔ میں اپنا خیال رکھوں گی۔''
نصیر کے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک دروازے پر کھڑی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے۔ یہ سب اس کی خوب صورتی کی وجہ سے ہو رہا ہو گا۔ اس کی طرف اٹھنے والی نگاہیں اور طرح کی ہوتی تھیں یا تو بہت مہربان اور پیار بھری یا پھر ہوس زدہ۔
مہربان اور پیار بھری نگاہوں کی گنتی بہت کم تھی جبکہ ہوس زدہ نگاہیں بے شمار تھیں۔

☆☆☆

شیرا نے فہیم کو اس لڑکی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔
اس لڑکی کا نام ریشماں تھا۔ وہ اپنے فالج زدہ اپاہج باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک باپ کے سوا اس کا اور کوئی نہیں تھا یا کسی کو دیکھا نہیں گیا تھا۔
وہ خود کسی دفتر میں کام کرتی تھی اور محلے کے بہت سے نوجوان اس کو حاصل کرنے اور اس پر قابو پانے کے چکر میں رہتے تھے لیکن وہ کسی پر توجہ نہیں دیتی تھی۔
فہیم کے لیے اتنی معلومات بہت تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس لڑکی پر آسانی سے ہاتھ ڈالا جا سکتا تھا کیونکہ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ اگر ہوتا بھی تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔
سکندر نے جب یہ ساری تفصیل سنی تو چہک اٹھا۔
''فہیم! اسی لیے تو میں تیری قدر کرتا ہوں۔ تو بہت کام کا آدمی ہے۔ بندے کو قبر تک سے کھود کر لے آتا ہے۔''
''بس باس، یہ مہربانی ہے آپ کی۔''
''آگے تمہیں معلوم ہے نا کیا کرنا ہے؟'' سکندر نے پوچھا۔
''یس باس، اس کو اٹھا لینا ہے۔'' فہیم نے کہا۔
''نہیں، اس کو اٹھانا نہیں ہے۔'' سکندر مسکرا کر بولا۔
''اس لڑکی کے لیے میں نے کچھ اور سوچ رکھا ہے۔''

''وہ کیا باس؟'' فہیم نے حیران ہو کر پوچھا۔
''میں نے اس لڑکی سے شادی کا ارادہ کرلیا ہے۔'' سکندر نے بتایا۔
''کیا؟'' فہیم کی حیرت اور بڑھ گئی۔
''ہاں، وہ لڑکی مجھے بیوی بنانے کے لیے پسند آئی ہے۔'' سکندر نے کہا۔
فہیم کے لیے یہ بہت حیرت کی بات تھی۔ وہ پہلی لڑکی تھی جس کے لیے سکندر نے شادی کی بات کی ہوگی۔ ورنہ وہ تو لڑکیوں کو بس اٹھوالیا کرتا تھا۔
''اور سنو۔۔۔'' سکندر نے اس کی طرف دیکھا۔ ''میرا رشتہ تم لے کر جاؤ گے۔''
''میں۔''
''ظاہر ہے اور کون لے کر جائے گا۔'' سکندر نے کہا۔ ''تم ان کو میرے بارے میں بتادینا اور ان سے یہ بھی کہہ دینا کہ میں اس بوڑھے کا خرچہ اٹھانے کو تیار ہوں۔ اسے علاج کے لیے باہر بھی بھیجا جاسکتا ہے۔''
''او کے باس۔'' فہیم نے سر جھکا دیا۔ ''میں اس سے بات کرلوں گا، اس گھر میں اس لڑکی کے سوا اور ہے کون۔''
''اور یہ کام جلد ہوجانا چاہیے۔'' سکندر نے حکم دیا۔ ''اگلے ہی ہفتے۔ میں دس دنوں کے بعد یورپ میر کے لیے جارہا ہوں اور وہ بھی میرے ساتھ ہوگی، سمجھ گئے۔''
''جی باس سمجھ گیا۔''

☆☆☆

فہیم نے سکندر کا پیغام ریشماں کو پہنچا دیا تھا۔
وہ دوسری ہی شام ریشماں کے دروازے پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے شیرا کو بتادیا تھا کہ وہ کس کام سے ریشماں کے پاس جارہا ہے۔
ریشماں اپنے دروازے پر ایک اجنبی کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔
''تمہارا نام ریشماں ہے نا۔'' اس نے ریشماں کو گھورتے ہوئے پوچھا۔
''جی ہاں، لیکن آپ کون ہیں؟''
''میرا نام فہیم ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اور مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ کیا میں تمہارے گھر میں بیٹھ سکتا ہوں؟''
''نہیں، میرے گھر میں کوئی نہیں ہے۔ میں آپ کو اندر نہیں بٹھا سکتی۔''
''چلو کوئی بات نہیں۔ یہیں بات کرلیتے ہیں۔''

''جی فرمائیں۔''
''دیکھو، تین چار دنوں پہلے کی بات ہے۔ تم بازار سے آرہی تھیں کہ میرے باس سکندر نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔ وہ تم سے اتنا متاثر ہوا اور تم اسے اتنی پسند آئیں کہ اس نے مجھے بھیجا کہ میں تمہارا گھر دیکھ لوں۔''
ریشماں کا منہ بن گیا۔ ''تو اس دن تم میرا پیچھا کررہے تھے اور محلے کے دو لڑکوں نے تمہیں گھیر لیا تھا۔''
''ہاں، وہ میں ہی تھا۔'' فہیم مسکرا دیا۔ ''لیکن وہ لڑکے نہیں جانتے تھے کہ میں کون ہوں۔''
''مجھے کچھ نہیں سننا۔'' ریشماں نے دروازہ بند کرنا چاہا لیکن فہیم نے اپنا پیر اڑا دیا۔
''میری بات سن لو، فائدے میں رہو گی۔'' فہیم نے کہا۔ ''مجھے میرے باس سکندر نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ وہ بہت دولت مند ہے۔ بہت بااثر بہت طاقتور اور بہت خطرناک۔''
''کیا وہ اتنا طاقتور ہے کہ ایک مظلوم اور شریف لڑکی کی بددعاؤں کا مقابلہ کرسکے۔'' ریشماں نے کہا۔
ایک لمحے کے لیے فہیم کانپ کر رہ گیا۔ اس لڑکی نے یہ کیسی بات کردی تھی۔ ''لڑکی! میری پوری بات سن لو کہ میں کیوں آیا ہوں تمہارے پاس۔''
''چلو بتاؤ، کیوں آئے ہو؟''
''میں تمہارے لیے سکندر کا رشتہ لے کر آیا ہوں۔'' فہیم نے بتادیا۔ ''وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''
''ایسے لوگ شادی وادی کے چکر میں نہیں پڑتے۔'' ریشماں نے کہا۔ ''تم میری طرف سے جاکر اسے یہ پیغام دے دو کہ وہ چاہے جو بھی ہو، میں اس سے شادی نہیں کرسکتی۔''
''او کے۔'' فہیم نے ایک گہری سانس لی۔ ''وہ چونکہ میرا باس ہے۔ اس نے مجھے ایک ڈیوٹی دی تھی، وہ میں نے پوری کردی اور اب میں اپنی طرف سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔''
''اب کیا کہنا ہے؟''
''وہ بات یہ ہے کہ تم جتنی جلدی ہو، یہ مکان چھوڑ دو۔ تمہارا یہاں رہنا بہت خطرناک ہے۔'' فہیم نے کہا۔ ''یہ میں تمہاری ہمدردی میں کہہ رہا ہوں۔ ورنہ تمہیں کسی بھی وقت نقصان ہوسکتا ہے اور کوشش یہ کرو کہ محلے کے کسی بھی آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ تم لوگ کہاں گئے ہو۔ ورنہ سکندر کے آدمی محلے والوں سے اگلوالیں گے۔''

اب ریشماں کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا تھا۔ وہ اب تک بہت اطمینان اور ہمت کے ساتھ فہیم کی باتیں سن رہی تھی لیکن اب اس کی ہمت جواب دینے لگی تھی۔ انجانے سے خوف کی ایک لہر اس کی رگوں میں سرائیت کرتی جارہی تھی۔

اس نے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے دروازے کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

☆☆☆

دو پولیس والے سکندر کے سامنے مؤدبانہ انداز میں بیٹھے تھے۔

سکندر کا موڈ اس وقت بہت خراب ہو رہا تھا۔ ''سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم لوگ میرے پاس کیوں چلے آئے ہو؟''

''سر، ہم آپ کے پاس صرف خانہ پُری کے لیے آئے ہیں۔'' ایک نے کہا۔ وہ عہدے کے لحاظ سے انسپکٹر تھا۔

''تمہیں معلوم ہے اس لڑکی کی موت کا سن کر خود مجھے بھی افسوس ہوا ہے۔'' سکندر اپنی آواز کو پُرافسوس بناتے ہوئے بولا۔ ''وہ میرے دفتر میں ایک عام سے عہدے پر کام کرتی تھی لیکن اس کی محنت اور صلاحیت دیکھ کر میں نے اس کو ترقی دے دی تھی۔''

''یس سر، یہ سب ہمیں معلوم ہے۔'' دوسرے نے کہا۔ ''اصل میں وہ لڑکی کئی بار آپ کی گاڑی میں دیکھی گئی ہے اس لیے...''

''تو یہ کون سی بات ہوگئی۔ وہ غریب اور شریف لڑکی تھی۔ میرے اسٹاف میں تھی۔ اس لیے اگر وہ میری کسی گاڑی میں اپنے گھر چلی گئی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''سر! ہم آپ کے پاس اس لیے آئے تھے کہ شاید آپ ہمیں اس کے بارے میں کچھ بتا سکیں، ہوسکتا ہے اس نے کبھی آپ سے ذکر کیا ہو کہ اس کے کچھ دشمن ہیں یا اسے کسی طرف سے خطرہ ہے۔''

''نہیں، اس نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی اور ویسے بھی میں اپنے اسٹاف کے درمیان ایک فاصلہ رکھتا ہوں۔'' سکندر نے کہا۔ ''کچھ اور پوچھنا ہے آپ لوگوں کو؟''

''نو سر۔'' وہ دونوں کھڑے ہوگئے۔

''سر!'' انسپکٹر نے سکندر کی طرف دیکھا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے پتا چلا ہے کہ مرنے والی پریگننٹ بھی تھی۔''

''اوہ، یہ تو واقعی افسوس کی بات ہے۔'' سکندر نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ''خیر میں دیکھوں گا کہ اس کے گھر والوں کے لیے کیا کرسکتا ہوں۔''

☆☆☆

''رحمت کو کھانا دے دیا۔'' سرکار نے اپنے شاگردِ خاص سے دریافت کیا۔

''جی حضرت، اس نے کھانا کھا لیا ہے۔'' شاگردِ خاص شکور نے جواب دیا۔

''جزاک اللہ۔'' سرکار نے دھیرے سے کہا۔ ''اس کی دیکھ بھال کرتے رہنا۔ وہ پناہ کی تلاش میں ہمارے پاس آئی ہے اور ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کریں۔''

''جی سرکار۔'' شکور نے گردن جھکالی۔ ''کاش ہمیں یہ معلوم ہوسکتا کہ وہ کون ہے، کس گھرانے سے اس کا تعلق ہے، کہاں کی رہنے والی ہے، ہمیں تو اس کا نام بھی نہیں معلوم۔''

''افسوس کہ وہ بے چاری گونگی ہے یا کسی صدمے نے اس کی زبان بند کردی ہے۔'' سرکار نے کہا۔ ''اسی لیے میں نے اس کا نام رحمت رکھا ہے۔ وہ چاہے کوئی بھی ہو۔ اس کا نام کچھ بھی ہو، ہے تو لڑکی۔ اور لڑکیاں خدا کی رحمت ہوتی ہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم ہر حال میں ان کا خیال رکھیں۔ ان کو دکھی نہ ہونے دیں۔''

''جی حضرت۔'' شکور نے تائید کی۔ ''جب میں اسے دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی مرحوم بیٹی یاد آجاتی ہے اگر وہ زندہ ہوتی تو اس کی عمر کی ہوتی۔'' شکور کی آواز بھرا گئی۔

سرکار نے تسلی دینے والے انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''نہیں شکور، اداس نہیں ہوتے اور خدا کی مصلحت اور مرضی کے آگے کچھ بولتے بھی نہیں ہیں۔''

سرکار اللہ کے نیک بندے تھے۔ جعلی پیروں اور باباؤں سے بالکل مختلف۔ ان کی اپنی دنیا تھی۔ اپنے شب و روز تھے۔ اپنی زندگی تھی۔

ان کا آستانہ ہائی وے پر تھا... یہ زمین انہوں نے باقاعدہ خریدی ہوئی تھی۔ جن لوگوں کو ان کے بارے میں معلوم تھا، وہ دور دراز سے ان کے پاس آیا کرتے تھے۔

مہینے کے دو دن ان کے یہاں درس بھی ہوا کرتا۔

سرکار ایک پڑھے لکھے انسان تھے۔ مطالعہ بہت اچھا تھا۔ اسی لیے ان کی باتوں میں ادب کی چاشنی بھی ہوا کرتی تھی۔

ان کے یہاں نذرانے وغیرہ کا کوئی رواج نہیں تھا۔

ان کے سارے اخراجات ان کی کتابوں کی فروخت اور ان کی رائلٹی سے چلا کرتے۔

سرکار کے ساتھ ان کا شاگردِ خاص شکور رہا کرتا تھا۔ وہ تنہا انسان تھا۔ اس نے جب سرکار کو دیکھا تو پھر ان ہی کا ہو کر رہ گیا۔

سرکار نے اپنے آستانے کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد بھی بنا رکھی تھی۔ یہ ایک کچی مسجد تھی۔ شکور کی اذانیں جب اس مسجد سے باہر جاتیں تو کچھ فاصلے پر جو ایک چھوٹی سی بستی تھی، اس کے کچھ لوگ بھی نماز کے لیے آجاتے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی اس طرف سے گزرتی ہوئی مسافر بسوں کے مسافر بھی اتر کر نماز میں شریک ہو جاتے تھے۔ اس طرح وہ جگہ عارضی طور پر آباد ہو جاتی تھی۔

سرکار نے ایک صبح جب اس لڑکی کو دیکھا تو حیران رہ گئے۔ وہ ایک قبول صورت لڑکی تھی۔ بیس یا بائیس برس کی۔ اس کے نقوش یہ بتا رہے تھے کہ اس کا تعلق کسی اچھے گھرانے سے ہے۔ اس کا لباس بھی بہت معقول تھا۔ وہ اس علاقے کی نہیں معلوم ہوتی تھی۔

وہ بہت تھکی ہوئی، خوف زدہ اور نڈھال دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی اطلاع شکور ہی نے دی تھی۔ وہ مسجد کی بیرونی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

''بیٹی کون ہو تم؟ کہاں سے آئی ہو؟'' سرکار نے اس کے پاس جا کر پوچھا۔

اس لڑکی نے آں آں کرتے ہوئے اپنی گردن ہلا دی۔

''حضرت یہ بے چاری گونگی معلوم ہوتی ہے۔'' شکور نے بتایا۔ اس وقت وہ پاس ہی کھڑا تھا۔

''ہاں۔'' سرکار نے افسوس کا اظہار کیا۔ ''کسی اچھے گھرانے کی معلوم ہوتی ہے۔ نہ جانے اس پر کیا بیتی ہوگی کہ یہاں آگئی۔''

''بیٹا!'' سرکار نے پھر اس لڑکی کو مخاطب کیا۔ پھر اشارے سے پوچھا۔ ''کچھ کھاؤ گی؟''

لڑکی نے جلدی سے اپنی گردن ہلا دی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھوکی ہے۔''

''حضرت میں اس کے لیے کھانا لے کر آتا ہوں۔'' شکور نے کہا۔

''یہاں نہیں، پہلے اس کے لیے برابر والا کمرا ٹھیک کرادو۔''

''وہ کمرا صاف ستھرا ہے سرکار۔'' شکور نے بتایا۔

''فرش پر بستر بھی بچھا ہوا ہے۔''

''ٹھیک ہے جب تک اس لڑکی کے گھر کا پتا نہیں چلتا، یہ یہیں رہے گی۔''

اس طرح وہ لڑکی بھی اب ان کے ساتھ ہی رہنے لگی تھی۔ وہ ان لوگوں کے لیے بہت مفید ثابت ہو رہی تھی۔

اس نے جب شکور کو کھانا بناتے ہوئے دیکھا تو اس کو ہٹا کر خود کھڑی ہوگئی۔ اس دن کے کھانے کا ذائقہ ہی مختلف تھا۔

''سرکار، یہ کھانا اسی لڑکی نے بنایا ہے۔'' شکور نے بتایا۔ ''بے چاری بہت نیک اور اچھی معلوم ہوتی ہے۔ پانچوں وقت کی نمازی بھی ہے۔''

''ہمیں تو اس کا نام بھی نہیں معلوم۔'' سرکار نے کہا۔

''سرکار! ہم خود ہی اس کا کوئی نام رکھ دیتے ہیں۔ اب تو وہ ہمارے ساتھ ہی رہنے لگی ہے۔''

''چلو اس کا نام رحمت رکھ دیتے ہیں۔'' سرکار نے کہا۔ ''کیونکہ وہ ہمارے پاس رحمت بن کر آئی ہے۔''

رحمت کے لیے وہ دن بہت خوشی کا ہوتا جب سرکار کا درس سننے کے لیے دور دور سے لوگ آیا کرتے۔ وہ خود ہی ان کے لیے چائے وغیرہ کا بندوبست کر دیتی تھی۔ اس کی آمد نے شکور کے بوجھ کو بہت حد تک کم کر دیا تھا۔

سرکار نے اس کے حالات جاننے کے لیے کئی بار استخارہ بھی کیا تھا لیکن کوئی واضح اشارہ نہیں مل سکا تھا۔

سرکار اسے اپنی بیٹی کی طرح سمجھنے لگے تھے۔ اس کا انتہائی خیال رکھتے۔ جتنا خیال کوئی باپ اپنی بیٹی کا رکھتا ہو گا۔

رحمت بھی سرکار اور شکور کے ساتھ بہت مانوس ہوگئی تھی۔ سرکار جب بھی اشارے سے اسے یہ بتاتے کہ اس کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ چلو تمہیں تمہارے گھر پہنچا دیا جائے تو وہ اس وقت سخت خوف زدہ ہو جاتی۔ انکار میں زور زور سے گردن ہلانے لگتی۔ سرکار پھر ہنس پڑتے۔ ''اچھا اچھا میری اماں، تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ یہیں ہمارے ساتھ رہو گی۔ ٹھیک ہے۔''

اس وقت رحمت خوش ہو جاتی۔ سرکار نے اس کے لیے شکور کو شہر بھیج کر اس کی ضرورت کی بہت سی چیزیں منگوا دی تھیں۔

☆☆☆

فہیم، سکندر کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

سکندر اس دن بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ آج اس کے اکاؤنٹ میں بہت سے پیسے آگئے تھے۔ ایک بہت

بڑی کھیپ اس نے باہر بھجوائی تھی۔
''فہیم! سات دن گزر چکے ہیں۔'' سکندر نے کہا۔ ''اب تم دوبارہ اس لڑکی کے گھر جاؤ اور جواب لے کر آؤ۔''
''میں گیا تھا باس۔'' فہیم نے بتایا۔
''اچھا، تو پھر کیا ہوا؟''
''وہ لوگ وہ مکان اور وہ محلہ چھوڑ کر کہیں جا چکے ہیں۔''
''کیا بکواس ہے؟'' سکندر غصے سے دہاڑنے لگا۔ ''کہاں چلے گئے؟''
''کسی کو نہیں معلوم ہے باس۔'' فہیم نے کہا۔ ''میں نے پورے محلے سے پوچھ کر دیکھ لیا۔ شیرا اور اس کے آدمی بھی کچھ نہیں جانتے۔''
''کیسے نہیں جانتے نمک حرام، کہیں سے بھی ہو ڈھونڈو اس کو۔'' سکندر کرسی سے اٹھ کر زخمی شیر کی طرح کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ''وہ کسی دفتر میں بھی کام کرتی تھی نا؟''
''یس باس، میں اس کے دفتر بھی جا چکا ہوں۔ اس نے دفتر سے نوکری چھوڑ دی ہے اور دفتر والوں کو بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں گئی ہوگی۔''
''کون ہے اس کا ہمدرد۔ جو اس کو نکال کر لے گیا؟'' سکندر اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا۔ ''کون ہو سکتا ہے۔ تم بھی نکمے اور ناکارہ نکلے ہو۔ یاد رکھو اگر دو دنوں تک اس کا پتا نہیں چلا تو میں.... نہ جانے کیا کر جاؤں۔''
''باس جانے دیں اس کو، وہ ایک عام سی لڑکی ہے۔''
''ہاں عام سی لڑکی تھی۔'' سکندر مسکرا دیا۔ ''لیکن مجھ سے بھاگ کر اب وہ بہت خاص ہوگئی ہے۔ اس نے بتا دیا کہ ایسی بھی کوئی ہے جو مجھے ٹھکرا کر جا سکتی ہے۔ اب وہ میری ضد ہو کر رہ گئی ہے، سمجھے۔ یہ میری انا کا سوال ہے۔ جاؤ ڈھونڈو اُس کو۔ اور اب جب وہ مل جائے تو شادی وادی کا پیغام دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کو اپنے پاس دیکھنا چاہتا ہوں بس، سمجھ گئے میری بات؟''
''یس باس اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔''
''تو جاؤ اب دفع ہو یہاں سے۔ میرا سارا موڈ خراب کر کے رکھ دیا ہے تم نے، جاؤ۔''
فہیم کے جانے کے بعد بھی سکندر بہت دیر تک بھناتا رہا تھا۔ اس لڑکی نے اسے چیلنج دیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے سنجیدہ ہو کر کسی لڑکی کے بارے میں سوچا تو وہ اس طرح کہیں غائب ہوگئی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔ کئی لڑکیاں اسی طرح اس کے چنگل سے بھاگ نکلی تھیں لیکن اُس وقت جب وہ لڑکیاں اس کے ہاتھوں پامال ہو چکی ہوتیں۔ لیکن یہ لڑکی تو بہت پہلے بھاگ نکلی تھی۔ سکندر تو اس کو ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں پایا تھا۔
اس نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ اب اگر وہ لڑکی اس کے ہاتھ آ گئی تو وہ اس سے شادی وادی کی بات نہیں کرے گا بلکہ ایسی سزا دے گا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔

☆☆☆

ریشماں کا باپ اب بستر پر ہی رہتا تھا۔
اس کا ایک پیر اور ایک ہاتھ فالج زدہ ہو گیا تھا۔ ریشماں ہی اسے سہارا دے کر باتھ روم تک لے جاتی تھی۔ کم از کم اتنا ضرور تھا کہ وہ اپنی ضروریات خود ہی ادا کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ کسی قابل نہیں رہا تھا۔
وہ کسی زمانے میں ایک اچھا کھلاڑی رہ چکا تھا۔ ہاکی کا کھلاڑی۔ اب وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک ایسا وجود جو گوشت کے لوتھڑے کی طرح بستر پر پڑا رہتا۔
گھر میں اور کوئی نہیں تھا۔ ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب صرف باپ رہ گیا تھا۔ وہ بھی معذور۔ دنیا بھر کے اخراجات کہاں سے پورے ہوتے۔ اچھے زمانے میں ریشماں نے تعلیم حاصل کر لی تھی۔ وہی تعلیم اب اس کے کام آ رہی تھی۔ وہ ایک طرح سے بدقسمت تھی اور خوش قسمت بھی۔
خوش قسمت اس لیے کہ خدا نے اس کو بنانے میں جی بھر کے نوازا تھا اور بدقسمت اس لیے کہ اس کا یہی حسن اس کے لیے وبال بن گیا تھا۔
وہ اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے سات دریاؤں میں اکیلی ناؤ کی طرح ڈگمگاتی پھرتی تھی۔ جہاں بھی جاتی اس کو اس کی تعلیم اور صلاحیت کی بنیاد پر نہیں دیکھا جاتا۔ اس کے حسن اور دلکشی کو دیکھ کر اسے ملازمت دے دی جاتی تھی۔
وہ جانتی تھی کہ ایسی نگاہیں کیا مفہوم رکھتی ہیں۔ وہ کچھ دنوں کے بعد اس دفتر سے بھاگ نکلتی۔ خدا خدا کر کے اسے اب جو جاب ملی تھی، وہ بہت مناسب تھی۔ یہاں کے لوگ بھی اپنے کام سے کام رکھنے والے تھے۔ تنخواہ بھی معقول تھی۔
اس نے پرانا مکان چھوڑ دیا تھا اور اب دوسرے محلے میں رہنے لگی تھی۔ زندگی کسی حد تک اپنے ڈھرے پر آ چکی تھی کہ سکندر کا معاملہ سامنے آ گیا۔ یہ خرابی بھی اس کے حسن ہی نے پیدا کی تھی۔
پھر خدا نے اس کی مدد کی۔ سکندر کے آدمی فہیم کو اس

سے اور اس کے حالات سے ہمدردی ہوگئی۔ اسی نے راتوں رات ریشماں اور اس کے باپ کو ایک دوسرے محلے میں شفٹ کروا دیا تھا۔ اس کے کہنے پر ریشماں نے اپنے دفتر سے ایک مہینے کی چھٹی لے لی تھی۔ اس کا اندازہ ہوگیا تھا کہ فہیم ایک معقول انسان ہے۔ اس کی نگاہوں میں ستائش کے ... جذبات تو ہوتے ہیں، ہوس کے نہیں۔

فہیم کا سہارا مل جانے کے بعد ریشماں نے بہت تقویت محسوس کی تھی۔ فہیم ہر رات اس کے پاس خیریت معلوم کرنے آیا کرتا تھا۔

ایک رات اس نے ریشماں سے کہا۔ ''ریشماں میں نہیں جانتا کہ میری اس بات پر تمہارا کیا ردِعمل ہوگا اور تم کیا سمجھو گی لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس کم بخت سکندر کا خطرہ ابھی بھی تمہارے سر پر منڈلا رہا ہے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو تمہاری تلاش میں پھیلا دیا ہے۔''

''خدا غارت کرے اس کو۔ میں نے کیا بگاڑا ہے اس کا۔''

''تم نے کچھ نہیں بگاڑا۔ لیکن سکندر جیسے لوگ ہوس کے کتے ہوتے ہیں جب تم اس کے ہاتھ نہیں آئیں تو وہ غصے میں پاگل ہو رہا ہے۔ وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ اب اس سے بچنے کی صرف ایک ترکیب ہے۔ حالانکہ ہوسکتا ہے کہ یہ ترکیب بھی کارگر نہ ہو۔ لیکن ایک امکان تو ہوسکتا ہے۔''

''وہ کیا ہے؟''

''تم، میرا مطلب ہے کہ ہم دونوں نکاح کر لیتے ہیں۔'' فہیم نے کہا۔

ریشماں نے چونک کر فہیم کی طرف دیکھا لیکن اس کے چہرے پر اسے خلوص نظر آیا۔ ریشماں کے لیے بھلائی اور ہمدردی کے جذبات تھے۔ وہ ریشماں کو خراب لوگوں سے بچانا چاہتا تھا۔ جس طرح اب سے بہت پہلے کامران نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ وہ فہیم کی طرف دیکھتی رہی۔ کامران اس کی نگاہوں کے سامنے اپنے طاقتور تصور کے ساتھ اس طرح آ گیا جیسے فہیم کی جگہ کامران بیٹھا ہو۔

کامران جو ریشماں کا پیار تھا۔ ریشماں کی پسند تھا۔ جو اس کا کزن بھی تھا۔ ریشماں نے جس کے ساتھ مل کر خوب صورت زندگی کے خواب دیکھے تھے۔

''ریشماں! کیا تمہیں میری یہ بات بری لگی ہے؟'' فہیم کی آواز نے اسے چونکایا۔

''نہیں، نہیں۔'' ریشماں نے جلدی سے گردن ہلا دی۔ ''آپ نے کوئی جبر نہیں کیا۔ کوئی زبردستی والی بات نہیں کی۔ آپ نے تو سیدھے طریقے سے اپنا پروپوزل میرے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس میں برا ماننے والی کوئی بات نہیں ہے۔''

''تو پھر، کیا فیصلہ ہے تمہارا؟''

''فہیم صاحب! کیا آپ دو چار دن سوچنے کے لیے دیں گے تاکہ میں اپنے آپ کو سمیٹ سکوں۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔ میں تمہاری ذہنی کیفیت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت کتنی الجھنوں میں ہو۔ لیکن میں ایک بات بتا دوں کہ اگر تمہارا جواب انکار میں بھی ہوا تو بھی تم میرے سلوک میں کوئی فرق نہیں پاؤ گی۔''

''یہ اندازہ ہے مجھے۔'' ریشماں دھیرے سے بولی۔ ''آپ نے میرے ساتھ جو بھلائی کی ہے، اس کا میں صلہ دے ہی نہیں سکتی۔ بس ایک دو دن ٹھہر جائیں۔ میں اپنے آپ کو سنبھال لوں۔''

''ضرور۔'' فہیم نے کہا۔ ''اب یہ بتاؤ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟''

''نہیں، سب کچھ ہے گھر میں۔'' ریشماں نے جواب دیا۔ ''میں تو سبزیاں لینے بھی نہیں جاتی۔ سبزی والے کا بچہ خود یہ پہنچا دیتا ہے۔''

''ہاں فی الحال یہ احتیاط ضروری ہے۔'' فہیم نے کہا۔ ''اس کے بعد اللہ مالک ہے۔''

فہیم کے جانے کے بعد ریشماں اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ اس کے سینے میں ایک طوفان سا امڈ آیا تھا۔ بہت دنوں پہلے ایسی ہی بات کامران نے بھی کی تھی۔

☆☆☆

کامران نے اپنی دو انگلیوں سے اس کے چہرے کو اوپر اٹھاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔ ''کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟''

''وہ کیوں؟'' ریشماں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' کامران نے کہا۔

''جناب! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھ سے اس قسم کی بات کرنے والے سیکڑوں ہیں۔''

''جانتا ہوں میں۔'' کامران نے ایک گہری سانس لی۔ ''چلو ان سیکڑوں میں ایک میرا بھی نام شامل کرلو۔''

''ویسے، میں اس پر غور کروں گی۔''

ان دونوں کے درمیان اسی قسم کی پیار بھری باتیں ہوا کرتیں۔ بہت چھوٹی چھوٹی پیار بھری باتیں۔ دونوں نے بچپن سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ کامران عمر میں اس سے سات آٹھ برس بڑا تھا لیکن ریشماں کے ساتھ ہی کھیلا کرتا۔

اسے ریشماں شروع ہی سے پسند تھی۔ وہ ایک ذہین لڑکا تھا، ہر وقت کتابوں کی باتیں کیا کرتا۔ اپنے ابو سے کتابوں کی فرمائش کرنے والا۔ جب اس نے میٹرک کرلیا تو اس وقت بھی اس کے پاس اپنی ایک چھوٹی سی لائبریری ہوا کرتی تھی۔

وہ اپنی کوئی کتاب ضائع نہیں کرتا تھا۔ پہلی سے لے کر میٹرک تک کی کتابیں اس کے پاس محفوظ تھیں۔ وہ کہا کرتا۔ ''یاد رکھو ریشماں، کتابیں کبھی پرانی نہیں ہوتیں۔ یہ ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔''

''اچھا بقراط صاحب۔'' ریشماں اسے بقراط کہا کرتی تھی۔ ''کبھی کتابوں سے ہٹ کر بھی باتیں کرلیا کرو۔ کوئی اور شوق ہے بھی یا نہیں؟''

''کیوں نہیں۔ دو ہی تو شوق ہیں۔ ایک تو کتابوں کا اور دوسرا تمہیں دیکھتے رہنے کا۔ تم سے باتیں کرنے کا اور تم سے پیار کرنے کا۔''

اس وقت ریشماں کو ایسا لگتا جیسے وہ فضاؤں میں پرواز کررہی ہو۔ ہلکے پھلکے بادل اس کے آگے پیچھے ہوں اور کامران اس کے ساتھ ساتھ ہو۔

دونوں ایک دوسرے کے کزن تھے۔ ایک دوسرے کو اپنانے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ گھر جیسی بات تھی۔

دونوں کے لیے سب کچھ بہت روشن روشن اور واضح تھا کہ اچانک بہت کچھ ہوگیا۔ سب سے پہلا حادثہ یہ ہوا کہ ریشماں کا باپ مفلوج ہوگیا۔ اس کی ماں کا تو پہلے ہی انتقال ہوچکا تھا۔ ساری ذمے داری ریشماں پر آگئی۔

حالات نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کامران پر بھی قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ایک ایسے حادثے کا شکار ہوا جس میں کوئی نہیں بچ سکا تھا۔

ریشماں کس کس کا ماتم کرتی۔ اپنی ماں کا۔ اپنے باپ کے مفلوج ہونے کا۔ کامران کے امی ابو یعنی اپنی پھوپی پھوپا کا۔ یا پھر کامران کا۔

جس کا دکھ سب سے گہرا تھا۔ یہ وہ زخم تھا جو ہر وقت تازہ ہی رہتا تھا۔ حالات ایسے ہوگئے کہ انہیں اپنا پرانا محلہ چھوڑنا پڑا۔

نئی جگہ آئی تو نئی پریشانیاں اس کے ساتھ چلی آئیں۔ پریشانیاں اس کے حسن نے پیدا کی تھیں۔ لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھتے۔ ہوس کے ماروں کی ہر طرف بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ پھر جب وہ جاب کی تلاش میں نکلی تو اندازہ ہوا کہ زندگی کبھی کبھی کتنی تباہ کن اور کتنی دشوار ہوجاتی ہے۔

اس کی طرف نگاہوں کے تیر اُڑتے ہوئے آتے اور اس کے بدن میں پیوست ہوجاتے۔ اسے اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا بہت مشکل ہورہا تھا۔

پہلے وہ ایک خوش اخلاق اور ہر دم مسکرانے والی لڑکی تھی لیکن اب اس نے اپنے تیور سخت کرلیے تھے۔ کسی سے بات بھی کرتی تو بہت اکھڑے ہوئے انداز میں۔ اپنے آپ کو بچانے کا شاید یہی طریقہ تھا۔

پھر اسے پتا چلا کہ شہر کا ایک خطرناک انسان اس کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ اس نے شادی کا پیغام بھی بھیجا تھا۔ ریشماں خود کو بہت بے بس محسوس کررہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کون اس کا ساتھ دینے والا تھا۔ کوئی نہیں۔

پھر فہیم اس کے سامنے آگیا۔ وہ اسی خطرناک آدمی کا کارندہ تھا لیکن ریشماں کے سامنے آکر پگھل چکا تھا۔ اس نے ریشماں کو تحفظ دیا تھا۔ اس کو پرانے محلے سے نکال کر نئے محلے میں لے آیا تھا۔ پھر اس نے ریشماں سے شادی کی خواہش کا اظہار کردیا تھا۔

ریشماں نے اس کی باتوں میں اپنے لیے ہوس محسوس نہیں کی تھی۔ اسے خلوص نظر آیا تھا۔ کامران کے بعد یہ دوسرا آدمی تھا جس نے بہت پیار اور بہت نرمی سے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا تھا۔

ریشماں کے پاس کوئی آپشن نہیں تھا۔ اسے فہیم کی بات مان لینی چاہیے۔ وہ ایک مخلص شخص تھا۔ دوسروں سے بہت مختلف۔

کامران تو اب دوسری دنیا سے لوٹ کر آنے والا نہیں تھا۔ جو چلے جائیں، وہ واپس کہاں آتے ہیں۔ صرف ان کی یادیں ہی رہ جاتی ہیں۔

پھر اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ ہاں کہہ دے گی لیکن اس سے پہلے اسے اپنے باپ کو بتانا ضروری تھا۔ وہ معذور ہیں۔ لیکن دل میں دعائیں تو دے سکتے تھے۔ ایک اچھی زندگی کی دعائیں۔ ریشماں کے بہتر مستقبل کی دعائیں۔

وہ اپنے کمرے سے نکل کر باہر کمرے میں آگئی۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ ریشماں اس کے بستر کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا تھا۔

''ابو، مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

اس نے کہنا شروع کیا۔ ''میں جانتی ہوں کہ آپ میرے لیے کتنے پریشان رہتے ہوں گے۔ کیا کیا سوچتے ہوں گے، میرے مستقبل کی فکر آپ کو کتنی پریشان کرتی ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ آپ بول نہیں سکتے۔ اظہار نہیں کر سکتے لیکن آپ کی آنکھیں بتاتی ہیں ابو۔''

باپ شاید بہت خاموشی سے اس کی باتیں سنے جارہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ ''ابو، اب تو کوئی نہیں ہے جو میری طرف سے آپ سے ایسی باتیں کرے اسی لیے میں خود ہی کہہ رہی ہوں۔ ابو! وہ جو نعیم ہیں نا، وہ اچھے آدمی ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ انہوں نے کس طرح ہمارا ساتھ دیا ہے... انہوں نے اپنے لیے شادی کا پیغام بھیجا ہے۔ ابو! اب جو آپ کی مرضی ہو۔''

سناٹا۔ باپ کی طرف سے کوئی اظہار نہیں ہوا۔ ریشماں نے مڑ کر دیکھا۔ باپ کے ہونٹوں کے کنارے سے مکھیاں چپکی ہوئی تھیں اور وہ انہیں اُڑانے سے بھی قاصر تھا۔ نہ جانے کتنی دیر پہلے وہ مر چکا تھا۔ بیٹی کے لیے کسی شادی کا پیغام سنے بغیر ہی مر چکا تھا۔

☆☆☆

اس وقت سرکار اور رحمت ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

سرکار کچھ سوچ رہے تھے سوچ کی گہری لکیریں ان کی پیشانی پر دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کی نگاہیں رحمت پر جمی تھیں جو سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔

''رحمت، یہ ٹھیک ہے کہ تم بول نہیں سکتیں لیکن یہ اچھی بات ہے کہ تم سن سکتی ہو اور اپنے ردِعمل کا اظہار بھی کر سکتی ہو۔ کیوں، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

رحمت نے اس بات پر اپنی گردن ہلادی تھی۔

''میں نے تمہیں بیٹی کہا ہے اسی لیے ایک باپ کی نگاہ سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔'' سرکار نے بات آگے بڑھائی۔ ''دیکھو، اس آستانے کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے ہوئے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ تم ایک جوان لڑکی ہو۔ تم یہاں رہوگی تو نہ جانے کتنی باتیں سامنے آئیں گی۔ ابھی تو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ آئندہ بھی ایسی ہی خاموشی رہے۔ میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو، کہاں کی رہنے والی ہو، کہاں سے آئی ہو۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ تم ایک شریف لڑکی ہو۔ تمہارا تعلق کسی اچھے گھرانے سے ہے۔''

رحمت سر جھکائے ان کی باتیں سنتی رہی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ تم میری بات سمجھ رہی ہوگی۔'' سرکار نے کہا۔ ''میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ کسی لڑکی کی زندگی اس طرح نہیں گزر سکتی جس طرح تمہاری گزر رہی ہے اسی لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہاری شادی ہوجائے۔''

رحمت نے اس بار چونک کر سرکار کی طرف دیکھا۔

''جو کچھ ہوگا، وہ تمہاری مرضی سے ہوگا۔ تم پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں ہوگا۔''

سرکار نے پھر کہا۔ ''میں نے تمہارے لیے ایک نوجوان کا انتخاب کرلیا ہے۔ وہ میرا ہی تربیت یافتہ ہے۔ تم اس پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کرسکتی ہو۔ اب یہ بتاؤ، کیا تمہیں اس پر کوئی اعتراض ہے؟''

رحمت نے نفی میں گردن ہلادی۔

''جزاک اللہ۔'' سرکار خوش ہوگئے۔ ''وہ نوجوان آج شام کو یہاں آئے گا۔ تم اسے دیکھ لینا۔ اس کے بعد میں پھر تمہاری مرضی معلوم کروں گا۔''

شام کے وقت وہ نوجوان سرکار کے آستانے پہنچ گیا۔ سرکار نے اس کا نام نعیم بتایا تھا۔ وہ بہت مؤدب ہوکر سرکار کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

نعیم کو دیکھتے ہی رحمت نے ہنگامہ برپا کردیا تھا۔ وہ باقاعدہ شور کر رہی تھی۔ بلند آواز میں اسے گالیاں دے رہی تھی۔ برا بھلا کہہ رہی تھی۔ اس نے بولنا شروع کردیا تھا۔

سرکار اور شکور حیرت سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔

''کیا، کیا تم بول سکتی ہو؟'' سرکار نے حیرت سے پوچھا۔

''جی سرکار۔'' رحمت نے اب رونا شروع کردیا تھا۔ ''میں بول سکتی ہوں۔ میں گونگی نہیں ہوں۔''

''تو پھر کیا تھا یہ سب، اتنے دنوں تک تم نے چھپائے کیوں رکھا؟''

''سرکار! میں خوف زدہ تھی۔ بے حد خوف زدہ۔ انسان پر سے میرا بھروسا ختم ہوگیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ شخص اتنا بڑا دھوکا دے گا۔'' اس نے نعیم کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں نے تو اس پر بھروسا کیا تھا۔ اس کو

اپنا سمجھا تھا۔ پیار کیا تھا اس سے۔ اس نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا میں بتا نہیں سکتی۔''

''نعیم! کیا کیا ہے تم نے اس کے ساتھ۔'' سرکار نے اسے مخاطب کیا۔ ''میں بھی تم پر بہت اعتماد کرتا ہوں۔ کیونکہ بہت دنوں تک میرے ساتھ رہے ہو۔ پھر یہ سب کیا ہے؟''

''سرکار! مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی تھی۔'' نعیم شرمندہ لہجے میں بتانے لگا۔ ''سرکار! میں نے سکندر نام کے ایک آدمی کے دفتر میں ملازمت کی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایک خبیث انسان ہے۔ اس کے باوجود میری عقل ماری گئی تھی کہ میں فریدہ کو ملازمت کے لیے اس کے پاس لے گیا۔''

''فریدہ شاید تمہارا نام ہے؟'' سرکار نے رحمت سے پوچھا۔

''جی سرکار، میں ہی بدقسمت فریدہ ہوں۔'' فریدہ نے کہا۔

''میں یہ اندازہ نہیں کر سکا تھا سرکار کہ وہ کم بخت فریدہ کی عزت کے پیچھے پڑ جائے گا۔'' نعیم آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔

''بہت برا ہوا ہے میرے ساتھ۔'' فریدہ اب رونے لگی۔ ''اس کا کوئی آدمی میرا گھر دیکھ آیا تھا۔ اور میرے باپ کو قتل کر کے مجھے اٹھا کر اس نے سکندر کے سامنے پہنچا دیا۔'' اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔

ساری کہانی سمجھ میں آ گئی تھی۔

''سرکار! وہ سکندر میرے سامنے حیران ہوتا رہتا تھا کہ میری لائی ہوئی لڑکی نے صرف ایک دن دفتر میں کام کیا اور دوسرے دن سے غائب ہو گئی، مجھے کیا معلوم تھا کہ فریدہ اسی کے قبضے میں ہے۔ پھر جب مجھے یہ پتا چلا کہ فریدہ کے باپ کا مرڈر ہو گیا پھر تو میرا شبہ اور بھی مضبوط ہو گیا لیکن صرف شبہ ہی تھا۔ ثبوت کوئی نہیں تھا۔''

''پھر تم اس کے چنگل سے فرار کیسے ہوئیں؟'' سرکار نے پوچھا۔

''ایک مہربان عورت نے فرار کروایا تھا سرکار۔ پھر اس کے آدمیوں کو پتا چل گیا۔ انہوں نے میرا پیچھا کیا اور میں نہ جانے کہاں کہاں بھاگتی رہی۔ مختصر یہ ہے سرکار کہ ایک دن میں آپ کے آستانے تک پہنچ گئی اور میں نے یہی مناسب سمجھا کہ میں گونگی بن جاؤں۔ اب میں کسی کو اپنی بربادی کی کیا داستان سناتی۔ کون سی ایسی اچھی بات تھی جو کسی کو بتائی جاتی۔''

''میں تو پاگل ہو گیا تھا سرکار۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فریدہ کو کہاں تلاش کروں۔ وہ کہاں غائب ہو گئی ہے۔ پھر جس عورت نے فریدہ کو فرار ہونے میں مدد دی تھی، اسی نے یہ بتا دیا تھا کہ سکندر کے ہاتھوں فریدہ پر کیا گزری ہے۔ میں تلملا کر رہ گیا۔ اس شخص کے سامنے تو میں ایک کمزور شخص ہوں۔ انتقام کی آگ تو میرے سینے میں ہے لیکن میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔''

سرکار اور شکور ان دونوں کی داستانیں سن رہے تھے۔ بہت حد تک کہانی سامنے آ گئی تھی لیکن ابھی یہ نہیں پتا چلا تھا کہ نعیم، فریدہ سے شادی کرنے یہاں کیسے چلا آیا تھا۔

''سرکار! آپ نے مجھے یاد کیا۔ آپ نے یہ فرمایا کہ ایک بے سہارا لڑکی ہے اور آپ یہ چاہتے ہیں کہ کسی معقول جگہ اس کی شادی کر دی جائے اور آپ نے مجھے اس کے لیے پسند فرمایا ہے۔ شکور نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ ایک بے سہارا لڑکی ہے۔ اس نے جو حلیہ بتایا تھا، وہ فریدہ ہی کا تھا۔ لیکن اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ایک گونگی لڑکی ہے۔ میں کشمکش میں مبتلا تھا پھر بھی میں آپ کے حکم پر چلا آیا اور خدا کا شکر ہے کہ یہ فریدہ ہی ہے۔''

''چلو۔'' سرکار نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہ بہت اچھا ہوا کہ تم دونوں ایک دوسرے سے مل گئے اور اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''وہی جو پہلے تھا سرکار۔ میں تو ہر حال میں فریدہ کو اپنانا چاہتا تھا اور آج بھی میری یہی خواہش ہے۔''

''شکور۔'' سرکار نے شکور کی طرف دیکھا۔

''جی سرکار۔''

''تم کل ہی ان دونوں کے نکاح کا بندوبست کر دو۔'' سرکار نے کہا۔

''لیکن سرکار، مجھے اس آدمی سے شادی نہیں کرنی۔'' فریدہ بول پڑی۔

''وہ کیوں؟'' سب ہی حیران رہ گئے۔

''اس لیے کہ اس کی وجہ سے میں اس حال کو پہنچی ہوں۔'' فریدہ نے کہا۔ ''یہ مجھے اس خبیث کے پاس کیوں لے گیا تھا۔ جب یہ جانتا تھا کہ وہ کس کردار کا انسان ہے تو پھر اس کے پاس لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا صرف اس لیے کہ میری عزت کی دھجیاں اڑا دی جائیں۔ میرے باپ کو مار دیا جائے۔ کیا صرف اس لیے؟ نہیں سرکار! اس سے کہیں کہ یہ چلا جائے۔ مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔ اس نے مجھے برباد کیا ہے۔ تباہ کر دیا ہے اس نے۔'' فریدہ

نے پھر رونا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

سکندر کا ڈرائیور گل زمان سکندر کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

''باس! میں نے اس لڑکی کو تلاش کر لیا ہے۔'' گل زمان نے بتایا۔

''کون سی لڑکی؟'' سکندر نے پوچھا۔

''وہی، جس کو آپ نے شادی کا پیغام دیا تھا اور جس نے اپنا گھر بدل لیا تھا۔''

''شاباش۔'' سکندر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ''واہ، یہ بات ہوئی نا۔ کہاں ہے وہ؟''

''وہ ایک چھوٹے سے محلے میں رہنے لگی ہے باس اور اس سے بڑھ کر ایک بات اور بھی ہے۔''

''وہ کیا ہے؟''

''وہ اب فہیم کی بیوی ہے۔ فہیم نے اس سے شادی کر لی ہے۔'' گل زمان نے بتایا۔

''کیا؟'' سکندر بھڑک اٹھا۔ ''یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہی ہوا ہے صاحب! آپ کے اس نمک حرام نے آپ کا شکار آپ سے چھین لیا ہے۔''

سکندر کسی بھیڑیے کی طرح غرانے لگا۔ ''میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ دونوں کو ماردوں گا، گل زمان۔''

''یس باس۔''

''ابھی کچھ لوگوں کو ساتھ لو اور چلو اس کے گھر کی طرف۔ میں خود چل رہا ہوں تمہارے ساتھ۔ میں اس کو ایسی موت ماروں گا کہ اس کے فرشتے تک کانپ جائیں گے۔''

تین گاڑیوں پر یہ قافلہ اس مکان تک پہنچ گیا تھا۔ سب سے آگے سکندر اور گل زمان تھے۔ اس کے پیچھے اس کے غنڈے بھرے ہوئے تھے۔ سب کے سب مسلح، بے رحم اور خونخوار قسم کے لوگ۔

ایک منزلہ معمولی سا مکان تھا۔

''توڑ دو دروازہ۔'' گل زمان نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

اس سے پہلے کہ اس کے آدمی اس کے حکم کی تعمیل کرتے، دروازہ خود ہی کھل گیا۔ دو آدمی باہر نکلے تھے۔ سکندر نے انہیں مخاطب کیا۔ ''کہاں ہے وہ نمک حرام؟''

''کس کی بات کر رہے ہیں صاحب؟'' ایک نے سہم کر پوچھا۔ وہ سکندر اور اس کے آدمیوں کو دیکھ کر بری طرح گھبرایا ہوا تھا۔

''فہیم کی۔'' سکندر غرایا۔ ''وہ اور اس کی بیوی۔''

''اچھا۔ آپ شاید پرانے کرائے دار کی بات کر رہے ہیں۔''

''پرانا کرائے دار؟''

''ہاں صاحب، جو یہاں رہتا تھا وہ تو پرسوں ہی مکان چھوڑ کر یہاں سے جا چکا ہے۔'' دوسرے والے نے بتایا۔ ''آپ چاہیں تو کسی سے بھی پوچھ لیں۔''

گل زمان، کیا ہے یہ سب؟''

''میں تو خود حیران ہوں صاحب۔'' گل زمان نے کہا۔ ''تین دن پہلے تک تو وہ لوگ اسی مکان میں تھے۔''

''تین دن پہلے کی خبر تو نے آج دی مجھے؟''

''باس! میں یہ چاہ رہا تھا کہ پہلے اپنے طور پر خوب اچھی طرح اطمینان کر لوں۔ یہ دیکھ لوں کہ وہ دونوں واقعی اس مکان میں رہ رہے ہیں یا وہ لڑکی کچھ دیر کے لیے اپنے کسی رشتے دار کے پاس آئی ہوئی ہے پھر جب اطمینان ہو گیا اور یہ بھی پتا چل گیا کہ دونوں کی شادی ہو گئی ہے تو پھر میں نے آپ کو خبر دی ہے۔''

''اب میں دیکھتا ہوں۔ وہ حرام زادہ کب تک مجھ سے بھاگتا ہے۔ چلو واپس چلو۔''

یہ قافلہ جس طرح گیا تھا اسی طرح واپس آ گیا۔

☆☆☆

فہیم کی چھٹی حس نے کام دکھایا تھا۔ ورنہ وہ دونوں مارے جاتے۔

بازار سے لوٹتے ہوئے اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اس نے تعاقب کرنے والے کو بھی پہچان لیا تھا۔ گل زمان، سکندر کا خاص ڈرائیور۔

اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ دونوں ٹریس کر لیے گئے ہیں اور کسی بھی وقت ان پر مصیبت آ سکتی ہے پھر اس نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

سامان نام کی بہت کم چیزیں تھیں ان کے پاس۔ انہوں نے صرف کپڑے اور ضروری چیزیں اپنے ساتھ رکھی تھیں۔

ریشماں کو برقع پہنچا دیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ''ریشماں یہ تمہارا حسن ہی ہے جس کی وجہ سے ہمیں دربدر ہونا پڑ رہا ہے۔''

''تو کیوں نا میں خود اپنے چہرے پر تیزاب ڈال کر بدصورت بن جاؤں۔''

''نہیں۔ ایسا سوچنا بھی نہیں۔ تمہاری یہ صورت تم نے خود نہیں بنائی۔ یہ خدا نے بنائی ہے اور خدا کی بنائی ہوئی کسی بھی چیز کو ہمیں خراب کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ چلو برقع پہن کر نکل لو۔''

فہیم نے گھر کا بھاری سامان اپنے ایک جاننے والے کے یہاں رکھوا دیا تھا اور خود سوٹ کیس لے کر ریشماں کے ساتھ نکل پڑا تھا۔

''کہاں، یہ اس نے ابھی خود بھی نہیں سوچا تھا لیکن یہ بات طے تھی کہ وہ اس شہر میں تو نہیں رہ سکتے تھے۔ یہاں ہر طرف سکندر کے آدمیوں کے جال پھیلے ہوئے تھے۔ وہ کہیں بھی رہتے کبھی نہ کبھی کسی کی نگاہوں میں تو آ ہی سکتے تھے۔

بہتر یہی تھا کہ دونوں کسی اور شہر کی طرف نکل جائیں۔ حالانکہ اور کہیں ان کے لیے کوئی ٹھکانا نہیں تھا لیکن کہیں پہنچ کر دیکھا جاتا۔

انہوں نے لانگ روٹ پر جانے والی بس پکڑی تھی۔ ریشماں بہت سہمی سہمی تھی۔ فہیم اسے تسلیاں دیتا رہا تھا۔

''فہیم! کیا اب ہماری قسمت میں صرف بھاگنا ہی رہ گیا ہے؟'' اس نے سیٹ پر بیٹھنے کے بعد پوچھا۔

''نہیں۔ خدا ہمارے لیے کوئی راستہ ضرور نکالے گا۔ ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔''

''لیکن میری وجہ سے تم تو پریشان ہو رہے ہو نا۔''

''پاگل مت بنو، اب تم میری بیوی ہو۔ تمہارا مسئلہ اب میرا مسئلہ ہے۔''

بس ایک جگہ پندرہ بیس منٹ کے لیے رک گئی۔

یہاں ایک چھوٹا سا چائے کا ڈھابا تھا۔ عام طور پر بس والے یہاں روک دیا کرتے تھے۔

''میں تمہارے لیے چائے لے کر آؤں۔'' فہیم نے پوچھا۔

''میں بھی چلوں گی، بیٹھے بیٹھے کمر اکڑ گئی ہے۔'' ریشماں نے کہا۔

''آجاؤ۔''

دونوں بس سے اتر کر ڈھابے کی طرف چل دیے۔

ان کے علاوہ بھی کچھ اور مسافر اترے تھے۔ ان میں خواتین بھی تھیں۔

وہ ڈھابے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ایک جیپ بس کے پاس آکر رک گئی۔ فہیم نے اس میں بیٹھے ہوئے دو تین آدمیوں کو پہچان لیا تھا۔ وہ سکندر کے آدمی تھے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ انہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ یہ دونوں شاید شہر سے باہر جائیں گے۔ فہیم نے بڑی تیزی سے ریشماں کا ہاتھ تھاما اور ڈھابے کے پیچھے چلا گیا۔ اس طرف دور تک میدان تھا۔ اور میدان میں جھاڑیاں تھیں۔ چھوٹے پودے تھے۔

''بھاگ ریشماں، وہ لوگ بس تک پہنچ گئے ہیں۔'' فہیم نے کہا۔ ''بس ڈھابے کی آڑ لے کر بھاگتی چلو۔ فی الحال بس کی تلاشی میں مصروف ہوں گے۔''

دونوں نے میدان میں دوڑ لگا دی۔ ریشماں ایک کومل سی لڑکی تھی۔ اس کے لیے اس قسم کی بھاگ دوڑ بہت مشکل ہو رہی تھی۔

''آخر وہ بس تک کیسے پہنچ گئے؟'' ریشماں نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

''بس ایک ہی بات سمجھ میں آرہی ہے۔'' فہیم نے کہا۔ ''ہم نے جس کے پاس اپنا سامان رکھوایا تھا شاید یہ لوگ کھوج لگاتے ہوئے اس تک پہنچ گئے ہوں گے۔ پھر وہاں سے ان کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم شہر سے باہر جا رہے ہیں۔''

''لیکن اب کیا ہوگا۔ ہم کہاں تک بھاگتے پھریں گے؟''

''جس خدا نے اب تک ہمیں ان لوگوں سے بچائے رکھا ہے وہی آئندہ بھی حفاظت کرے گا۔''

وہ لوگ اس بس اڈے سے بہت دور نکل آئے تھے۔

ہر طرف سناٹا تھا۔ پورے میدان میں کیکر کے پودے تھے۔ راستہ سخت ناہموار تھا۔ پتھروں سے بھرا ہوا۔

وہ جس راستے پر جا رہے تھے وہ ایک پگڈنڈی سی تھی۔ جو آگے جا کر اسی بڑی سڑک سے جا کر مل جاتی تھی جس سڑک پر وہ بس کے ذریعے سفر کر رہے تھے۔

بہت دیر چلنے کے بعد اچانک اس ویرانے میں اذان کی آواز گونج اٹھی۔ یہ آواز اگرچہ کچھ فاصلے سے آرہی تھی لیکن بہت واضح تھی۔

''ریشماں شاید کوئی آبادی قریب ہے۔'' فہیم نے

کہا۔ ’’اذان کی آواز یہی بتا رہی ہے۔‘‘
’’چلیں، اسی طرف چلتے ہیں۔ اب تو مجھ سے چلا بھی نہیں جا رہا۔‘‘
کچھ دیر سفر کے بعد وہ دونوں ایک چھوٹی سی مسجد کے پاس پہنچ گئے۔ اس مسجد کے ساتھ تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک کمرا کچھ بڑا تھا۔ دو تین آدمی... مسجد کے پاس کھڑے تھے جو ان دونوں کو بہت گہری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔
ان میں سے ایک آدمی بہت نورانی صورت کا اور بہت مہذب اطوار کا معلوم ہوتا تھا۔ یہ دونوں ان کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔
فہیم نے سلام کرتے ہوئے کہا۔ ’’ہم مسافر ہیں اور ہمیں پناہ کی ضرورت ہے۔ میرا نام فہیم ہے اور یہ میری بیوی ریشماں ہے۔‘‘
’’مسافر تو سڑک کی طرف سے آتے ہیں فہیم میاں۔‘‘ اس آدمی نے کہا۔ ’’تم دونوں تو میدان کی طرف سے آ رہے ہو؟‘‘
’’جی جناب، کیونکہ ہم اپنی جانیں اور عزت بچا کر بھاگے ہیں۔‘‘
’’اوہ۔‘‘ اس آدمی نے ایک گہری سانس لی۔ ’’آ جاؤ، نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ پہلے نماز پڑھ لو، اس کے بعد تم اپنے بارے میں بتانا۔‘‘ پھر اس نے شکور کی طرف دیکھا۔ ’’شکور ان بی بی کو فریدہ کے پاس لے جاؤ۔‘‘

☆☆☆

ناکامی نے سکندر کو وحشی بنا کر رکھ دیا تھا۔
اس سے پہلے بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس نے جس لڑکی کو چاہا، وہ اس کے پاس پہنچا دی جاتی تھی لیکن اس لڑکی نے اسے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کو سہارا دینے والا کچھ دنوں پہلے تک اس کا اپنا آدمی تھا اور اب وہ دونوں ہی اس کے لیے چیلنج بن گئے تھے۔
اسے پتا چلا تھا کہ وہ دونوں شہر سے باہر جا رہے ہیں۔ بسوں کی تلاشیاں بھی لی گئی تھیں لیکن وہ دونوں ہاتھ نہیں آئے تھے۔
پھر آخری خبر نے تو اسے بولا کر رکھ دیا تھا۔ اس کا ایک آدمی بتا رہا تھا۔ ’’باس۔ ہم نے تو بالکل صحیح بس پر ہاتھ ڈالا تھا لیکن وہ دونوں اس میں سے نکل کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔‘‘
’’لیکن کیسے؟ کیسے بھاگ نکلے؟‘‘
’’ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہو، پہچان لیا ہو۔‘‘
’’فہیم ہی نے پہچانا ہوگا۔ کیونکہ وہ لڑکی تو تم لوگوں کو جانتی بھی نہیں ہوگی۔‘‘
’’یس باس۔ فہیم نے دیکھا ہوگا اور وہ موقع پا کر لڑکی کو لے کر بھاگ نکلا۔‘‘
’’لیکن کہاں جا سکتا ہے۔ تم لوگ یہ بتا رہے ہو کہ جس جگہ تم لوگوں نے بس کی تلاشی لی تھی وہاں دور تک ایک میدان ہی میدان ہے۔‘‘
’’یس باس لیکن اسی روڈ پر آگے چل کر کسی نے اپنا آستانہ بنا رکھا ہے۔ ساتھ ہی ایک چھوٹی مسجد بھی ہے۔ دو تین کمرے بھی بنے ہوئے ہیں۔‘‘
’’اوہ۔‘‘ سکندر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ’’کس کا ہے وہ آستانہ؟‘‘
’’معظم علی نام ہے ان کا۔ سرکار سرکار پکارے جاتے ہیں۔ سنا ہے کہ بہت اللہ والے آدمی ہیں۔‘‘
’’کہیں ایسا تو نہیں کہ ان دونوں نے اسی اللہ والے کے یہاں پناہ لے لی ہو۔‘‘
’’ایسا ہی لگتا ہے سرکار۔ کیونکہ اس ویرانے میں اور کوئی جگہ تو ہے نہیں۔‘‘
’’تو جاؤ۔ ان دونوں کو وہیں تلاش کرو اور مل جائیں تو کسی طرح بھی ہو، نکال کر لے آؤ اور جہاں تک اس اللہ والے کا سوال ہے، اس کو میں دیکھ لوں گا۔‘‘
’’جیسا آپ کا حکم سرکار۔‘‘
’’بلکہ ایسا کرو، اس شخص کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے کچھ نہیں پوچھنا۔ بس ان دونوں کے بارے میں معلوم کر کے مجھے بتا دو پھر میں خود جاؤں گا۔ سمجھے۔‘‘

☆☆☆

سخت بے قراری تھی۔
سرکار کی ذمے داریاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ حیرت انگیز طور پر ان سبھوں کی کہانیوں کے ڈانڈے ایک ہی شخص سے جا کر مل گئے تھے اور وہ تھا سکندر۔
اس کے ہاتھوں برباد ہو جانے والی پہلی لڑکی فریدہ تھی۔ جو اس کے ظلم سے خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلی تھی اور اب یہ دونوں آ گئے تھے۔ فہیم اور ریشماں۔ ان دونوں نے بھی جو کہانی سنائی اس کا مرکزی کردار وہی شخص سکندر تھا۔
سرکار کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کچھ لوگ فرعون کیوں بن جاتے ہیں۔ ذرا سا اقتدار، ذرا سی دولت... ان کو

آنکھوں پر پٹی بندھ جاتی ہے۔ پھر انہیں سوائے اپنے آپ کے اور کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ معاشرے کے سارے کمزور مردوں کو وہ اپنا غلام اور ساری عورتوں کو اپنی کنیزیں سمجھنے لگتے ہیں۔

کیسی بے چینی تھی۔

شاید حساس لوگوں کے لیے موت ہی لکھی ہوتی ہے۔ لوگ تو یہ سوچ کر اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں کہ مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا۔

سرکار (معظم علی) کا یہ خیال تھا کہ انہوں نے دنیا سے کٹ کر گوشہ گیری اختیار کر لی ہے۔ اسی لیے اب ان کے پاس کوئی نہیں آیا کرے گا۔ وہ تنہائی میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف کا کام انجام دیتے رہیں گے اور کبھی کبھی درس بھی دے دیا کریں گے۔

بس اس سے زیادہ ان کا دنیا اور دنیا والوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ دنیا ان کے قدموں سے لپٹی ہوئی یہاں تک چلی آئی تھی۔ دنیا والے اپنے مسائل لے کر ان کے پاس آنے لگے تھے اور اب دو ذمے داریاں ان کے پاس آ گئی تھیں۔

ایک ذمے داری فریدہ کی تھی جس نے نعیم سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ نعیم سے ناراض تھی۔ نعیم ہی نے اسے سکندر کے پاس بھیجا تھا اور اب اس کی بربادی کے بعد شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کو اپنا لینا چاہتا تھا۔

سرکار نے فریدہ کو سمجھایا۔ اس سے کہا کہ پہلے جو ہو چکا، اسے بھول جائے۔ اب نعیم کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے۔ وہ شرمندہ ہے اور اسی شرمندگی کی وجہ سے وہ شادی کرنا چاہتا ہے تاکہ فریدہ کو ایک باعزت اور پُرسکون زندگی دے سکے۔

فریدہ نے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے میں لگی ہوئی تھی اور اب نعیم اور ریشماں بھی اس کے پاس آ گئے تھے اور یہ دونوں بھی اسی خونخوار درندے کے ستائے ہوئے تھے جس کا نام انہوں نے سکندر بتایا تھا۔

پتا نہیں، دنیا کیسی ہو گئی تھی اور لوگوں کے رویے ایسے کیوں ہو گئے تھے۔ برائیاں اتنی طاقتور کیوں ہوتی جا رہی تھیں۔

سرکار کو اس وقت بہت کچھ یاد آرہا تھا۔

وہ زندگی جو پہلے بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وہ ایک پڑھا لکھا انسان تھا۔ باپ ایک بہت بڑا صنعت کار تھا۔ گھر میں دولت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ دو ہی بھائی تھے۔ معظم علی اپنی فطرت میں بالکل مختلف انسان تھا۔ کتابوں نے اسے زندگی کی تلخیوں کے بہت قریب کر دیا تھا۔

اس کے بھائی نے باپ کے کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا جبکہ وہ خود الگ تھلگ رہتا تھا۔

ایک دن اس کے باپ نے اس سے پوچھا۔ ”معظم! آخر تمہارا ارادہ کیا ہے۔ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”بابا! اسی لیے تو الجھا ہوا ہوں کہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

”تم نے پورے گھر کو لائبریری بنا کر رکھ دیا ہے۔ کیا فائدہ ہے اس سے؟“

”بابا! میں اپنے آپ کو ان لوگوں میں گھرا ہوا پاتا ہوں جنہوں نے دنیا میں تہذیبوں کی آبیاری کی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے دنیا کے بڑے بڑے مفکرین اور دانشور میرے دوست ہو گئے ہیں۔“

”بکواس ہے یہ سب۔ تم صرف پاگل ہو گئے ہو۔“

”بابا! اس دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جن کو اسی طرح پاگل سمجھا گیا تھا۔ مہاتما بدھ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس شخص کے پاس کیا نہیں تھا۔ پوری سلطنت کا حکمراں تھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ یہ سب فریب ہے اور وہ فریب کے جال توڑ کر باہر نکل آیا۔“

”اچھا اچھا، تم جا کر کسی سے اپنے دماغ کا علاج کرواؤ۔“ اس کا باپ چڑ گیا۔

معظم علی کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کا بھی شوق تھا۔ کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ لکھنے کا عمل بھی جاری رکھا۔

اس کی پہلی کتاب ”دین کی آسان تفہیم“ کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب نے بے حد مقبولیت حاصل کی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ تجارتی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت کچھ اتنی زیادہ نہ ہو لیکن علمی، ادبی اور مذہبی حلقوں میں اس کتاب کو بہت سراہا گیا تھا۔

اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد اس کا باپ اس کی طرف سے اور مایوس ہو گیا۔

پھر یہ ہوا کہ شیرازی صاحب سے ملاقات نے اس کی دنیا اور بدل دی۔ وہ ایک بزرگ انسان تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ خدا کچھ خاص لوگوں کو خاص کاموں کے لیے منتخب کر لیتا ہے۔ وہ گلاب کے پھول کی طرح ہوتے ہیں۔ اس گلاب کے پودے کے لیے زمین بہت پہلے منتخب کر لی جاتی ہے۔

پھر بیج اور کھاد ڈال کر گلاب کا پھول حاصل کر لیتے ہیں۔ خوش نصیب ہو کہ خدا نے یقیناً تمہیں کسی بڑے کام کے لیے چن لیا ہے اور اسی لیے تمہاری فطرت مختلف کر دی۔

''یہ بات تو ہے جناب۔ میں اپنے سرمایہ دارانہ ماحول سے بالکل مختلف ہوں۔''

''لکھتے رہو۔ جس طرح تم نے اس کتاب میں لوگوں کی رہنمائی کی ہے، مجھے امید ہے کہ تم یہ سلسلہ جاری رکھو گے۔ تمہاری دوسری کتابیں بھی اسی پائے کی ہوں گی۔''

''دعا فرمائیں جناب کہ میں توقعات پر پورا اتر سکوں۔''

شیرازی صاحب نے ڈھیر ساری دعائیں دے دیں۔ اس سلسلے کے بعد معظم علی گلاب کا پھول بننے کے مرحلے طے کرتا چلا گیا۔

اب اس کی دنیا کچھ اور تھی۔ علم و ادب کی دنیا۔ تصوف کی دنیا۔ وہ سب سے کنارہ کش ہو گیا۔ اس کی کتابیں ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہونے لگیں۔ ان ہی کتابوں کی رائلٹی سے اس کی گزر ہو رہی تھی۔

اس نے باپ کی دولت سے اپنا حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے باپ کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی ہے۔

بہرحال اب بہت وقت گزر چکا تھا۔ اس نے ہائی وے پر آ کر باقاعدہ حکومت سے اجازت لے کر اپنا ایک چھوٹا سا آستانہ بنا لیا تھا۔ اس سے محبت کرنے والے اور اس کی باتیں سننے والے یہاں بھی آ جایا کرتے۔ اس کی بنائی ہوئی مسجد آباد ہو جاتی۔

لیکن وہ بڑا کام کیا تھا۔

ابھی تک ایسی کوئی خاص بات سامنے نہیں آئی تھی۔ چند کتابیں لکھ لینا یا گوشہ نشین ہو جانا کسی بڑی منزل کی طرف تو رہنمائی نہیں کرتا تھا۔

اس نے کچھ بے سہاروں کو پناہ دے دی تھی۔ خوف زدہ لوگ۔ کسی کے ظلم اور جبر سے بھاگے ہوئے لوگ اس کے دامن میں آ کر سکون محسوس کرنے لگے تھے۔ کیا یہ کوئی بڑا کام تھا۔ اس ملک میں تو ایسے، نہ جانے کتنے ادارے ہوں گے۔

تو پھر وہ بڑا کام کیا تھا؟

کسی کی آہٹ نے اس چونکا دیا۔ شکور اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ کچھ پریشان سا دکھائی دے رہا تھا۔

''کیا بات ہے شکور، خیریت تو ہے نا؟'' سرکار نے پوچھا۔

''سرکار! وہ سمندر کے آدمی پھر دکھائی دیے تھے۔'' شکور نے بتایا۔

ایک لمحے کے لیے سرکار کے ماتھے پر پریشانی کی دو چار شکنیں نمودار ہوئیں پھر غائب ہو گئیں۔ سمندر اس علاقے کا ایک بہت بڑا اور بارسوخ ڈاکو تھا۔ اس کی حدیں ہائی وے پر بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

وہ ان علاقوں میں خوف اور وحشت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

''تو پھر؟'' سرکار نے شکور کی طرف دیکھا۔ ''تم کیوں پریشان ہو رہے ہو؟''

''سرکار، آپ تو جانتے ہیں کہ وہ کیسے لوگ ہیں۔ سمندر کی نگاہیں ہماری زمین پر ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ ہم یہ زمین خالی کر دیں۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ آپ اس کے آدمیوں کو بہکا رہے ہیں۔ اس کے آدمی ہماری مسجد میں آ کر نماز پڑھنے لگے ہیں۔''

''یہ تو سراسر ناانصافی ہے شکور۔'' سرکار نے دھیرے سے کہا۔ ''ہم نے تو کسی کا نقصان نہیں کیا۔ اور یہ زمین وہ زبردستی کیسے لے سکتا ہے۔ یہ جگہ تو ہم نے باقاعدہ خریدی ہے۔''

''تو وہ ٹھیک ہے سرکار۔ لیکن ایسے لوگ کہاں مانتے ہیں۔ بہت ہی موذی قسم کے لوگ ہیں۔''

''چلو، پریشان مت ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم ابھی سے کیوں پریشان ہوں۔''

شکور بہت اچھا کہہ کر سرکار کے حجرے سے باہر آ گیا۔ سرکار نے اسے اطمینان تو دلا دیا تھا لیکن وہ بے چین ہو رہے تھے۔ سمندر کے آدمیوں کا آس پاس دکھائی دینا یونہی نہیں تھا۔ شکور کو صرف اس بات کا اندیشہ تھا کہ وہ کہیں اس کے سرکار کو نقصان نہ پہنچا دیں۔

شکور کو سرکار سے والہانہ محبت تھی۔ یہ سرکار ہی تھے جنہوں نے شکور کی دنیا بدل کر رکھ دی تھی۔ ورنہ وہ پہلے اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے گناہ کتنے جرائم کر چکا تھا۔ پھر جب سرکار سے اس کی ملاقات ہوئی تو نگاہِ مردِ مومن نے اسے بدل کر رکھ دیا۔

اگر سمندر یا اس کے آدمی سرکار کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے تو وہ اپنی جان بھی قربان کر سکتا تھا۔ سرکار کے حجرے کے باہر دو آدمی کھڑے تھے۔ یہ دونوں شکور کے

جانے پہچانے لوگ تھے اور شکور کے لیے ایک خبر لے کر آئے تھے۔ سمندر کے آدمیوں کی خبر بھی انہی دونوں نے دی تھی۔

شکور کو دیکھ کر وہ اس کے پاس آ گئے۔ ''ایک بری خبر ہے شکور بھائی۔'' ان میں سے ایک نے بتایا۔

''کیا خبر ہے۔''

''سائیں، ہم نے اپنی آنکھوں سے سمندر کو دیکھا ہے۔ وہ بھی اسی علاقے میں ہے۔''

''اوہ، کہاں تھا وہ؟''

''ہم نے بتایا تھا نا کہ اس کے بندے اس علاقے میں گھومتے پھر رہے ہیں۔ تو اب وہ بھی اسی علاقے میں ہے۔ ہم نے اسے بس اسٹاپ کے پاس جو ہوٹل ہے، وہاں دیکھا تھا۔''

''ہو سکتا ہے، وہ کسی کام سے گزر رہا ہو۔''

''وہ گزرتا وزرتا نہیں ہے سائیں شکور۔ وہ تو اپنی جگہ بیٹھا رہتا ہے جب کوئی بہت ہی خاص معاملہ ہو تو سامنے آتا ہے۔''

''ہم نے بتا دیا ہے سائیں، وہ ایک بار پہلے بھی آپ لوگوں سے چھیڑ چھاڑ کر چکا ہے اور اب تو آپ کے یہاں عورتیں بھی رہتی ہیں۔''

یہ ایک اندیشہ تھا جس کی طرف اس آدمی نے اشارہ کیا تھا لیکن کیا ہو سکتا تھا۔ سرکار کو اپنے اللہ پر اتنا بھروسا تھا کہ وہ کہیں اور جانے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے تھے۔

سامنے میدان کی طرف سے گرد اُڑتی ہوئی دکھائی دی۔

''مولا خیر کرے سائیں شکور'' اطلاع دینے والے نے کہا ''میرا خیال ہے کہ سمندر کی سواری آ گئی۔ ہم تو چلتے ہیں سائیں۔''

دونوں رخصت ہو گئے۔ میدان کی طرف سے جیپیں آ رہی تھیں۔ دو جیپیں تھیں جو مسجد کے پاس آ کر رک گئی تھیں۔ ان میں سے لوگ اترنے لگے۔ شکور نے ان کو پہچان لیا تھا۔ وہ سمندر ہی کے آدمی تھے اور پچھلی جیپ سے خود سمندر بھی نیچے اتر آیا تھا۔

وہ ایک ایسا آدمی تھا جسے دیکھ کر ہی ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ چھ ساڑھے چھ فٹ قد۔ ویسا ہی مضبوط جسم۔ چڑھی ہوئی مونچھیں۔ خونخوار سرخ آنکھیں اور گونجتی ہوئی آواز۔

وہ ہر وقت مسلح رہنے کا عادی تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ سوتے وقت بھی ریوالور اپنے ہاتھ میں رکھ کر سویا کرتا ہوگا۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا شکور کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے مسلح آدمی اس کے ساتھ ساتھ آئے تھے۔

''کہاں ہے تیرا سرکار؟'' سمندر نے کرخت آواز میں پوچھا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ سرکار اپنے کمرے میں آرام کر رہے ہیں۔'' شکور نے اطمینان اور بے خوفی سے بتایا۔ ''اور دوسری بات یہ ہے کہ تم سرکار کا نام عزت اور احترام سے لو۔''

''اوئے۔'' سمندر کے ایک آدمی نے بندوق تان لی۔ ''آرام سے بات کر۔''

''نہیں۔'' سمندر نے اسے روک دیا۔ ''جوش میں مت آ... پہلے مولوی سے بات کر لینے دے۔''

وہ تیزی سے چلتا ہوا سرکار کے کمرے کے دروازے تک پہنچا۔ ایک بار دستک دی پھر دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ اس کے آدمی اس کے ساتھ نہیں آئے تھے۔

سرکار اس وقت کوئی کتاب دیکھ رہے تھے۔ سمندر کو دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

''آؤ سمندر۔'' ان کا لہجہ بہت نرم تھا۔ ''آج بہت غصے میں معلوم ہوتے ہو؟''

''مولوی! تم اپنا یہ بوریا بستر یہاں سے اٹھاؤ'' سمندر نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''چلے جاؤ یہاں سے۔''

''کیوں سمندر، میرے ہونے سے تمہارا کیا نقصان ہو رہا ہے؟''

''مولوی! میرے بندے تمہاری مسجد میں آ کر نماز پڑھنے لگے ہیں۔''

''پھر یہ تو اچھی بات ہے نا۔''

''نہیں، ہمارے لیے یہ اچھی بات نہیں ہے۔'' سمندر نے کہا۔ ''وہ نیک بنتے جا رہے ہیں اور ہمیں نیک بندے نہیں چاہئیں بابا۔''

''تو پھر تم ہی روک دو اُن کو۔''

''بحث رہنے دو مولوی، تم جاؤ یہاں سے۔''

''ایک بات بتاؤ میں چلا گیا پھر بھی یہ مسجد تو یہیں رہے گی نا، کیا تم اس مسجد کو تڑوا دو گے؟'' سرکار نے پوچھا۔ وہ بہت گہری نگاہوں سے سمندر کو دیکھ رہا تھا۔

سمندر ہچکچا کر رہ گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن بات نہیں بن پا رہی تھی۔

''اچھا چلو، تم یہ چاہتے ہو نا کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔'' سرکار نے پوچھا۔

''ہاں، میں یہی چاہتا ہوں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔'' سرکار نے کہا۔ ''لیکن مجھ سے ایک وعدہ کرو۔''

''کیسا وعدہ؟''

''یہی کہ تم اپنے آدمیوں کو مسجد میں آنے سے نہیں روکو گے۔ سمندر تم انہیں اللہ کا کام بھی کرنے دو اور اپنا کام بھی لیتے رہو۔''

سمندر پھر ہچکچا گیا۔ شاید اس کی قوتِ فیصلہ جواب دیتی جا رہی تھی۔

''چلو، ابھی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے تو بعد میں آ کر بتا دینا۔'' سرکار نے کہا۔ ''تم یقین کرو کہ میں یہ جگہ چھوڑ دوں گا۔ حالانکہ تم یہ اچھی طرح جانتے ہو کہ میں نے یہ جگہ اپنے پیسوں سے خریدی ہے، قبضہ نہیں کیا ہے اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں ایک بے ضرر سا انسان ہوں۔ میں نے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ پھر بھی تمہاری خوشی کے لیے میں یہ جگہ چھوڑ دوں گا۔''

اس دوران شور کی آواز گونج اٹھی۔ وہ عصر کی اذان دے رہا تھا۔

''سمندر نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ کم از کم میرے ساتھ نماز ہی پڑھ لو۔ ایک ہی وقت کی سہی۔''

☆☆☆

فہیم کو سرکار کے روپ میں ایک سایہ میسر آ گیا تھا اور ریشماں کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے سرکار اس کا باپ ہو۔

باپ والی شفقت، وہی مہربان رویّہ، وہی ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھنا۔ جس طرح کوئی شفیق باپ اپنی اولاد کا رکھ سکتا ہے۔

فہیم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب کب تک یہاں رہے گا۔ اسے ریشماں کو لے کر یہاں سے نکل جانا تھا۔ سکندر کے آدمی یہاں تک پہنچ گئے تھے۔ وہ کسی بھی وقت سرکار کے آستانے تک بھی آ سکتے تھے۔ بے چارے سرکار کب تک ان کی حفاظت کر سکتے تھے۔ ان کو اپنے پاس رکھ سکتے تھے۔

اس نے سرکار سے بات کر لی۔ ''جناب! دل تو نہیں چاہ رہا ہے کہ ہم آپ کو چھوڑ کر کہیں جائیں۔''

''تو پھر کیوں جا رہے ہو؟''

''ہم یہاں کب تک رہ سکتے ہیں جناب۔'' فہیم نے کہا۔ ''ہمیں کہیں نہ کہیں سیٹل ہو کر اپنی زندگی تو گزارنی ہے نا۔''

''یہ تو ہے لیکن کہاں جاؤ گے؟ کچھ سوچا ہے تم دونوں نے؟''

''میرا ارادہ ہے لاہور چلا جاؤں۔'' فہیم نے بتایا۔ ''وہاں دو چار جاننے والے ہیں۔ شاید کہیں جاب مل جائے۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ میری کتابیں لاہور ہی کا ایک پبلشر شائع کرتا ہے۔ اگر تم پسند کرو تو میں اس سے تمہاری سفارش کر سکتا ہوں۔ تمہیں وہ کہیں نہ کہیں جاب دلوا دے گا۔''

''آپ کی مہربانی ہو گی جناب۔ ایک بات اور عرض کرنی تھی۔''

''ہاں کہو۔''

''میں فی الحال اپنی بیوی کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔ نہ جانے کیسے حالات پیش آئیں۔ اور وہ آپ کے یہاں رہے تو مجھے سکون ہو گا کہ وہ ایک مہربان سائے میں ہے۔''

''خدا مجھے اتنی توفیق دے کہ میں اس کی حفاظت کر سکوں۔'' سرکار نے کہا۔ ''تم بے فکر ہو کر جاؤ۔''

''آپ نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا ہے جناب۔'' فہیم نے کہا۔ ''میں انشاء اللہ کل پرسوں تک نکل جاؤں گا یہاں سے۔''

ہلکی سی دستک کے ساتھ نعیم اندر داخل ہو گیا۔ وہ بہت پُرجوش نظر آ رہا تھا۔

''کیوں میاں ہو گیا بندوبست؟'' سرکار نے دریافت کیا۔

''جی سرکار۔'' نعیم مؤدب سا سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

''فریدہ سے بات ہوئی؟''

''جی سرکار۔ اس کا وقتی غصہ تھا، وہ ختم ہو چکا ہے۔ اب وہ ناراض نہیں ہے۔ میں نے جب اپنی مجبوریاں بتائیں تو پھر اس کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔''

''تم جس کام کے لیے شہر گئے تھے، وہ ہو گیا؟''

''جی سرکار، اس کے لیے شادی کے جوڑے لے آیا ہوں۔'' نعیم نے بتایا۔ ''جن حالات میں ہماری شادی ہو رہی ہے، ان میں زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے۔''

''فہیم۔'' سرکار نے فہیم کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم لوگ نعیم اور فریدہ کی شادی میں شریک نہیں ہو گے؟''

''کیوں نہیں سرکار۔'' فہیم جلدی سے بولا۔ ''ہم نے

تو اس شادی کے بعد جانے کا پروگرام بنایا ہے۔''
''ٹھیک ہے۔ خدا جزائے خیر دے۔''
اس رات آس پاس کے گاؤں کی کچھ عورتیں اپنے ساتھ ڈھول وغیرہ لے آئی تھیں۔ یہ وہ عورتیں تھیں جن کے مرد مسجد میں نماز کے لیے آیا کرتے تھے۔ ان مردوں کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ آستانے پر شادی ہو رہی ہے اور سب کو اس شادی میں شریک ہونا ہے۔ وہی مرد اپنی خواتین کو بھی لے کر آ گئے تھے۔
جنگل میں منگل کا سا سماں ہو گیا تھا۔ فریدہ کو باقاعدہ مہندی لگائی گئی تھی۔ اس کام میں ریشماں کی مدد دوسری عورتوں نے بھی کی تھی۔
سب خوش تھے لیکن سرکار بے چین تھے۔ ایک ایسے اضطراب کی کیفیت تھی جس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اِک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ مسجد کے آس پاس گاؤں والوں نے روشنی کا انتظام کر رکھا تھا۔ کمرے میں عورتیں شادی بیاہ کے گیت گا رہی تھیں۔
وہ ایک بہت بڑے فرض سے سبکدوش ہونے والے تھے۔ فریدہ سے ان کا کوئی تعلق، کوئی رشتہ نہیں تھا۔ پھر بھی انہوں نے بہت کھلے دل سے فریدہ کو اپنایا تھا، اپنی اولاد کی طرح۔ ایک دو دنوں میں وہ رخصت ہو کر جانے والی تھی۔ اس کے بعد ریشماں بھی چلی جاتی۔ اس کے بعد پھر سناٹا ہو جاتا۔ پہلے کی طرح۔
پھر مسجد ہوتی۔ شکور کی اذانیں ہوتیں، کچھ لوگ اِدھر اُدھر سے نماز کے لیے آ جاتے۔ اس کے بعد پھر وہی ویرانی۔
وہ اپنے کمرے سے باہر آ گئے۔ بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔ شکور، فہیم اور نعیم وغیرہ مسجد کے صحن میں بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ گاؤں کے چار پانچ افراد تھے۔ سرکار کو وہ لوگ دور سے دکھائی دے رہے تھے لیکن وہ لوگ سرکار کو نہیں دیکھ پا رہے تھے۔
سرکار نے ایک گہری سانس لی اور میدان کی طرف چل پڑے۔ جو انتہائی گہرے اندھیرے کی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔
انہوں نے اپنی جیب کو تھپتھپایا۔ ان کا پستول ان کے پاس ہی تھا۔ ان علاقوں میں جنگلی جانوروں کو خوف زدہ کرنے کے لیے کبھی کبھی اس کی ضرورت پڑ جاتی تھی۔
سرکار اکثر اپنے کمرے سے نکل کر اس میدان میں چکر لگایا کرتے تھے۔ یونہی، بغیر کسی سبب کے۔ لیکن اس سے ایک فائدہ یہ ہوتا تھا کہ ان کے ذہن میں آئندہ کسی کتاب کے موضوعات آنے لگتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے نئی نئی سوچیں اور زاویے اندھیروں اور ویرانیوں ہی میں سامنے آتے ہیں۔ ہنگاموں میں تو یہ کہیں گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

☆☆☆

وہ لوگ تین جیپوں پر آئے تھے۔
سکندر پہلی جیپ پر تھا۔ اس کے ساتھ ... اس کے مسلح محافظ تھے۔ جبکہ دوسری جیپوں پر اس کے پالے ہوئے بدمعاش تھے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔
وہ جیپیں ایک صاف جگہ دیکھ کر روک دی گئی تھیں۔
سکندر کے لیے ایک فولڈنگ چیئر ایک طرف رکھ دی گئی تھی۔ سرکار کا آستانہ یہاں سے بہت فاصلے پر تھا لیکن اس کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔
انہیں کسی کا انتظار تھا۔ اس کے مسلح غنڈے اپنی اپنی گاڑی سے اتر کر ارد گرد کھڑے ہو گئے تھے۔ بہت دیر بعد اندھیرے میں ایک ٹارچ کی روشنی دکھائی دی۔ وہ ٹارچ دو دفعہ جل کر بجھ گئی۔
''اپنا ہی آدمی ہے باس۔'' اس کے پاس کھڑے ہوئے ایک شخص نے بتایا۔
''ہاں۔'' سکندر نے گردن ہلا دی۔
سب کی نگاہیں اسی راستے کی طرف مرکوز تھیں جس راستے پر ٹارچ کی روشنی دکھائی دی تھی۔ وہ اشارہ ایک بار پھر ہوا۔ اس بار قریب کا اشارہ تھا۔ آنے والا قریب آ چکا تھا۔
پھر اندھیرے کی چادر سے ایک آدمی ظاہر ہوا۔ وہ سیدھا سکندر کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔
''کیا کہتا ہے چلیں ہم لوگ؟'' سکندر نے پوچھا۔
''ابھی نہیں باس۔ ابھی گاؤں کی عورتیں اور مرد جمع ہیں۔ مہندی کی رسم ہو رہی ہے۔ کچھ دیر بعد وہاں سناٹا ہو جائے گا۔ اس کے بعد چلنا زیادہ مناسب ہوگا۔'' اس آدمی نے بتایا۔
''کیا دونوں لڑکیاں وہیں ہیں؟''
''ہاں باس' دونوں ہیں۔ ایک وہ جو فہیم سے شادی کر کے بھاگی ہے اور دوسری کی کل شادی ہونے والی ہے۔''
''ٹھیک ہے۔'' سکندر نے ایک گہری سانس لی۔ کچھ دیر اور انتظار کر لیتے ہیں لیکن یہ کیسے پتا چلے گا کہ گاؤں والے چلے گئے ہیں۔''
''یہ جو روشنیاں دکھائی دے رہی ہیں نا، یہ بند ہو جائیں گی۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہاں اب وہی آستانے

والے رہ گئے ہیں۔''

پھر اچانک ہی کچھ ہوا۔

کچھ اور گاڑیاں کسی طرف سے نمودار ہو گئیں۔ ان گاڑیوں کی روشنیاں ان لوگوں پر پڑ رہی تھیں۔ یہ سب بوکھلا گئے تھے۔

آنے والی گاڑیوں سے بھی کچھ لوگ اترے۔ ان کی بندوقوں کی کھٹ کھٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ اب آنے والوں نے اپنی گاڑیوں کی روشنیاں بند کر دی تھیں۔ اسی لیے گھپ اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں کسی کی گونج دار آواز سنائی دی۔ ''اے! تم سب اپنے اپنے ہتھیار نیچے پھینک دو۔ ورنہ بھون کر رکھ دوں گا۔ میرے بندے چاروں طرف پھیل گئے ہیں۔''

سکندر نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ اس نے وہ آواز پہچان لی تھی۔ وہ سمندر کی آواز تھی۔ اس علاقے کا مشہور انسان اور بے رحم ڈاکو۔

''سمندر۔'' سکندر نے آواز لگائی۔ ''میں نے پہچان لیا ہے تمہیں۔''

''کون ہو تم؟'' اندھیرے سے آواز آئی۔

''سکندر۔'' سکندر نے بتایا۔

''کون سکندر؟''

''کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کیا تم سکندر کو بھول گئے؟''

''اوہ، سکندر سائیں۔ خوش آمدید بابا! خوش آمدید۔'' سمندر اندھیرے سے نکل کر سکندر کے سامنے آ گیا۔

دونوں بہت گرم جوشی سے ملے تھے۔ تناؤ کی کیفیت اچانک ختم ہو گئی تھی۔

''بابا! تم اس علاقے میں اپنے آدمیوں کو لے کر کیا کر رہا ہے؟'' سمندر نے پوچھا۔

''ایک مہم پر آیا ہوں سمندر۔'' سکندر نے بتایا۔

''بابا! ہم کو حکم دیا ہوتا۔'' سمندر نے عقیدت سے کہا۔

سکندر نے پیار سے اس کے شانے پر تھپکی دی۔

''نہیں سمندر، یہ میرا اپنا معاملہ ہے۔ اپنی توہین کا معاملہ ہے اس لیے میں خود اپنے بندوں کے ساتھ چلا آیا ہوں۔''

''کیا ہم کو نہیں بتائے گا بابا؟''

''کیوں نہیں بتاؤں گا۔ اس علاقے میں ایک آستانہ ہے۔ جہاں سرکار نام کے ایک آدمی نے ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ میری مہم وہیں کے لیے ہے۔''

''سکندر سائیں، وہ بندہ تو اپنا بھی دشمن ہے۔''

سمندر نے بتایا۔ ''بابا، ہم ڈاکو لوگ ہیں۔ ہم نماز، روزے کے چکر میں نہیں پڑتے۔ ہمارا دین دھرم دوسروں سے الگ ہے۔ اس آدمی نے میرے کئی بندوں کو توڑ لیا ہے۔''

''کیا مطلب؟ کیسے توڑ لیا؟''

''میرا مطلب ہے وہ بھی اس کی مسجد میں نماز کے لیے جانے لگے تھے۔ خود سوچو، پھر وہ ہمارے کس کام کے رہتے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنا سامان یہاں سے اٹھائے اور یہ علاقہ خالی کر کے چلا جائے۔''

''تو پھر اس نے کیا کہا؟''

''کچھ نہیں بابا، مجھ کو نصیحت کرنے لگا۔ ایک بار اپنے ساتھ نماز کے لیے بھی لے گیا تھا۔'' سمندر نے ہنستے ہوئے بتایا۔ پھر پوچھا۔ ''لیکن تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے بابا؟''

اس نے میرے دو آدمیوں کو پناہ دے رکھی ہے اور ان کے ساتھ دو لڑکیاں بھی ہیں۔ جو مجھ سے نکل کر بھاگی ہیں۔ میں ان دونوں کو اٹھانے کے لیے آیا ہوں۔''

''ان لڑکیوں کے لیے خود کیوں اتنی زحمت کی سکندر سائیں، مجھے بتا دیتے۔ میرے آدمی اٹھا کر تمہارے پاس پہنچا دیتے۔''

''سچ تو یہ ہے کہ میں ان لڑکیوں کو اٹھانے کے ساتھ ساتھ اس سرکار سے بھی ملنا چاہتا ہوں۔ ذرا دیکھوں تو سہی، وہ کتنے پانی میں ہے۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے سکندر سائیں؟''

''کچھ نہیں تم جاؤ۔ تم کہاں جا رہے تھے؟''

''میں ماچھو گوٹھ کی طرف جا رہا تھا سکندر سائیں۔''

سمندر نے بتایا۔ ''وہاں ایک معاملہ آ گیا تھا۔''

''ٹھیک ہے تو پھر تم جاؤ۔ میرے ساتھ بہت لوگ ہیں۔ تمہاری ضرورت نہیں پڑے گی۔'' سکندر نے کہا۔ ''ور کبھی شہر آ جانا۔ تم سے ایک بڑا کام لینا ہے۔''

''ضرور آ جاؤں گا سائیں۔''

سمندر، سکندر سے اجازت لے کر اپنے آدمیوں کو لے کر روانہ ہو گیا۔ اس میدان میں ایک بار پھر روشنیاں دکھائی دیں۔ پھر غائب ہو گئیں۔

اب ہر طرف سناٹا تھا یا سمندر کے قافلے کی گاڑیوں نے جو گرد اڑائی تھی، وہ گرد فضا میں ناچتی پھر رہی تھی۔

☆☆☆

سرکار اپنی دھن میں چلتے ہوئے بہت دور نکل آئے تھے۔ آستانے کی طرف سے آتی ہوئی عورتوں کی آوازیں اب مدھم ہو گئی تھیں۔ ایک جگہ انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ روشنیاں بھی دھندلی دھندلی سی ہو گئی تھیں۔ یعنی انہوں نے اچھا خاصا فاصلہ طے کر لیا تھا۔

وہ آج کچھ زیادہ ہی دور تک نکل آئے تھے۔ ورنہ عام طور پر اتنی دور نہیں آتے تھے۔ بس کچھ دور آنے کے بعد کھلے آسمان تلے پالتی مار کر بیٹھ جاتے۔

اور سر پر چھائے ہوئے ستاروں کو دیکھتے رہتے۔ اس ویران میدان میں ستارے بڑے بڑے اور زیادہ روشن دکھائی دیتے تھے۔

وہ سوچتے رہتے۔ اپنے بارے میں... اپنی ذات کے بارے میں۔ کائنات اور رب کائنات کے بارے میں۔

وہ سوچتے کہ آخر کیوں؟ اس دنیا کی تخلیق کا مقصد کیا تھا؟ انسان کو کیوں پیدا کیا گیا اور اگر اسے پیدا کر ہی دیا تھا تو اس کے نصیب میں اتنے دکھ کیوں لکھ دیے گئے۔ اس کو اتنی پریشانیاں کیوں دے دی گئیں۔

اور کچھ لوگوں کے مقدر میں تنہائی کیوں لکھ دی گئی۔ جیسے خود سرکار کی قسمت میں تھی۔ وہ دنیا بھر کو سکون بانٹا کرتے تھے لیکن خود بے سکون رہتے۔

نہ جانے ایسا کیوں ہوا تھا۔

ان کا باپ ایک کروڑپتی آدمی تھا۔ کیا نہیں تھا ان کے پاس۔ کارخانے، بنگلا، گاڑیاں، لیکن خود سرکار کو ان سب چیزوں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔

دنیا کے بہت سے بڑے لوگوں کی طرح۔ مہاویر کی طرح۔ بدھا کی طرح۔ ان کی روح بے چین ہی رہی تھی۔

انہوں نے اپنی زندگی کتابوں کے انبار میں گزار دی تھی اور زیادہ سے زیادہ اتنا ہوا تھا کہ خود کئی کتابیں لکھ چکے تھے لیکن اس سے کیا ہوتا تھا۔

وہ دنیا تیاگ دینے والے مہاویر اور بدھا کی طرح کیوں نہیں بن پائے تھے۔ کس بات کی کمی رہ گئی تھی۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ کچھ بھی تو نہیں تھا ان کے پاس۔ سوائے تنہائیوں کے۔ ان کے انسانی جذبے بھی اب نہ جانے کہاں گم ہو چکے تھے۔

شاید وہ ایک خالی انسان تھے۔

بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ان سے بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ورنہ عام طور پر بہت دیر تک بیٹھے رہتے تھے۔ لیکن آج کچھ بے چینی سی تھی۔

وہ اٹھ کر پھر ایک طرف چل دیے۔ پھر اچانک انہیں کچھ احساس ہوا۔

یہ کچھ لوگوں کی موجودگی کا احساس تھا۔ تاروں کی ہلکی

ہلکی روشنی میں انہیں کچھ گاڑیاں بھی دکھائی دے گئیں۔ اس کے ساتھ کچھ لوگ بھی نظر آ گئے۔

ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون لوگ ہو سکتے تھے۔ ان کا خیال سمندر کی طرف گیا۔ شاید یہ اس کا قافلہ ہو۔ وہ اسی طرح اپنے ساتھیوں کو لے کر نکلا کرتا تھا۔

وہ گاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ انسانوں کے خدوخال کسی جگہ کو گھیرے ہوئے تھے۔ شاید وہاں کوئی تھا۔

سرکار نے ایک گاڑی کی آڑ لے لی تھی۔ وہ اطمینان کر لینا چاہتے تھے کہ یہ قافلہ بے ضرر ہے یا بدمعاشوں کا ہے۔

انہوں نے ایک آدمی کی آواز سنی۔ ''اب کیا خیال ہے تیرا۔ اب تو روشنیاں بھی دکھائی نہیں دے رہیں۔ کیا گاؤں والے چلے گئے ہوں گے؟''

سرکار کے پورے بدن میں ایک سرد سی لہر دوڑتی چلی گئی۔

سرکار نے پھر اس آدمی کی آواز سنی۔ ''وہاں صرف تم لوگ ہی جاؤ گے۔ میں یہیں تمہارا انتظار کروں گا۔ ہر حال میں ان دونوں لڑکیوں کو اٹھا کر یہاں میرے پاس لانا ہے۔''

''بابا اگر وہ بندہ راستے میں آ گیا تو؟'' کسی نے پوچھا۔

''وہ تو آئے گا۔'' وہی آواز آئی۔ ''تو پھر اس کا بھی قصہ ختم کر دینا۔ اپنا سمندر بھی خوش ہو جائے گا۔''

ایک بار پھر ایک سرد سی لہر نے سرکار کے پورے بدن کا گھیراؤ کر لیا۔ ان کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا تھا۔ یہ کون لوگ تھے۔ کس ارادے سے آئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔

جس آدمی کی آواز سنائی دے رہی تھی، اس کا چہرہ دکھائی تو نہیں دے رہا تھا لیکن اتنا ضرور احساس ہو گیا تھا کہ وہ سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔

سرکار نے جیب سے اپنا پستول نکال لیا۔ اب ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔

☆☆☆

اس جمعے کی نماز میں پوری مسجد بھری ہوئی تھی۔

آس پاس کے گاؤں کے بہت سے لوگ آئے تھے۔

آج آستانے پر ایک نکاح کی تقریب بھی تھی۔ اس کے بعد کھانے کا بندوبست بھی کیا گیا تھا۔ اس ویران علاقے میں اس دن ایک پُرجوش سی ہلچل مچی ہوئی تھی۔

سرکار وعظ دے رہے تھے۔ ان کا یہ وعظ جہاد کے موضوع پر تھا۔

''ظلم کو روکنا جہاد ہے۔'' وہ کہہ رہے تھے۔ ''اگر طاقت ہے تو ظلم کو طاقت سے روک لو۔ ہاتھ پکڑ لو ظالم کا۔ اگر یہ بھی نہیں کر سکتے تو زبان سے برا سمجھو اور سب سے کمتر یہ ہے کہ اس شخص کو دل میں برا سمجھو جو برائی کا اشتہار بنا ہوا گھوم رہا ہے۔ خدا سے دعا کرو کہ وہ ہم میں سے ہر ایک کو اس کی توفیق دے۔''

لوگ بہت غور سے اُن کی باتیں سن رہے تھے۔

سرکار نے پھر کہا۔ ''آج اس مسجد میں ایک فریضہ ادا ہونے جا رہا ہے۔ ہم ایک سنت کی پیروی کر رہے ہیں۔ اس کے بعد دعوت ہو گی لیکن میں اس میں شریک نہیں ہو سکوں گا۔''

''وہ کیوں سرکار؟'' شکور نے پوچھا۔

''مجھے ایک فریضہ انجام دینے کے لیے کہیں جانا ہے۔'' سرکار نے بتایا۔ ''شکر ہے اللہ کا کہ اس نے کل رات مجھے ایک برائی ایک شیطانی قوت کو ختم کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اور اب دوسرا فریضہ یہ ہے کہ میں دنیا کی عدالت میں بھی اپنے آپ کو پیش کر دوں۔ حالانکہ میرا ضمیر مطمئن ہے۔''

''ہم نہیں سمجھے سرکار۔''

''کل رات میں نے اپنے بھائی کا خون کر دیا ہے۔'' سرکار نے ایک گہری سانس لے کر بتایا۔ ''سکندر، میرا سگا بھائی تھا۔ دونوں لڑکیاں اسی کے ظلم کا شکار ہوئی تھیں۔ کل رات وہ اور اس کے ساتھی دونوں لڑکیوں کو اٹھانے کے لیے آستانے تک آ رہے تھے۔ لیکن خدا نے ایسی صورت پیدا کر دی کہ میں نے سکندر کو اپنے ہاتھوں مار ڈالا۔ میں پوری دنیا کو اس قسم کے لوگوں سے پاک تو نہیں کر سکتا لیکن کم از کم ایک شیطان کا خاتمہ تو ہوا۔''

''سرکار تو پھر آپ یہ کیوں کہہ رہے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ دعوت میں شریک نہیں ہوں گے۔''

''اس لیے کہ نماز کے بعد اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرنے جا رہا ہوں۔''

''نہیں سرکار، ہم یہ نہیں ہونے دیں گے۔'' بہت سے لوگ ایک ساتھ کھڑے ہو گئے تھے۔

''نہیں یہ ہونے دیں۔ کیونکہ کل رات میری سمجھ میں ایک بات آ گئی ہے کہ مجھے اپنی زندگی میں جو بڑا کام کرنا تھا، وہ یہی تھا۔ قدرت نے اسی دن کے لیے میری فطرت مختلف رکھی تھی اور میں اس بات پر خوش ہوں کہ یہ کام کرتے ہوئے میرے ہاتھوں میں لغزش نہیں ہوئی۔''

سرورق کی دوسری کہانی

یومِ حساب

مسز ریم کے حنان

اس خانۂ خرابات سے ہر شخص کو رخصت ہونا ہے... رنگ و بُو... اور عیش و نشاط کے اس رنگین و سنگین میلے کی ہلچل میں ہم سب غوطہ زن ہیں... کسی کو اس وقت کی اہمیت و افادیت کا ادراک نہیں... جب ہر شے پر صرف اعمال کی پاس داری ثابت ہو گی... کیا کیا، کیسے کیا اور کیا کر چکے... صرف اور صرف یوم آخرت کو یوم حساب ہو گا... سراب اور خسارے کا سودا تمام ہو گا... گل و گلزار کے اس خوش نما ہنڈولے میں جھولنے والے شوخ و چنچل... اداس و غمگین... اور جرم کی دلدل میں دھنسے انسانوں کے پہیلے عکس در عکس... ایک ایسے شخص کا المیہ جو زندہ ہوتے ہوئے موت سے ملاقات کر آیا... اور اس ملاقات نے اسے بر اس شخص کا چہرہ دکھا دیا... جس کے پیچھے مکروہ فعل بددیانتی اور جھوٹ کی ملمع کاری تھی... دوڑتے بھاگتے کرداروں سے ملاقات جو اب صرف زندگی کے حصول کے لیے لڑ رہے تھے...

زندگی کی بے ثباتی پر ایک انوکھی اور پر اثر کہانی... سرورق کا تیکھا رنگ

جابر اچھا آدمی نہیں تھا۔ وہ اسم با مسمّٰی تھا۔ بچپن سے بُری صحبت میں پڑنے کے بعد جوانی میں اس کا ٹھکانا جرائم پیشہ افراد کے درمیان تھا۔ کبھی اس کی حیثیت سربراہ والی تھی اور اُن دنوں اس نے بہت عیاشی سے زندگی گزاری۔ جیل بھی گیا تو مزے میں رہا کیونکہ اس کے پاس دولت تھی اور جس کے پاس دولت ہو، اس کے لیے جیل میں بھی عیاشی لکھی ہوتی ہے۔ مگر رفتہ رفتہ اس کی گرفت اپنے آدمیوں پر ڈھیلی پڑتی گئی۔ وہ آزاد اور خود مختار ہوتے

گئے۔ جرائم کی دنیا میں بھی جنگل کا قانون ہے جو ایک بار بادشاہت سے اترتا ہے، اسے فوری موت نصیب ہوتی ہے۔ ورنہ وہ بہت دربدر اور اکیلا ہو کر مرتا ہے۔ یہی حال جابر کا بھی ہو گیا۔ اب اس کا کوئی نہیں تھا۔ آمدنی کا کوئی یقینی ذریعہ نہیں تھا۔ کوئی اسے اپنے آس پاس دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اگر کسی نے اسے یاد رکھا تھا تو وہ پولیس والے تھے۔ جو کسی بھی واردات کے موقع پر اسے اٹھا کر لے جاتے اور ٹھوک بجا کر چھوڑ دیتے۔

مگر رفتہ رفتہ پولیس نے بھی اسے بھلا دیا اور اب خاصے عرصے سے اسے نہ تو اٹھایا گیا تھا اور نہ تھانے طلب کیا گیا تھا۔ یہ اکتوبر کی آخری تاریخوں کی ایک رات تھی۔ موسم اچھا ہوتا مگر شام سے ہونے والی بارش نے سرما کی آمد سے قبل ہی موسم اچانک خاصا خنک کر دیا تھا۔ جابر شہر کے اس صاف ستھرے قبرستان کے پاس کھڑا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ باہر سے بہ ظاہر خاموش اور صاف نظر آنے والے اس قبرستان کے اندر کیسے ہنگامے اور گندے کام ہوتے ہیں۔ وہ اندر جاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ اس کے پاس رقم نہیں تھی مگر چرس کا ٹوٹتا نشہ اسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ اندر جا کر ان لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائے جو ایک زمانے میں اس کے آگے نظر بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔

وہ کشمکش و پیچ میں تھا۔ شاید اس کے اندر تھوڑی بہت عزت نفس باقی تھی مگر نشے کی جنگ میں فتح ہمیشہ نشے کی ہوتی ہے۔ بالآخر اس نے قدم اندر رکھا اور قبروں کے درمیان سے گزرنے لگا۔ قبرستان کا اندرونی حصہ زیادہ اچھی حالت میں نہیں تھا۔ یہاں زیادہ تر قبریں ٹوٹی پھوٹی اور بیٹھی ہوئی حالت میں تھیں۔ بارش کی وجہ سے جا بہ جا پانی کھڑا تھا۔ ایک قبر جو بالکل زمین کے ساتھ لگ گئی تھی۔ جبار کا پاؤں غلطی سے اس پر گیا اور اندر دھنستا ہی چلا گیا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا کیونکہ پوری قبر ہی اندر دھنس رہی تھی۔ جبار گرا اور پھر منہ کے بل سامنے گیا۔ اس کا سر قبر کے اندر دھنس جانے والے پتھر سے ٹکرایا۔ روشنی کا ایک جھما کا سا ہوا اور پھر بتدریج وہ مدھم ہوتے ہوئے تاریکی میں بدل گیا۔ کچھ دیر بعد وہ ہڑبڑا کر اٹھا تو دنگ رہ گیا۔ وہ قبر میں نہیں تھا۔ اگرچہ یہ جگہ بھی قبر جیسی تاریک اور ہولناک تھی مگر بہرحال قبر نہیں تھی۔

''میں کہاں ہوں؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔

''امتحان گاہ میں۔'' عقب سے آواز آئی۔ جابر نے مڑ کر دیکھا تو ایک لمبا تڑنگا سیاہ پوش آدمی کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ بھی سیاہ نقاب میں چھپا ہوا تھا اور آنکھیں جیسے دودہکتے ہوئے انگاروں جیسی تھیں۔ وہ بہت طویل نہیں تھا مگر جابر کو بہت لمبا لگ رہا تھا۔ جابر کو بہت کم خوف آتا تھا مگر اس وقت اسے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ اس نے کانپتی آواز میں کہا۔

''کیسی امتحان گاہ اور میں یہاں کیوں ہوں؟''

''آج تمہارا یوم حساب ہے۔ تم نے دنیا میں جو کیا، اس کا حساب دینا ہے۔''

اس بار جابر خود کانپنے لگا تھا۔ ''دنیا میں جو کیا ہے.... کیا مطلب؟ کیا میں مر چکا ہوں۔''

سیاہ پوش آگے آیا۔ ''ہاں تم مر چکے ہو۔''

''نہیں یہ جھوٹ ہے، میں زندہ ہوں۔'' جابر نے خود کو چھوتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے خود کو چٹکی کاٹی۔ ''میں تکلیف محسوس کر سکتا ہوں۔''

سیاہ پوش ہنسا اس نے ایک طرف ہاتھ جھٹکا اور بولا۔ ''تم ایسے ہی زندہ ہو۔''

سیاہ پوش نے جس طرف ہاتھ جھٹکا تھا وہاں کا منظر اچانک دکھائی دینے لگا۔ وہاں روشنی نہیں ہوئی تھی تاریکی بدستور چھائی ہوئی تھی مگر عجیب بات تھی کہ جابر کو اب سب نظر آ رہا تھا۔ وہاں بے شمار لوگ تھے جو جلائے جا رہے تھے۔ کچلے جا رہے تھے توڑے پھوڑے جا رہے تھے۔ کاٹے جا رہے تھے مگر اس سب کے باوجود وہ زندہ تھے۔ ایک لمحے میں انہیں اذیت ہوتی اور دوسرے لمحے وہ ٹھیک ہو جاتے اور تیسرے لمحے پھر اسی اذیت سے گزرتے۔ ان کی چیخیں اور کراہیں اتنی بلند تھیں کہ جابر کو کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔ اس نے زندگی میں بھی ایسی خوفناک اور مکروہ آوازیں نہیں سنی تھیں۔ اس نے گھبرا کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ ''خدا کے لیے اسے بند کرو۔''

سیاہ پوش نے ہاتھ جھٹکا اور منظر غائب ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی آوازیں بھی غائب ہو گئیں۔ سیاہ پوش نے کسی قدر تعجب سے کہا۔ ''تم خدا کا نام لے سکتے ہو؟''

''ہاں میں خدا کا نام لے سکتا ہوں۔''

یہ سن کر سیاہ پوش سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے زیر لب کہا۔ ''کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔'' اس نے کہتے ہوئے ہاتھ لہرایا اور اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ جلد والی کتاب آ گئی۔ وہ اس کے صفحے پلٹنے لگا۔ ایک صفحے پر آ کر وہ رکا اور اس نے سر ہلایا۔ ''بالکل غلطی ہوئی ہے۔ تم قبل از وقت یہاں آ گئے ہو؟''

''قبل از وقت؟'' جابر نے گویا سکون کا سانس لیا۔
''یعنی ابھی میرے مرنے کا وقت نہیں آیا تھا؟''
''بالکل! تمہارا وقت اصل میں چوبیس گھنٹے بعد کا ہے۔ تمہیں لانے والے سے غلطی ہوئی ہے۔''

جابر کا سکون غارت ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر کہا۔
''چوبیس گھنٹے بعد مجھے پھر یہیں آنا ہوگا؟''
''ہاں تمہیں یہیں آنا ہے کیونکہ تمہارے اعمال تمہیں اس جگہ کا حق دار بناتے ہیں۔''
''کیا مطلب؟''
''مطلب صاف ہے تم نے زندگی میں کبھی کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ سارے ہی برے کام کیے اس لیے تم یہاں آئے۔''

جابر نے اپنی ابتدائی کیفیت پر قابو پا لیا تھا اور یہ سن کر اسے ذرا اطمینان ہوا تھا کہ ابھی اس کے پاس چوبیس گھنٹے ہیں۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ چوبیس گھنٹے بعد میں یہاں نہ آؤں؟''

سیاہ پوش نے سر ہلایا۔ ''ایسا ہو سکتا ہے۔ دنیا کا ایک لمحہ بھی انسان کی قسمت بدل سکتا ہے اور تمہارے پاس تو چوبیس گھنٹے باقی ہیں۔''
''تم خدا کا نام لینے پر کیوں چونکے تھے؟''
''خدا کا نام لینا بھی نیک عمل ہے اور یہاں آنے والے کے اعمال ختم ہو جاتے ہیں اس لیے جب تم نے خدا کا نام لیا تو میں چونکا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے پتا چلا تم غلطی سے چوبیس گھنٹے پہلے یہاں لائے گئے ہو۔ تمہیں واپس جانا ہوگا۔''

''لیکن ....'' جابر نے کہنا چاہا تھا کہ سیاہ پوش نے ہاتھ جھٹکا اور جابر نے خود کو قبر میں پڑے پایا۔ اس کا سر شدت سے دکھ رہا تھا۔ چوٹ خاصی تھی اگر خون بہہ رہا تھا تو پانی کی وجہ سے پتا نہیں چل رہا تھا۔ بہرحال اوپر سے برستے سرد پانی نے جلد اس کے حواس بحال کر دیے تھے۔ وہ بہ مشکل قبر سے نکلا۔ وہ اس منظر کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس نے بے ہوشی کے دوران دیکھا تھا۔ کیا وہ خواب تھا؟ اس نے خود سے پوچھا اور خود ہی جواب بھی دیا۔ ہاں وہ خواب تھا۔ مگر اس کے اندر سے کسی نے کہا۔ ''اگر وہ خواب نہ ہوا تو؟''

جابر کا دین سے تعلق نہ ہونے کے برابر تھا اس کے باوجود اس نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ انسان دنیا میں جو کرتا ہے، اس کا حساب اسے مرنے کے بعد دینا پڑتا ہے۔ اس کے بعد اسے اُن کے اعمال کے حساب سے سزا یا جزا دی جاتی ہے۔ مگر جابر نے کبھی ا باتوں پر یقین نہیں کیا تھا۔ اس کے خیال میں زندگی کے بعد کوئی زندگی نہیں تھی۔ جب انسان مر جاتا ہے تو بس مٹی میں مل جاتا ہے مگر آج اس نے جو دیکھا تھا، وہ اس کے خیال کی نفی کر رہا تھا۔ سیاہ ماحول، ایک سیاہ پوش اور اس کی ایک جھلک نے جابر کے اندر اتنا گہرا تاثر چھوڑا تھا کہ اسے وہ سب اپنے آس پاس اور اپنے اندر تک محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی ایک ایک تفصیل اسے یاد تھی، اس کے جسم کے رونگٹے اب تک کھڑے تھے۔ اگر یہ سچ تھا تو وہ اس جگہ نہیں جانا چاہتا تھا جہاں انسانوں کے ساتھ ایسا ہولناک سلوک ہو رہا تھا۔

نشے کی طلب جیسے کہیں غائب ہو گئی تھی اور وہ لڑکھڑاتے قدموں سے قبرستان سے باہر آیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے اور کہاں جائے۔ اسی لمحے اس پر تیز روشنی آئی اور اس نے پلٹ کر دیکھا تو دو پولیس والے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ بے ساختہ کراہ کر رہ گیا۔ ''خدایا نہیں۔''

☆☆☆

احسن خان کی صورت اپنے ہم نام ٹی وی اور فلمی اداکار سے ملتی تھی۔ اس لیے اس کے اکثر ساتھی اس سے کہتے تھے کہ وہ کہاں پولیس میں آ گیا۔ اسے شوبزنس میں ہونا چاہیے تھا مگر احسن کو شوبزنس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایف ایس سی کے بعد اس نے پولیس میں درخواست دی اور اسے منتخب کر کے تربیت کے بعد اے ایس آئی بھرتی کر لیا۔ پانچ سال بعد وہ ایس آئی تھا۔ وفاقی پولیس میں ہونے کی وجہ سے اس کی تنخواہ بہت اچھی تھی۔ لیکن اگر اس کی تنخواہ اچھی نہ ہوتی تب بھی شاید وہ رشوت نہ لیتا کیونکہ اس کی پرورش رزق حلال پر اور بہت اچھے انداز میں ہوئی تھی۔ احسن کا باپ ایک درمیانے درجے کا زمیندار تھا۔ اس نے ساری عمر محنت کی تھی اور صلے میں خوشحالی پائی تھی۔ احسن کی ماں نیک صفت اور تہجد گزار عورت تھی۔ جب وہ نوکری کے لیے شہر جانے لگا تو اس نے کہا۔
''احسن اگر تو نے کبھی ایک پیسا بھی حرام کا لیا یا کسی پر ظلم کیا تو سمجھ لینا تیری ماں تجھ سے ناراض ہو کر مر گئی ہے۔''
احسن یہ بات دل میں رکھ کر شہر آیا۔ یہاں اس نے ایک ہاسٹل میں رہائش رکھی۔ یہاں اسے تو تقریباً سبھی تمام سہولتیں میسر تھیں۔ وہ وقت کا کھانا وہ نزدیکی ہوٹل میں کھاتا تھا۔ ہاسٹل اس کی تھانے سے زیادہ دور نہیں تھا جہاں اس کی

تعیناتی تھی۔ آج اس کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔ دن میں ایس ایچ او ڈی ایس پی حامد نیاز ہوتا تھا۔ احسن اس کا نائب تھا اگر ایمرجنسی ہوتی تو دن میں بھی طلب کرلیا جاتا۔ احسن ہاسٹل سے روانہ ہوا تو بارش برس رہی تھی اور اگر وہ برساتی میں نہ ہوتا تو بھیگ جاتا کیونکہ وہ بائیک پر تھا۔ تھانے کے قریب ایک ویران سڑک پر جیسے ہی اس نے کراسنگ کی کوشش کی دائیں طرف سے ایک بے انتہا تیز رفتار کار نمودار ہوئی اور اتفاق سے اسی وقت بائیک ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اس کا انجن بند ہوگیا تھا اور نہ جانے کیسے بریک بھی لگ گئے۔ اس کے پاس وقت نہیں تھا کہ خود کو بچاتا۔

کار والے نے پوری قوت سے بریک لگائے مگر بارش سے چکنی ہوجانے والی سڑک پر پھسلتی ہوئی احسن کی طرف آنے لگی اور اس نے آخری لمحے میں آنکھیں بند کرلیں۔ اسے پورا یقین ہوگیا کہ اب بچنا ممکن نہیں ہے۔ مگر جب کار اس سے نہیں ٹکرائی اور اس کی آواز بھی بند ہوگئی تو احسن خان نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ کار اس سے چند انچ کے فاصلے پر رک گئی تھی۔ نہ جانے کیسے رکی تھی مگر رک گئی تھی۔ وہ مشتعل ہوکر بائیک سے اترا اور کار کی طرف بڑھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک نوجوان بہت خوف کی حالت میں جیسے منجمد بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ احسن نے دروازہ کھولا اور اسے گریبان سے کھینچ کر باہر نکالا۔ ''تمہارا دماغ درست ہے۔ تم نے مجھے مار ہی دیا تھا۔''

''پلیز۔'' نوجوان گھگیایا۔ ''آپ اچانک سامنے آگئے تھے مگر میں نے پوری قوت سے بریک لگایا تھا۔''

احسن جانتا تھا کہ وہ اسی وجہ سے بچا تھا۔ اس نے گہری سانس لے کر اپنے اشتعال پر قابو پایا اور خود کو یاد دلایا کہ وہ پولیس مین ہے۔ اس نے اگلا سوال اسی حیثیت سے کیا۔ ''تمہارے پاس لائسنس ہے؟''

''نہیں؟''

''شناختی کارڈ، گاڑی کے کاغذات؟''

''وہ گھر میں ہیں۔''

''تب تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

نوجوان بدکا۔ ''وہ کیوں؟''

احسن نے برساتی ہٹا کر اسے اپنی وردی دکھائی تو نوجوان کا چہرہ اتر گیا۔ احسن نے اسے اوور اسپیڈنگ اور کسی قسم کے کاغذات نہ ہونے کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ جب وہ اسے اس کی کار میں بٹھا کر اس کے پیچھے اپنی بائیک پر تھانے جارہا تھا تو اس نے نوجوان کو خبردار کردیا تھا کہ وہ فرار ہونے کی کوشش نہ کرے ورنہ چند گھنٹوں بعد زیادہ سنگین الزامات میں پکڑا جائے گا۔ احسن نے اس کی کار کا نمبر دیکھ لیا تھا۔

☆☆☆

شہر کے مین بس ٹرمنل پر باہر سے آنے والی ایک بس رکی اور اس سے ایک جوڑا اترا۔ نوجوان تو خاص نہیں تھا۔ خوش شکل اور متوسط جسامت کا مگر کسی قدر چالاک نظر آتا تھا۔ اس کی عمر بائیس سے زیادہ نہیں تھی۔ البتہ اس کے ساتھ موجود لڑکی خاصی حسین اور چہرے وحلیے سے کسی اچھے گھر کی لگ رہی تھی۔ اس کے سرمئی بال جوڑے کی صورت میں بندھے تھے اور سرخ رنگت پر سیاہ آنکھیں اچھی لگ رہی تھیں۔ اس نے ہلکا میک اپ کیا ہوا تھا۔ سادہ شلوار قمیص اور دوپٹے میں وہ اچھی لگ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بس سے اترتے ہی کئی نگاہیں اس کی طرف اٹھی تھیں۔ رات کے نو بجے بھی ٹرمنل پر خاصی چہل پہل تھی لوگ آجارہے تھے۔ لڑکا چوکنا اور لڑکی گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کے پاس چھوٹا ہینڈ کیری تھا جبکہ لڑکے کے ہاتھ میں بڑا بیگ تھا۔ لڑکی نے آہستہ سے کہا۔

''ہم کہاں رکیں گے؟''

''جہاں رکنا تھا، وہ تو اتفاق سے شہر میں ہے ہی نہیں۔'' لڑکے نے جواب دیا۔ ''اب ہمیں کسی ہوٹل میں رکنا ہوگا۔''

نصف گھنٹے بعد وہ ایک متوسط سے ہوٹل میں تھے اور یہاں لڑکے نے ایک ڈبل بیڈ کمرا کرائے پر لیا۔ اس پر لڑکی نے آہستہ سے کہا۔ ''میرے لیے الگ کمرا لو۔''

''کوئی بات نہیں۔'' لڑکے نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''ویسے بھی کل ہمارا نکاح ہوجائے گا۔''

ڈیسک کلرک نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ نصف گھنٹے بعد پولیس نے اچانک چھاپا مارا۔ اس وقت لڑکا لڑکی سونے کی تیاری کررہے تھے۔ حوالدار اور اس کے ساتھ آنے والا سپاہی دونوں کو گرفتار کرکے ساتھ لے گئے۔ کیونکہ ان کے مطالبے پر وہ نکاح نامہ نہیں پیش کرسکے تھے۔ لڑکی کے شناختی کارڈ کے مطابق اس کا نام نازیہ رحمان تھا جبکہ لڑکا احمر ریاض تھا۔ ان کے پاس چند جوڑے اور معمولی سا سامان تھا۔

☆☆☆

احسن لڑکے سمیت تھانے میں داخل ہوا تو وہاں ڈی

ایس پی حامد کی نئے ماڈل کی چمکتی دمکتی کار کھڑی تھی۔ وہ جب سے پولیس میں آیا تھا اگر اس وقت سے اب تک اپنی تنخواہ کا ایک ایک روپیہ بچاتا تب بھی ایسی کار نہیں خرید سکتا تھا۔ احسن جانتا تھا کہ اس کے پاس ایسی دو کاریں ہیں جو اس کی بیوی اور بچوں کے نام پر ہیں۔ شہر میں اور اس سے باہر اس کی خاصی اراضی زمین و جائداد تھی مگر اس کے نام پر کچھ نہیں تھا۔ کوئی خاص وجہ تھی ورنہ حامد آٹھ بجے ہی گشت کے نام پر نکل جاتا تھا۔ کھانے پینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا مگر ایک اچھی بات تھی کہ وہ اپنے ماتحتوں کو حرام کھانے پر مجبور نہیں کرتا تھا۔ مجرموں سے کسی قدر بہتر انداز میں پیش آتا تھا۔ تفتیش کے نام پر اذیت کے پہاڑ نہیں توڑتا تھا۔ اسی وجہ سے احسن کی اس سے اچھی بنی ہوئی تھی۔

احسن لڑکے سمیت اندر آیا اور اس کی منت سماجت نظر انداز کرتے ہوئے حوالدار رحیم خان کو اسے لاک اپ کرنے کا حکم دیا۔ تھانے کی یہ عمارت چند سال پہلے بنی تھی اور اسے روایتی تھانے سے مختلف بنایا گیا تھا۔ اس میں لاک اپ تہ خانے میں تھا جہاں سے کسی کا فرار ہونا مشکل کام تھا۔ احسن حامد کے کمرے میں آیا۔ وہ نائب انچارج کی حیثیت سے یہیں بیٹھتا تھا۔ حامد نے بدمزگی سے کہا۔

”تم لیٹ آئے ہو۔“

”شکر کریں آ گیا ورنہ ممکن ہے اس وقت فرشتوں کو حساب کتاب دے رہا ہوتا۔“

حامد چونکا۔ ”کیا ہوا؟“

احسن نے اسے مختصراً راستے میں پیش آنے والا واقعہ سنایا تو حامد کے ماتھے پر شکنیں آ گئیں۔ ”یہ ایک اور مصیبت ہے۔ اب اسے بھی دیکھنا پڑے گا۔“

”آپ فکر مت کریں۔ میں اسے رات بھر رکھ کر صبح جانے دوں گا۔ اس کا قصور اتنا بڑا نہیں ہے کہ باقاعدہ پرچہ کٹے۔“

حامد کھڑا ہو گیا۔ ”ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔ ہاں لاک اپ میں ایک بندہ جہانگیر ہمدانی موجود ہے۔ اس کے بارے میں کوئی خبر باہر نہ جائے۔ اگر کوئی اس کے بارے میں براہِ راست پوچھے تو کہنا کہ میں لاک اپ کر کے گیا ہوں۔“

احسن نے سر ہلایا۔ ”میں سمجھ گیا۔“

حامد سر پر ٹوپی جماتا ہوا باہر نکل گیا۔ دن میں تھانے میں درجن سے اوپر افراد کا عملہ ہوتا تھا مگر رات میں صرف چار افراد رہ جاتے تھے۔ احسن کے ساتھ حوالدار رحیم خان کے ساتھ دو سپاہی شرافت علی اور ممتاز صابر موجود تھے۔ دوسرے چار افراد جن کی نائٹ ڈیوٹی ہوتی تھی، وہ گشت پر تھے۔ عام طور سے وہ کسی ہوٹل یا رات بھر کھلی رہنے والی جگہ آرام کرتے تھے اور صرف کاغذات میں گشت پر ہوتے تھے۔ احسن نے برساتی کھونٹی سے لٹکائی اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے روزنامچہ اپنی طرف کیا۔ حامد نے جہانگیر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور نہ اس کے بارے میں روزنامچے میں کچھ درج تھا کہ اسے کس سلسلے میں لاک اپ کیا گیا ہے۔ احسن سوچ رہا تھا کہ نیچے کا ایک چکر لگائے مگر پہلے اس نے چائے پینے کا فیصلہ کیا اور گھنٹی بجا کر سپاہی ممتاز کو بلایا۔ ”یار ممتاز زبردست قسم کی چائے بنا لاؤ۔“

”ابھی لو صاحب۔“ اس نے دانت نکالے۔ ”آج کیسی چائے چلے گی؟“

”پتی زیادہ اور دودھ کم۔“

ممتاز چائے بنانے چلا گیا۔ چند منٹ بعد باہر کچھ آوازیں آئیں اور پھر حوالدار حسین نواز اندر آیا۔ وہ آج گشت پر تھا۔ احسن کو سلیوٹ کر کے اس نے کہا۔ ”سر دو پنچھی ہاتھ آئے ہیں۔“

احسن نے سر ہلایا۔ ”کس سلسلے میں؟“

حسین نواز معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”ہوٹل سے پکڑا ہے۔ لڑکی اچھے گھر کی لگ رہی ہے اور لڑکا چالو ہے۔ دونوں میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔“

احسن کا چہرہ تن گیا۔ ”خود چھاپا مارا ہے؟“

”نہیں جی ہوٹل والوں نے شکایت کی تو ہم گئے۔“

احسن نے سوچا اور بولا۔ ”پیش کرو۔“

ایک منٹ بعد نازیہ اور احمر اس کے سامنے تھے۔ احسن نے انہیں سامنے بٹھایا تو وہ کچھ حیران ہوئے۔ احسن نے براہِ راست سوال کیا۔ ”گھر سے بھاگے ہوئے ہو؟“

”سر، وہ بات یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔“ لڑکے نے پُراثر انداز میں کہا۔ ”لیکن ہمارے گھر والے نہیں مانتے۔“

”اس لیے تم لوگ گھر سے بھاگ نکلے۔“ احسن نے کہا۔ ”کیا تم نے نکاح کر لیا ہے؟“

”نہیں لیکن ہم کل ہی .....“

”تب ایک کمرے میں کیسے رکے تھے؟“

”سر ہمارے پاس کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔“

”تم دونوں خود کو گرفتار سمجھو۔ کل لڑکی کا میڈیکل چیک اپ ہوگا اور اگر رپورٹ آئی تو پھر حدود کے تحت کیس

بنے گا۔''

یہ سن کر لڑکے نے کہنا چاہا۔ ''سر میں قسم کھاتا ہوں ہم ....''

''کل بات ہوگی۔'' احسن نے کہا اور انہیں لاک اپ میں بند کرنے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی اس نے نازیہ کو ایک الگ لاک اپ میں رکھنے کو کہا تھا۔ حسین نواز اور اس کا ساتھی کچھ دیر ٹھہر کر دوبارہ گشت پر چلے گئے۔ اس چکر میں چائے کا مزہ کرکرا ہوگیا تھا۔ تقریباً ٹھنڈی ہو جانے والی چائے چند گھونٹ میں پی کر دس بجے احسن لاک اپ کے معائنے کے ارادے سے اٹھا تھا کہ پھر باہر ہلچل ہوئی اور اس بار دوسری گشتی پارٹی جابر کے ساتھ آئی۔ اس کی حالت بری تھی اور سر پر گہرا زخم تھا جس سے خون بہا تھا مگر مسلسل بارش میں رہنے کی وجہ سے خون صاف ہوگیا تھا اور اب زخم کی سرخی باقی رہ گئی تھی۔ ان میں سے ایک سپاہی بہت پریشان تھا۔ اس نے آتے ہی احسن سے کہا۔ ''سر مجھے چھٹی چاہیے میری بچی کی طبیعت بہت خراب ہے۔''

''گھر سے کال آئی ہے؟''

''نہیں جی آج بہت عجیب بات ہوئی ہے۔ میں اور نور قبرستان کے پاس گشت پر تھے کہ قبرستان سے جابر نکلا اور اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی، یہ زخمی بھی تھا۔ ہم نے اسے روکا تو یہ بھاگا مگر ہم نے پکڑ لیا۔ تب اس نے مجھ سے کہا کہ میں گھر جاؤں میری بچی کی طبیعت خراب ہے اور میری بیوی مسلسل مجھے کال کر رہی ہے۔ میں نے موبائل نکال کر دیکھا تو وہ بند تھا، اسے آن کر کے بیوی کو کال کی تو جابر کی بات کی تصدیق ہوگئی۔''

احسن کا موڈ آف ہوگیا۔ ''اس پر تم اسے گرفتار کر کے لے آئے؟ اور یہ زخمی کیسے ہوا کیا تم لوگوں نے مارا ہے؟''

''نہیں جی، آپ اس سے پوچھ لیں، یہ قبرستان سے نکلا تو زخمی تھا اس لیے ہم اسے یہاں لے آئے۔ اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔''

''تھانہ شیلٹر ہاؤس ہے جہاں اسے رات بھر پناہ دی جائے یا پھر اسپتال ہے جہاں اس کا علاج کیا جائے۔'' احسن کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔

''سر جی پلیز۔'' سمیع نے عاجزی سے کہا۔ ''اس نے مجھ پر احسان کیا ہے۔''

احسن نے کچھ دیر بعد سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے تم جاؤ لیکن کیسے جاؤ گے؟''

''کوئی ٹیکسی مل جائے گی۔''

''نہیں تم میری بائیک لے جاؤ۔''

''شکریہ سر جی۔'' سمیع نے اس سے چابی لی اور رخصت ہوگیا۔ جابر باہر ہال میں بیٹھا ہوا تھا۔ حوالدار رحیم خان اسے گھور رہا تھا۔ وہ اس تھانے کا سب سے پرانا فرد تھا اور وہ جابر کو اچھی طرح جانتا تھا۔ احسن نے دیکھا، جابر سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''بہت دنوں بعد آنا ہوا جابر۔''

''ایسے لوگ تھانے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔'' رحیم خان نے کہا۔

جابر کے کپڑے گیلے تھے اور وہ ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا۔ اس کے سر کے زخم سے پھر ہلکا سا خون رسنے لگا تھا۔ اس کے ہونٹ نیلے ہو رہے تھے اور بہ ظاہر اسے سردی لگ رہی تھی۔ رحیم خان کی بات پر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''آج یوم حساب ہے۔''

''کس کا؟ .... تیرا؟'' رحیم خان نے مذاق اڑانے والے انداز میں پوچھا۔

''نہیں میرا کل ہوگا لیکن تمہارا آج ہے۔''

نہ جانے کیوں احسن کو اس پر ترس آنے لگا۔ اسے لگا کہ جابر کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے ممتاز سے کہا۔ ''اس کے لیے چائے بناؤ۔ جابر تم میرے ساتھ آؤ۔''

جابر اٹھا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ پہلے احسن اسے اپنے کمرے میں لایا۔ یہاں اس کے پاس فرسٹ ایڈ کٹ تھی۔ اس نے زخم صاف کر کے اس پر پٹی لگا دی اور پھر اسے پانی کے ساتھ دو پین کلر کھانے کو دیں۔ آخر میں وہ اسے نیچے تہ خانے میں لایا۔ لاک اپ کی چابیاں احسن کے پاس تھیں۔ یہاں دہرا حفاظتی نظام تھا۔ سیڑھیوں کے بعد ایک راہداری دو حصوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ دائیں طرف باتھ روم تھا اور بائیں طرف ایک مضبوط فولادی دروازہ تھا۔ اس کے اوپری حصے میں چھوٹا سا خانہ تھا جو موٹی سلاخوں سے بند تھا۔ اس سے جھانک کر اندر دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ لاک اپ میں کھلتا تھا۔ احسن نے پہلے اسے کھولا اور اندر آیا۔ ایک راہداری میں دونوں طرف لاک اپ کے آٹھ سیل تھے۔

ان میں سے تین سیل اس وقت آباد تھے۔ یہ سیل آٹھ بائی چھ کے تھے۔ دونوں طرف دیواروں کے ساتھ دو فٹ چوڑی اور چھ فٹ لمبی لکڑی کی بنچیں لگی تھیں۔ ان پر لیٹا جا سکتا تھا۔ دائیں طرف کے پہلے سیل میں جہانگیر تھا۔ وہ

سوٹ میں ملبوس تھا مگر اس نے کوٹ کے بٹن کھول دیے تھے اور ٹائی اتار دی تھی۔ وہ یقیناً ذی حیثیت آدمی تھا۔ اس کے رخسار پر زخم تھا جس سے خون بہہ کر اس کے گال پر جم گیا تھا۔ احسن کو دیکھتے ہی وہ تیزی سے سلاخوں کے پاس آیا۔

''انسپکٹر میری بات سنو۔''

مگر احسن نے ان سنی کر کے بائیں طرف کے دوسرے سیل کا دروازہ کھولا اور جابر کو اس میں جانے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے اندر چلا گیا۔ اسے آرام کی ضرورت تھی مگر احسن اسے اوپر کہیں نہیں رکھ سکتا تھا۔ صبح تک اس کی حالت ٹھیک ہو جاتی تو وہ اسے چھوڑ دیتا۔ دائیں طرف کے دوسرے سیل میں تیمور، احمر کے ساتھ تھا۔ تیمور وہی نوجوان تھا جس کے پاس نہ لائسنس تھا اور نہ گاڑی کے کاغذات۔ اسے اسپورٹس کار کی صورت میں لائسنس ٹو کِل یقیناً اس کے گھر والوں نے دیا تھا اور اسی وجہ سے احسن نے اسے گھر اطلاع کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ وہ اس کے گھر والوں کو بھی ایک رات کی سزا دینا چاہتا تھا۔ احسن نے جابر کا سیل بند کیا تو تیمور نے آواز دی۔ ''سر پلیز میری بات سنیں۔''

''تم سب کی سنوں گا۔'' احسن نے مڑ کر استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''لیکن ایک رات تھانے میں گزارنا کوئی ایسا تجربہ نہیں ہے جو تم لوگ دوہائیاں دینے لگو۔''

دائیں طرف کے تیسرے لاک اپ میں نازیہ تھی۔ احسن اس کے پاس آیا تو وہ جلدی سے بینچ سے اٹھ گئی۔ اس کا ہینڈ بیگ اور احمر کے پاس سے نکلنے والا بیگ حسین نواز نے احسن کے پاس جمع کرا دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بیگوں میں صرف ان کے کپڑے، ضرورت کی چیزیں اور کچھ معمولی رقم تھی۔ نازیہ نے سادہ سوٹ پہنا ہوا تھا اور موسم سرد ہو چلا تھا۔ احسن نے پوچھا۔ ''تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے؟''

''شال چاہیے، مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔'' نازیہ نے آہستہ سے کہا۔

''میں بھجواتا ہوں۔''

وہ واپس جانے لگا تو جہانگیر نے پھر اسے روکا۔ ''انسپکٹر میری بات سنو۔''

''میں سب انسپکٹر ہوں۔'' احسن نے اپنے شانے کی طرف اشارہ کیا۔ ''دوسرے میں نے تمہیں گرفتار نہیں کیا ہے اس لیے تم مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہو؟''

''میں تمہیں ایک نمبر دے رہا ہوں، اس پر کال کر دو۔''

احسن نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہاں سے کوئی باہر رابطہ نہیں کر سکتا ہے۔''

''سنو۔'' وہ ممکنہ حد تک دھیمی آواز میں بولا۔ ''صرف ایک کال اور اس کے بدلے تم مجھ سے جو چاہے لے لو۔''

''رشوت۔'' احسن نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''آج تک لی نہیں ہے اس لیے ایک کال کا ریٹ نہیں معلوم۔ بائی دی وے تم کس سلسلے میں یہاں ہو؟''

جہانگیر جواب دیتے ہوئے ہچکچایا مگر اس نے کہہ دیا۔ ''میں پستول صاف کر رہا تھا کہ اتفاق سے گولی چل جانے سے میرا گھریلو ملازم ہلاک ہو گیا۔''

احسن نے آنکھیں پھیلائیں۔ ''یہ تو تین سو دو کا کیس ہے۔''

''کوئی کیس نہیں ہے۔'' جہانگیر نے اس بار اعتماد سے کہا۔ ''مجھے یقین ہے ڈی ایس پی نے بھی ایف آئی آر نہیں کاٹی ہوگی۔ وہ مجھ سے سودا کرنا چاہتا ہے۔''

''تو اس سے سودا کر لو۔'' احسن نے مشورہ دیا۔

''وہ جو چاہ رہا ہے، میں اسے نہیں دے سکتا۔'' اس کا لہجہ پھر دھیما ہو گیا۔

''تب صبح کا انتظار کرو۔'' احسن آگے بڑھا۔ جہانگیر اسے عقب سے آوازیں دیتا رہ گیا۔ اوپر جا کر اس نے ممتاز سے کہا۔ ''جب جابر کے لیے چائے لے کر جاؤ تو میرے پاس سے ہو کر جانا۔''

احسن نے کمرے میں آ کر الماری سے چھوٹا ہینڈ بیگ نکالا اور اسے کھولا تو اندر سے نازیہ کے دو سوٹ، ایک سوئیٹر اور ایک شال نکلی تھی۔ بیگ کی تہہ میں بھی کچھ تھا۔ اس نے ٹٹولا تو ایک پتلا سا فولڈر نکل آیا۔ احسن نے اسے نکال کر اس کا کھٹکا کھولا تو اندر سے ڈاکومنٹس نکلے تھے۔ یہ نازیہ کے تعلیمی سرٹیفکیٹ، ڈومیسائل اور دوسرے ضروری کاغذات تھے۔ اس نے ایف ایس سی کیا تھا اور بہت اچھے نمبروں سے کیا تھا۔ پھر اس نے نرسنگ کورس کے لیے داخلہ لیا تھا۔ اس کا کارڈ اور دوسری چیزیں فولڈر میں موجود تھیں۔ اس کا پتا ایک چھوٹے شہر کا تھا جو یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ ریل سے صرف نصف گھنٹے کا سفر تھا۔ فولڈر کے اندر ہی ایک چھوٹی سی درز میں پانچ ہزار کی رقم تھی جو ہزار ہزار کے پانچ نوٹوں پر مشتمل تھی۔ احسن نے اسے نہیں چھیڑا۔ سب ویسے ہی رکھ کر فولڈر بند کر کے بیگ کے نچلے حصے میں رکھ دیا اور بیگ سے شال نکال لی۔ جب ممتاز چائے

لے کر آیا تو احسن نے اسے چابیوں کے ساتھ شال بھی دی۔

''یہ لاک اپ میں موجود لڑکی کو دے دینا۔''

ممتاز کے جانے کے بعد وہ دونوں پاؤں میز پر رکھ کر آرام سے بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لڑکی بہ ظاہر اس قماش کی نہیں لگ رہی ہے پھر بھی وہ اس لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ نکلی تھی۔ کچھ دیر بعد اسے دوسرا بیگ دیکھنے کا خیال آیا اور اس نے الماری سے نکال کر چیک کیا تو یہ لڑکے کا ثابت ہوا اور اس میں اس کے کئی جوڑے اور استعمال کی دوسری چیزیں تھیں مگر کوئی رقم نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ حوالدار حسین نواز بدعنوان پولیس والا ہے اگر لڑکے اور لڑکی کے پاس کوئی بڑی رقم تھی تو وہ اس کی جیب میں جا چکی ہوگی۔ اگر انہوں نے شور شرابا کیا تو کوئی ان کی بات سنے گا نہیں۔ پھر اس کا دھیان جابر کی طرف گیا۔ اس تھانے میں آنے کے بعد اس کا واسطہ کئی بار جابر سے پڑا تھا۔ وہ پکا ہسٹری شیٹر تھا۔ مگر احسن نے آج سے پہلے کبھی اسے اس حالت میں نہیں پایا تھا۔ جب وہ رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا تب بھی سینہ تان کر بے خوفی سے تھانے آتا تھا۔ مگر اس بار اس کا انداز بالکل مختلف تھا۔ وہ بہت خوف زدہ لگ رہا تھا۔ البتہ اس نے رحیم خان کو یوم حساب سے ڈرایا تھا اور اپنا یوم حساب اگلے دن کو قرار دیا تھا۔

☆☆☆

جابر خاموشی سے سلاخیں پکڑے کھڑا تھا۔ اس کے کپڑے اب کسی قدر سوکھ چلے تھے اور وہ پُرسکون تھا مگر وہ سردی کی وجہ سے نہیں کانپ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا اس کی کپکپی کی وجہ کچھ اور تھی۔ جب وہ قبرستان سے نکلا اور پولیس والے اس کی طرف آئے تو وہ بے ساختہ بھاگا مگر انہوں نے پیچھا کر کے اسے پکڑ لیا اور اسی وقت اس کے ذہن میں جھما کا سا ہوا اور اسے لگا کہ ایک پولیس والے کے گھر میں کچھ مسئلہ ہے۔ اسے تصور میں ایک بچی دکھائی دی جو بیمار تھی اور اس کی ماں جو بار بار اپنے شوہر کو کال کر رہی تھی مگر اس کا موبائل بند جا رہا تھا۔ اسے لگا کہ یہ اس سپاہی کی بیوی تھی جس نے اسے پکڑا ہوا تھا۔ جابر نے اسے بتایا تو سپاہی نے اپنا موبائل چیک کیا۔ وہ بند تھا۔ اسے آن کر کے اس نے بیوی کو کال کی۔ جابر کی بات درست ثابت ہوئی۔ سپاہی اس سے بار بار پوچھ رہا تھا کہ اسے کیسے پتا چلا کہ اس کی بچی بیمار ہے اور اس کی بیوی اسے کال کر رہی ہے۔

جابر کی حالت غیر ہو رہی تھی اور وہ بے اختیار کانپ رہا تھا اس کے منہ سے لایعنی آوازیں نکل رہی تھیں۔ دونوں سپاہی اسے تھانے لے آئے۔ جب اسے ہال میں بٹھایا تو رحیم خان اس کے سر پر تھا اور وہ اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ ایک بار اس نے رحیم خان کی طرف دیکھا تو پھر جھما کا ہوا اور اس نے رحیم خان کو بے بسی سے آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں دیکھا تھا۔ پھر احسن نے اسے لاک اپ میں ڈال دیا۔ مگر اس نے کوئی وجہ نہیں بتائی اور نہ ہی جابر نے پوچھی۔ اسے لگا کہ احسن نے اسے یہاں پناہ دی تھی۔ کچھ دیر میں سپاہی ممتاز اس کے لیے چائے اور نازیہ کے لیے شال لے آیا۔ چائے پی کر جابر نے سکون محسوس کیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اسے یہ سب کچھ کیوں نظر آ رہا ہے؟ کیا یہ تبدیلی اس منظر کے بعد سے آئی ہے جو اس نے قبر میں دورانِ بے ہوشی دیکھا تھا؟

اس کے سامنے احمر اور نازیہ اپنے اپنے سیل کی دیوار سے بالکل جڑے دھیمے لہجے میں کچھ بات کر رہے تھے۔ تیمور دوسری بینچ پر بیٹھا بالکل سامنے تھا۔ جابر نے تیمور کو دیکھا تو اچانک اس کے ذہن میں ویسا ہی جھما کا ہوا اور پھر اس نے دیکھا کہ تیز بارش میں ایک تیز رفتار کار سڑک پر جا رہی ہے۔ یہ شوخ نارنجی رنگ کی اسپورٹس کار تھی۔ ایک موڑ کاٹتے ہی سامنے ایک شخص سڑک پر نظر آتا ہے۔ کار کی تیز روشنیاں اسے اندھا کر دیتی ہیں اور اس سے پہلے کہ وہ مدافعت کرے کار اسے ٹکر مار کر اچھالتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ کار تیمور چلا رہا تھا۔ منظر یہیں تک تھا اور پھر جابر چونک گیا۔ اس نے تیمور کو دیکھا تو وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ جابر نے سلاخوں کو پکڑتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''تم نے اچھا نہیں کیا۔''

تیمور نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''تم مجھے کہہ رہے ہو؟''

جابر نے سر ہلایا۔ ''ہاں میں تم سے کہہ رہا ہوں۔''

''میں نے کیا اچھا نہیں کیا؟''

''تم جانتے ہو۔'' جابر نے جواب دیا اور سلاخوں سے سر ٹکا لیا۔ اس نے دیکھا نہیں کہ تیمور کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ احمر نے جابر اور تیمور کی اس گفتگو پر پلٹ کر دیکھا مگر اس کا معاملہ نہیں تھا اس لیے وہ خاموش رہا۔ جہانگیر اپنے سیل میں یوں ٹہل رہا تھا جیسے جنگل سے لایا جانے والا جانور پہلی بار اپنے پنجرے میں بے چین ہوتا ہے۔ اچانک اس نے سلاخوں کے پاس آ کر کہا۔

''تم میں سے کسی کے پاس موبائل فون ہے؟''

جابر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے

یہاں لاک اپ میں کسی کو موبائل رکھنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔''
''نہیں مگر......''
''موبائل اور سب بھول جاؤ، آج یوم حساب ہے۔''
سب جابر کی طرف متوجہ ہوگئے۔ جہانگیر بولا۔''کیا مطلب کیسا یوم حساب؟''
''انسان جو کرتا ہے، اسے اس کا جواب دینا ہوتا ہے۔ جس دن جواب دینا ہوتا ہے وہی یوم حساب ہوتا ہے۔''
''تمہارا خیال ہے، ہمیں کس کو جواب دینا ہے؟'' جہانگیر استہزائیہ انداز میں بولا۔''ان پولیس والوں کو؟''
''نہیں اس کو جس کی گرفت سے کوئی بچ نہیں سکتا ہے۔'' جابر سنجیدگی سے بولا۔
احمر نے جہانگیر اور احسن کی گفتگو سنی تھی۔ وہ سلاخوں کے پاس آیا۔''ہم میں سے کسی کے پاس موبائل نہیں ہے لیکن میں تمہیں ایک طریقہ بتا سکتا ہوں۔''
''کیسا طریقہ؟''
''جو آفر تم نے ایس آئی کو کی تھی، وہی اس سپاہی کو کر کے دیکھو جو ابھی آیا تھا۔''
جابر اب احمر کو گھور رہا تھا۔ اسے نہ جانے کیوں اس لڑکے سے نفرت محسوس ہو رہی تھی حالانکہ وہ اسے جانتا بھی نہیں تھا مگر اس بچے باوجود یہ نفرت بہت شدید تھی۔ اس میں کراہت بھی شامل تھی۔ احمر کی بات سن کر جہانگیر سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔''تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر میں اسے کیسے بلاؤں؟''
''یہاں باتھ روم کی سہولت نہیں ہے، تم اس بہانے اسے بلا سکتے ہو۔'' احمر نے دوسرا مشورہ دیا اور یہ بھی جہانگیر کے دل کو لگا تھا۔
''مگر بلاؤں کیسے؟''
احمر نے اپنے سیل میں رکھا ہوا المونیم کا گلاس اٹھایا اور اسے سلاخوں پر رکھ کر ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹکراتا چلا گیا۔ اس سے ایک مسلسل کریہہ سا شور بلند ہوا۔ احمر نے کہا۔''اس طرح سے۔''
''تم ذہین نوجوان ہو۔'' جہانگیر نے کہا۔ اس نے اپنا گلاس اٹھایا اور سلاخوں پر اسی طرح مارنے لگا۔ احمر نے بھی اس کی مدد کی اور دونوں کا مشترکہ شور اتنا بلند تھا کہ وہ اوپر تک یقیناً جا رہا تھا۔

☆☆☆

احسن کسی قدر غنودگی میں تھا کہ شور نے اسے چونکایا۔ یہ نیچے لاک اپ سے آرہا تھا۔ یہ شور نیا نہیں تھا۔ قیدیوں کو رفع حاجت کے لیے جانا ہوتا تو وہ اسی طرح اوپر والوں کو متوجہ کرتے تھے۔ اس نے ممتاز کو آواز دی۔''دیکھو کسے تکلیف ہو رہی ہے؟''
ممتاز نیچے گیا اور کچھ دیر بعد واپس آیا۔''وہ جی بڑی پارٹی کو باتھ روم جانا ہے۔''
ممتاز نے یقیناً فولادی دروازے کی اوپری جھری سے پوچھا ہوگا۔ احسن نے چابیوں کا گچھا اس کی طرف اچھال دیا۔''احتیاط سے جانا بعض اوقات بڑی پارٹی گلے پڑ جاتی ہے۔''
''سر جی پانچ سال سے پولیس میں ہوں۔ سب پتا ہے۔'' ممتاز نے گچھا لے کر جاتے ہوئے کہا۔ احسن کی نیند غائب ہوگئی تھی۔ اس نے ایک کونے میں دیوار پر لگا ہوا ٹی وی آن کر لیا اور چینل گھمانے لگا۔ مگر کسی چینل سے کوئی ڈھنگ کی چیز نہیں آرہی تھی۔ اس نے ایک مووی چینل لگایا اور اس پر آنے والی خاصی پرانی سی فلم دیکھنے لگا۔ اس وقت یہ فلم یقیناً بہت سنجیدگی سے بنائی گئی تھی اور یقیناً لوگوں نے بہت سنجیدگی سے دیکھی ہوگی۔ مگر احسن کو یہ مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ وقت ہر چیز کو بدل دیتا ہے۔ بعض سین اتنے زیادہ دردناک تھے کہ احسن کو ہنسی آجاتی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ ممتاز کو گئے ہوئے خاصی دیر ہوگئی تھی۔ اب تک اسے آجانا چاہیے تھا۔ احسن نے بیل بجائی تو ممتاز کی جگہ دوسرا سپاہی شرافت آگیا۔ احسن نے اس سے ممتاز کے بارے میں پوچھا۔ اس نے جواب دیا۔
''وہ نیچے سے نہیں آیا ہے جناب عالی۔''
احسن اسے کہنے جا رہا تھا کہ وہ نیچے جا کر دیکھے مگر پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا اور شرافت کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے خود کھڑا ہوگیا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔ اصولاً جو فرد فولادی دروازہ کھول کر اندر جاتا، وہ اسے اندر سے فوراً لاک کر لیتا۔ مگر عام طور سے پھر تالا کھولنے کی زحمت سے بچنے کے لیے ایسا نہیں کیا جاتا تھا۔ اس وقت بھی دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ احسن اندر آیا اور پہلے اس نے لاک اپ والے حصے میں جھانک کر دیکھا۔ ممتاز وہاں نہیں تھا۔ یقیناً وہ جہانگیر کو باتھ روم لے گیا تھا۔ یہاں باتھ روم تفتیش والے حصے میں تھا۔ قیدیوں کو وہیں لے جایا جاتا تھا۔ احسن یہاں آیا تو اسے باتھ روم کے نزدیک کسی کے آہستہ سے بات کرنے کی آواز آئی۔ اس نے باتھ روم کا

دروازہ کھولا تو ممتاز سامنے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ چونکا۔
''خیریت سر جی کوئی کام تھا تو مجھے بلا لیا ہوتا۔''
''تم نے اتنی دیر لگا دی۔'' احسن نے غور سے اسے دیکھا۔
''سر جی بندہ نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ لگتا ہے ٹریفک جام ہے۔''
اسی لمحے اندر سے فلیش چلنے کی آواز آئی۔ یہی باتھ روم پولیس والوں کے استعمال میں بھی تھا اس لیے یہاں ہر چیز درست حالت میں رکھی جاتی تھی۔ صبح صفائی والا آ کر اس کی مکمل صفائی کر کے اور فنائل ڈال کر جاتا تھا۔ جہانگیر باہر آیا اور اس نے واش بیسن سے ہاتھ دھویا۔ ممتاز اسے واپس سیل کی طرف لے گیا۔ احسن وہیں رکا رہا۔ ممتاز آیا تو اس نے چابیاں لیں اور اس سے پوچھا۔ ''باتھ روم میں کون بول رہا تھا؟''
''کوئی نہیں جی۔''
''میں نے آواز سنی تھی۔''
ممتاز مسکرایا۔ ''سر جی وہ تو میں ٹائم پاس کرنے کے لیے گانا گا رہا تھا۔''
احسن نے جو سنا تھا، وہ گانے کی طرز پر نہیں تھا۔ مگر وہ یقین سے بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس نے ممتاز کو اوپر جانے کا حکم دیا اور پھر لاک اپ میں آیا۔ جہانگیر بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ احسن نے کہا۔ ''اب تم کسی کو نہیں بلاؤ گے اور نہ ہی شور کرو گے۔''
''میرا کام ہو گیا ہے۔'' وہ بولا۔ ''اب میں کسی کو تنگ نہیں کروں گا۔''
''تمہارے لیے بہتر یہی ہے۔'' احسن نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''کیا کسی اور کو باتھ روم جانا ہے۔ اگر نہیں جانا تو صبح چھ بجے سے پہلے موقع نہیں ملے گا۔''
''مجھے جانا ہے۔'' نازیہ نے کہا۔ وہ جھینپ رہی تھی۔ احسن نے آ کر لاک اپ کھولا۔ وہ اس کے ساتھ باہر آئی۔ احسن باتھ روم کے اندر نہیں گیا تھا، وہ باہر ہی کھڑا رہا۔ اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ نازیہ کچھ دیر بعد باہر آئی اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ احسن نے سر ہلایا۔
''کوئی بات نہیں۔''
وہ چلنے کے بجائے کھڑی رہی پھر ہچکچاتے ہوئے کہا۔
''کیا مجھے سزا ہوگی؟''
احسن نے گہری سانس لی۔ ''تم ایک میچور لڑکی ہو۔ نرسنگ کا کورس کر رہی ہو اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے اس قدم کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں۔''
نازیہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ ''میں سمجھتی تھی کہ ایک عذاب سے نکل گئی ہوں۔ یہاں تو میں دوسرے عذاب میں پھنس گئی ہوں۔''
''اگر تم بے گناہ ہو اور یہ بات میڈیکل ٹیسٹ میں ثابت ہو گئی تو تم چھوٹ جاؤ گی ورنہ .....'' احسن نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
نازیہ کا چہرہ مزید سفید ہو گیا۔ اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ ''خدا گواہ ہے میں پاک دامن ہوں۔''
''تمہارے گھر والے .....؟''
''میرا اس دنیا میں کوئی ہوتا تو میں یوں دربدر کیوں ہوتی؟'' اس نے احسن کی بات کاٹ کر تلخی سے کہا۔ ''دوسروں کے در پر تھی حالانکہ اپنا کما رہی تھی مگر پھر بھی مجھے بوجھ سمجھا جاتا تھا۔''
''اس کے باوجود احمر جیسے لڑکے کے ساتھ بھاگنا سمجھ میں نہیں آتا۔''
نازیہ ذرا دیر کے لیے چپ ہوئی پھر اس نے کہا۔ ''شاید وہ اتنا اچھا نہ ہو مگر مجھ سے محبت کرتا ہے اور میرا سہارا بننا چاہتا ہے۔ ہم کل نکاح کرنے جا رہے تھے۔''
احسن نے اسے غور سے دیکھا۔ ''کل کیوں اس نے پہلے نکاح کیوں نہیں کیا؟''
''ہم شام کو گھر سے نکلے تھے اور یہاں آئے۔ احمر یہاں جاب کرتا ہے۔''
احسن نے جاب کی جگہ پوچھی تو نازیہ نے ایک کمپنی کا نام لیا۔ پھر احسن نے رقم کا پوچھا۔ ''تمہارے پاس پانچ ہزار کے علاوہ بھی کوئی رقم تھی؟''
نازیہ نے سر ہلایا۔ ''میرے چالیس ہزار روپے احمر کے پاس تھے۔''
''اس کے سامان میں کوئی رقم نہیں ملی اور نہ ہی اس کے پاس ہے اور نہ ہی تم لوگوں کو لانے والوں نے اس بارے میں بتایا۔''
''جب پولیس نے چھاپا مارا تو پہلے وہ احمر کو مارتے رہے اور پھر اسے باہر لے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد واپس آئے تو ایسا لگ رہا تھا کہ سب ٹھیک ہو گیا ہے لیکن پھر وہ ہمیں گرفتار کر کے یہاں لے آئے۔''
احسن کو خیال آیا کہ حسین نواز اور اس کے ساتھی نے چالیس ہزار روپے رشوت میں لے لیے تھے اور اس کے بدلے احمر کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مدد کیا کرنی تھی اگر

نازیہ کا دعویٰ درست تھا کہ وہ پاک دامن ہے تو چند دن بعد وہ دونوں ہی رہا ہو جاتے۔ احسن اس سے مزید سوالات کرنا چاہتا تھا مگر اس نے فی الحال اسے واپس لاک اپ تک پہنچانا مناسب سمجھا۔ وہ نازیہ کا سیل بند کر رہا تھا کہ تیمور نے اس سے باتھ روم جانے کو کہا۔ احسن اس کے ساتھ باتھ روم میں آیا۔ جب تیمور فارغ ہو کر باہر آیا تو اس نے احسن سے استدعا کی کہ اس کے گھر والوں کو اطلاع کر دی جائے مگر احسن نے اس کی درخواست مسترد کر دی۔ وہ اسے لاک اپ میں بند کر رہا تھا کہ جابر بولا۔ ''تو نے اچھا نہیں کیا؟''

احسن چونکا۔ ''کیا ...۔ کیا کہا تم نے؟''

''صاحب اس نے اچھا نہیں کیا ہے۔'' جابر نے تیمور کی طرف اشارہ کیا۔ احسن نے دلچسپی سے جابر کو دیکھا۔ اس کا تاثر بدلا ہوا تھا اب وہ نہ تو کانپ رہا تھا اور نہ ہی مسکین لگ رہا تھا مگر یہ اُس جرائم پیشہ جابر سے الگ تھا جس سے احسن کا کئی بار سابقہ پڑ چکا تھا۔ مگر جابر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تیمور کو گھور رہا تھا اور تیمور اس سے نظریں چرا رہا تھا۔ یقیناً کوئی بات تھی۔ احسن سیڑھیوں کی طرف چل پڑا۔ اس نے عقب میں جابر کو کہتے سنا۔ ''ابھی وقت ہے تیرے پاس .... بتا دے ورنہ ....''

☆☆☆

جس وقت احسن تیمور کو واپس لاک اپ میں بند کر رہا تھا، جابر کے ذہن میں اسے دیکھتے ہوئے پھر ویسا ہی جھماکا ہوا۔ اس نے دیکھا تیز بارش ہو رہی ہے اور نارنجی کار آدمی کو ٹکر مارتی چلی گئی۔ آدمی اچھل کر گھنی جھاڑیوں میں جا گرا اور اسی وجہ سے شاید فوری موت سے بچ گیا تھا۔ اگر وہ سخت زمین یا پتھروں پر گرا ہوتا تو اس کا دم وہیں نکل جاتا۔ وہ زندہ تھا مگر شدید زخمی تھا اور اسے طبی مدد کی ضرورت تھی۔ جب منظر ختم ہوا تب جابر نے تیمور کو خبردار کیا۔ احسن نے اس سے پوچھا مگر جابر نے اسے جواب نہیں دیا تھا۔ اس کے اندر کوئی کہہ رہا تھا کہ کسی کا راز اس پر آشکارا کیا گیا ہے اور وہ یہ راز کسی کو بتا نہیں سکتا۔ اس لیے وہ تیمور سے ہی بات کر رہا تھا۔ تیمور سر جھکا کر بینچ پر بیٹھ گیا۔ احمر غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے تم خوف زدہ ہو۔''

''میں خوف زدہ نہیں ہوں۔'' تیمور نے تند لہجے میں کہا مگر فوراً ہی دھیما پڑ گیا۔ ''مجھے اس شخص نے پریشان کر دیا ہے۔''

احمر نے جابر کی طرف دیکھ۔ سیل میں بلب نہیں تھا مگر ان کے درمیان والی راہداری میں ہر دو سیلوں کے درمیان چھت سے لٹکا بلب روشن تھا۔ کل چار بلب تھے اور ان کی روشنی اچھی خاصی تھی۔ احمر نے کہا۔ ''اس میں کیا خاص بات ہے شکل سے ہی چرسی لگ رہا ہے۔''

''میں نہیں جانتا۔''

''میں اس سے پوچھتا ہوں۔'' احمر نے کہا۔

''نہیں ....'' تیمور نے اسے روکنا چاہا مگر احمر سلاخوں کے پاس آ گیا اس نے جابر کو آواز دی۔

''اے چرسی کیا کہہ رہا تھا تو؟''

جابر نے چونک کر اسے دیکھا۔ فوراً ہی اس کے ذہن میں جھماکا ہوا اور اس نے ایک بہت پیاری سی کمسن بچی کو دیکھا۔ اس کی عمر سات آٹھ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے نیلے اور سرخ رنگ کی فراک پہن رکھی تھی۔ بچی رو رہی تھی اور بہت دہشت زدہ تھی۔ وہ جھاڑیوں کے درمیان زمین پر بے بسی سے پڑی تھی۔ پھر احمر نظر آیا جو چہرے پر شیطانی تاثرات لیے بچی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ منظر اچانک ختم ہوا اور جابر بے ساختہ بولا۔ ''مجھ سے بات مت کر تو شیطان ہے۔''

جابر کے لہجے میں ایسی بات تھی کہ احمر چاہنے کے باوجود اس کا مذاق نہیں اُڑا سکا۔ اس نے کہا۔ ''کیوں میں نے کیا کیا ہے؟''

جابر نے نفرت سے کہا۔ ''شیطان بھی تجھ سے اچھا ہے۔ تو نے بدترین کام کیا ہے۔ اب بھی وقت ہے توبہ کر لے ورنہ تیری پکڑ قریب ہے۔''

اس بار احمر کو اس کا مذاق اُڑانے کا موقع ملا۔ ''اب یہ مولوی بن گیا ہے ہمیں قبر کے عذاب سے ڈرائے گا۔''

''ہاں کیونکہ میں اس کی ایک جھلک دیکھ چکا ہوں۔ پہلے مجھے لگا تھا، میں نے خواب دیکھا ہے لیکن اب مجھے یقین ہے میں نے جو دیکھا تھا، وہ سچ ہے۔''

''پوری بھری سگریٹ پی ہو گی۔'' احمر کا لہجہ زیادہ طنزیہ ہو گیا۔ ''تب ہی ایسا خواب دیکھا۔''

''وہ خواب نہیں تھا۔'' جابر کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ''اور جو ابھی دیکھا وہ بھی خواب نہیں تھا۔ نیلی اور سرخ فراک والی معصوم بچی۔''

احمر یوں لڑکھڑا کر پیچھے گیا جیسے کسی نے اسے پوری قوت سے مُکا مارا ہو۔ وہ بینچ پر ڈھیر ہو گیا اور یوں ہانپنے لگا جیسے اچانک ہوا کم ہو گئی ہو اور اسے سانس لینے کے لیے زور لگانا پڑ رہا ہو۔ اب تیمور اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس

نے آہستہ سے پوچھا۔ ”تمہیں کیا ہوا؟“
”اسے کیسے معلوم ہوا؟“
”کیا کیسے معلوم ہوا؟“
احمر چونکا۔ اس نے بے خیالی میں کہا تھا اور اب وہ تیمور کو گھور رہا تھا۔ اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ ”کچھ نہیں، تم اپنے کام سے کام رکھو۔“
تیمور نے منہ بنایا۔ ”تم نے کچھ کہا تو میں سمجھا مجھ سے کہا ہے۔“
احمر اب بھی اسے گھور رہا تھا مگر اب اس کا انداز بدل گیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”جب اس نے تم سے کچھ کہا تھا تو تمہاری حالت بھی بدل گئی تھی ۔۔۔ بھلا کیوں؟“
تیمور نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”جب تم مجھے کچھ نہیں بتا رہے ہو تو مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟“
”میں نہیں بتا سکتا۔“
”میں بھی نہیں بتا سکتا۔“
”کیا تم اسے جانتے ہو؟“
”نہیں۔“ تیمور نے نفی میں سر ہلایا۔
”میں بھی نہیں جانتا مگر یہ بہت پُراسرار شخص ہے۔“
”یہاں پولیس والوں کے انداز سے لگ رہا ہے کہ وہ اسے جانتے ہیں۔ صورت سے بھی یہ جرائم پیشہ لگتا ہے۔“
”ضروری نہیں ہے کہ آدمی صورت سے جرائم پیشہ لگے تو ۔۔۔۔“ احمر نے سوچتے ہوئے کہا۔
برابر والے سیل میں جہانگیر سلاخوں سے لگا ہوا ان کی گفتگو سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے بھی محسوس کیا تھا کہ سامنے قید شخص میں کوئی بات ہے۔ وہ اسی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ ہر دو سیل کے درمیان اینٹوں سے بنی چھ انچ چوڑی دیوار تھی۔ اسی وجہ سے آواز صاف سنائی نہیں دے رہی تھی بہرحال جہانگیر نے جو سنا تھا، اسے لگا جیسے سامنے والا ان کے کچھ رازوں سے واقف ہو گیا ہے اور وہ انہیں انہی رازوں کے حوالے سے کہہ رہا تھا۔ سوال یہ تھا کہ وہ ان کے ان رازوں کے بارے میں کیسے جانتا تھا؟ جہانگیر نے سلاخوں کے ساتھ کھڑے جابر کو دیکھا۔ وہ ساکت تھا اور اس کی نظریں خلا میں گھور رہی تھیں۔ وہ جب سے آیا تھا اسی طرح کھڑا تھا۔
اس نے اس دوران میں جتنی بھی گفتگو کی تھی، وہ عجیب تھی جیسے اس کا دعویٰ تھا کہ وہ قبر کے عذاب کی جھلک دیکھ کر آیا تھا اور اب ان دونوں کو اس سے ڈرا رہا تھا۔ جہانگیر کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ وقت گزاری کے لیے نوٹ لے رہا ہے ورنہ اسے اس معاملے سے خاص دلچسپی نہیں تھی۔ جب سے وہ سپاہی کے ساتھ باتھ روم سے ہو کر آیا تھا اس کا انداز بدل گیا تھا۔ اب وہ وقفے وقفے سے اپنی کلائی پر بندھی بیش قیمت گھڑی دیکھ رہا تھا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ کبھی وہ ٹہلنے لگتا اور کبھی بینچ پر بیٹھ جاتا۔ اس کے چہرے پر تھکن کے بجائے بے چینی اور فکر کے آثار تھے۔ اس نے زیرِلب کہا۔ ”کہاں رہ گئے یہ لوگ اب تک آ جانا چاہیے تھا۔“

☆☆☆

سپاہی ممتاز ہال میں ایک طرف بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ شرافت تھا۔ حوالدار رحیم خان سونے کے لیے دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔ نائٹ شفٹ والے اگر کوئی مسئلہ نہ ہوتا تو باری باری کچھ دیر کے لیے سو جاتے تھے۔ مگر ایک وقت میں ایک ہی فرد کو سونے کی اجازت تھی۔ جب احسن نائٹ شفٹ کا انچارج ہوتا تو جاگتا رہتا تھا۔ ہاں کبھی دن میں موقع نہ ملا ہو یا تھکن ہو تو کچھ دیر کے لیے لیٹ جاتا تھا۔ ویسے یہاں آبادی کم تھی اور علاقہ بھی پوش تھا۔ لوگوں نے اپنی سیکورٹی رکھی ہوئی تھی اس لیے پولیس کو کم ہی کسی گڑبڑ کی صورت میں زحمت دی جاتی تھی۔ تھانہ تو بالکل ہی ویران جگہ تھا۔ یہ جس ذیلی سڑک پر تھا وہ ہائی وے سے دو سو گز اندر تھی اور اس کے عقب میں جھاڑیاں اور سامنے کھیل کا بڑا سا میدان تھا جہاں مغرب تک رونق ہوتی تھی اور اس کے بعد یہاں ویرانی چھا جاتی تھی۔ ممتاز ساکت بیٹھا ہوا تھا اور کبھی کبھی غیر محسوس انداز میں سامنے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈال لیتا تھا۔ شرافت اونگھ رہا تھا، اسے اپنے ساتھی کی بے چینی کا علم نہیں تھا۔ اچانک ممتاز اٹھا اور اس نے شرافت سے کہا۔
”یار میں سگریٹ لگا کر آتا ہوں۔“
”یہیں پی لے۔“ شرافت نے کہا۔ ”باہر تو ٹھنڈ ہو گی۔“
”نہیں یار صاحب کو بُو گئی تو شامت آ جائے گی۔“
احسن نے تھانے کی عمارت کے اندر سگریٹ نوشی پر پابندی لگائی ہوئی تھی۔ ورنہ یہاں جگہ جگہ ٹوٹے اور راکھ کے ڈھیر نظر آتے تھے۔ ممتاز باہر آیا۔ داخلی دروازے کے سامنے چھوٹا سا برآمدہ تھا اس نے وہیں کھڑے ہو کر سگریٹ سلگایا اور کش لینے لگا۔ دوسرا سگریٹ پینے کے دوران میں اس نے گیٹ کے باہر روشنی نمودار ہوتے دیکھی اور سگریٹ پھینک کر پہلے اس نے اندر جھانک کر دیکھا، شرافت بدستور کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کا سر آگے جھول رہا تھا۔ ممتاز

واپس آیا اور اس نے برآمدے سے نیچے قدم رکھا فوراً ہی اوپر سے برستے پانی نے اسے شرابور کر دیا۔ بارش تیز ہو گئی تھی مگر وہ بدمزہ نہیں ہوا بلکہ بارش اس کے لیے بہتر تھی۔ اسے امید تھی کہ مین گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھولنے کی آواز اندر تک نہیں جائے گی۔ چھوٹا دروازہ اندر سے صرف کنڈی سے بند تھا۔ مگر کم کھلنے کی وجہ سے اس کے قبضوں میں زنگ آ گیا تھا اور یہ کھلتے وقت بہت شور مچاتے تھے۔ مگر بارش نے قبضوں کو بھی رواں کر دیا تھا۔ چھوٹا دروازہ بنا کسی شور کے اور آسانی سے کھل گیا۔ سامنے ہی ایک چھوٹی گاڑی کھڑی تھی اور اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ہی آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ ممتاز تیز قدموں سے اس کی طرف بڑھا۔ ڈرائیور سگریٹ نوشی کر رہا تھا۔ اس نے ممتاز کو دیکھ کر شیشہ نیچے کیا اور بولا۔

''تم ممتاز ہو؟''

''جی جناب۔'' وہ بولا۔

''ہمارا بندہ کیسا ہے؟''

''ٹھیک ہے جی پر اسے ڈی ایس پی صاحب نے اندر رکھا ہے وہی چھوڑ سکتے ہیں۔''

''وہ ہم دیکھ لیں گے ابھی تو تمہارے شکر گزار ہیں کہ تم نے ہماری اس سے بات کرادی۔''

ممتاز نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''وہ جی انہوں نے کہا تھا کہ مجھے دس ہزار ملیں گے۔''

''اوہ، کیوں نہیں۔'' ڈرائیور نے کہا اور اپنے کوٹ میں ہاتھ ڈالا۔ ''میں ساتھ لایا ہوں۔''

مگر جب اس نے ہاتھ نکالا تو اس میں لمبی نال والا پستول دبا ہوا تھا۔ اس کی نال اس لیے لمبی لگ رہی تھی کہ اس پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا۔ ممتاز کی آنکھیں پستول دیکھ کر پھیل گئیں اور اس نے بھاگنے کی کوشش کی مگر اسے دو کے بعد تیسرا قدم اٹھانا نصیب نہیں ہوا۔ ڈرائیور نے عقب سے اس کی پشت میں عین دل کے مقام پر گولی اتار دی۔ وہ منہ کے بل گرا اور جب تک ڈرائیور نیچے آیا وہ ہاتھ پاؤں مار کر دم توڑ چکا تھا۔ گولی نے دل کو چھید دیا تھا۔ سائلنسر کی وجہ سے معمولی سی آواز آئی جو بارش کے شور میں بالکل ہی دب گئی تھی۔ ڈرائیور نے ہلکی سی سیٹی بجائی اور فوراً ہی تھانے کی دیوار کے ساتھ چھپے دو افراد وہاں سے نکل آئے۔ انہوں نے پھرتی سے ممتاز کی لاش اٹھائی اور اسے تھانے کے ساتھ والے پلاٹ میں اگی جھاڑیوں میں ڈال آئے۔ اس دوران میں ڈرائیور نے ڈکی کھولی تھی۔ اس نے اندر سے ایک شاٹ گن اور ایک سیمی آٹومیٹک رائفل نکالی۔ اس کے ساتھی واپس آئے تو اس نے ہتھیار ان کے حوالے کیے اور بولا۔

''یاد رکھنا یہ ہتھیار انتہائی ناگزیر صورت میں استعمال کرنے ہیں۔ ورنہ دھماکوں سے دوسرے متوجہ ہو سکتے ہیں۔ کام خاموشی اور صفائی سے کرنا ہے اس کے لیے ہمارے پاس سائلنسر لگے پستول ہیں۔''

ڈرائیور کے دونوں ساتھیوں نے سر ہلایا۔ وہ نوجوان تھے اور صورت سے نچلے طبقے کے جرائم پیشہ لگ رہے تھے جن کی جان کی قیمت خاص نہیں ہوتی ہے۔ البتہ ڈرائیور جو تقریباً چالیس برس کا تھا۔ وہ چوڑے چہرے والا اور صورت سے ہوشیار نظر آتا تھا۔ اس کی ناک باکسروں کی طرح پھیلی ہوئی تھی اور اس کے شانے اور بازو بھی باکسرز کی طرح مضبوط تھے۔ وہ انداز سے ہی ان کا باس لگ رہا تھا۔ اس مختصر گفتگو کے بعد ان تینوں نے اپنے چہروں پر ٹوپی والے نقاب کھینچ کر چڑھائے اور اندر کی طرف بڑھے۔ چھوٹا گیٹ کھلا تھا۔ اندر آ کر ڈرائیور نے اس کی کنڈی چڑھا دی۔ اب باہر سے کوئی اندر نہیں آ سکتا تھا۔ تھانے کے احاطے کی دیوار دس فٹ اونچی تھی اور اس پر تین فٹ تک خاردار باڑ لگی تھی۔ سامنے کی طرف ایک واچ ٹاور بھی تھا مگر یہ خالی ہی پڑا رہتا تھا۔ احاطہ روشن تھا۔ تھانے کی عمارت کے چاروں طرف چھت کے ساتھ تیز روشنی والی لائٹس لگی تھیں مگر وہ بے خوف ہو کر آگے بڑھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اب اندر صرف تین پولیس والے ہیں اور ان سے نمٹنا اتنا مشکل ثابت نہیں ہوگا۔

☆☆☆

احسن نے ٹی وی بند کر دیا تھا۔ وہ بور ہو رہا تھا۔ ہلکی سی غنودگی چھا رہی تھی مگر وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ اسے چائے کی طلب ہو رہی تھی، پہلی بار میں طلب پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس نے گھنٹی بجائی تو شرافت اندر آیا۔ اس نے سیلوٹ کیا۔

''جناب عالی حکم؟''

''ممتاز کہاں ہے؟''

''وہ جی باہر سوٹا لگانے گیا ہے۔ آپ مجھے حکم کریں جناب عالی۔''

شرافت بھی چائے بنا لیتا تھا مگر ممتاز بہت اچھی چائے بناتا تھا اور اس وقت احسن اس کے ہاتھ کی چائے پینا چاہتا تھا۔ ''یار ممتاز کو بلاؤ اُسے چائے کا کہہ دو۔''

''جو حکم جناب عالی۔'' شرافت بولا اور باہر آیا۔ اسی

لمحے دروازہ کھلا اور اس نے تین نقاب پوشوں کو اندر آتے دیکھا۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی اس نے چلّانے کے لیے منہ کھولا تھا کہ آگے آنے والے نقاب پوش نے اس کے کھلے منہ میں گولی ماری۔ شرافت پلٹ کر ایک چھوٹے ریک سے ٹکرایا اور اسے لیتا ہوا نیچے گرا۔ ریک گرنے سے خاصا شور ہوا تھا اور اس سے پہلے احسن نے ایک ہلکی سی پٹاخے نما آواز سنی تھی۔ اس کی چھٹی حس نے شور مچایا اور وہ اپنے ہولسٹر سے پستول نکالتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا مگر اس نے اسے براہِ راست کھولنے کے بجائے کنارے ہو کر دروازہ کھولا اور فوراً ہی باہر سے کئی بے آواز گولیاں آ کر دروازے کے پار ہو گئیں۔ احسن دیوار کی اوٹ میں ہونے کی وجہ سے بچا تھا۔ جیسے ہی فائرنگ رکی، اس نے ہاتھ باہر نکالا اور اندازے سے اس سمت فائر کیا جہاں سے گولیاں آئی تھیں۔

دو گولیاں چلا کر اس نے ہاتھ اندر کھینچ لیا۔ اس بار خاصا شور ہوا تھا کیونکہ اس کے پستول پر سائلنسر نہیں تھا۔ فوراً ہی جواب آیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ زیادہ تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ زیادہ ہتھیار استعمال ہوئے ہوں۔ مگر اس بار بھی تمام ہی فائرنگ بے آواز تھی۔ احسن پھر آڑ میں ہونے کی وجہ سے محفوظ رہا تھا۔ البتہ گولیوں کی بوچھاڑ نے اس کی میز پر رکھا کمپیوٹر ایل سی ڈی تباہ کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے فون سیٹ کے پرخچے بھی اڑا دیے تھے۔ فائرنگ کرنے والے نزدیک آ رہے تھے۔ اگر وہ کمرے میں آ جاتے تو دیوار کی آڑ... بھی اسے بچا نہیں سکتی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر رحیم خان کو آوازیں دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے جواب دیا۔

''انہوں نے شرافت کو مار دیا ہے۔''

''ہتھیار نکالو۔'' احسن نے اپنے پستول میں دوسرا میگزین لگاتے ہوئے کہا۔ اسے ممتاز کا خیال آیا۔ یقیناً اسے بھی اندر گھسنے والوں نے مار دیا ہوگا۔ ملک کے خراب حالات کے تناظر میں اس کا شبہ دہشت گردوں کی طرف گیا تھا جو آئے دن ملک کے پولیس اسٹیشنوں اور سیکورٹی فورس کی چوکیوں پر حملے کرتے تھے۔ مگر دہشت گرد سائلنسر لگے ہتھیار استعمال نہیں کرتے ہیں۔ وہ زیادہ پُرشور ہتھیار استعمال کرتے ہیں جیسے دستی بم اور خودکش جیکٹ وغیرہ۔ تھانے کے تمام بڑے ہتھیاروں والی الماری اسی کمرے میں تھی جہاں رحیم خان موجود تھا۔ احسن نے چاروں طرف دیکھا۔ ایس ایچ او کے کمرے سے نکلنے والا ایک ہی دروازہ تھا۔ مگر برابر والے کمرے میں کھلنے والا ایک بڑا روشن دان چھت سے ذرا نیچے موجود تھا۔ احسن نے پہلے ہاتھ باہر نکال کر چند فائر کیے اور پھر روشن دان کے نیچے رکھی الماری پر چڑھ گیا۔ اس نے جھانک کر رحیم خان کو دھیمی آواز میں پکارا۔ رحیم خان میز کے پیچھے دبکا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں موجود شاٹ گن کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ پہلے تو وہ چونکا اور آس پاس دیکھا۔ احسن نے دوبارہ آواز دی تو اس نے اوپر دیکھا اور لپک کر میز پر چڑھ گیا۔

''سر۔'' اس نے گھبرائے لہجے میں کہا۔ ''یہ کون لوگ ہیں۔ میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ بے چارے شرافت کو بھی مار دیا ہے، اس کا بھیجا باہر نکال دیا۔''

''پتا نہیں کون ہیں۔ تم میز اس طرف کرو اور دروازے پر بھی دھیان دو۔''

رحیم خان نے میز کھینچ کر روشن دان کے نیچے کی اور شاٹ گن کا رخ دروازے کی طرف کر کے کھڑا ہو گیا۔ احسن سر کے بل گیا اور اگر نیچے ہاتھ ٹیکنے کے لیے میز نہ ہوتی تو وہ سر کے بل جاتا۔ جب وہ روشن دان میں گھس چکا تھا تو اسے یاد آیا کہ اس کا موبائل میز پر ہی رہ گیا ہے۔ مگر اب وقت نہیں تھا کہ وہ واپس جاتا۔ حملہ آور کسی وقت بھی اندر آسکتے تھے اور اس سچویشن میں وہ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ حملہ آور اس وقت اندر گھسے جب اس کے پاؤں روشن دان سے نکل رہے تھے۔ کسی نے فائر کیا اور گولی احسن کی پتلون کے پائنچے میں سوراخ کرتی نکل گئی۔ دوسرے لمحے اس کے پاؤں روشن دان میں غائب ہو چکے تھے۔ وہ ہاتھ کے بل گرا اور پھر اس کا جسم گھوم کر نیچے فرش پر جا گرا۔ اچھی خاصی چوٹ آئی تھی۔ وہ کراہ کر اٹھا اور سب سے پہلے پستول نکالا۔ اس نے پستول کا رخ روشن دان کی طرف کیا اور جیسے ہی ایک پستول کی نال نمودار ہوئی اس نے فائر کیا۔ دوسری طرف سے کوئی چلّایا اور نال غائب ہو گئی۔

اسلحے والی الماری میں ایک عدد شاٹ گن اور ایک سیمی آٹو میٹک رائفل تھی۔ ایک شاٹ گن رحیم خان کے پاس تھی۔ احسن نے بھی شاٹ گن نکالی۔ اس کا بلٹ رائفل کے مقابلے میں زیادہ خطرناک تھا۔ اب ان کے پاس بھاری ہتھیار تھے۔ الماری میں تین عدد بلٹ پروف جیکٹس بھی تھیں۔ اگرچہ ان کی کارکردگی مشکوک تھی کیونکہ ان کی خریداری میں کمیشن لیا گیا تھا اور معاملہ ابھی عدالت میں تھا۔ البتہ جیکٹیں پولیس کو دے دی گئی تھیں۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہوتا ہے۔ اس لیے انہوں نے یہ بلٹ

پروف جیکٹس پہنی ہیں۔ رحیم خان نے ممتاز کا پوچھا مگر احسن اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ حملہ آور کتنے تھے اور ان کے پاس کون سا اسلحہ تھا۔ رحیم خان نے تین افراد کی جھلک دیکھی تھی جو نقاب پوش تھے اور ان کے پاس پستولوں کے علاوہ بڑا اسلحہ بھی نظر آ رہا تھا۔ البتہ اس نے کسی کے پاس دھماکا خیز چیز یا بارودی جیکٹ نہیں دیکھی تھی۔ احسن نے یہ سن کر اطمینان کا سانس لیا۔ ورنہ ان کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اسے مدد طلب کرنے کا خیال آیا اور اس نے رحیم خان سے اس کا موبائل مانگا۔ اس کا چہرہ ستّ گیا اور اس نے مرے لہجے میں بتایا۔

''وہ تو ہر میری میز کی دراز میں لاک ہے۔''

''میرے خدا۔'' احسن کراہا۔ ''یعنی ہم کسی سے مدد بھی طلب نہیں کر سکتے ہیں؟''

''اتنے فائر ہوئے ہیں، ہوسکتا ہے کسی نے باہر آواز سنی ہو۔'' رحیم خان نے پُرامید لہجے میں کہا۔

☆☆☆

نازیہ اور احمر دیوار کے ساتھ سر جوڑے آپس میں محو گفتگو تھے۔ نازیہ کہہ رہی تھی۔ ''اس آدمی نے کیا کہا ہے۔ سرخ اور نیلے فراک والی لڑکی سے کیا مراد تھی؟''

''میں نہیں جانتا۔'' احمر نے جواب دیا تو نازیہ نے اس کے لہجے میں کھوکھلا پن محسوس کیا۔ ''یہ پاگل ہے۔ جب سے آیا ہے دیوانوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔''

''مجھے تو یہ پاگل نہیں لگتا۔'' نازیہ بولی اور اسی لمحے اوپر سے فائرنگ کی آواز آئی اور وہ سب پریشان ہوکر سلاخوں کے ساتھ آ کھڑے ہوئے تھے۔ باقی سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ صرف دو افراد خاموش کھڑے تھے۔ ایک جہانگیر اور دوسرا جابر جو اب اسے گھور رہا تھا۔ اچانک جابر کے دماغ میں جھماکا ہوا اور اس نے دیکھا کہ ایک عام سا شخص گڑگڑا رہا ہے کہ اس نے غلطی سے دیکھ اور سن لیا تھا اسے معاف کر دیا جائے مگر جہانگیر کے چہرے پر سخت تاثرات تھے۔ اس کے رخسار کے تازہ زخم سے خون رس رہا تھا اور ہاتھ میں چھوٹی نال والا ریوالور تھا۔ اس نے ریوالور آدمی کی طرف کیا اور گولی چلا دی۔ گولی اس کے سر میں لگی اور وہ نیچے گر کر ساکت ہوگیا۔ منظر یہاں تک پہنچ کر ختم ہوگیا۔ اب جابر، جہانگیر کو گھور رہا تھا۔ جس کے ہونٹوں پر پُراسرار سی مسکراہٹ تھی اور وہ اوپر ہونے والی فائرنگ سے ذرا بھی پریشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

''تم نے اسے جان بوجھ کر مارا ہے۔'' جابر نے کہا تو جہانگیر نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ ماند پڑ گئی۔

''کیا کہہ رہے ہو؟''

''گولی غلطی سے نہیں چلی تھی، تم نے اسے جان بوجھ کر مارا ہے۔ اس نے کچھ سن اور دیکھ لیا تھا۔''

جہانگیر کی پیشانی پر شکنیں آگئیں اور اس نے اوپر کی آوازیں سننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''پتا نہیں تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ مگر تم زیادہ دیر بکواس نہیں کر سکو گے۔''

جابر اب تک دوسروں کے بارے میں غیر متوقع طور پر جان رہا تھا مگر موجودہ صورت حال میں اسے غیبی مدد کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اس نے جہانگیر کی صورت سے تاڑ لیا۔ ''یہ تمہارے آدمی ہیں۔ تم نے سپاہی کی مدد سے کال کر کے انہیں بلایا ہے۔''

اس بار جہانگیر کا چہرہ بالکل بدل گیا۔ اس نے بھیڑیے کی طرح دانت نکالے اور غرا کر بولا۔ ''بہت بھونک رہے ہو، سب سے پہلے تمہارا منہ بند کروں گا۔''

احمر، تیمور اور نازیہ ان کی گفتگو سن رہے تھے۔ احمر بے چین ہوکر سلاخوں کے پاس آگیا اور اس نے جہانگیر سے کہا۔ ''یہ سچ مچ تمہارے آدمی ہیں؟''

مگر جہانگیر نے اقرار نہیں کیا۔ اس نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا کہ اوپر کون ہیں۔''

احمر نے پھر پوچھا۔ ''تم سپاہی کے ساتھ گئے تھے، کیا تم نے کال نہیں کی تھی؟''

''میں نے کوئی کال نہیں کی۔'' جہانگیر نے کہا۔ اوپر خاموشی چھانے سے وہ کسی قدر فکرمند نظر آ رہا تھا۔ اچانک فائرنگ دوبارہ شروع ہوگئی اور اس بار اس میں کسی خودکار ہتھیار کی آمیزش بھی تھی۔ جہانگیر کے ہونٹوں سے غائب ہونے والی مسکراہٹ پھر لوٹ آئی تھی۔

☆☆☆

احسن نے رحیم خان سے کہا۔ ''ہمیں باہر جانا ہوگا۔''

''کیسے؟ وہ باہر موجود ہیں اور ہمیں دیکھتے ہی مار دیں گے۔''

''وہ یہاں بھی مار دیں گے اور ہمارے پاس بھی ہتھیار ہیں۔'' احسن نے کہا۔ ''ہم دونوں بیک وقت نکلیں گے تو وہ آسانی سے ہمیں نہیں مار سکیں گے۔ یہاں تو انہوں نے ایک دستی بم پھینک دیا تو ہم بغیر لڑے ہی مارے جائیں گے۔''

رحیم خان کا چہرہ فق ہوگیا۔ ویسے وہ بزدل نہیں تھا مگر

اس سے پہلے اتنی خراب صورت حال سے واسطہ بھی نہیں پڑا تھا۔ تب جابر کی بات یاد آئی کہ آج اس کا یوم حساب ہے۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ تھانہ یقیناً ان لوگوں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ موسم اچھا نہیں تھا اور بارش کی وجہ سے یہاں ہونے والی فائرنگ کا شور شاید دور تک بھی نہیں گیا ہوگا۔ رات کے وقت یہ سارا علاقہ سنسان ہو جاتا تھا۔ حسین نواز اور دوسری پارٹی کے آنے کا اب کوئی امکان نہیں تھا۔ اگر وہ آ بھی جاتے تو بے خبری میں مارے جاتے۔ رحیم خان نے سوال کیا۔ ''یہ یہاں کیوں آئے ہیں۔''

احسن کا دھیان پہلی بار نیچے لاک اپ میں موجود قیدیوں کی طرف گیا۔ جابر خان مجرم تھا۔ ایک زمانے میں اس کا بہت بڑا گروہ تھا اگر وہی حالات ہوتے تو وہ سوچ سکتا تھا کہ اس کے ساتھیوں نے حملہ کیا ہے مگر موجودہ حالات میں اس کے لیے کوئی ایسی زحمت نہیں کر سکتا تھا۔ باقی تین افراد عام سے تھے۔ یعنی تیمور، احمر اور نازیہ۔ صرف جہانگیر بچتا تھا۔ اگرچہ احسن اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا مگر نہ جانے کیوں وہ اسے بہت خطرناک محسوس ہوا تھا۔ احسن نے رحیم خان کے سوال کا جواب دیا۔ ''شاید نیچے موجود کسی قیدی کے لیے۔''

''قیدی چھڑانا کون سا مشکل کام ہے۔'' رحیم خان طنزیہ انداز میں بولا۔ ''اپنا صاحب اِدھر کس لیے بیٹھا ہے۔ سودا کرو اور بندہ لے جاؤ۔ اتنا مارا ماری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔؟''

رحیم خان، احسن کے بعد دوسرا ... فرد تھا جو صرف تنخواہ میں گزارا کرتا تھا۔ رشوت سے پرہیز کرتا تھا مگر سرِعام اس کی برائی سے بھی گریز کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ احسن کے زیادہ نزدیک تھا۔ جب دونوں اکیلے ہوتے تو دل کی بھڑاس نکال لیتے تھے۔ احسن نے سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ پتا نہیں کیا معاملہ ہے۔ بعض اوقات ماہی گیر کے جال میں وہیل مچھلی بھی آ جاتی ہے۔'' احسن نے کہا اور دیوار کے ساتھ آیا۔ اس کے اشارے پر رحیم خان دروازے کے دوسری طرف آ گیا۔ مگر وہ باہر نکلتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ احسن نے محسوس کیا کہ دو افراد زیادہ بہتر نشانے پر آ سکتے تھے اس لیے بہتر یہی تھا کہ ایک باہر جائے اس نے رحیم خان سے آہستہ سے کہا۔ ''میں باہر جاؤں گا لیکن پہلے ہم دونوں ایک ساتھ فائر کریں گے۔ اس کے بعد میں باہر جاؤں گا اور تم مجھے کور دو گے۔''

''آپ کس طرف جائیں گے؟'' رحیم خان نے دریافت کیا۔ ''اور پھر میں کیا کروں؟''

''میں سیڑھیوں کی طرف جاؤں گا اور ان کی آڑ لے کر پھر تمہیں کور دوں گا۔''

''ہم نیچے جائیں گے۔'' رحیم خان پریشان ہو گیا۔ ''اس طرح تو ہم پھنس جائیں گے۔''

''نہیں، نیچے ہم محفوظ ہوں گے۔ ایک بار ہم نے فولادی دروازہ پار کر لیا تو یہ اندر نہیں آسکیں گے۔''

رحیم خان نے سر ہلایا تو احسن نے ایک دو تین کہا اور انہوں نے بیک وقت بند دروازے کے پیچھے سے ہی شاٹ گن کے کئی فائر کیے۔ بند کمرے میں دھاکوں سے کان کے پردے پھٹنے لگے تھے اور اندر دھواں ہی دھواں بھر گیا۔ مگر ردِعمل میں باہر سے کوئی چیخ کی آواز یا گولی نہیں آئی تھی۔ احسن نے دروازہ کھولا اور زمین پر گرتے ہوئے باہر آیا۔ فوراً ہی اس پر فائرنگ کی گئی۔ یہ کسی آٹومیٹک گن کی تھی۔ جو تین تین گولیوں کا برسٹ مارتی ہے۔ احسن بال بال بچا تھا۔ ایک گولی اس کے سر کے پاس زمین پر لگی تھی۔ اس نے فرش پر رول کیا اور سیڑھیوں کے پاس چلا گیا مگر اٹھنے کے بجائے اس نے قلابازی کھائی اور پیروں کے بل سیڑھیوں

قلابازی

ثقلِ سماعت میں مبتلا مریض ڈاکٹر کے پاس گیا۔ دیکھ بھال مکمل ہو جانے کے بعد مریض نے پوچھا۔ ''ڈاکٹر صاحب! میرے علاج پر کتنا خرچ آئے گا؟''

''دو ہزار۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''نو ہزار؟'' مریض نے تصدیق چاہی۔

ڈاکٹر چونک کر سیدھا ہو گیا اور رکھائی سے بولا۔

''میں نے کہا ہے پندرہ ہزار۔''

ترتیب

کال کوٹھری میں نیا قیدی آیا تو وہاں موجود اکلوتے قیدی نے لیٹے لیٹے اس کا استقبال کیا۔ ''کیسے آنا ہوا؟''

''ذرا دس پندرہ قتل ہو گئے تھے اپنے ہاتھوں۔''

''کتنے دنوں کے لیے آئے ہو؟''

''ستر سال کی سزا ہوئی ہے۔''

''پھر میں اسی کونے میں ٹھیک ہوں۔'' پرانے قیدی نے کہا۔ ''تم دروازے کے پاس بستر لگا لو کیونکہ تم پہلے رہا ہو جاؤ گے۔ میری رہائی میں ابھی نوّے سال باقی ہیں۔''

ملک اختر، سیالکوٹ

پر تیزی سے گھوما۔ اس بار اس کے پاؤں ٹک گئے اور وہ مزید نیچے جانے سے رک گیا۔ ورنہ وہ اگر آخری سیڑھی تک جاتا تو پتا نہیں اس کا کیا حشر ہوتا۔ احسن نے پوزیشن سنبھالی اور چلا کر کہا۔

''آجاؤ۔''

اس نے کہتے ہوئے شاٹ گن کا رخ اوپر کیا اور ہال کی طرف ایک فائر کیا۔ وہ رحیم خان کو کور دے رہا تھا۔ اس کی آواز پر رحیم خان ہچکچاتے ہوئے نکلا اور زمین پر گرنے کے بجائے اس نے کھڑے ہو کر آنے کو ترجیح دی اور اس کا خمیازہ بھی بھگتا تھا۔ عقب سے چلنے والی دو گولیاں اس کے پیروں میں اتر گئیں اور وہ چیختا ہوا سیڑھیوں کے سامنے آ کر گرا تھا۔ احسن نے بروقت اسے نیچے کھینچ لیا ورنہ اگلی بوچھاڑ اسے چھلنی کر دیتی۔ رحیم خان منہ کے بل سیڑھیوں سے نیچے جا رہا تھا۔ اس کے پیروں سے بہتا خون سیڑھیوں پر گر کر ان کو چکنا کر رہا تھا اور اگر احسن نے جیکٹ سے پکڑ کر رحیم خان کو نہ روکا ہوتا تو وہ ایسے ہی نیچے جاتا۔ احسن ..... نے حملہ آوروں کو پیچھے رکھنے کے لیے مزید دو فائر کیے۔ اس دوران میں رحیم خان اسے کچھ کہہ رہا تھا۔ پہلے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ فائرنگ کا شور مسلسل گونج رہا تھا۔ اس میں وقفہ آیا تو احسن کی سمجھ میں آیا۔ رحیم خان کہہ رہا تھا۔

''مجھے چھوڑ دو میں ایسے ہی نیچے جاؤں گا۔''

اگرچہ ایسے نیچے جانے میں رحیم خان کو بہت رگڑیں اور چوٹیں برداشت کرنا پڑتیں۔ مگر اس کے سوا اور کوئی طریقہ بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ احسن نے اسے چھوڑ دیا اور وہ پیٹ کے بل سیڑھیوں پر پھسلتا ہوا نیچے جانے لگا۔ اس کی زخمی ٹانگیں کونوں سے ٹکرا رہی تھیں اور اس کے حلق سے چیخیں ابل رہی تھیں۔ احسن شاٹ گن کا رخ اوپر کیے ہوئے نیچے جا رہا تھا۔ پھر ایک حملہ آور کی جھلک دیکھتے ہی اس نے فائر کیا مگر وہ سامنے نہیں آیا اس لیے بچ گیا۔ نیچے آتے ہی اس نے رحیم خان کو سہارا دے کر اٹھایا اور فولادی دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے پاس آ کر اس نے بیلٹ سے بندھا چابیوں کا گچھا نکالا اور اس میں سے دروازے والی چابی چننے لگا۔ رحیم خان دیوار سے ٹکا کراہ رہا تھا اگر اسے احسن کا سہارا نہ ہوتا تو وہ اب تک گر چکا ہوتا۔

احسن نے بہ مشکل چابی تلاش کر کے تالے میں لگائی اور جیسے ہی دروازہ کھولا سیڑھیوں کی طرف آہٹ ہوئی۔ احسن نے تیزی سے رحیم خان کو اندر کھینچا اور دروازہ بھی کھینچ کر بند کر لیا۔ سیڑھیوں کی طرف سے چلائی گولیاں دروازے سے ٹکرائی تھیں۔ اس کے بعد گولیاں چلانے والا نکل آیا۔ یہ ڈرائیور کا ایک نوجوان ساتھی تھا جو احتیاط بالائے طاق رکھ کر بہت تیزی سے آیا تھا۔ مگر دروازہ اس کی آمد سے پہلے خودکار انداز میں لاک ہو چکا تھا۔ اس نے سنبھل کر دروازے کے اوپری حصے میں چھوٹی سی کھڑکی کا فولادی تختہ کھسکایا۔ مگر غیر متوقع طور اپنے چہرے کے عین سامنے شاٹ گن کی نال پائی۔ نال کے عقب میں احسن تھا۔ اس نے کہا۔ ''جہنم میں جاؤ۔''

نقاب پوش نے نال کے سامنے سے ہٹنے کی کوشش کی مگر اس سے نکلنے والا شعلہ اس سے کہیں تیز تھا۔ اس کا سر تقریباً غائب ہو گیا تھا اور اس کی سر بریدہ لاش نیچے گری تھی۔ رحیم خان دیوار کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور اس کے زخموں سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اسے چھوڑ کر احسن بائیں طرف کے پہلے سیل تک آیا اور اس کا لاک کھولا۔ پھر رحیم خان کو سہارا دے کر اندر لایا اور بینچ پر لٹا دیا۔ وہ کراہ رہا تھا اور خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ احسن نے اس کے زخم دیکھے۔

ایک گولی دائیں پنڈلی میں لگی تھی اور پار نکل گئی تھی۔ اس کی ہڈی محفوظ تھی مگر دوسری گولی جو بائیں پاؤں میں ٹخنے پر لگی تھی اور اس نے ٹخنہ توڑ دیا تھا۔ احسن نے بلٹ پروف جیکٹ کے نیچے موجود اپنی شرٹ اتاری اور اسے پھاڑ کر پٹیاں بناتے ہوئے انہیں رحیم خان کے زخموں پر باندھ دیا۔ وہ کراہا اور اس کی تکلیف بڑھ گئی تھی مگر خون روکنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ اس دوران میں دوسرے اس سے بار بار پوچھ رہے تھے کہ اوپر کیا ہوا ہے اور فائرنگ کرنے والے کون ہیں۔ احسن ان سنی کر کے اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ صرف دو افراد خاموش تھے۔ ایک جہانگیر جس کا چہرہ احسن اور زخمی رحیم خان کو دیکھ کر تشویش زدہ ہو گیا تھا اور دوسرا جابر تھا۔ رحیم خان کی پٹی سے فارغ ہو کر احسن نے اسلحے کا جائزہ لیا۔

اس کے پاس پستول کا ایک میگزین اور پستول میں لگے میگزین میں سات گولیاں تھیں۔ بلٹ پروف جیکٹ کے بلٹ رکھنے والے کھانچوں میں شاٹ گن کے دو درجن بلٹ تھے اور آخری فائر کے بعد شاٹ گن خالی ہو گئی۔ رحیم خان نے زخمی ہونے کے باوجود اپنی شاٹ گن نہیں چھوڑی تھی اور اس کے پاس بھی دو درجن بلٹ تھے۔ چار بلٹ اس کی شاٹ گن میں بھی تھے۔ اسلحہ کافی تھا۔ احسن مطمئن

ہو کر باہر آیا اور اس نے اعلان کرنے کے انداز میں کہا۔ ''اوپر کچھ افراد نے حملہ کیا ہے اور انہوں نے میرے دو آدمیوں کو مار دیا ہے۔ انہوں نے ہمیں بھی مارنے کی کوشش کی مگر ہم بچ کر نیچے آگئے اور جب تک مدد نہیں آجاتی ہمیں یہیں رہنا ہوگا۔''

''وہ کتنے ہیں؟'' تیمور نے پوچھا، وہ خوفزدہ لگ رہا تھا۔ ''اگر وہ یہاں آگئے تو...؟''

''پتا نہیں کتنے ہیں لیکن کم سے کم ایک میرے ہاتھ سے مارا گیا ہے۔'' احسن نے شانے اچکائے۔ ''اگر وہ اندر آگئے تو امکان ہے سب کو ماردیں گے۔''

یہ سن کر سب کے چہرے سفید پڑ گئے۔ نازیہ نے گھبرا کر کہا۔ ''یہ کیوں آئے ہیں؟''

احسن، جہانگیر کے سیل کے سامنے آیا اور سرد لہجے میں پوچھا۔ ''یہ لوگ کیوں آئے ہیں؟''

''میں نہیں جانتا۔'' اس نے جواب دیا۔ احسن کو اس کے انداز میں استہزا کی جھلک محسوس ہوئی تھی۔

''یہ جھوٹ کہہ رہا ہے، یہ جانتا ہے۔'' عقب سے جابر نے کہا۔

احسن اس کی طرف مڑا۔ ''تم کیسے جانتے ہو کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے؟''

''کیونکہ اس نے اپنے ملازم کے معاملے میں بھی جھوٹ بولا ہے۔ اس نے جان بوجھ کر اسے مارا ہے۔ اس نے ایسا کچھ دیکھ اور سن لیا تھا جو اس کا راز ہے۔''

''یہ جھوٹ بکتا ہے۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اس کے ملازم نے سرمئی رنگ کا شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کی عمر پچاس کے آس پاس ہے۔ چہرے پر ہلکی سفید داڑھی ہے۔'' جابر نے روانی سے کہا۔ جب اس نے جہانگیر کا راز فاش کرنا چاہا تو اس کے اندر کوئی رکاوٹ یا خوف نہیں آیا تھا جیسا کہ تیمور کے معاملے میں آیا تھا۔ احسن نے جہانگیر کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اس نے ہکلا کر کہا۔

''اس .... اس نے کس طرح جان لیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' احسن نے کہا۔ مگر اس وقت اس کا مسئلہ جہانگیر اور اس کا کیا ہوا جرم نہیں تھا۔ اسے حملہ آوروں سے خود کو اور ان لوگوں کو بچانا تھا۔ اسے رحیم خان کی فکر تھی جو شدید زخمی تھا۔ وہ نازیہ کے پاس آیا۔ ''تم نے نرسنگ کا کورس مکمل کر لیا ہے؟''

''تقریباً کر لیا ہے بس آخری امتحان دینا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ احسن نے لاک اپ کھولا۔

''اس کا مطلب ہے تم ہماری مدد کرسکتی ہو، میرا ساتھی زخمی ہے، اسے دیکھو۔''

نازیہ ... رحیم خان کے پاس آئی۔ پنڈلی کا زخم دیکھنے کے لیے اس نے پتلون کا پائنچہ پھاڑا تھا۔ یہ کام احسن نے کیا اور خاصی مشکل سے کیا۔ نازیہ نے زخم دیکھا اور مطمئن ہو کر بولی۔ ''یہاں ہڈی بچ گئی ہے اور خون بھی رک گیا ہے۔ لیکن اس کا ٹخنہ بری حالت میں ہے۔''

''اس کی جان کو تو خطرہ نہیں ہے۔'' احسن نے پوچھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ رحیم خان کا ٹخنہ سوج رہا ہے مگر اس سے خون نکلنا بند ہو گیا تھا۔

''نہیں۔'' نازیہ نے تازہ پٹیاں کرتے ہوئے کہا۔ احسن کی شرٹ کا کچھ حصہ بچ گیا تھا۔ اسی لمحے کسی نے دروازے پر ضرب لگائی۔ دھمک بتا رہی تھی کہ کوئی بھاری چیز ماری گئی ہے۔ نازیہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ''وہ اندر آنے والے ہیں۔''

''دروازہ بہت مضبوط ہے۔'' احسن نے اسے تسلی دی۔ ''اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹے گا۔''

دوسری طرف دروازے پر ضرب لگتے ہی جہانگیر کے چہرے پر پھر رونق آگئی تھی۔ جابر اسے گھور رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''زیادہ خوش مت ہو۔ تم جو سوچ رہے ہو ویسا نہیں ہوگا۔''

جہانگیر چونکا۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ آنے والے ....'' جابر کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا کیونکہ احسن اس کے سامنے آیا۔

''تم کیا بات کر رہے ہو؟''

''صاحب یہ اچھا آدمی نہیں ہے۔'' جابر نے جہانگیر کی طرف اشارہ کیا تو احسن نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تم بہت اچھے آدمی ہو؟''

''نہیں صاحب۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''میں بھی بہت برا آدمی ہوں لیکن صاحب اوپر والا گواہ ہے صرف پیسے کے لیے جرم کیا۔ کبھی کسی کو ذاتی تکلیف نہیں دی۔ صاحب یہ سب جو قید ہیں یہ مجرم نہیں ہے پر ان لوگوں نے دوسروں کو بلا وجہ صرف اپنی ذات سے بہت تکلیف دی ہے۔''

''مثلاً انہوں نے کیا کیا ہے؟''

''میں سب کی نہیں صرف اس کی بات کروں گا۔'' جابر نے جہانگیر کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس نے اپنے ملازم کو

جان بوجھ کر مار رہا ہے۔''

''یہ جھوٹ بکتا ہے مجھ سے گولی غلطی سے چلی تھی۔''
جہانگیر نے اعتماد سے کہا۔''اس نے شاید تم لوگوں سے سن لیا ہے اور یہ اب بابا بن کر غیب کی باتیں بتا رہا ہے۔''

دروازے پر ضربیں مسلسل پڑ رہی تھیں۔ اس کی اوپری کھڑکی کھلی تھی اور کبھی کبھی اس سے کسی کی جھلک نظر آتی تھی۔ اچانک ایک نال اندر آئی اور فائر ہوا۔ احسن جو جابر کے پاس کھڑا تھا بال بال بچا۔ گولی اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھی۔ نازیہ نے چیخ ماری اور بولی۔''اندر آؤ... اندر آؤ۔''

احسن تیزی سے اندر آ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ دروازہ کتنا ہی مضبوط سہی اگر اس پر مسلسل کسی بھاری چیز سے ضرب لگائی جائے تو اس کے قبضے جواب دے سکتے ہیں۔ یہاں سے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ راہداری کے آخری سرے پر دائیں جانب کے سیلوں کے آخر میں تھوڑی سی جگہ خالی تھی اور اس میں بھرے کاٹھ کباڑ کے عین اوپر روشن دان تھا مگر دو بائی ڈیڑھ فٹ کے اس روشن دان میں ایک انچ موٹے لوہے کی تین سلاخیں لگی تھیں اور ان کے سوراخ سے انسان کا بچہ بھی نہیں گزر سکتا تھا۔ احسن نے ایک بار سیل سے باہر جھانکا، دروازے کی طرف سے پھر فائر ہوا۔ اب کوئی مسلسل مورچا لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ وہ تو یہاں قید ہو کر رہ گیا تھا۔ اچانک جابر نے کہا۔''صاحب روشنی بجھاوو۔''

''یہ صرف باہر سے بند ہو سکتی ہے۔''

''تب بلب توڑ دو۔''

احسن کو یہ تجویز اچھی لگی۔ اس نے پہلے پستول استعمال کرنے کا سوچا مگر یہ گولیوں کا ضیاع ہوتا کیونکہ راہداری میں چار بلب روشن تھے اور اسے چار گولیاں استعمال کرنا پڑتیں۔ نشانہ خطا جانے کی صورت میں ایک اضافی گولی اور خرچ ہوتی۔ اس نے آسان طریقہ سوچا۔ اپنا بھاری جوتا اتارا۔ اپنی قمیص کے بیچ جانے والے حصوں سے باریک پٹیاں بنائیں اور انہیں آپس میں جوڑ کر رسی کی صورت دی۔ نازیہ دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔''یہ کیا کر رہے ہو۔''

''بلب توڑنے جا رہا ہوں۔'' احسن نے کہا اور رسی کو جوتے کے تسموں سے باندھا۔ پھر اس نے جوتا سامنے والے بلب پر اچھالا اور نشانہ ٹھیک بیٹھا۔ بلب ایک دھماکے سے پھٹا تھا۔ احسن مسکرایا۔''ایک تو گیا۔''

مگر دوسرا بلب خاصی مشکل سے اور تیسری باری میں جا کر ٹوٹا تھا۔ یہ دروازے کے سب سے نزدیک والا بلب تھا اور خطرہ تھا کہ سامنے آنے کی صورت میں دروازے کی طرف سے گولی آئے گی۔ اب باقی دو رہ جانے والے بلب عقبی سمت میں تھے۔ تیسرا آسانی سے ٹوٹ گیا مگر چوتھا اتنا دور تھا کہ جوتا اس تک جا ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اس سے پہلے ہی رسی ختم ہو جانے سے گر جاتا تھا۔ رسی احسن نے سیل کی سلاخ سے باندھ دی تھی تاکہ وہ بھی جوتے کے ساتھ ہی نہ چلی جائے۔ نازیہ نے کہا۔''یہ تو بلب تک جا ہی نہیں رہا ہے۔''

وہاں اور کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے اسے باندھا جا سکتا۔ ایسے موقع پر نازیہ کی شال کام آئی۔ اس نے اس میں سے ایک پٹی پھاڑ کر اسے رسی سے جوڑا تو وہ اتنی لمبی ہو گئی کہ جوتا آخری بلب تک جا سکتا تھا۔ احسن نے خوش ہو کر کہا۔''یہ تم نے کیا کام۔''

رسی لمبی ہونے سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ رسی کے بل جوتا گھما کر مار سکتا تھا اس طرح جوتا زیادہ قوت سے جاتا۔ یہاں پانچویں بار میں کامیابی ملی اور راہداری میں تاریکی چھا گئی۔ اچانک روشنی ختم ہوئی تو کچھ دیر کے لیے انہیں کچھ نظر ہی نہیں آیا۔ مگر پھر فولادی دروازے کی جھری اور روشن دان سے آنے والی ہلکی روشنی نے انہیں دیکھنے کے قابل بنا دیا۔ اس دوران میں ضربیں رک گئی تھیں۔ احسن نے اپنی شاٹ گن وہیں سیل میں رکھی اور دوسرا جوتا اتار کر ہاتھ میں پستول لیے باہر آیا اور جھکا جھکا دروازے کے نزدیک پہنچا۔ تختہ کھلا ہوا تھا اور باہر روشنی ہو رہی تھی۔ احسن نے ایک سائڈ پر ہوتے ہوئے سیڑھیوں والے حصے کی طرف دیکھا لیکن اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ پھر اس نے باتھ روم کی طرف جانے والے راستے کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ مگر اس جھری سے بہت تھوڑا سا حصہ نظر آ رہا تھا اگر کوئی اس کی طرح دیوار سے چپک کر کھڑا تھا تو ظاہر ہے وہ یہاں سے نظر نہیں آتا۔ احسن ساکت رہ کر سن گن لینے لگا۔ مگر دوسری طرف بالکل خاموشی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ وہاں سے جا چکے تھے۔

☆☆☆

ڈرائیور اور اس کا ساتھی سچ مچ اوپر جا چکے تھے کیونکہ وہ جس بھاری ہتھوڑے سے دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے بالآخر اس کا دستہ الگ ہو گیا تھا اور اب یہ استعمال کے قابل نہیں رہا تھا۔ پھر دروازہ بہت مضبوط ثابت ہوا تھا

اور اسے توڑنا مشکل ترین کام تھا۔ اتنی ضربیں لگنے کے بعد اس میں معمولی سی لرزش پیدا ہوئی تھی۔ اب انہیں کسی ایسی چیز کی تلاش تھی جس سے وہ دروازہ توڑ سکیں۔ ان کے پاس دھماکا خیز مادہ نہیں تھا ورنہ وہ اسے استعمال کرتے۔ ہتھوڑا انہیں احاطے میں رکھے سامان سے ملا تھا۔ اپنے ساتھ وہ ایسی کوئی چیز نہیں لائے تھے جس سے دروازہ توڑا جا سکتا تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ انہیں ایسی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ یہ سوچ کر آئے تھے کہ بہ آسانی چار پولیس والوں کو ٹھکانے لگا دیں گے۔ ان کا ایک ساتھی اپنی حماقت سے مارا گیا تھا اور اس کی سربریدہ لاش اس وقت تہ خانے میں پڑی تھی۔ مگر ڈرائیور مطمئن تھا۔ اس کا چہرہ ہی نہیں بچا تھا اس لیے اسے شناخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لاشیں چھوڑنا ان کے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ اس کے ساتھی نے کہا۔

''اب کیا کریں۔''

ڈرائیور نے پُرخیال نظروں سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور حکم دیا۔ ''پولیس کی گاڑی سے پیٹرول نکالو۔ کین بھی آس پاس کہیں ہوگا۔''

انہیں پیٹرول نکالنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ گاڑی کے پیچھے بیس وس لیٹرز کا ایک کین مل گیا تھا۔ جو پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ ڈرائیور کا ساتھی پریشان ہو گیا۔ ''باس یہ کیا کر رہے ہو؟ کیا آگ لگاؤ گے؟''

''دیکھتے جاؤ۔'' باس نے جواب دیا۔ کچھ دیر بعد وہ کین سمیت دوبارہ نیچے کا رخ کر رہے تھے۔

☆☆☆

احسن کو کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ نازیہ اس کے پیچھے چلی آئی ہے اور دیوار سے چپک کر کھڑی ہے۔ اس کی موجودگی کا احساس اس کے پاس سے آتی خوشبو سے ہوا تھا۔ اس نے پلٹ کر اسے دیکھا اور واپس جانے کا اشارہ کیا مگر نازیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نہیں جا رہی، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

اگرچہ نازیہ کی آواز دھیمی تھی لیکن اس سناٹے میں باہر تک سنی جا سکتی تھی۔ بارش رک گئی تھی اس لیے اس کا شور بھی نہیں تھا۔ احسن اسے بازو سے پکڑ کر سیل کی طرف لایا۔ ''کس سے ڈر لگ رہا ہے۔''

''اندھیرے سے۔'' وہ بولی۔ ''پلیز مجھے اپنے ساتھ رہنے دو۔''

''مجھے ان لوگوں سے مقابلہ کرنا ہے۔'' احسن نے اسے سمجھایا۔ ''تم نے دیکھا یہ کیسے گولیاں چلا رہے ہیں۔ تم سیل میں محفوظ ہو۔''

''جب گولیاں چلیں گی تو میں سیل میں آ جاؤں گی۔''

''ہمیں کھول دو۔'' جہانگیر نے مطالبہ کیا۔

''اسے مت کھولنا۔'' نازیہ نے جلدی سے کہا۔ ''یہ ٹھیک آدمی نہیں ہے۔''

''تم اس کے بارے میں کیسے جانتی ہو؟''

نازیہ ہچکچائی پھر اس نے کہا۔ ''اس شخص نے جو ساتھ والے سیل میں ہے، اس نے اس کے بارے میں کہا تھا۔''

''اور تم نے یقین کر لیا؟''

''ہاں کیونکہ یہ باتیں عجیب کر رہا ہے مگر جس کے بارے میں بات کرتا ہے، وہ یوں خاموش ہو جاتا ہے جیسے اس نے کوئی بہت بڑا سچ بول دیا ہو۔''

''تمہارے بارے میں بات کی؟''

''نہیں لیکن ان تینوں کے بارے میں کہا ہے۔'' نازیہ نے کہا اور اسے کسی قدر تفصیل سے بتایا کہ جابر نے کس کس کے بارے میں کیا کہا تھا؟ احسن حیران ہوا۔ اس نے نازیہ کو بتایا۔

''یہ پرانا مجرم ہے، سمجھو پیدائشی مجرم ہے مگر آج بدلا بدلا نظر آ رہا ہے۔''

''اس کا کہنا ہے کہ یہ قبر سے آیا اور آج یومِ حساب ہے۔''

اچانک احسن کو احساس ہوا کہ وہ کس صورتِ حال میں ہے اور وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ اسے جان بچانے کی تدبیر سوچنی چاہیے۔ مجرم باہر اور آزاد تھے۔ وہ اندر اور قید تھا۔ اگرچہ یہاں فوری خطرہ نہیں تھا مگر مجرم کوئی چال چل سکتے تھے۔ معاً ایک رونگٹے کھڑے کرنے والا خیال احسن کے ذہن میں آیا۔ اگر مجرموں نے اوپر آگ لگا دی تو وہ سب جل کر یا دم گھٹ کر ہلاک ہو سکتے تھے۔ اس خیال کے ساتھ اسے پیٹرول کی بُو آئی۔ پہلے وہ اسے اپنا وہم سمجھا مگر اسی وقت جابر بولا۔ ''یہ پیٹرول کی بُو کہاں سے آ رہی ہے؟''

احسن باہر آیا تو بُو تیز ہو گئی اور یہ دروازے کی طرف سے آ رہی تھی۔ وہ دبے قدموں دروازے تک آیا تو اسے ننگے پیروں تک نمی محسوس ہوئی۔ اس نے جھک کر ہاتھ لگایا تو پیٹرول کی خنکی محسوس ہوئی۔ بُو اب شدید ہو گئی تھی۔ اسے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ اس کا خدشہ اتنی جلدی حقیقت بن کر سامنے آ جائے گا، اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ باہر سے کوئی پیٹرول انڈیل رہا تھا جو بہتا ہوا اندر

تک آ رہا تھا۔ اب اگلا مرحلہ آگ لگانے کا ہوتا۔ احسن نے ٹٹول کر دیکھا، زیادہ پیٹرول اندر نہیں آیا۔ مگر مزید پیٹرول آنے میں کتنی دیر لگتی۔ چند منٹ اور اس کے بعد باہر سے صرف ایک تیلی دکھانے کی دیر ہوتی اور وہ آگ میں گھر جاتے۔ اسے کچھ کرنا تھا اس سے پہلے کہ مزید پیٹرول اندر آئے اور ان کے لیے بڑا خطرہ بنے۔ اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور جب اس نے غور کیا تو اسے یہی مناسب لگا۔ آگ تو بہرصورت لگنی تھی تو کیوں نہ وہ اپنی مرضی سے لگاتا۔

احسن نے واپس آتے ہوئے چند لمحے کے لیے سوچا اور پھر فیصلہ کیا۔ اس نے پستول نکالا اور دروازے کے ساتھ فرش کی طرف کر کے گولی چلادی۔ گولی نے پلک جھپکنے میں پیٹرول کو آگ دکھ دی اور اگلے ہی لمحے یہ آگ دروازے کے پار جا چکی تھی۔ وہاں کسی نے بھیانک چیخ ماری۔ کوئی چیز گرنے کی آواز آئی اور پھر چیخیں مسلسل آنے لگیں۔ یوں لگا جیسے جو شخص پیٹرول انڈیل رہا تھا، وہ آگ کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ لاک اپ ایک بار پھر روشن ہو گیا تھا۔ مگر باہر زیادہ روشنی تھی اور یہ متحرک روشنی تھی۔ کیونکہ آگ کی لپیٹ میں آنے والا شخص بھاگ دوڑ کر رہا تھا اور اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نازیہ چلائی۔

''آگ.....''

باقی سب بھی خوف سے چلانے لگے۔ احسن نے بلند آواز سے کہا۔ ''خاموش رہو۔ آگ یہاں نہیں باہر لگی ہے۔''

''جھوٹ بولتے ہو تم۔'' جہانگیر بولا۔ ''یہاں بھی آگ لگی ہے اور تم نے لگائی ہے۔''

''یہ محدود ہے۔'' احسن نے جواب دیا۔ ''یہاں پیٹرول کم آیا تھا اس لیے جلد ختم ہو جائے گا اصل آگ باہر ہے۔''

''اصل آگ جب پوری عمارت میں پھیلے گی تو محدود نہیں رہے گی۔'' جہانگیر نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''ہمیں باہر نکالو۔''

''ہاں ہمیں باہر نکالو۔'' احمر بولا اور تیمور نے اس کی حمایت کی تھی۔ صرف جابر خاموش تھا۔ باہر سے آنے والی چیخیں اب مدھم پڑ گئی تھیں مگر شعلوں کی روشنی تیز ہو گئی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ واقعی اگر آگ اوپری منزل تک پہنچ گئی تو پھر ان کے بچنے کا امکان بھی کم رہ جائے گا۔ مگر وہ انہیں لاک اپ سے نکالنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اگر وہ انہیں لاک اپ سے نکال بھی دیتا تو وہ یہاں سے تو نہیں نکل سکتے تھے۔ اصل کام یہاں سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنا تھا۔ وہ لاک اپ کے آخری حصے میں آیا۔ جہاں روشن دان کے نیچے والے حصے میں ایک عدد نل لگا ہوا تھا۔ یہ نل اصل میں قیدیوں کو پینے کا پانی دینے کے لیے تھا۔ ان کو پانی کی بوتل یہیں سے بھر کر دے دی جاتی تھی۔ باہر سے لانے کی زحمت نہیں کرنا پڑتی تھی۔ احسن نے نل کھول دیا اور پانی بہنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ پانی آگ کو اندر آنے سے روکے گا۔ پانی پہلے آخری حصے میں جمع ہوا اور یہاں اس کی نکاسی کا کوئی راستہ نہیں تھا اس لیے یہ بہتا ہوا راہداری سے دروازے کی طرف جانے لگا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟'' جہانگیر نے پوچھا۔

''آگ کو روکنے کی کوشش۔'' احسن نے جواب دیا۔

پانی اب بہتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا تھا اور آگ سے تپ جانے والی زمین کو ٹھنڈا کر رہا تھا۔ آگ واقعی رک گئی تھی مگر ردعمل میں پانی بھاپ بننے لگا اور تہ خانے کا ماحول گرم ہونے لگا۔ باہر لگی آگ اب زیادہ بھڑک رہی تھی اور دروازے کی کھڑکی کے باہر آگ ہی آگ تھی۔ نازیہ، احسن کے ساتھ تھی۔ اس نے کہا۔

''بھاپ اور دھواں اسی طرح بڑھتا رہا تو سب دم گھٹ کر مر جائیں گے۔''

''یہاں سے باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔''

نازیہ روشن دان دیکھ چکی تھی۔ اس نے کہا۔ ''اس روشن دان کی سلاخیں نکل جائیں تو.....''

''یہ سلاخیں بہت مضبوط ہیں کسی صورت نہیں ٹوٹ سکتیں...'' احسن اس کی بات کاٹ کر بولا۔

''ہم یہاں سے مدد کے لیے تو پکار سکتے ہیں۔'' نازیہ نے اصرار کیا۔

اس کی بات احسن کے دل کو لگی تھی۔ وہ پھر اس حصے میں آیا۔ اس نے نل بند کیا کیونکہ پانی خاصا ہو چکا تھا۔ اس نے اوپر دیکھا۔ نل پر پاؤں رکھ کر اچکتے ہوئے اس نے تقریباً نو فٹ اوپر روشن دان کے کنارے پر ہاتھ جمایا اور پھر دونوں ہاتھوں کی مدد سے خود کو بلند کیا۔ روشن دان عقبی حصے میں کھل رہا تھا اور یہاں اسے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا مدد کے لیے پکارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ امکان یہی تھا مجرم ہی آتے اور وہ اس روشن دان سے بھی واقف ہو جاتے۔ تین سلاخوں کے درمیان چھ چھ انچ کا فاصلہ تھا۔ اگر دو سلاخیں نکل جاتیں تو باہر جانے کا راستہ بن سکتا تھا۔ اس کا

ہاتھ تھک گیا تھا اس لیے وہ نیچے اتر آیا۔ نازیہ نے پوچھا۔
''کوئی ہے باہر؟''
''جان کے دشمن ہی ہو سکتے ہیں۔'' احسن نے خشک لہجے میں کہا۔ اندر اب بھاپ اور دھواں بڑھ گیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے غلطی تو نہیں کی ہے۔ مگر نہیں ۔۔۔ وہ آگ نہ بھی لگاتا تب بھی باہر موجود دشمن نے یہی کام کرنا تھا۔ پیٹرول زیادہ مقدار میں اندر آتا تو ان کے بچنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس نے فائر کر کے اچانک آگ لگائی تو یہ ان لوگوں کے لیے غیر متوقع تھی اور جو شاید پیٹرول انڈیل رہا تھا، وہ خود آگ کی زد میں آ گیا۔ ممکن ہے باہر موجود سارے ہی افراد مارے گئے ہوں مگر احسن نے یہ خیال مسترد کر دیا کیونکہ آواز صرف ایک آدمی کے چلانے کی آئی تھی اور وہی آخر تک چلاتا رہا جب تک اس کا دم نہیں نکل گیا تھا۔ اس کے علاوہ باقی بچ نکلے ہوں گے۔ بھاپ کے ساتھ مل کر دھوئیں نے ہوا کو اور کثیف کر دیا تھا اور وہ سب ہانپنے کے انداز میں سانس لے رہے تھے۔ جہانگیر مسلسل باہر نکالنے کو کہہ رہا تھا۔ احسن نے اسے جھڑکا۔ ''چپ کرو، باہر آ کر بھی تم اس جگہ سے باہر نہیں جا سکو گے۔''
''تب تم نے آگ کیوں لگائی؟'' وہ حلق کے بل دہاڑا اور پھر کھانسنے لگا۔ جابر ہنسا۔
''یہ اپنے بچھائے ہوئے دام میں آ گیا ہے۔''
''تمہارا مطلب ہے کہ آگ لگانے والے اس کے آدمی ہیں؟''
''مجھے یقین ہے۔'' جابر نے کہا۔ ''اسی نے انہیں بلایا کہ وہ اسے آزاد کرائیں اور اب یہ سب کے ساتھ یہاں پھنس ہوا ہے۔ اس کی زندگی و موت کا فیصلہ ہمارے ساتھ ہونا ہے۔''
احسن سوچ رہا تھا کہ وہ اکیلے کچھ نہیں کر سکتا۔ رحیم خان خود مدد کا محتاج ہو گیا تھا اور اسے کسی کی مدد کی ضرورت تھی۔ نازیہ لڑکی تھی وہ اس کی قوت کے معاملے میں مدد نہیں کر سکتی تھی۔ جہانگیر پر وہ اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ تیمور اور احمر بھی قابلِ اعتبار نہیں تھے۔ ایسے میں صرف جابر بچتا تھا۔ احسن نے سوچا اور اس کے سیل کا لاک کھولا۔ جابر باہر آیا، وہ کسی قدر حیران تھا۔ ''آپ نے مجھے کیوں کھولا؟''
''اس لیے کہ تم یہاں قید نہیں تھے۔ میں نے صرف رات گزارنے کے لیے تمہیں یہاں رکھا۔ صبح تمہیں چھوڑ دیتا۔ یہ سب ملزم ہیں۔''
''یہ بھی مجرم ہے۔'' جہانگیر بولا تو جابر نے اس کی طرف دیکھا۔
''میں مجرم تھا لیکن اب میری مہلت ختم ہو گئی ہے۔ میں کل رات نو بجے تک اس دنیا سے گزر جاؤں گا۔''
''نو بجے کا وقت بہت دور ہے۔'' احسن نے آگ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اگر ہم نے کوئی تدبیر نہ کی تو صبح سے پہلے سب مارے جائیں گے۔''
''یہاں سے نکلنے کا دوسرا راستہ ہے؟'' جابر نے پوچھا۔
''صرف ایک روشن دان ہے۔'' احسن نے کہا اور اسے روشن دان دکھایا۔ جابر نے وہاں پڑا ہوا کاٹھ کباڑ جمع کر کے ایک دوسرے پر رکھا اور اس پر چڑھ کر روشن دان کا جائزہ لیا۔ اس نے احسن سے کہا۔
''اگر اس کی دو سلاخیں ایک طرف سے نکال دی جائیں تو ہم باہر نکل سکتے ہیں۔''
''وہ کیسے نکالی جائیں؟'' احسن بولا۔ ''یہاں تو اسکرو ڈرائیور بھی نہیں ہے۔''
جابر نیچے اتر آیا۔ ''تب شاید سب مارے جائیں مگر مجھے یقین ہے ایسا نہیں ہوگا۔''
احسن نے تجسس سے پوچھا۔ ''یہ تم نے کیا چکر چلایا ہوا ہے دوسروں کے بارے میں کیسے بتا رہے ہو؟''
''میں نہیں جانتا صاحب کہ مجھے دوسروں کے بارے میں کس طرح معلوم ہو جاتا ہے۔ مگر جب سے میں مر کر زندہ ہوا ہوں میرے ساتھ ایسا ہو رہا ہے۔''
احسن ہنسا۔ ''اب تم مجھے کوئی کہانی سناؤ گے۔''
''یہ کہانی نہیں سچ ہے صاحب مگر میں کسی کو نہیں بتاؤں گا اگر کل رات نو بجے کے آس پاس میری موت ہو جائے تو سمجھ لینا میں سچ کہہ رہا تھا۔''
احسن سوچ میں پڑ گیا کہ روشن دان کی سلاخیں کیسے نکالے۔ ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حبس اور حدت بڑھ رہی تھی۔ جابر تیمور کے پاس آیا اور آہستہ سے کہا۔ ''تیرے پاس موقع ہے تلافی کا، پولیس کو بتا دے وہ بچ گیا تو تو بھی بچ جائے گا۔''
''کک ۔۔۔ کیسے؟'' تیمور نے بہ مشکل کہا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''
''اسے چھوڑ مجھے کیسے پتا چلا۔ تو اپنی جان بچا۔''
''اس کی باتوں میں مت آؤ۔'' احمر بولا۔ ''یہ کوئی فراڈیا ہے۔''
''تیرا یومِ حساب قریب ہے۔'' جابر نے اسے گھورا۔

"معاف مانگ لے شاید کہ تو بچ جائے۔"
نازیہ قریب موجود تھی اور سن رہی تھی، اس نے پوچھا۔ "تم کیا کہہ رہے ہو؟ اس نے کیا کیا ہے؟"
"یہ جانتا ہے اس نے کیا کیا ہے۔ میں اپنی زبان سے نہیں بتا سکتا۔"
"تم نے سرخ اور نیلی فراک والی بچی کا حوالہ کیوں دیا تھا؟"
احسن واپس آیا اس نے سن لیا تھا اور نازیہ سے پوچھا۔ "تم دوسری بار ایک بچی کا پوچھ رہی ہو، کیا بات ہے؟"
نازیہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے کہا۔ "ہمارے محلے میں ایک سات آٹھ سال کی بچی غائب ہوئی تھی۔ یہ ایک سال پہلے کی بات ہے۔ غائب ہوتے وقت بچی نے نیلی اور سرخ فراک پہنی ہوئی تھی اور پھر وہ نہیں ملی۔"
احسن نے چونک کر احمر کی طرف دیکھا تو وہ نظریں چرانے لگا مگر یہ وقت تفتیش کا نہیں تھا۔ احسن نے رحیم خان کو دیکھا وہ ہوش میں تھا مگر تکلیف کی شدت بڑھ گئی تھی۔ اس نے اسے تسلی دی۔ "تم فکر مت کرو ہم جلد یہاں سے نکل جائیں گے اور تمہیں طبی امداد ملے گی۔"
"صاحب آپ میری فکر مت کرو، یہاں سے نکلنے کا سوچو۔"
احسن نے جابر کی مدد سے سیل میں رکھی لکڑی کی بینچ اٹھائی اور اسے روشن دان کے پاس لایا۔ اسے کھڑا کر کے وہ اس پر چڑھا اور بیٹھ کر اس نے دیکھا۔ وہ اچھی طرح جم کر بیٹھ رہا تھا۔ جابر نے پوچھا۔ "صاحب یہ کیا کر رہے ہو؟"
"ایک خیال آیا ہے۔" احسن نے کہا اور شانے سے شاٹ گن اتاری۔ "سب پیچھے ہٹ جاؤ۔"
جابر اور نازیہ پیچھے ہو گئے۔ احسن نے شاٹ گن کی نال دائیں طرف موجود سلاخ کے اوپری حصے میں کر کے جہاں وہ کنکریٹ میں پیوست ہو رہی تھی، فائر کیا۔ دھماکے سے بلٹ نے کنکریٹ کے ٹکڑے اڑائے اور وہ احسن کو آ کر لگے۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ چند انچ کا ٹکڑا اڑا تھا اور اندر سے فولادی سلاخ نظر آ رہی تھی۔ احسن خوش ہو گیا اس کا آئیڈیا کام کر رہا تھا۔ اس نے ذرا سا رخ موڑ کر دوسرا فائر کیا اور اس بار کنکریٹ کا بڑا ٹکڑا نکلا تھا۔ تیسرے فائر پر سلاخ کا اوپر والا حصہ بالکل عریاں ہو گیا۔ احسن نے اسے پکڑا تو وہ ہلنے لگا تھا۔ مگر سلاخ نکالنے کے لیے نچلے حصے کو کمزور کرنا بھی ضروری تھا۔ اس نے اب نچلے حصے کا نشانہ لیا۔ یہاں خطرہ زیادہ تھا۔ اگر گولی پلٹ جاتی تو وہ بالکل سامنے تھا اس لیے وہ ایسے رخ سے فائر کر رہا تھا کہ گولی کے واپس آنے کا امکان کم ہو۔
اس نے نچلے حصے پر دوسری گولی چلائی تھی کہ اسے لگا جیسے اس کے بائیں شانے میں دہکتا ہوا انگارا گھس گیا ہو۔ ایک لمحے کو اسے لگا کہ شاٹ گن کا بٹ پلٹ کر آیا تھا مگر فوراً ہی باہر سے چمکتے شعلوں نے بتایا کہ اس پر اصل میں باہر سے کسی نے فائر کیا تھا۔ اس سے پہلے کوئی اور گولی اسے نشانہ بناتی، وہ دیوار سے پاؤں ہٹا کر پیچھے پھسل گیا۔ اس کے گرتے ہی دو گولیاں اس جگہ ٹکرائیں جہاں وہ ایک لمحے پہلے تھا۔ نیچے گرتے ہوئے اسے ہلکی چوٹ لگی تھی مگر یہ شانے کی تکلیف کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ اٹھ رہا تھا کہ روشن دان کی طرف سے پستول سمیت ہاتھ اندر آیا اور لگاتار کئی شعلے نکلے۔ ایک بار پھر قسمت نے احسن کو بچایا تھا۔ ساری گولیاں اس کے آس پاس گئیں اور وہ بچ کر تیزی سے سرک کر آڑ میں آ گیا۔ ان لوگوں کو پتا نہیں تھا کیونکہ پستول کا فائر بے آواز تھا۔ پہلے نازیہ نے محسوس کیا اور وہ اس کی طرف آئی۔ "کیا ہوا ہے؟"
"پیچھے رہو۔" احسن نے تکلیف کے ساتھ کہا۔ "وہ باہر موجود ہیں۔ کسی نے مجھ پر فائر کیا ہے۔"
نازیہ رک گئی۔ احسن اٹھ کر لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف آیا تو وہ بے قرار ہو کر بولی۔ "تم زخمی ہو؟"
"ہاں شانے میں گولی لگی ہے۔"
گولی اصل میں شانے میں نہیں بلکہ کالر بون سے ذرا اوپر لگی تھی اور آر پار ہو گئی تھی۔ نازیہ نے زخم دیکھا۔ خون بہہ رہا تھا مگر کالر بون بچ گئی تھی اور شہ رگ بھی کسی قدر فاصلے سے بچی تھی۔ اتفاق سے یہ جگہ بلٹ پروف سے باہر تھی۔ نازیہ نے اپنی شال پھاڑ کر پہلے ایک گدی سی بنا کر اسے زخم پر رکھا اور احسن سے کہا۔ "اسے دبائیں۔"
احسن نے اسے دبایا تو اس کے منہ سے چیخ نکلی۔ جابر اس کے پاس آیا۔ "صاحب تم نے کتنا کام کیا ہے؟"
"ایک سلاخ تقریباً نکل گئی ہے مگر باہر وہ موجود ہیں۔"
"میں کوشش کرتا ہوں۔" جابر نے پیشکش کی۔
"نہیں۔" احسن ہچکچایا۔ وہ اس کے ہاتھ میں اسلحہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ جابر سمجھ گیا، اس نے آہستہ سے کہا۔ "صاحب تم جابر پر ایک بار اعتبار کر کے دیکھو۔ میں قسم نہیں کھاتا ورنہ قسم کھا کر اپنی نیت کا یقین دلاتا۔"

''یہ بات نہیں ہے، اس میں خطرہ بہت ہے۔''

''صاحب اس وقت یہاں موجود لوگوں میں میں واحد آدمی ہوں جو یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ ابھی میرا وقت نہیں آیا ہے۔ میں کل رات نو بجے سے پہلے نہیں مروں گا اور صاحب اس سے پہلے بھی مر گیا تو کون سا میرے پیچھے رونے والے بیٹھے ہیں۔''

نازیہ نے اس کی حمایت کی۔ ''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وقت نہیں رہا ہے۔ یہاں زیادہ گرمی ہو گئی ہے، اس کا مطلب ہے کہ آگ اوپر تک پہنچ گئی ہے۔''

احسن کی تکلیف میں کمی ہوئی۔ شاید اس لیے کہ گولی نے کسی اہم عضو یا شریان کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ نازیہ نے گدی ہٹا کر دیکھا تو خون تقریباً رک گیا تھا، اس نے دوسری گدی رکھ کر اوپر سے پٹی باندھ دی تھی۔ احسن نے ہاتھ ہلا ... کر دیکھا تو تکلیف ہوئی تھی مگر اس کا ہاتھ استعمال کے قابل تھا۔ البتہ وہ سلاخ نکالنے والا کام یقیناً نہیں کر سکتا تھا۔ یہ مکمل طور پر فٹ بندہ ہی کر سکتا تھا۔ احسن نے فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے شاٹ گن جابر کی طرف بڑھائی اور بولا۔ ''ایک بار سوچ لو، باہر موت ہے۔ وہ تمہیں آسانی سے نشانہ بنا سکتا ہے۔''

''اوپر والا مالک ہے۔'' جابر نے کہا اور روشن دان کی طرف آیا۔ اس نے پہلے گن لی۔ اب دھواں اور بھاپ یہاں بھی تھے۔ روشن دان سے باقاعدہ خارج ہو رہے تھے۔ اس صورت میں باہر موجود افراد کے لیے اندر دیکھنا یقیناً مشکل تھا۔ مگر وہ فائر کی آواز سے سمجھ جاتے کہ اندر کارروائی ہو رہی ہے اور وہ جوابی کارروائی کے لیے آ جاتے۔ اس میں خطرہ بہت زیادہ تھا۔ جابر نے سوچا اور واپس آ کر احسن سے کہا۔ ''مجھے اس کی مدد کی ضرورت ہے۔''

اس نے جہانگیر کی طرف اشارہ کیا۔ احسن چونکا۔ ''یہ کیا مدد کرے گا؟''

''یہ ان لوگوں کو روکے گا۔'' جابر بولا۔ ''مجھے یقین ہے یہ اسی کے بلائے لوگ ہیں۔''

احسن سوچ میں پڑ گیا۔ ''فرض کرو وہ اس کے آدمی نہ ہوئے؟''

''کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ اگر دیر کی تو سب یہیں مر جائیں گے۔''

احسن نے سر ہلایا اور چابیاں جابر کے حوالے کر دیں۔ اس نے جہانگیر کی کھولی کا دروازہ کھولا اور اسے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ جہانگیر ان کی گفتگو نہیں سن سکا تھا مگر وہ مشکوک ہو گیا تھا۔ ''کیا بات ہے.... مجھے کیوں کھول رہے ہو؟''

جابر نے جواب دیا۔ ''ہم نے ایک راستہ تلاش کر لیا ہے۔ یہاں سے نکلنا ہے۔''

جہانگیر باہر آیا اور پھر جابر کے ہاتھ میں شاٹ گن دیکھ کر چونکا۔ ''یہ کیا.... تمہارے پاس گن....؟''

''ہاں اور اب اس طرف چلو۔'' جابر نے گن کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ جہانگیر نے احسن سے کہا۔

''یہ کیا ہے، تم نے اس مجرم کو ہتھیار دیا ہے۔''

''یہ ہماری مدد کر رہا ہے۔'' احسن نے کہا۔ ''اور اب تم اس کی مدد کرو گے۔ جیسا یہ کہے، ویسا ہی کرو۔''

بادلِ ناخواستہ جہانگیر حرکت میں آیا اور جابر کے ساتھ روشن دان والے حصے میں آیا۔ جابر نے اس سے کہا۔ ''اوپر چڑھو۔''

جہانگیر بینچ پر چڑھا۔ اس کے پیچھے جابر بھی تھا لیکن وہ روشن دان کے سرے والے حصے میں رہا اور اس نے جہانگیر سے کہا۔ ''تم دیکھ رہے ہو، ہم یہاں شاٹ گن کی مدد سے راستہ بنا رہے ہیں۔ لیکن کسی نے باہر سے انسپکٹر پر فائر کر کے اسے زخمی کر دیا ہے۔''

جہانگیر کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''تب تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟''

''تاکہ باہر موجود لوگ تمہاری موجودگی میں فائر نہ کر سکیں۔'' جابر نے کہا۔ ''تم انہیں آواز دے کر کہو کہ تم یہاں ہو اور اگر انہوں نے گولی چلائی تو وہ تمہیں لگے گی۔''

''مم.... نہیں میرا ان سے تعلق نہیں ہے۔'' جہانگیر نے ہکلا کر کہا۔

''تب بھی تم یہاں سے نہیں ہلو گے۔'' جابر نے شاٹ گن کا رخ سلاخ کی طرف کر دیا۔ ''میں فائر کروں گا تو وہ باہر سے فائرنگ کریں گے۔''

جہانگیر کا چہرہ پسینے میں تربتر ہونے لگا۔ یہ گرمی سے زیادہ خوف کا اثر تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''رک جاؤ۔''

''تم بات کر رہے ہو یا نہیں۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اگر دیر کی تو سب دم گھٹ کر مارے جائیں گے۔''

جہانگیر نے فیصلہ کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگایا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''اوکے میں کہتا ہوں مگر میرا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تعلق نہیں بھی ہے تو بتاؤ۔'' جابر نے کہا۔
جہانگیر نے چلّا کر کہا۔ ''میں جہانگیر بات کر رہا ہوں اگر کسی نے روشن دان پر فائر کیا تو میں مارا جاؤں گا۔ انہوں نے مجھے آگے رکھا ہے۔ ہمیں باہر آنے دو۔''
جابر نے اسے پھر بات دہرانے کا حکم دیا اور جہانگیر نے دوبارہ یہی الفاظ دہرائے۔ دوسری طرف سے کوئی ردِعمل نہیں ہوا تو جابر نے سلاخ کی نچلی جڑ پر فائر کیا اور پہلی سلاخ نکل گئی۔ پھر اس نے درمیان والی سلاخ کے اوپری حصے کو نشانہ بنانا شروع کیا۔ اسلحہ اور اس کا استعمال جابر کے لیے اتنا ہی آسان تھا جیسے کسی کاری گر کا اپنے اوزاروں کو استعمال کرنا۔ اس نے تین فائر میں اوپری پلاسٹر اکھاڑ دیا اور سلاخ عریاں ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے نچلے حصے کو نشانہ بنایا۔ یہ حصہ پہلے ہی کسی وجہ سے کمزور ہو گیا تھا اور دو فائر میں سلاخ ڈھیلی ہو کر جھولنے لگی تھی۔ جہانگیر نے اسے پکڑا اور اکھاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند جھٹکوں میں اس نے سلاخ نکال لی اور پھر وہ کیا جو جابر نے سوچا نہیں تھا۔ اس نے اچانک ہی سلاخ گھما کر جابر کے سر پر ماری اور وہ بچنے کی کوشش کے باوجود چوٹ کھا بیٹھا۔ وہ نیچے گرا اور جہانگیر پھرتی سے باہر نکل گیا۔ جابر کی چیخ سن کر احسن اور نازیہ وہاں بھاگے آئے۔ جابر کا زخمی سر مزید زخمی ہوا تھا مگر وہ ہوش میں تھا اور اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ احسن نے پوچھا۔
''کیا ہوا جہانگیر کہاں ہے؟''
''اس خبیث نے میرے سر پر سلاخ دے ماری۔ میں سمجھا وہ مدد کر رہا ہے۔ وہ باہر نکل گیا ہے۔''
اچانک اوپر سے دھماکے کی آواز آئی جیسے عمارت کا کوئی حصہ گرا ہو۔ آگ نے یقیناً پوری عمارت کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اگرچہ پانی کی وجہ سے سیل والے حصے میں آگ نہیں گھس سکی تھی مگر تپش، دھواں و بھاپ اور حبس مسلسل بڑھ رہا تھا اور انہیں سانس لینے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ نازیہ نے گھبرا کر کہا۔ ''ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔''
جابر نے اپنا سر نل کے نیچے رکھ کر پانی کھول دیا تھا۔ پانی نے اس کی حالت بہتر کی۔ چند گھونٹ پانی پی کر وہ تیار ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''پہلے میں اوپر جاتا ہوں تاکہ کسی کو حملہ کرنے سے روک سکوں۔''
''ان لوگوں کو بھی کھولو۔'' احسن نے چابیاں نازیہ کو دیں۔ دھواں اتنا بڑھ گیا تھا کہ انہیں کپڑا گیلا کر کے منہ پر رکھنا پڑا تھا۔ نازیہ نے جا کر احمر اور تیمور والا سیل کھولا۔ احمر نے باہر آتے ہی نازیہ سے کہا۔ ''لگتا ہے تم نے لائن بدل لی ہے۔''
''شٹ اَپ۔'' وہ بولی۔
اس دوران میں جابر اوپر چڑھا اور رینگ کر روشن دان سے باہر نکل گیا۔ کھلی فضا میں آ کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ اندر کس فضا میں سانس لے رہا تھا۔ یہاں عقبی حصے میں بڑے درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ وہ باہر آتے ہی زمین پر لیٹ گیا اور چند گہرے سانس لینے کے بعد اس نے روشن دان میں منہ ڈال کر کہا۔ ''آ جاؤ، یہاں کوئی نہیں ہے۔''
سب سے پہلے نازیہ آئی۔ اس کے بعد رحیم خان کو باہر نکالا گیا۔ کباڑ میں کچھ رسیاں بھی تھیں، ان سے باندھ کر تیمور اور احمر نے رحیم خان کو اوپر کھینچ لیا تھا۔ اس کا اسلحہ احسن نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ کیونکہ اس کی شاٹ گن جابر کے پاس تھی۔ سب سے آخر میں احسن آیا اور زخمی شانے کی وجہ سے بہت مشکل سے آیا تھا۔ اصل مشکل شاٹ گن کو سنبھالنے میں ہو رہی تھی مگر اس نے گن کسی اور کو نہیں پکڑائی۔ اس دوران میں جابر چوکسی سے پہرا دے رہا تھا۔ اوپری حصہ پوری طرح شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا تھا اور کھڑکیوں سے باہر تک روشنی آ رہی تھی۔ اچانک ایک جھماکا ہوا اور بجلی غائب ہو گئی۔ اب وہاں صرف اندر جلنے والی آگ کی روشنی تھی۔ احسن نے کہا۔ ''یہاں سے ہٹو، یہ کھلی جگہ ہے۔ ہم آسانی سے نشانہ بن سکتے ہیں۔''
''میرا خیال ہے وہ بھاگ گئے ہیں۔'' احمر بولا۔
احسن نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ ہمیں ختم کیے بغیر نہیں جائیں گے کیونکہ ہم عینی گواہ ہیں۔''
وہ رحیم خان کو اٹھا کر جھاڑیوں میں لے آئے اور لٹا دیا۔ وہ اب نیم بے ہوش تھا اور کراہنا بند کر دیا تھا۔ یہاں تاریکی اور سناٹا تھا۔ احسن نے نازیہ سے کہا۔ ''تم یہیں اس کے پاس رکو، جابر تم اور احمر میرے ساتھ آؤ۔''
احمر بدکا۔ ''میں کیوں؟''
احسن نے اسے گریبان سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ ''بکواس کرنے کے بجائے وہ کرو جو میں کہہ رہا ہوں ورنہ تمہیں اس جلتی عمارت میں پھینک دوں گا۔''
احمر ڈر گیا، اس نے منمنا کر کہا۔ ''میں منع تھوڑی کر رہا ہوں۔''
''اور تم...'' احسن نے اب تیمور سے کہا۔ ''یہاں سے فرار کی کوشش مت کرنا۔''
''میں کہیں نہیں جاؤں گا۔'' اس نے یقین دلانے

کے انداز میں کہا۔

احسن، جابر اور احمر جلتی عمارت کے دائیں طرف سے ہوتے ہوئے اگلے حصے کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

جہانگیر کے ذہن میں اچانک خیال آیا تھا اور اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ بہ ظاہر وہ جابر کی مدد کر رہا تھا مگر اس نے سلاخ نکا کے اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا مگر عجلت میں کاری ضرب نہیں لگا سکا تھا۔ پھر بھی جابر نیچے گر گیا تھا۔ جہانگیر کھڑکی پینچ پر توازن برقرار رکھتے ہوئے اتنی پھرتی سے روشن دان سے نکلا کہ وہ خود بھی حیران رہ گیا۔ وہ کسی قدر بھاری جسم کا سست آدمی تھا کیونکہ اس نے کبھی بھاگ دوڑ والا کام نہیں کیا تھا، اس کے لیے اس کے پاس آدمی تھے... باہر آ کے وہ تیزی سے تھانے کے اگلے حصے کی طرف آیا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جہانگیر اس سے نکلا تو سے ایک نقاب پوش کار کے پاس کھڑا کسی سے موبائل پر بات کرتا دکھائی دیا۔ جہانگیر کی موجودگی محسوس کر کے وہ بھڑ کا مگر اسے دیکھتے ہی وہ بے تابی سے اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ''باس تم ... تم ٹھیک ہو؟''

''رئیس۔'' جہانگیر نے کہا اور پھر اس پر برس پڑا۔ ''تم نے یہ کیا حماقت کی تھی۔''

''باس۔'' رئیس گڑگڑایا۔ اس نے نقاب اتار دیا تھا۔ ''میں انہیں دھمکانا چاہتا تھا اس لیے پیٹرول والا حربہ اختیار کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اندر سے فائر کر کے آگ لگا دے گا۔''

جہانگیر اسے گھور رہا تھا۔ ''تم کتنے آدمی ساتھ لے کر آئے تھے؟''

''میرے ساتھ جامو اور افتی تھے۔'' رئیس نے سر جھکا کر کہا۔ ''دونوں مارے گئے۔ جامو کو گولی لگی اور افتی پیٹرول ڈال رہا تھا جب آگ لگی اور وہ اسی میں جل گیا، میں بڑی مشکل سے بچ سکا۔''

''صرف دو آدمی اور وہ بھی اتنے نکمے ...'' جہانگیر نے پاؤں زمین پر مارا۔

''باس دو آدمی تو ہم نے ایک منٹ میں ختم کر دیے تھے مگر اندر موجود ایک بندہ مصیبت بن گیا۔''

''ایس آئی۔'' جہانگیر نے دانت پیس کر کہا۔ ''اس کے ساتھ ایک مصیبت اور بھی ہے۔''

رئیس، جہانگیر کا خاص آدمی تھا اور اپنے دو آدمیوں کے مارے جانے کے بعد وہ پریشان تھا۔ اس نے کال کر کے مزید آدمی بلوائے تھے۔ اس کا مشن جہانگیر کو یہاں سے آزاد کرانا تھا اور اب جہانگیر کو آزاد دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ اسے سب سے زیادہ خطرہ یہ تھا کہ جہانگیر اگر اندر لگنے والی آگ میں مارا گیا تو اس کی بھی خیر نہیں ہوگی۔ اس نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''باس آؤ یہاں سے جتنی جلد نکل جائیں، اتنا اچھا ہے۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو۔'' جہانگیر نے اسے جھڑکا۔ ''ان لوگوں کو ختم کیے بغیر میں یہاں سے نہیں جا سکتا۔ ورنہ یہ میرے گلے کا پھندا بن جائیں گے۔''

''اندر کتنے آدمی ہیں؟'' رئیس نے مرے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''ویسے تو چھ آدمی ہیں مگر خطرناک دو ہی ہیں۔ ایک پولیس والا شدید زخمی ہے، اسے تو شاید تہ خانے سے نکالنا ممکن نہیں ہوگا۔ دوسرا بھی زخمی ہے، اسے تم نے روشن دان کے باہر سے گولی ماری تھی۔ مگر وہی سب سے خطرناک ہے۔ جامو اور افتی کو اسی نے مارا ہے۔ اس کے ساتھ جابر بھی ہے۔''

''جابر؟'' رئیس نے حیرت سے کہا۔ ''وہی جابر جو کسی زمانے میں شہر کی دہشت کہلاتا تھا؟''

''ہاں وہی جابر جو اب قبرستان ... کا کیڑا ہے۔'' جہانگیر نے حقارت سے کہا۔ ''مگر وہ آج بہت عجیب لگ رہا ہے۔''

''کیا مطلب باس؟'' رئیس نے تجسس سے پوچھا۔

''وہ بابا بن کر لوگوں کو ان کے کرتوتوں کے بارے میں بتا رہا ہے۔''

رئیس کا تجسس بڑھ گیا مگر جہانگیر نے اس سے آدمیوں کے بارے میں پوچھا جنہیں بلایا گیا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ''میں نے بالی، رشید اور فرحان کو مکمل لوڈ ہو کر آنے کو کہا ہے، وہ آدھے گھنٹے میں یہاں پہنچ جائیں گے۔''

یہ تینوں ان کے خاص آدمی تھے۔ جہانگیر نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ ''یہاں کیا، کیا ہے؟''

''ہمارے پاس اسلحہ تھا مگر وہ جامو اور افتی کے ساتھ اندر رہ گیا۔ اب میرے پاس یہ پستول ہے اور اندر ایک شاٹ گن رکھی ہے۔''

جہانگیر نے اسے گھورا۔ ''کوئی قانونی اسلحہ تو نہیں ہے؟''

''باس، کیا میں احمق ہوں جو ایسی مہم پر قانونی اسلحہ لے کر آؤں۔''

جہانگیر نے اس سے پستول لے لیا۔ ''تم شاٹ گن نکال لو۔''

جہانگیر پستول لے کر واپس آیا تو اس نے عمارت کے پہلو سے احسن، جابر اور تیمور کو نکلتے دیکھا۔ وہ باہر آگئے تھے۔ اس نے آہستہ سے رئیس کو آواز دی جو ڈکی سے شاٹ گن نکال رہا تھا۔ اس نے ڈکی بند کی تو اس سے بلند ہونے والی آواز نے احسن اینڈ پارٹی کو چونکا دیا۔ کھلا گیٹ وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ خطرے کا احساس کرتے ہی وہ سب تیزی سے دوبارہ عمارت کی اوٹ میں چلے گئے۔ جہانگیر کو ان کی طرف سے تشویش نہیں تھی۔ وہ فکرمند نظر سے جلتی عمارت کو دیکھ رہا تھا جس کے شعلے اب باہر آگئے تھے اور یہ شعلے دور تک نظر آتے تو کوئی نہ کوئی فائر بریگیڈ یا پولیس کو کال کر دیتا۔ ابھی جہانگیر یہاں کسی کی مداخلت نہیں چاہتا تھا تاکہ اس کے آدمی سکون سے اپنا کام کر سکیں۔ فی الحال شعلے بلند نہیں تھے اور دھواں نکل رہا تھا مگر رات کی تاریکی اور بادل چھائے ہونے کی وجہ سے یہ نزدیک سے بھی بمشکل دکھائی دے رہا تھا۔ آگ نے بجلی کا بکس اُڑا دیا تھا اور اب اندر تمام روشنیاں بند ہو چکی تھیں۔ آگ چیزوں کو جلا رہی تھی اور تباہ کر رہی تھی اس کی آوازیں باہر تک آ رہی تھیں۔ درمیان میں ایمونیشن کو آگ لگی تو اس کے دھماکے بھی سنائی دیے تھے۔

جہانگیر مطمئن تھا جس طرح کوئی سوائے گیٹ کے تھانے میں گھس نہیں سکتا تھا اسی طرح سوائے گیٹ کے تھانے سے باہر جانے کا اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ وہ جابر کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اسے کیسے علم ہوا کہ اس نے اپنے نوکر اشفاق کو خود شوٹ کیا تھا۔ جہانگیر کا بہت عرصے سے اپنی دوسری بیوی سے جھگڑا چل رہا تھا۔ وہ ایک دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور اسے اسی چیز کا غرور تھا۔ وہ نوجوان بھی تھی اور چاہتی تھی کہ جہانگیر اس کے ناز نخرے برداشت کرے۔ جہانگیر ایسا آدمی نہیں تھا۔ شادی کے شروع دنوں میں اس نے تھوڑا بہت خیال رکھا مگر جلد شازمین کا رویّہ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ خاص طور سے جب اس کی بے وفائی کے قصے جہانگیر کے علم میں آئے اور اس نے شازمین سے کہا تو وہ بے پروائی سے بولی۔ ''ہاں میں دوسرے مردوں سے ملتی ہوں۔ کیا تم دوسری عورتوں سے نہیں ملتے۔ ہمارے طبقے میں یہ عام سی بات ہے۔''

مگر جہانگیر کے لیے عام سی بات نہیں تھی۔ اوپر سے وہ لاکھ ماڈرن سہی لیکن بیوی کے معاملے میں روایتی مرد تھا۔

اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر اطمینان سے وقت کا انتظار کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ شازمین کے گھر والوں کو شک نہ ہو۔ وہ جرائم پیشہ نہیں تھے مگر دولت مند ضرور تھے۔ اس رات جب اسے اپنا کام مکمل کرنا تھا، گڑبڑ ہو گئی۔ عین اس وقت جب وہ شازمین کو ٹھکانے لگا کر اسے ڈکیتی کی واردات کا رنگ دے رہا تھا۔ اشفاق جو شام سے چھٹی لے کر گیا ہوا تھا، غیر متوقع طور پر آ گیا اور اس نے سب دیکھ اور سن لیا اور اپنی بیوقوفی میں وہ جہانگیر کے سامنے آ گیا اور مجبوراً جہانگیر کو اسے ٹھکانے لگانا پڑا۔ اس نے پولیس کو کال کرنے کے بجائے ڈی ایس پی حامد کو کال کی۔ حامد سے اس کے کاروباری تعلقات تھے یعنی وہ اس کے غیر قانونی کاموں کو تحفظ دیتا تھا۔ اس نے پولیس بھیجی مگر آنے والی پارٹی نے اسے ہی گرفتار کر لیا اور لا کر حامد کے حوالے کر دیا۔ جہانگیر کے قبضے میں شہر کے ایک اہم علاقے میں خاصا بڑا پلاٹ تھا اور حامد کی نظر اسی پر تھی۔

حامد نے اس سے کہا کہ اگر وہ اس کیس میں بچنا چاہتا ہے تو یہ پلاٹ اس کے حوالے کر دے۔ مگر جہانگیر کئی لاکھ مالیت کا یہ پلاٹ اس کے حوالے کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ساری گڑبڑ اشفاق کے قتل سے ہوئی تھی۔ جہانگیر نے پولیس کو بیان دیا تھا کہ ڈکیتی کے دوران میں جوابی کارروائی میں اشفاق غلطی سے سامنے آ گیا اور اس کی چلائی گولی اشفاق کو لگ گئی۔ اگر اشفاق نہ آتا تو اصل منصوبہ یہ تھا کہ وہ شازمین کو ٹھکانے لگا کر اور ڈکیتی کا منظر بنا کر گھر سے نکل جاتا اور بعد میں اس کی موجودگی ایک کلب میں ثابت ہوتی اور اس کے گواہ ایسے لوگ ہوتے جن کو پولیس جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ مگر جابر کو کیسے علم ہوا کہ اس نے اشفاق کو جان بوجھ کر مارا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اگر جابر زندہ اس کے ہاتھ آ گیا تو وہ اسے ٹھکانے لگانے سے پہلے یہ بات ضرور پوچھے گا۔ رئیس کی خراب کارکردگی کے باوجود وہ اس سے خوش تھا کہ اس نے ایس آئی کو زخمی کر کے اسے کسی حد تک ناکارہ کر دیا تھا۔ آدھا گھنٹا ہونے کو آ رہا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی اور رئیس سے پوچھا۔

''تمہارے آدمی کہاں ہیں؟''

رئیس نے موبائل نکالا اور کال کرنے جا رہا تھا کہ ہائی وے سے اس سڑک پر ایک گاڑی گھومی اور وہ دونوں چوکس ہو گئے۔ رئیس نے موبائل رکھ کر شاٹ گن سنبھال لی تھی مگر جلد وہ پُرسکون ہو گیا، آنے والے اس کے آدمی تھے۔ گاڑی رکی اور وہ تینوں نیچے آئے۔ تینوں رائفلوں سے مسلح

تھے۔اوران کے پاس خاموش پستول بھی تھے۔ جہانگیر خوش ہو گیا۔اس نے رئیس سے کہا۔ ''اب مزہ آئے گا۔ کسی کو نہیں چھوڑنا ہے، سب کو ٹھکانے لگا دو اور پھر ان کی لاشیں جلتی عمارت میں ڈال دینا۔''

''فکر مت کرو باس کوئی زندہ نہیں بچے گا۔'' رئیس نے کہا اور ان تینوں کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھا۔ جہانگیر ان کے پیچھے تھا۔

☆☆☆

کھلے گیٹ اور پھر باہر سے آنے والی آواز نے احسن کو چونکا دیا۔ اس نے جابر اور تیمور کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا اور وہ دوبارہ تھانے کی عمارت کی آڑ میں آگئے مگر وہ اس کی دیوار کے ساتھ کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ اندر سے تپش آرہی تھی اور.......ٹوٹ جانے والی کھڑکیوں سے دھواں بھی خارج ہو رہا تھا۔ آگ کی لپٹیں اب باہر تک آنے لگی تھیں۔ احسن نے امید سے سوچا کہ اگر شعلے زیادہ بلند ہوئے تو دور سے دکھائی دیں گے اور اس کے بعد مدد آنے کا امکان تھا۔ سامنے احاطے میں پولیس موبائل کے ساتھ تیمور کی اسپورٹس کار اور دو موٹر سائیکلیں کھڑی تھیں۔ موبائل میں ریڈیو تھا۔ مگر اس کے لیے گیٹ کے سامنے سے گزر کر جانا پڑتا اور احسن یہ رسک لینے کے لیے تیار نہیں تھا اسے یقین تھا کہ جہانگیر اور اس کے ساتھی گیٹ کے باہر موجود ہوں گے اور وہ کسی لمحے بھی اندر آسکتے تھے۔ دوسری طرف سے تھانے کی عمارت احاطے کی دیوار سے لگی تھی۔ اگر اس طرف بھی گلی ہوتی تو وہ آرام سے موبائل تک رسائی حاصل کر سکتے تھے۔ وقت گزر رہا تھا اور دوسری طرف سے کوئی حرکت سامنے نہیں آئی تھی۔ احمر نے کہا۔

''شاید وہ بھاگ گئے ہیں۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو۔ کیا تم نے آواز نہیں سنی ہے۔'' احسن نے کہا۔ ''وہ باہر موجود ہیں۔''

''تب اندر کیوں نہیں آرہے؟''

''میرا خیال ہے انہوں نے مزید بندے بلوائے ہیں۔'' جابر بولا۔ ''ممکن ہے پہلے آنے والے تین چار سے زیادہ نہ ہوں۔ ان میں سے دو تو یقینی مارے گئے ہیں۔ اب باقی ہم سے نمٹنے کی ہمت نہیں کر پا رہے اس لیے اور آدمی بلوائے ہیں اور ان کا انتظار کیا جا رہا ہے۔''

ابھی جابر نے بات مکمل کی تھی کہ باہر کسی گاڑی کی روشنی دکھائی دی اور پھر انجن کی آواز آئی۔ وہ گیٹ پر رکی تھی۔ احسن نے کہا۔ ''تمہارا خیال درست ہے، وہ آگئے

مشین

کھیم کرن کے ایک دور افتادہ گاؤں سے سردار ملکھا سنگھ شہر دیکھنے کے شوق میں دہلی گئے۔ گھومتے پھرتے اور حیران ہوتے ہوئے وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی لابی میں جا گھسے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر چیز کو دیکھتے ہوئے، وہ لفٹ کے سامنے جا رکے جس کا دروازہ خودبخود کھل گیا تھا۔ ایک عمر رسیدہ عورت لفٹ میں گئی، دروازہ بند ہو گیا۔ ملکھا سنگھ وہیں کھڑے، اس کمرے سے عورت کی واپسی کا انتظار کرتے رہے، چند منٹ بعد وہی لفٹ دوبارہ نیچے آئی۔ دروازہ کھلا اور ایک شوخ و طرح دار لڑکی برآمد ہوئی اور فرش پر ایڑیوں سے کھٹ کھٹ کرتی ایک طرف چل دی۔

ملکھا سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور بڑبڑائے۔

''کیسی اعلیٰ مشین ہے۔ ذرا سی دیر میں بڑھی کو جوان کر کے نکال دیا۔ پہلے سے پتا ہوتا تو بیوی کو اپنے ساتھ لے آتا۔''

سردار سوڈی سنگھ کا خوشگوار واقعہ امرتسر سے

ہیں۔''

احمر کے منہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ''اب کیا ہو گا؟''

''مقابلہ۔'' احسن نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''یہ ہمیں ختم کرنے کے ارادے سے آئے ہیں اور ہم اسی صورت میں بچ سکتے ہیں کہ انہیں ختم کر دیں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہا ہے صاحب۔'' جابر بولا۔ ''آپ پیچھے جاؤ۔ جولڑ نہیں سکتے ان کو محفوظ جگہ کرو اور جولڑ سکتے ہیں وہ مور چا بنائیں۔''

''اور تم؟''

''میں پہلے یہاں ان کو روکنے کی کوشش کروں گا اگر نہیں روک سکا تو پیچھے آجاؤں گا۔'' جابر نے جواب دیا۔ ''یہ جگہ زیادہ آدمیوں کے لحاظ سے ٹھیک نہیں ہے۔''

احسن نے بھی محسوس کیا کہ یہ جگہ حملے کی صورت میں محفوظ نہیں ہے۔ وہ عمارت کی دیوار سے بھی نہیں لگ سکتے تھے اور کھلی جگہ ہونے کی صورت میں وہ آسانی سے کسی حملے کا نشانہ بن سکتے تھے۔ احسن احمر کے ساتھ پیچھے ہٹا۔ اگرچہ وہ احمر اور تیمور پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا مگر اس نے پوچھا۔ ''تم

کیا کرسکتے ہو؟''

احمر نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔''میں کیا کرسکتا ہوں۔میرے پاس کچھ نہیں ہے۔''

اسی اثنا میں تیمور آگے آیا۔اس نے احسن سے کہا۔

''کیا ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے ؟''

''یہاں سے کوئی نہیں نکل سکتا ہے۔'' احمر نے سرد لہجے میں جواب دیا اور پھر اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ تیمور بھی فکر مند ہوگیا تھا۔احسن نے اس سے پوچھا۔

''تمہیں پستول چلانا آتا ہے؟''

تیمور نے نفی میں سر ہلایا۔احمر جلدی سے بولا۔''مجھے چلانا آتا ہے۔''

احسن نے اسے غور سے دیکھا اور درختوں کی طرف چل پڑا۔نازیہ، رحیم خان کے ساتھ تھی۔احسن نے انہیں بتایا کہ حملہ آور شاید پھر آنے والے تھے۔ابھی اس نے کہا تھا کہ فضا شاٹ گن کے دھماکے سے گونجی۔آواز نزدیک سے آئی تھی اور شاید جابر نے فائر کیا تھا۔اس کے فوراً بعد بے تحاشا فائرنگ شروع ہوگئی۔احسن نے نازیہ اور تیمور سے کہا۔''تم لوگ رحیم خان سمیت جھاڑیوں کے اندر چلے جاؤ اور زمین پر لیٹ کر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں چھپالو۔''

نازیہ اور تیمور نے سہارا دے کر رحیم خان کو اٹھایا اور اسے جھاڑیوں میں اندر لے جانے لگے۔اچانک ہی بہت بڑا دھماکا ہوا اور آسمان روشن ہوگیا۔بجلی کڑک کر کہیں گری تھی اور یہ اسی کا دھماکا تھا۔اس کے ساتھ ہی موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔احسن، احمر کے ساتھ احاطے میں دائیں طرف ایک ہی جگہ اُگے بڑے تنے والے دو درختوں کی طرف بڑھا یہاں سے سامنے والا حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ اگر کوئی آتا تو ان کی نظروں سے بچ کر نہ آتا۔جابر عمارت کے وسط تک آگیا تھا۔اچانک دوسری سمت سے ایک شخص نمودار ہوا اور اس نے برسٹ مارا۔جابر نے جوابی فائر کیا مگر وہ برسٹ مار کر واپس آڑ میں جا چکا تھا۔جابر لڑکھڑاتا ہوا پیچھے آیا۔احسن نے محسوس کیا کہ وہ زخمی ہوگیا تھا۔اس نے چلا کر جابر کو آواز دی اور درختوں کی طرف آنے کو کہا مگر اس نے اشارے سے منع کیا اور عمارت کے عقبی حصے میں آگیا۔ اس نے یہاں مورچا بنالیا۔احسن نے پستول احمر کی طرف بڑھایا اور بولا۔

''تم آگے رہو گے مگر گولیاں احتیاط سے خرچ کرنا اندھا دھند فائرنگ مت کرنا، میں تمہارے پیچھے ہوں۔''

احمر بادلِ ناخواستہ آگے والے تنے کی اوٹ میں ہوا۔اس سے پچھلا تنا ذرا دائیں طرف تھا۔احسن نے اسے خبردار کیا کہ وہ اس کی فائرنگ لائن سے دور رہے۔ ورنہ وہ بھی نشانہ بن سکتا ہے۔جابر ذرا آگے دیوار سے لگا کھڑا تھا اور وقفے وقفے سے سر نکال کر دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔بارش اتنی تیز تھی کہ اس نے ایک منٹ سے بھی پہلے عمارت کے باہر تک پھیل جانے والی آگ بجھا دی تھی اور اب بجھے حصوں سے دھواں اٹھ رہا تھا مگر بارش اسے بھی منتشر کررہی تھی۔احسن کو مایوسی ہوئی۔بارش نے آگ بجھا دی تھی اور اب کسی کے خبردار ہوکر اس طرف آنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا مگر ساتھ ہی بارش نے انہیں موقع دیا تھا کہ وہ اپنا دفاع بہتر انداز میں کرسکتے تھے۔یہاں تاریکی شدید تھی اور صرف عمارت کے پاس اندر جلتی آگ کے انعکاس کی کچھ روشنی تھی۔احسن نے چلّا کر جابر سے پوچھا۔

''تم زخمی ہو؟''

''ہاں لیکن معمولی زخم ہے۔'' اس نے بھی چلّا کر جواب دیا۔''تم فکر مت کرو میں کسی کو آگے نہیں آنے دوں گا۔''

احسن کے زخم کی تکلیف کم تھی اور وہ اپنا بایاں ہاتھ بہتر طور پر استعمال کرسکتا تھا۔احاطے میں سامنے تاریکی تھی۔خاص طور سے جو حصے عمارت سے دور تھے وہاں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔پانی کی چادر بھی نظر میں رکاوٹ ثابت ہو رہی تھی۔اچانک احسن کو محسوس ہوا کہ احاطے کی دیوار کے ساتھ کوئی آگے آرہا ہے۔وہ دیوار سے جڑا ہوا تھا اس لیے نظر نہیں آرہا تھا۔بجلی وقفے وقفے سے چمک رہی تھی۔ایک بار بجلی چمکی تو احسن کو احساس ہوا ورنہ وہ تو ذرا اوپر اور درمیان میں دیکھ رہا تھا۔اس بار احسن نے نظریں اس طرف جما دیں اور ایک بار بجلی چمکی تو اس نے دیکھ لیا دیوار کی جڑ کے ساتھ دو افراد تھے جو لیٹ کر آگے بڑھ رہے تھے۔وہ ابھی دور تھے۔احسن نے آہستہ سے احمر کو متوجہ کیا۔''اے وہ دیکھو.... دو آدمی ہیں.... مگر فائر مت کرنا۔''

احمر سمجھا نہیں تھا۔کئی بار سمجھانے اور بتانے کے بعد وہ سمجھا اور پھر بجلی چمکی تو اس نے دیکھ بھی لیا۔وہ پُرجوش ہو گیا۔''میں فائر کروں۔''

''نہیں، جب تک میں فائر نہ کروں، تم بھی مت کرنا اور فائر کی صورت میں تم پیچھے والے کو نشانہ بناؤ گے۔میں آگے والے کو نشانہ بناؤں گا۔''

''میں سمجھ گیا جناب۔'' احمر نے مستعدی سے کہا۔ احسن ان کے اتنے نزدیک آنے کا انتظار کررہا تھا کہ نشانہ

خطا جانے کا امکان کم ہو۔ اسے امید تھی کہ ایک دو مارے گئے تو ان کا پلہ پھر بھاری ہو جائے گا۔ وہ ابھی کوئی ساٹھ ستر فٹ دور تھے۔ احسن ان کے پچاس فٹ کے اندر آنے کا انتظار کر رہا تھا مگر اس صورت میں وہ عمارت کے نزدیک آجاتے اور جابر کو خطرہ ہو سکتا تھا۔ وہ اسے ان سے خبردار بھی نہیں کر سکتا تھا ورنہ وہ بھی ہوشیار ہو جاتے۔ احسن انہیں بے خبری میں شکار کرنا چاہتا تھا۔ وہ وقفے وقفے سے چمکنے والی بجلی کی روشنی میں ان پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ بالآخر وہ اتنے نزدیک آگئے کہ احسن نے فائر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اچانک چلا کر کہا۔

''فائر۔'' ساتھ ہی اس نے آگے والے پر فائر کیا مگر نشانہ غلط رہا اور وہ اچھل کر بھاگا تھا۔ عقب سے احمر نے بھی اس پر فائر کیا مگر وہ جابر کے ہاتھوں مارا گیا کیونکہ بدحواسی میں وہ بالکل اس کے سامنے جا نکلا تھا۔ احسن نے اسے ڈھیر ہوتے دیکھا مگر اسے دوسرا فرد کہیں نظر نہیں آیا۔ شاید وہ لیٹے لیٹے پیچھے کھسک رہا تھا۔ احسن آگے بڑھا اور اس نے شاٹ گن کا رخ اسی طرف رکھا تھا۔ اس بار بجلی چمکی تو وہ اسے نظر آگیا۔ وہ شدید زخمی تھا اور احسن نے جو گولی سامنے والے پر چلائی تھی، وہ سے جا لگی تھی۔ گولی نے اس کی پشت گردن سے نیچے ادھیڑ دی تھی اور وہ بس چند لمحوں کا مہمان لگ رہا تھا۔ وہ ابھی اس کا معائنہ کر رہا تھا کہ اچانک فائر کی آواز گونجی اور جابر جو ذرا فاصلے پر تھا، نیچے گرا۔ ایک لمحے کو احسن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا ہے مگر دوسرے لمحے احمر کو بھاگتے دیکھ کر وہ سمجھ گیا۔ احمر کا رخ سامنے والے حصے کی طرف تھا۔ احسن نے شاٹ گن کا رخ اس کی طرف کیا مگر پھر فائر کیے بنا جابر کی طرف بھاگا تھا۔

☆☆☆

جہانگیر اور اس کے ساتھی اندر آگئے تھے۔ جابر کی طرف سے ان پر فائر ہوا مگر انہوں نے ایک ساتھ جواب دیا تو اسے پیچھے ہٹنا پڑا تھا۔ اب وہ احاطے میں تھے۔ رئیس نے فوری منصوبہ بنایا اور اپنے دو ساتھیوں بالی اور رشید کو حکم دیا۔ ''احاطے کی دیوار کے ساتھ لگ کر جاؤ اور جو نظر آئے اسے شوٹ کر دو۔''

وہ روانہ ہوئے تھے۔ رئیس خود دیوار سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ بارش نے ان کا کام آسان کر دیا تھا۔ ایک تو عمارت میں لگی آگ بجھ رہی تھی اور اب دور سے آگ دیکھ لیے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ دوسرے وہ اب عمارت کے پاس آسکتے تھے کیونکہ اس کی تپش کم ہو رہی تھی۔ فرحان گیٹ کی نگرانی کر رہا تھا۔ البتہ جہانگیر اس کے پاس تھا۔ اچانک شاٹ گن کا دھماکا ہوا اور بالی یا رشید میں سے ایک اچھل کر بھاگا مگر وہ عمارت کے پاس آیا تو نزدیک سے کسی نے اس پر فائر کیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ بجلی چمکی تو رئیس نے دوسرے کو بھی دیوار کے پاس دیکھ لیا اس سے ذرا فاصلے پر پولیس والا کھڑا تھا۔ رئیس نے رائفل سیدھی کی مگر جب بجلی کی روشنی ختم ہوئی تو وہ بھی نظر آنا بند ہو گیا اور اب رئیس دوبارہ بجلی چمکنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جہانگیر مضطرب تھا۔ اس نے عقب سے پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

''بالی اور رشید مارے گئے۔'' رئیس نے آہستہ سے کہا۔

''لعنت ہو۔'' جہانگیر غرایا۔ ''مجھے پہلے ہی یہ پلان کمزور لگ رہا تھا۔''

''تو آپ اس وقت مجھے منع کر دیتے۔''

جہانگیر کچھ کہنے جا رہا تھا کہ ایک فائر ہوا اور فائر مخالف سمت سے ہوا تھا۔ یہ پستول کا فائر تھا مگر نشانہ وہ نہیں تھے کیونکہ وہ آڑ میں تھے۔ اچانک کوئی چلاتا ہوا نزدیک آنے لگا۔ وہ چلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''گولی مت چلانا، یہ میں ہوں، میں نے جابر کو مار دیا ہے۔''

''گولی مت چلانا۔'' جہانگیر جلدی سے بولا اور اس نے احمر سے کہا۔ ''اپنے دونوں ہاتھ اوپر کر کے آؤ، اگر کوئی ہتھیار نظر آیا تو تمہیں گولی مار دیں گے۔''

احمر نے جلدی سے پستول پھینک دیا اور دونوں ہاتھ بلند کر کے آگے آیا۔ کسی قدر روشنی میں جہانگیر اور رئیس نے اسے دیکھا۔ رئیس نے اس کی تلاشی لی اور جہانگیر کی طرف دھکیل دیا۔ اس نے پوچھا۔ ''تم نے جابر کو مار دیا؟''

''ہاں انسپکٹر نے مجھے پستول دیا تھا کہ آپ لوگوں کے خلاف استعمال کروں مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اسے اس کے خلاف ہی استعمال کروں گا۔'' وہ جوش سے بولا۔ ''دیکھیں، میں نے پہلے بھی آپ کا ساتھ دیا تھا اور اب بھی دے رہا ہوں۔ آپ مجھے یہاں سے نکال دیں۔''

''کیوں نہیں۔'' جہانگیر نے معنی خیز انداز میں کہا اور پستول کا رخ احمر کی طرف کر دیا۔ ''میں تمہیں ضرور لے جاؤں گا۔''

''یہ کیا کر رہے ہیں؟'' احمر بوکھلا گیا۔

''فرحان کو بلاؤ۔'' جہانگیر نے رئیس کو حکم دیا۔ رئیس نے پلٹ کر ہلکی سی سیٹی بجائی تو فرحان دوڑا آیا۔

''حکم جناب۔''

''اسے آگے رکھو اور اس کے پیچھے چلو۔'' جہانگیر نے حکم دیا۔

''کیا مطلب؟'' احمر نے کہا۔ ''کیا تم مجھے ڈھال کے طور پر استعمال کرو گے؟''

''اب تم سمجھ گئے ہو۔'' رئیس نے اسے گھمایا اور اپنی شاٹ گن اس کی پشت سے لگا دی۔ ''کوئی حماقت کرنے سے پہلے یاد رکھنا، موت تم سے ایک فٹ کے فاصلے پر ہے۔''

''اب چلو۔'' جہانگیر نے حکم دیا تو احمر لرزتے قدموں سے آگے چل پڑا۔ وہ تینوں اس کے پیچھے ایک قطار میں تھے۔

☆☆☆

جابر زمین پر گرا ہوا تھا اور اس کے بائیں پہلو سے خون بہہ رہا تھا۔ پہلی گولی اس کی ران کو زخمی کرتے گئی تھی مگر یہ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ البتہ احمر نے جو گولی چلائی تھی، اس نے کاری زخم دیا تھا۔ احسن نے ہاتھ سے زخم دبا کر خون روکنے کی کوشش کی تو جابر کراہ اٹھا اور بولا۔ ''صاحب کہا تھا نا کہ یہ اچھا بندہ نہیں ہے۔''

''چپ رہو۔'' احسن نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور جھاڑیوں کی طرف بڑھا۔ جابر اس کا دستِ راست ثابت ہو رہا تھا۔ اس کا زخمی ہونا بہت بڑا نقصان تھا۔ اب وہ ان لوگوں سے نمٹنے کے لیے اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ جابر کو جھاڑیوں میں لایا جہاں تیمور پہرا دے رہا تھا۔ وہ آگے آیا اور اس نے جابر کو سنبھال لیا۔ نازیہ نے اس کے زخم کو ٹٹول کر دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

''گولی خطرناک جگہ لگی ہے۔''

''فکر مت کرو صاحب، میں اتنی جلدی نہیں مروں گا۔'' جابر نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''ان کی فکر کرو وہ اب ادھر آئیں گے۔''

جابر لڑنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ احسن نے تیمور سے کہا۔ ''تم شاٹ گن چلا لو گے؟''

اس نے انکار کیا۔ ''میں نہیں چلا سکتا، میرا دل کمزور ہے۔''

''اس وقت دل کمزور نہیں تھا جب اس بے چارے کو مارا تھا۔'' جابر نے اتنے آہستہ سے کہا کہ صرف تیمور سن سکا تھا۔ ''ابھی وقت ہے۔ اس کے بارے میں بتا دو۔''

تیمور خاموش رہا۔ نازیہ اپنی شال کے باقی حصے سے جابر کے زخم کی پٹی کر رہی تھی۔ ویسے بھی اس برستی بارش میں شال بیکار تھی۔ احسن کھڑا دیکھ رہا تھا۔ جابر نے اس کی طرف دیکھا۔ ''جاؤ صاحب، مجھے یقین ہے وہ اس سیانے کو بھی استعمال کریں گے یا مار دیں گے ویسے وہ اسی سلوک کا مستحق ہے۔''

احسن باہر کی طرف بڑھا تو نازیہ نے آہستہ سے جابر سے پوچھا۔ ''احمر کیوں اس سلوک کا مستحق ہے؟''

''اس نے بہت بڑا ظلم کیا ہے۔'' جابر نے جواب دیا۔ ''میں بتا نہیں سکتا مگر اس کی سزا دنیا میں موت ہے۔''

''تم نے سرخ اور نیلی والی بچی کا حوالہ کیوں دیا؟'' نازیہ کے لہجے میں اصرار تھا۔ ''کیا اس کی گمشدگی کا تعلق احمر سے ہے؟''

اس بار جابر نے اثبات میں سر ہلایا مگر منہ سے نہیں بولا۔ نازیہ نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ جب وہ بولی تو اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ ''اس نے بچی کے ساتھ کیا کیا؟''

''جو ایک شیطان صفت انسان کر سکتا ہے۔'' جابر نے اس بار بھی واضح جواب نہیں دیا مگر اس کا جواب واضح تھا۔ ''وہ بالکل بھی اچھا آدمی نہیں ہے اور نہ ہی تمہارے قابل ہے۔''

''کاش میں پہلے اس کی اصلیت جان جاتی۔''

☆☆☆

احسن اور تیمور جھاڑیوں سے آگے ایک درخت کے ساتھ کھڑے تھے۔ ان کی نظریں عمارت کے کونے پر مرکوز تھیں۔ آنے والے اسی سمت سے نمودار ہو سکتے تھے۔ یہ کونا عمارت کے دائیں اور عقبی حصے والا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک سایہ نمودار ہوا۔ احسن نے شاٹ گن سامنے رکھی تھی مگر فوراً اس نے دیکھ لیا کہ وہ احمر تھا۔ جابر کی یہ بات بھی درست ثابت ہو رہی تھی کہ وہ اسے استعمال کریں گے۔ وہ اسے ڈھال بنا کر لائے تھے۔ احمر آگے نہیں آنا چاہ رہا تھا مگر کسی نے اسے پیچھے سے دھکا دیا اور وہ زیادہ نمایاں ہو گیا۔ احسن نے گولی نہیں چلائی۔ اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا کہ وہ اسے آزما رہے تھے۔ اس نے اشارے سے تیمور کو پیچھے جانے کو کہا کیونکہ تنے کے پیچھے دو افراد کے روپوش ہونے کی گنجائش نہیں تھی۔ تیمور دبے قدموں پیچھے ہٹا اور جھاڑیوں میں چلا گیا۔ احسن اپنے پاس بلٹ دیکھ رہا تھا۔ پستول جا چکا تھا مگر شاٹ گن کے ابھی گیارہ بلٹ باقی تھے اور چار شاٹ گن میں تھے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ آخری بلٹ تک لڑے گا۔ وہ آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالے گا۔ اچانک جہانگیر کی آواز آئی۔

''ایس آئی تم میری آواز سن رہے ہو؟''

بارش کے شور میں اس نے بلند آواز سے کہا تھا۔ احسن نے جواب نہیں دیا۔ جہانگیر کچھ دیر بعد دوبارہ بولا۔

"اگر تم ہتھیار ڈال کر سامنے نہیں آئے تو میں اس لڑکے کو شوٹ کر دوں گا۔"

"شوق سے کرو۔" احسن نے دل میں کہا۔ "یہ ہے بھی اسی قابل۔"

وہ سمجھ رہا تھا کہ جہانگیر اس کی پوزیشن جاننا چاہ رہا ہے اس لیے وہ قطعی خاموش رہا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ کوئی سامنے آئے اور وہ اس پر شاٹ گن آزما سکے۔ یہاں سے کنارہ زیادہ دور نہیں تھا۔ ان لوگوں نے اس کے آدمیوں اور اس کے ٹھکانے کے ساتھ جو کیا تھا اس کے اندر ان کے لیے ذرا بھی رحم باقی نہیں رہا تھا۔ تین آدمی اس کے ہاتھ سے مارے گئے تھے مگر اس کی پیاس اور بھڑک اٹھی تھی۔ جہانگیر کو جب اس کی طرف سے جواب نہیں ملا تو اس نے مایوس ہو کر پہلی حکمت عملی پر عمل درآمد کا فیصلہ کیا۔ احمر کے پیچھے ایک آدمی نمودار ہوا اور اس سے بالکل چپک کر اسے آگے دھکیلنے لگا۔ اس کے پیچھے ایک آدمی اور تھا۔ دونوں نے شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا اور ان میں جہانگیر نہیں تھا۔ وہ یقیناً ابھی تک دیوار کی اوٹ میں تھا۔ احسن نے ایک بار پھر گولی چلانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اگر جہانگیر ہوتا تو وہ احمر کی پروا بھی نہ کرتا۔ وہ لوگ سیدھ میں آ رہے تھے اور اب وہ تینوں الگ الگ احسن کو نظر آ رہے تھے۔

اصل میں وہ سمجھ رہے تھے کہ احسن نے بڑے تنوں والے درختوں کے عقب میں مورچا بنایا ہوگا۔ اس لیے انہوں نے احمر کو اسی سمت میں آگے رکھا تھا جبکہ احسن درمیان میں درخت کے پیچھے تھا۔ وہ تینوں بالکل کھلی جگہ آ گئے تھے۔ تب جہانگیر اچانک کنارے سے نکلا اور بھاگ کر ان تینوں کے ساتھ آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی احسن حرکت میں آیا اور اس نے پہلے اس شخص کو نشانہ بنایا جو جہانگیر کے پاس تھا۔ گولی لگتے ہی وہ ذبح کیے بکرے کی طرح چلایا اور گھوم کر گرا۔ احسن نے دوسری گولی جہانگیر پر چلائی تھی مگر وہ بھاگ گیا تھا اور بچ گیا۔ اسی دوران میں احمر کے ساتھ موجود فرد نے برسٹ مارا اور احسن تنے کے پیچھے ہو لیا مگر جیسے ہی برسٹ رکا، اس نے دوبارہ شاٹ گن سیدھی کی اور دوسرے آدمی کو بھی شوٹ کر دیا۔ وہ اچھلا تو اس کے سینے کا بڑا سا سوراخ صاف دکھائی دیا تھا۔

یہ جگہ عمارت اور روشنی سے ذرا دور تھی اس لیے احسن کو ذرا تاخیر سے جہانگیر اور احمر کی گمشدگی کا احساس ہوا۔ وہ یقیناً آگے درختوں میں گھس گئے تھے۔ احسن نے جلدی سے شاٹ گن کے خالی ہو جانے والے خانوں میں نئے کارتوس ڈالے۔ اب وہ منتظر تھا کہ جہانگیر یا کوئی اور ہے تو سامنے آئے مگر کوئی سامنے نہیں آیا۔ جن افراد کو اس نے نشانہ بنایا تھا، وہ ساکت پڑے تھے۔ مر چکے تھے یا بے ہوش تھے۔ پھر درختوں کی طرف سے ایک سایہ نمودار ہوا اور احسن نے ٹریگر دبایا مگر گولی نہیں چلی۔ اس نے پھر کوشش کی اور اس بار بھی شاٹ گن نے کام نہیں کیا۔ شاید اس میں کوئی مسئلہ آ گیا تھا۔ احسن نے اسے ہلایا اور نال درخت کے تنے پر ماری۔ مگر شاٹ گن ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کے ہتھیار نے بہت غلط وقت پر دغا کی تھی۔ اس کے پاس ایک یہی ہتھیار تھا اور دوسری شاٹ گن جابر کے پاس پڑی تھی۔

وہ مشکل میں تھا۔ نہ تو تنے کے پیچھے سے نکل سکتا تھا اور نہ ہی آواز دے کر شاٹ گن مانگ سکتا تھا۔ ایک بار جہانگیر کو علم ہو جاتا کہ اس کی گن ناکارہ ہو گئی ہے تو وہ اس موقع سے لازمی فائدہ اٹھاتا۔ وہ یقیناً فرار کی کوشش کرتا اور احسن اب اسے کسی صورت فرار کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھا۔ اس لیے اس نے انتظار کرو اور دیکھو کی پالیسی اپنانے کا فیصلہ کیا۔ اسے امید تھی کہ اس کے ساتھی بھی سامنے آنے کی حماقت نہیں کریں گے۔ ہیولا بجلی چمکنے پر احمر ثابت ہوا تھا۔ اس لحاظ سے بھی اچھا ہی ہوا کہ احسن سے گولی نہیں چلی ورنہ وہ مارا جاتا۔ اس کے پیچھے جہانگیر تھا اس نے بلند آواز سے کہا۔ "انسپکٹر میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔ مجھے یہاں سے جانے دو اگر تم نے گولی چلائی تو یہ مارا جائے گا۔"

احسن فکرمند ہو گیا۔ جہانگیر جانے کی بات کر رہا تھا، اس کا مطلب تھا کہ وہ اکیلا رہ گیا ہے۔ اگر وہ احمر کو ڈھال بنا کر نکلنے کی کوشش کرتا تو احسن اسے روکنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس نے سوچا اور شاٹ گن تان کر سامنے آ گیا۔

"جہانگیر میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔"

جہانگیر عقب میں احمر کے جسم سے یوں چپکا ہوا تھا کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ الگ سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "اگر تم نے مجھے روکا تو میں اسے مار دوں گا۔"

"اگر تم اسے مار دو گے تو کیا تم بچ جاؤ گے؟" احسن نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ جہانگیر، احمر سمیت آہستہ آہستہ کھسک رہا تھا اور اب وہ درختوں سے نکل کر کھلے میں آ گیا تھا۔ احسن بھی اس کے ساتھ حرکت کر رہا تھا۔ یہی بات جہانگیر بھی سوچ رہا تھا۔ احمر کے ساتھ ساتھ گیٹ تک جانا اور وہاں سے یوں نکلنا کہ احسن اس کے پیچھے آنے کے لیے آزاد ہو اس کے لیے آسان کام نہیں تھا۔ ایسے میں اس کے ذہن

میں ایک ہی حل آیا تھا۔ اس نے اچانک پستول احمر کی پشت سے ہٹا کر احسن پر فائر کیا۔ وہ اس پر پوری طرح نظر رکھے ہوئے تھا۔ پستول کی جھلک دیکھتے ہی اس نے دائیں طرف چھلانگ لگائی اور زمین پر گر گیا۔ وہ پہلی گولی سے بچ گیا مگر جب وہ اٹھنے لگا تو اس نے جہانگیر کے پستول کا رخ اپنی طرف پایا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''اب بچ کر دکھاؤ۔''

جہانگیر نے ٹریگر دبایا تو دھماکا بہت بڑا تھا۔ احسن نے سر نیچے کرلیا۔ وہ محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ گولی کہاں لگی ہے۔ مگر جب اس نے سر اٹھایا تو احمر اور جہانگیر اوپر تلے ڈھیر تھے۔ وہ اٹھ کر لڑکھڑاتے قدموں سے ان کی طرف بڑھا۔ احمر یقینی مر چکا تھا کیونکہ اس کے سینے میں چھ انچ سے بڑا سوراخ تھا۔ اس کے تلے دبا جہانگیر آخری سانسیں لے رہا تھا۔ گولی احمر کے جسم سے گزر کر اس کے جسم میں اتری تھی۔ یہ شاٹ گن کا بڑا بلٹ تھا۔ جہانگیر نے اسے دیکھا اور سسکتے ہوئے بولا۔ ''جابر نے ٹھیک کہا تھا۔''

اس سے پہلے احسن کچھ کہتا، اس نے بھی دم توڑ دیا۔ احسن نے پلٹ کر دیکھا تو نازیہ شاٹ گن تانے سکتے کی سی کیفیت میں کھڑی تھی۔ احسن اس کی طرف بڑھا اور نرمی سے اس کے ہاتھ سے شاٹ گن لے لی۔ نازیہ کا سکتہ ٹوٹ گیا اور اس نے روتے ہوئے احسن کے شانے پر سر رکھ دیا۔ وہ اس کا سر تھپک رہا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ رحیم خان اور جابر کو فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ وہ جھاڑیوں میں آیا اور اس نے تیمور سے پوچھا۔ ''کیا تم اپنی گاڑی کسی اور طرح سے اسٹارٹ کر سکتے ہو؟''

''بالکل کر سکتا ہوں سر۔'' اس نے مستعدی سے جواب دیا۔ ''میں نے ایک خفیہ جگہ ایکسٹرا چابی رکھی ہے۔''

''تب فوراً چلو۔'' احسن نے کہا۔ ''پہلے ان دونوں کو اسپتال لے جانا ہے۔''

☆☆☆

احسن اور نازیہ جھیل کے کنارے بیٹھے تھے۔ نازیہ کا بیگ اس کے پاس تھا۔ نازیہ کہہ رہی تھی۔ ''ہوش سنبھالا تو خود کو اجنبیوں کے درمیان دیکھا۔ انہوں نے مجھے پالا مگر ایسے جیسے کسی جانور کو پالتے ہیں۔ کوئی برا سلوک نہیں کیا مگر محبت بھی نہیں دی۔ ان کے اپنے بچے تھے اور انہوں نے ساری محبت ان کے لیے وقف کی ہوئی تھی۔ میرے لیے ان کے پاس صرف خدا ترسی تھی۔ انہوں نے مجھے پڑھایا مگر میٹرک کے بعد میں نے اپنا خرچہ خود اٹھانا شروع کر دیا۔ میں کالج میں پڑھتی تھی اور ساتھ ہی شام کے وقت ایک کلینک میں کام کرنے لگی تھی۔ کام مجھے اس لیڈی ڈاکٹر نے سکھایا جس کا کلینک تھا۔ ایف ایس سی کے بعد اسی نے مجھے نرسنگ کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے نرسنگ میں داخلہ لیا۔ دوسری طرف اب میں ان لوگوں کے لیے ناقابلِ برداشت نہیں رہی تھی کیونکہ ان کا بیٹا جوان تھا اور وہ مجھ میں دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اب میں ان کے گھر سے چلی جاؤں مگر میں کہاں جاتی؟

شاید اسی پریشانی میں، میں نے احمر کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بہت عرصے سے میرے پیچھے تھا مگر میں اسے نظر انداز کر رہی تھی اور پھر وہی مجھے سہارا محسوس ہونے لگا۔ اس نے مجھے گھر سے نکلنے پر اکسایا۔ اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی نیت خراب تھی ورنہ وہ اپنا رشتہ بھیجتا تو انکار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے مجھے اکسایا اور سچی بات ہے، میں بھی تیار تھی۔ ورنہ کیوں یہ اندھا قدم اٹھاتی ....'' نازیہ کہتے ہوئے چپ ہوگئی اور اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے کسی قدر زرد پڑ جانے والی گھاس کو کریدنے لگی۔ احسن نے اسے دیکھا۔

''اب کیا ارادہ ہے؟''

نازیہ نے گہری سانس لی۔ ''پہلے امتحان دوں گی اور اس کے بعد جاب تلاش کروں گی۔''

احسن نے نازیہ کے لیے ایک وومین ہاسٹل میں جگہ حاصل کی تھی۔ وہ تین ہزار دے کر یہاں ایک کمرا شیئر کر سکتی تھی۔ احسن نے حسین نواز سے اس کی رقم بھی نکلوالی تھی۔ اب نازیہ کے پاس تقریباً پچاس ہزار روپے تھے۔ ان کی مدد سے وہ پانچ چھ مہینے گزارا کر سکتی تھی۔ ایک رات اس نے دارالامان میں گزاری تھی اور اب احسن اسے وہاں سے لے کر وومین ہاسٹل چھوڑنے جا رہا تھا۔ یہ اس کی ذمے داری تھی۔ ایک مہینے بعد نازیہ کا امتحان تھا۔ راستے میں نازیہ نے اس سے کہا کہ وہ اس سے بات کرنا چاہتی ہے تو اس نے موٹر سائیکل کا رخ جھیل کی طرف موڑ دیا۔ ''اللہ کا شکر ہے اس نے اس مشکل سے نکالا مگر مجھے جابر کا افسوس ہے۔''

''اس کی آخری پیش گوئی بھی درست ثابت ہوئی۔'' احسن نے افسوس سے کہا۔ ''ٹھیک نو بجے اس نے دم توڑ دیا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا اور اس نے کیا دیکھا جس نے اسے بدل کر رکھ دیا تھا۔''

''ہاں لیکن وہ ہمارے لیے اچھا کر گیا۔ ہماری جان بچانے میں اس کا بہت بڑا کردار ہے۔'' نازیہ نے کہا۔

''مجھے یقین ہے اس کے ساتھ اب اچھا ہوگا۔''

احسن نے سر جھٹکا۔ ''پتا نہیں اسے یہ سب کیسے معلوم ہوا۔ جہانگیر کے نوکر کی لاش سے اسی کے پستول کی گولی نکلی اور جس ہتھیار سے اس نے اپنی بیوی کو قتل کیا تھا وہ بھی مع اس کے ہاتھوں کے نشان کے مل گیا۔ پھر تیمور نے اعتراف کیا کہ اس نے ایک آدمی کو غلطی سے گاڑی سے ٹکر ماری تھی۔ رحیم خان اور جابر کو اسپتال پہنچا کر ہم اس جگہ پہنچے تو وہ آدمی زندہ تھا اور اب اس کی حالت بہتر ہے۔ اس کے علاج کا تمام خرچ تیمور کی فیملی برداشت کر رہی ہے۔''

''اس کی جان بھی جابر نے بچائی۔'' نازیہ نے سر ہلایا۔ ''درحقیقت تمہاری جان بھی اسی نے بچائی جب اس نے مجھے مجبور کر کے شاٹ گن تھمائی اور کہا کہ تمہیں بچاؤں ورنہ جہانگیر تمہیں مار دے گا۔ اسی کے اصرار پر میں نے ہمت کی۔''

''تم بروقت آئیں۔'' احسن مسکرایا۔ پھر اسے احمر کا خیال آیا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے کہ احمر اس معصوم بچی کی گم شدگی میں ملوث ہے؟''

''مجھے یقین ہے اور میں نے اسی یقین کے سہارے گولی چلائی تھی۔'' نازیہ بولی اور احسن کی طرف دیکھا۔ ''میں تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے اس معاملے سے الگ رکھا۔ ورنہ پولیس انکوائری کے چکر میں، میں امتحان سے تو ضرور رہ جاتی۔''

''اسی لیے میں نے تمہیں الگ کر دیا۔'' احسن نے سر ہلایا۔ ''میری بھی مجبوری تھی۔ پولیس اسلحے کا غیر ہاتھوں میں جانا میرے لیے بہت بڑا مسئلہ بن جاتا..... اس لیے تمہیں اور جابر کو کٹ کر دیا۔ رحیم خان کی واہ واہ ہو رہی ہے کہ اس نے زخمی ہونے کے باوجود پامردی سے مجرموں کا مقابلہ کیا اور انہیں جہنم رسید بھی کیا۔''

نازیہ ہنسی۔ ''حالانکہ سب آپ نے ہی کیا ہے مگر آپ نے رحیم خان کے سر سہرا باندھ دیا۔''

''وہ مستحق بھی ہے کیونکہ اس کا ٹخنہ بہت متاثر ہوا ہے۔ اب وہ شاید ایکٹو ڈیوٹی کے لیے فٹ نہ رہے اور اسے کہیں دفتری ڈیوٹی مل جائے گی۔ اگر اس کا رینک اور تنخواہ بڑھ جائے تو اس کی معذوری کا کسی حد تک ازالہ ہو جائے گا۔ مجھے ممتاز اور شرافت کا افسوس ہے۔ بہرحال اسے دہشت گردانہ حملہ قرار دیا گیا ہے اس لیے امید ہے ان کے لواحقین کو اچھا خاصا معاوضہ اور مراعات ملیں گی۔''

''آپ کو کیا ملے گا؟''

اس سے پہلے احسن کوئی جواب دیتا، عقب میں کسی گاڑی کا انجن گرجتا ہوا آیا اور ذرا دور رک گیا۔ یہ نارنجی اسپورٹس کار تھی اور اس سے تیمور اترا تھا۔ وہ ان کی طرف آیا اور خوشگوار لہجے میں بولا۔ ''ہیلو ایوری باڈی، جھیل کا نظارہ کیا جا رہا ہے۔''

''نہیں ہم بات کر رہے تھے۔'' احسن نے گویا صفائی پیش کی۔

''میں یہاں سے گزر رہا تھا تو آپ پر نظر پڑ گئی۔''

''تمہاری نظر بہت تیز ہے۔'' نازیہ نے کہا۔ ''مین روڈ یہاں سے خاصی دور ہے۔''

تیمور کھسیا گیا۔ ''ہاں مگر پھر بھی نظر پڑ گئی۔''

''برخوردار لگتا ہے تم دیر سے نظر رکھے ہوئے تھے۔'' احسن مسکرایا۔

تیمور بھی مسکرانے لگا۔ ''میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''نہیں ضرورت ہے۔'' اس نے جذباتی ہو کر کہا۔ ''آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو مجھے لمبے کیس میں پھنسا دیتا اور میرے باپ سے لمبی رقم کھینچتا مگر آپ نے تو مجھے بالکل صاف نکال دیا۔''

''اس لیے کہ تم نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور ایک بے گناہ کی جان بچ گئی۔''

''یہ جابر کی وجہ سے ہوا۔ وہ بہت عجیب آدمی تھا، میں اسے بھول نہیں سکوں گا۔''

''مجھے امید ہے کہ اس کے ساتھ اب بہتر ہوا ہوگا۔ اس نے زندگی بھر جو کیا، اس کا ازالہ اس نے چوبیس گھنٹے میں کر دیا تھا۔''

تیمور نے سر ہلایا اور نازیہ کے بیگ کی طرف دیکھا۔ ''آپ کہیں جا رہی ہیں کہیں تو میں چھوڑ دوں۔''

نازیہ انکار کرنے والی تھی مگر احسن نے کہا۔ ''یہ تو اچھا ہے کیونکہ مجھے ایک میٹنگ میں جانا ہے۔''

نازیہ ذرا مایوس ہوئی مگر کھڑی ہو گئی۔ تیمور کی خوشی دیکھنے والی تھی۔ اگرچہ وہ نازیہ سے عمر میں ذرا چھوٹا تھا۔ مگر احسن کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ کیوں خوش تھا؟ ان کے جانے کے بعد اس نے خود سے کہا۔ ''ضروری نہیں ہے کہ ہیپی اینڈ کی ہیروئن ہیرو کو ملے، کبھی کبھی وہ سائڈ ہیرو کا مقدر بھی ہوتی ہے۔ خوش رہو تم دونوں ہماری خیر ہے۔''